شرح دیوانِ غالب

مؤلفہ

(پروفیسر) یوسف سلیم چشتی

عشرت پبلشنگ ہاؤس متصل لاہور پریس عقب بان والی گلی

ہسپتال روڈ انارکلی لاہور

ردیف ا = 235 تا ۴۰۰ ردیف ب = ۴۰۱ تا 405

پتہ
عشرت پبلشنگ ہاؤس
حیات مارکیٹ بالمقابل ڈاکخانہ
غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

جس کتاب پر پبلشر کے دستخط نہ ہوں گے وہ مال مسروقہ
تصور ہوگا

شرحِ دیوانِ غالب

مؤلفہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

شائع کردہ

عشرت پبلشنگ ہاؤس

ہسپتال روڈ، انارکلی لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No 056445
MAILSI

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ

★

تعداد ——— ایک ہزار

★

قیمت ۔/ روپے

مطبع :۔ لاہور آرٹ پریس،
۱۵، نیوانارکلی لاہور
فون :۔ ۶۴۱۱۵۰

اِنتساب

میں اِس شرح کو بہت خوشی کے
ساتھ اپنے قدر دان، مہربان
جناب نُور محمدؐ صاحب جنرل منیجر
قریشی کنسٹرکشن کمپنی لاہور کے
نام منسُوب کرتا ہوں۔

دُعا گو

پروفیسر سلیم چشتی عفی عنہ

فہرست غزلیات

نمبر شمار	غزلیات	صفحہ

قصائد

فہرست عنوانات مقدمہ

دیباچہ

غالب نے اپنے کلام کے متعلق یہ پیشگوئی کی تھی کہ

ع شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔ بقول محترمی پروفیسر حامد حسن صاحب قادری "اردو شاعروں میں اِن کے کلام سے زیادہ کسی کے کلام کی قدر نہیں ہوئی دیوان غالب سے زیادہ کوئی دیوان نہ پڑھا گیا، نہ سمجھا گیا، نہ سمجھایا گیا، نہ چھاپا گیا اور یہ جو کچھ ہُوا بالکل بجا ہُوا۔ انیسویں صدی کا کوئی شاعر غالب سے زیادہ اس قدر دانی کا حقدار نہ تھا"

مولانا حالی مرحوم کی یادگار زمانہ "یادگار غالب" کے بعد نظم طبا طبائی نے دیوان غالب کی شرح لکھی اس کے بعد دیگر اصحاب نے اس طرف توجہ فرمائی چنانچہ اب تک ایک درجن سے زیادہ شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس قدر شروح کی موجودگی میں ایک سخن فہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ میں نے اس تعداد میں اضافہ کرنا کیوں ضروری سمجھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جس قدر شروح شائع ہو چکی ہیں، میں نے ان سب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا مگر مشکل ترین اشعار کا مطلب کسی شرح سے بھی مجھ پر واضح نہ ہو سکا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں ہرگز شرح لکھنے کی جسارت نہ کرتا۔ اب رہی یہ بات کہ میں کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ میں ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے دیوان غالب میں سے مشکل ترین اشعار منتخب کر لئے جائیں۔ (ایسے اشعار کی تعداد ستر اور اسی کے درمیان ہے۔) پھر ان کے مطالب اس شرح میں ملاحظہ کر لئے جائیں حقیقت حال خود بخود عیاں ہو جائے گی۔

میں نے یہ چند توضیحی سطور دل پر جبر کر کے لکھی ہیں اور مجبوراً لکھی ہیں۔ اگر میں صراحت نہ کرتا تو وہ سوال تشنۂ جواب رہ جاتا کہ آخر اتنی شروح کی موجودگی میں اس شرح کی کیا ضرورت تھی؟

اس شرح کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ میں نے شرح سے پہلے ایک بلسوط مقدمہ لکھا ہے جس کی قیمت اور افادیت کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہو سکے گا۔

چونکہ غالب نے اپنے دیوان میں نظریۂ وحدت وجود کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے اسلئے میں نے اپنے دوست ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مشورے کی بنا پر مقدمہ میں اس نظریہ کے مبادی بالوضاحت بیان کر دیئے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مطلب بیان کرنے کے بعد ہر شعر کا بنیادی تصور بھی درج کر دیا ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ آسان اشعار کا مطلب چند سطروں میں لکھا ہے لیکن مشکل ترین اشعار کی شرح میں وضاحت سے کام لیا ہے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ جن اشعار میں تعقید لفظی پائی جاتی ہے۔ مطلب بیان کرنے سے پہلے ان کی نثر بھی لکھ دی ہے اگرچہ میں نے کسی جگہ بھی "رجماً بالغیب" یا ظن وتخمین سے کام نہیں لیا ہے اس کے باوجود مجھے یہ دعوئے ہرگز نہیں ہے۔ کہ یہ شرح عیوب اور نقائص سے پاک ہے غلطی اور خطا کا ارتکاب تو لازمۂ بشری ہے۔

جن نامور حضرات ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر آل احمد سرور اور دیگر ارباب علم وفن نے جو کچھ غالب پر لکھا ہے میں نے بقدر ضرورت اس سے استفادہ کیا ہے جس کا اعتراف بصمیم قلب کرتا ہوں لیکن خصوصیت کے ساتھ اپنے محترم کرم فرما پروفیسر سید منظور احسن صاحب عباسی کا ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے مشکلات غالب کے حل کرنے میں ہر قدم پر میری دستگیری اور رہنمائی کی۔ اگر وہ میری امداد نہ فرماتے تو شاید میں اس مہم سے عہدہ برآنہ ہو سکتا۔ نیز یہ نکتہ عجیبہ کہ ہر شعر کا بنیادی تصور چند لفظوں میں لکھ دیا جائے انہی کا سمجھایا ہوا ہے ؛

(یوسف سلیم چشتی ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصلِ اوّل

غالبؔ کے سوانح حیات

پیدائش غالبؔ کا اصلی نام مرزا اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ مرزا نوشہ عرف تھا اور "نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ" خطاب تھا باپ کا نام مرزا عبید اللہ بیگ تھا۔ جن کی شادی آگرہ میں مرزا غلام حسین خاں کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ انہی کے بطن سے غالبؔ پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء ہے۔

ابتدائی زندگی غالبؔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لیے ان کی پرورش اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے کی لیکن جب وہ آٹھ سال کے ہوئے تو چچا بھی فوت ہو گئے۔ مگر نواب احمد بخش بیگ نے مرزا کے خاندان کے لیے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر اُن کے ثنا خوان رہے۔

مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم صاحب سے حاصل کی لیکن اُن کی خوش قسمتی سے ۱۸۱۱ء میں جب کہ اُن کی عمر ۱۴ سال کی تھی، ملا عبد الصمد نامی ایک ایرانی عالم جو نو مسلم تھا، بسلسلہ سیر و سیاحت وارد آگرہ ہوا۔ انہوں نے دو سال

تک اُس سے تعلیم حاصل کی مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے اس لیے اُن کا منہ بند کرنے کیلئے میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک فارسی نژاد آدمی تھا۔ اور مرزا نے اس سے فارسی زبان سیکھی تھی۔

چونکہ مرزا ابتدائی عمر میں یتیم ہو گئے تھے اور نانا نے اُن سے کبھی بازپرس نہیں کی اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر وہ جوانی میں راہ راست سے بھٹک گئے اور کچھ عرصہ تک لہو ولعب میں مشغول رہے لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لی۔ البتہ دختِ رز سے اُن کا تعلق آخر وقت تک قائم رہا۔

شاعری کی ابتدا بچپن ہی سے ہو گئی تھی چنانچہ انہوں نے اپنی ایک فارسی غزل اپنے استاد مولوی معظم کی خدمت میں بغرض اصلاح اس وقت پیش کی تھی جب کہ اُن کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

شادی اور دہلی میں قیام

۱۸۱۰ء میں جب کہ اُن کی عمر ۱۳ سال کی تھی، اُن کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی اور ۱۸۱۲ء میں انہوں نے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔

غور سے دیکھا جائے تو اس نقل مکانی سے اُن کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ یہاں آ کر اُن کی راہ و رسم بعض ایسے علم دوست حضرات سے ہوئی جن کی ذات سے انہیں گوناگوں علمی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوئے۔ اس دور انحطاط میں بھی دلی ایسی جگہ تھی کہ بقول میر ؎

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

چونکہ غالب نے نہایت اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ پایا تھا اور اُن میں اپنی اصلاح کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ اس لیے اُنھوں نے ساری عمر ہر گوشہ سے تمتع کیا جس کی بدولت اُن کا فن آسمان کو پہنچ گیا۔ اس کی تفصیل ان کی شخصیت کے باب میں پیش کی جائے گی۔

پنشن کا قضیہ اور سفر کلکتہ

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جب مرزا کے چچا نے وفات پائی تو اس وقت ان کی عمر ۹ سال کی تھی انگریزوں نے جو پنشن اُن کے خاندان کے لیے مقرر کر دی تھی۔ وہ ریاست فیروز پور جھرکہ سے ملتی تھی جب تک وہ صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا اس پر قانع رہے مگر شادی کے بعد اُن کی خانگی ضروریات بہت بڑھ گئیں اور وہ مقروض ہو گئے مرزا کو صحیح یا غلط یہ خیال پیدا ہوا کہ ریاست سے جس قدر پنشن ملنی چاہیے اس قدر نہیں ملتی لہٰذا کلکتہ پہنچ کر حکومت عالیہ میں استغاثہ دائر کرنا لازمی ہے۔

مرزا غالباً ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوئے اور یہاں سے کانپور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے علم دوست اور ادب نواز حضرات نے بڑی عزت اور محبت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ اور ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان محفل مشاعرہ بھی منعقد کی جس میں انھوں نے بھی ایک غزل پڑھی تھی جس کا مطلع یہ ہے :-

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

لکھنؤ میں ایک سال قیام کے بعد کانپور، بنارس، پٹنہ ہوتے ہوئے فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے لیکن ڈیڑھ سال سے زیادہ قیام کے بعد بے نیل مرام نومبر ۱۸۲۹ء میں دلی واپس آ گئے یہاں آ کر انھوں نے ریزیڈنٹ دہلی کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا جس کا فیصلہ ۱۸۳۶ء میں یہ ہوا۔ کہ جو پنشن (۷۵۰ روپے سالانہ) انھیں

ملتی ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن مرزا نے ہمت نہیں ہاری انہوں نے حکومت کو لکھا کہ میرا مقدمہ فیصلہ کے لیے ولایت بھیجا جائے مگر کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ آخر کار انہوں نے ملکہ انگلستان کی خدمت میں اپیل کی لیکن یہاں بھی کامیابی نہ ہو سکی چنانچہ ۱۸۴۴ء میں وہ بالکل مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔

مرزا نے اپنی پنشن میں اضافہ کے لیے مسلسل سولہ سال تک جدوجہد کی۔ اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ان کی باقی ماندہ عمر اُس قرضہ کے ادا کرنے میں کٹ گئی۔ جو انہوں نے دلی کے مہاجنوں سے اس مقدمہ کے سلسلہ میں لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے زندگی کی تلخیوں کو بڑی مردانگی کے ساتھ برداشت کیا۔ مگر یہ شعر اُن کی باطنی کیفیات کی بہت اچھی طرح عکاسی کرتا ہے :۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

قلعہ کی ملازمت

چونکہ مرزا انتہائی مالی مشکلات میں گرفتار ہو چکے تھے۔ بھلا ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار میں کیا گزار ہو سکتی تھی۔ اس لیے دوستوں کے مشورہ سے قلعہ کی ملازمت پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ جولائی ۱۸۵۰ء میں حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام اور مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب کی سفارش پر، بہادر شاہ ظفر نے ان کو خلعت فاخرہ اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب عطا کیا۔ پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی اور خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔

چونکہ ملازمین شاہی کو ہر ششماہی کے بعد چھ ماہ کی تنخواہ ملتی تھی اور مرزا اس قدر طویل عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے تھے اس لیے جنوری ۱۸۵۱ء میں انہوں نے ایک

منظوم درخواست پیش کی جس کا مضمون یہ تھا کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ تانہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

چنانچہ اس کے بعد انہیں ہر مہینے تنخواہ ملنے لگی جس کا سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔

۱۸۵۴ء میں مرزا فخرالدین ولیعہد اُن کے شاگرد ہوئے اور انہوں نے چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر کی۔ غالباً اسی زمانہ میں واجد علی شاہ کی سرکار سے پانچ سو روپے وظیفہ مقرر ہوا۔ لیکن شومی قسمت ملاحظہ ہو کر فروری ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ معزول ہو گئے جولائی ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ اور ۱۸۵۷ء میں لال قلعہ ہمیشہ کے لیے اجڑ گیا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء

اس زمانہ میں مرزا بلی ماروں میں رہتے تھے انہوں نے اپنی تصنیف دستنبو میں لکھا ہے کہ جب دیسی فوج شہر میں داخل ہوئی (۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء) تو میں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے۔ کہ وہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے انہیں ایسے ہنگامہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

چونکہ اسی محلہ میں اطبائے دہلی کے مشہور شریفی خاندان کے مکانات تھے اور اُن کا تعلق مہاراجہ پٹیالہ سے تھا اس لیے مہاراجہ نے اُن اطبا کی حفاظت کے لیے اپنی فوج کا ایک دستہ متعین کر دیا تھا اس لیے مرزا نسبتاً محفوظ رہے۔

ہنگامہ کے آغاز میں مرزا کی بیوی نے اپنے زیورات اور گھر کا قیمتی سامان میاں کالے صاحب کے یہاں بھیج دیا تھا مگر جب ۱۸ ستمبر کو انگریزوں نے دلی فتح کی تو میاں صاحب کے مکان کے ساتھ مرزا کا سامان بھی لُٹ گیا۔

اس ہنگامہ میں مرزا کی جان تو سلامت رہی مگر سرکاری پنشن اور قلعہ کی تنخواہ

بند ہو جانے سے ان کو شدید مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا نیز ۵ار اکتوبر کو پٹیالہ کے سپاہیوں کی روک ٹوک کے باوجود چند گورے دیوار پھاند کر محلہ میں داخل ہو گئے اور مرزا اور چند ہمسایوں کو پکڑ کر لے گئے اور کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا۔

لطیفہ کرنل نے مرزا سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو؟ مرزا نے جواب دیا حضور! آدھا مسلمان ہوں۔ وہ حیران ہو کر بولا۔ یہ آدھا مسلمان کیسا ہوتا ہے! مرزا نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ جناب شراب پیتا ہوں مگر سؤر نہیں کھاتا۔ یہ جواب باصواب سن کر کرنل ہنسنے لگا اور مرزا کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

مرزا یوسف کی وفات ۱۸ر اکتوبر کو مرزا کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ مرزا کو سخت رنج ہوا۔ ہمسایوں کو اُن کی بے کسی پر رحم آیا۔ وہ لوگ مہاراجہ پٹیالہ کے دو تین سپاہیوں کو ساتھ لے کر فراش خانے پہنچے مشکل تمام محلہ کی مسجد کے صحن میں قبر کھود کر میت کو دفن کر دیا۔

اس ہنگامہ میں مرزا کے ہندو دوستوں نے حتی الامکان ان کی امداد کی۔ جن میں منشی ہر گوپال تفتہ اور لالہ مہیش داس کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

رام پور کا وظیفہ انقلاب ۵۷ئہ کے بعد مرزا کی مالی حالت بہت زبون ہو گئی تھی اس لیے انہوں نے نواب یوسف علی خاں والئی رامپور کو لکھا کہ آپ میرا مستقل وظیفہ مقرر کر دیجیے چنانچہ انھوں نے سو روپے ماہوار مقرر کر دیئے جو مرزا کو تادم وفات ملتے رہے۔

سفر رامپور نواب صاحب کی دعوت پر جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا رامپور گئے اور مارچ میں وہاں سے واپس آئے۔

پنشن کا اجراء نواب رامپور کی کوشش سے مرزا کی پنشن بھی دوبارہ جاری ہو گئی چنانچہ مئی ۱۸۶۰ء میں اُن کو یک مشت تین سال کی پنشن

مل گئی۔

دربار اور خلعت جب پنشن جاری ہو گئی تو مرزا نے اپنے دربار اور خلعت کے لیے کوشش شروع کی۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں اُن کی یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔

رامپور کا دوسرا سفر ۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور کلب علی خاں مسند نشین ہوئے اس لیے مرزا اوّل الذکر کی تعزیت اور آخر الذکر کی تہنیت کے لیے اکتوبر ۶۵ء میں دوبارہ رامپور گئے اور جنوری ۱۸۶۶ء میں دلّی واپس آئے۔

آخر عمر کا نقشہ ۱۸۶۶ء سے مرزا کی صحت خراب رہنے لگی مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے غذا بھی کچھ نہیں رہی تھی۔

خواجہ عزیز لکھنوی نے لکھنؤ سے کشمیر جاتے وقت ایک دن کے لیے مرزا سے ملاقات کی خاطر دلی میں قیام کیا تھا اپنی ملاقات کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے کہ جب ہم مرزا صاحب سے ملاقی ہوئے تو ہم نے ان کو سلام کیا۔ مگر وہ اس قدر بہرے ہو چکے تھے کہ کچھ بھی نہ سُن سکے۔ آخر کچھ دیر کے بعد ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ تو انھوں نے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا ہم نے پھر سلام کیا تو چارپائی سے اُتر کر فرش پر بیٹھے اور قلمدان ہماری طرف سرکا کر کہا آنکھوں سے تو کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل نہیں سنائی دیتا اس لیے جو کچھ پوچھوں اس کا جواب لکھ دو۔۔۔۔

اس کے بعد نوکر سے کہا "کھانا لاؤ" اور ہم سے کہا آپ نے میرے ضعف جسمانی اور بصارت کی حالت تو دیکھ لی اب یہ بھی ملاحظہ کرنے جائیے کہ

میں کیا کھاتا ہوں۔" اتنے میں کھانا آگیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ روٹی کا چھلکا اتار کر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا۔

وفات جوانی کی بے اعتدالیوں اور شراب نوشی نے اُن کی صحت بالکل تباہ کردی تھی زندگی کے آخری ایام کا نقشہ خواجہ عزیز کے الفاظ سے عیاں ہے جس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں ہے۔

مرنے سے چند روز پیشتر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔ وفات سے ایک دن پہلے دماغ پر فالج گرا اور اسی بے ہوشی کی حالت میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اُن کا انتقال ہوگیا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں آف لوہارو نے اِن کو اپنے خاندانی قبرستان میں (جو بستی نظام الدین متصل چونسٹھ کھمبا واقع تھا۔) اہل تسنن کے طریقہ کے موافق دفن کیا۔ لوح مزار پر میر مہدی مجروح کا قطعہ تاریخ کندہ ہے۔ ع

ہاتف نے کہا "گنج معانی ہے تہ خاک" (۱۲۸۵ھ)

فصل دوم

مرزا کی شخصیّت

مولانا حالی جنہوں نے مرزا کو بہت قریب سے دیکھا تھا، لکھتے ہیں کہ مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ اِن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اِن کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے اس لیے اُن کے دوست جو ہر ملت و مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے جو خطوط انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان کے ایک ایک حرف سے محبت، غم خواری اور یگانگت ٹپکی پڑتی ہے ہر خط کا جواب لکھنا وہ فرضِ عین سمجھتے تھے وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی دل تنگ نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کے اصلاح کے علاوہ ان کے بعض مخلص دوست طرح طرح کی فرمائشیں کرتے تھے۔ اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے۔

مروت اور لحاظ، مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ بایں ہمہ کبھی کسی کی غزل بغیر اصلاح واپس نہ کرتے تھے۔ .. اگرچہ اُن کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے، اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے

تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "قلندری، آزادگی اور ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار، ایک بھی ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ جسمانی طاقت کہ ایک ہاتھ میں لاٹھی لوں۔ اور اس میں ایک شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود بوڑھا، ناتوان، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

جیسی مرزا کی طبیعت میں رسائی، ذہن میں جودت اور سرعت انتقال معنی تھی، اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس کر دیتے تھے مگر جو کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔

فکر شعر کا طریقہ یہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر سخن کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیا کرتے تھے اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد سے سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو اکثر ایک سرسری نظر میں اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ فرماتے تھے کہ ایک دن میں شاہ ولی اللہؒ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آ نکلے۔ میں نے وہ مقام ان کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہؒ بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے۔

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر سے کچھ کم لطف نہ تھا۔ اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا، لطف سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

ظرافت تو ان کے مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو حیوان ناطق کے بجائے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔ ایک دفعہ جب رمضان گذر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔"

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی بہت کم تھی مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء اور عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ بازار میں کبھی پالکی یا ہوادار کے بغیر نہیں نکلتے تھے۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ اخیر میں اُن کی خوراک بہت

کم ہوگئی تھی۔ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دستر خوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مسکرا کر کہنے لگے "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار دیکھیے تو بایزید کا۔"

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی مگر جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے اور اس میں دو حصے گلاب ملا لیتے تھے تاکہ حدت کم ہو جائے مگر اس احتیاط اور اعتدال کے باوجود اس کافرنشے کی عادت نے ان کی صحت کو سخت نقصان پہنچایا۔

اگرچہ انہوں نے اپنے کلام میں شراب کی جا بجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً اس کو بہت برا جانتے تھے اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں۔

اگرچہ ان کی طبیعت صلح جو واقع ہوئی تھی مگر داد سخن کے باب میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب تک کوئی شعر ان کو فی الواقع پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اس کی تعریف نہیں کرتے تھے، لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا اس کی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغہ کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے مومن کا یہ شعر سنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا!

تو بہت تعریف کی اور کہا "کاش مومن میرا سارا دیوان مجھ سے لے لیتا اور یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔"

ایک صحبت میں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

ایک دن مرزا شطرنج کھیل رہے تھے۔ منشی غلام علی خاں مرحوم نے کسی کو سُنانے کے لیے ذوق کا یہ شعر پڑھا:۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خان مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہنے لگے بھیا تم نے کیا پڑھا! میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا "ذوق کا" یہ سُن کر نہایت متعجب ہوئے۔ مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان واقعات سے ان کی انصاف پسندی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

مرزا کی دراکی اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں اسلاف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا، اس کے باوجود وہ اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اور اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے کیا اس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟"

مرزا کے کلام پر اگر کوئی شخص ٹھیک اعتراض کرتا تھا یا اُن کے شعر میں کوئی عمدہ تصرف کرتا تھا، تو اس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ ان کے ایک فارسی قصیدہ کی تشبیب کا یہ شعر ہے:۔

ہمچناں در تتق غیب ثبوتے دارند
بوجودیکہ ندارند ز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے "ثبوتے" کی جگہ "نمودے" لکھا تھا، لیکن جب مولوی فضل حق کو یہ شعر سنایا تو انہوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے، اس کی جگہ "ثبوت" بنا دو چنانچہ طبع ثانی میں انہوں نے نمود کے بجائے ثبوت بنا دیا۔

ان باتوں سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔

شیخ محمد اکرام نے اپنی قابل قدر تالیف "آثار غالب" میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"مرزا کی زندگی کے واقعات اور ان کی شخصیت پر غور کیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ اس میں تقدس اور ایثار و کرم اس قدر نمایاں نہیں ہے جس قدر مضبوط عقل و ہوش اور متوازن دل و دماغ۔ مرزا طبعاً نیک تھے، اور چونکہ انہوں نے خود طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کی تھیں اس لیے انہیں دوسروں کی تکالیف کا پورا احساس تھا اور انہیں دور کرنے کی ان کے دل میں مخلصانہ خواہش تھی۔ لیکن یہ خواہش اس قدر قوی نہ تھی جس قدر ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی۔ مرزا غالب سادہ دل ہرگز نہ تھے۔ بلکہ مضبوط ہوش و خرد کے مالک تھے۔ اور ان کے واقعات زندگی میں سب سے زیادہ معتمد اور باا‌ثر رہنما ان کی عقل سلیم ہی ہے۔

ان کی زندگی میں اس مضبوط عقل کی کارفرمائی صاف نمایاں ہے۔ جب مرزا پیدا ہوئے تو سلطنتِ مغلیہ کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ آٹھ سال کے تھے جب لارڈ لیک نے دلی اور آگرہ فتح کیے اور شمالی ہند میں کمپنی کی

حکومت مستحکم کر کے مغلوں اور افغانوں کی آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ مرزا نے یہ دیکھا کہ اب دنیاوی قدر و منزلت تو حاصل نہیں ہو سکتی زیادہ سے زیادہ کسی کچہری میں اہلمدی یا محرری مل جائے گی۔ اس لیے انہوں نے اپنی خاندانی پنشن پر قناعت کی اور شعر و سخن میں عروج حاصل کرنے کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مرزا کا یہ فیصلہ عقل سلیم پر مبنی نہ تھا اور اس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے ہمچشموں بلکہ تمام ہمعصروں سے آگے نہیں نکل گئے؟

مرزا کی تگ و تاز کا میدان شعر و ادب تھا اور ان کی ہمت اور جدوجہد کے کارنامے اسی میدان میں نظر آتے ہیں لیکن عام دنیاوی زندگی میں بھی انہوں نے دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اپنی جاگیر کی بازیابی اور پنشن میں اضافہ کے لیے مسلسل اٹھارہ سال تک کوشش کی۔ اگرچہ اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی مگر یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ وہ اپنی دھن کے بہت پکے تھے۔

مرزا کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ ان کی زندگی کی اقتصادی مہم اس طرح ناکام رہی کہ ایک بھرا ولا انسان بالکل بددل اور مایوس ہو جاتا اور اپنی باقی ماندہ زندگی غموں میں گھل گھل کر گذار دیتا لیکن ان کی روزمرہ زندگی میں تلخی اور ناکامی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ سچ ہے کہ ان کے اشعار اور ذاتی خطوط میں وہ درد و غم صاف نمایاں ہے جو ان کے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا لیکن اپنی زندگی میں اور دوسروں کے سامنے انہوں نے جس طرح اپنا بھرم قائم رکھا اس پر ان کے اشعار اور خطوط اور معاصرانہ تذکرے گواہ ہیں۔

انہوں نے نہ صرف رنج و غم اور مایوسی و ناکامی کے عالم میں اپنی شوخ طبعی اور شگفتگی برقرار رکھی بلکہ اقتصادی مشکلات کے باوجود خوش معاشی اور

نفاست پسندی کا ایک شاندار نمونہ قائم کیا۔

مضبوط ہوش و خرد، مسلسل جدوجہد، ظرافت، زندہ دلی اور نیک نفسی کے علاوہ ایک اور چیز جو مرزا کی زندگی میں خاص طور پر نمایاں ہے وہ اُن کی وضعداری حفظِ مراتب اور رکھ رکھاؤ کی کوشش ہے۔ وہ اگرچہ ایک شاعر اور آزادہ رو انسان تھے لیکن طبقۂ شرفا کے ترجمان بھی تھے۔

قوم اور ملک پر مرزا کے بڑے احسانات ہیں لیکن یہ احسانات محض ادبی نہیں ہیں بلکہ اُن کی عظیم الشان شخصیت اور مثالی زندگی بھی قومی روایات کا ایک بیش بہا زیور ہے۔

جس بارگاہ میں غالب کی شخصیت جلوہ گر ہے وہاں حاضر ہونے والوں کی گردنیں تعظیم اور احترام کے جذبہ سے جھک جاتی ہیں اور ان کے عظیم الشان کارناموں پر تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ جو ہستی یہاں صدر نشین ہے وہ فقط پُر شکوہ اور لائق احترام ہی نہیں بلکہ ہمارے ادب کی سب سے زیادہ ملنسار اور خوش صحبت اور خوش مذاق ہستی بھی ہے۔ آپ خواہ کسی مذاق کے ہوں وہ ہستی آپ کی تسکین خاطر کا سامان مہیا کر سکتی ہے۔ مثلاً

اگر آپ شوخی اور ظرافت کے طلبگار ہیں تو یہاں خیال آفرینی اور ظرافت کی پھلجھڑیاں ہیں جن سے آپ کے دل و دماغ پر لطیف تبسم کی لہر دوڑ جائے گی۔ اگر آپ شباب کی رنگین داستان اور حسن و عشق کے افسانے سُننا چاہتے ہیں تو یہاں وہ سوز و گداز اور رندی و سرمستی کی باتیں ہوں گی جن سے مردہ دلوں میں بھی جان پڑ جائے گی۔ اور اگر زندگی کے اسرار و رموز کی پردہ کشائی مطلوب ہے تو وہ پختہ کار ہستی آپ کو ایسی بلندی پر لے جا کر اس کارگاہ ہستی کی سیر کرائے گی جہاں سے اس عالم کون و مکان کی ہر شئے

صاف نظر آتی ہے۔

حضرت غوث علی شاہ صاحب قلندری پانی پتیؒ کے حالات و ملفوظات ان کے خلیفہ شاہ گل حسن قادری نے "تذکرۂ غوثیہ" کے نام سے شائع کئے ہیں۔ اس کتاب سے حسب ذیل اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ قلندر صاحب فرماتے ہیں:۔

"ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے لب فرش تک آگرے گئے اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا مرزا صاحب! ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے، علی الخصوص یہ شعر:۔

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی

کہا "صاحب! یہ شعر تو میرا نہیں ہے کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔"

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ ہر تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے "میں اس قابل نہیں ہوں۔ میخوار، روسیاہ گنہ گار مجھے آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اوش کا مضائقہ نہیں" ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ اُن کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے بھی ملے۔ اثناء گفتگو میں پوچھا کہ مرزا

صاحب! اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے؟ انہوں نے کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے "اور فسانۂ عجائب کی کیسی ہے؟ مرزا بیساختہ بول اُٹھے "اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطفِ زبان کہاں، ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب وہ چلے گئے تو حال معلوم ہوا بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔؟

دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے، یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں سرزد ہو گیا ہے۔ آیئے اس وقت ان کے مکان پر چلیں اور تلافیٔ مافات کریں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور صاحب کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے ہماری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ جناب مولوی صاحب! رات میں نے "فسانہ عجائب" کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبیٔ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں! نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے خیال میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اور اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو بہت مسرور کیا۔

دوسرے دن ان کی دعوت کی ہم کو بھی بلایا اور اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بہت بڑا گناہ ہے۔ اور درحقیقت ان کا یہ خیال بہت درست تھا کیونکہ اَلْمُؤْمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ عَنْ یَدِہٖ وَلِسَانِہٖ۔ یعنی مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔

خواجہ حافظ نے کیا خوب کہا ہے :۔

مباش در پے آزار دہر چہ خواہی کن
کہ در طریقت ما بیش ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا تم کو کسی سے محبت بھی ہے؟ کہا ہاں حضرت علی رضؓ سے۔ پھر ہم سے پوچھا آپ کو؟ ہم نے کہا واہ صاحب واہ! آپ تو مغل بچہ ہو کر علی رضؓ کی محبت کا دم بھریں۔ ہم ان کی اولاد کہلائیں اور ان سے محبت نہ کریں! کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے؟

مرزا کا مذہب

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "عقیدہ کی رو سے مرزا اثنا عشری شیعہ تھے اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علی رضؓ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے تو بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ "وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیاء" کے بدل معتقد تھے اور بزبان معترف تھے لیکن ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قبا ان کے بدن پر پوری طرح نہیں پھبتی تھی۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :۔

رموز دیں نہ شناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی است

مرزا کے کئی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روز جزا یا جسمانی عذاب کے بھی قائل نہ تھے۔ مثنوی ہو یا غزل جہاں کہیں انہوں نے بہشت کا ذکر کیا ہے ہمیشہ شوخی بلکہ تمسخر ہی سے کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سر سید احمد خان نعیم جسمانی کے منکر تھے، اسی طرح مرزا کی رائے بھی عام مسلمانوں سے مختلف تھی۔" (غالب نامہ صہ ۲۲۲)

مسٹر مالک رام لکھتے ہیں "جہاں تک اقرار باللسان کا تعلق ہے۔ مرزا

ساری عمر کھلے بندوں اپنے شیعی ہونے کا اعلان کرتے رہے۔ فرماتے ہیں:

(۱) محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ، علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدیٔ موعود علیہ السلام ۔ع بریں زیستم ہم بریں بگذرم" (بنام نواب علاؤ الدین احمد خاں سنّی)

(۲) "غالب اثنا عشری حیدری" (بنام غلام حسین قدر بلگرامی شیعی)

(۳) "علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا آپ کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا۔"

(بنام نواب میر غلام بابا خان بہادر سنّی)

(۴) "صاحب! میں اثنا عشری ہوں ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا خاتمہ بھی اسی عقیدے پر ہو۔" (بنام حاتم علی مہر شیعی)

(۵) جانتے ہو علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔"

(بنام یوسف مرزا شیعی)

(۶) "خدا کے بعد نبی، نبی کے بعد امام، یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام۔ علی علی کیا کر، فارغ البال جیا کر" (بنام میر جہدی مجروح سنّی)

خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسولِ خداﷺ کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔"

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "مرزا کے تمام خاندان کا، اور بزرگوں کا مذہب" سنت وجماعت تھا مگر اہلِ راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوشِ محبت میں تھا۔

نہ کہ تبرّا و تکرار میں، چنانچہ اکثر لوگ انھیں نصیریؔ[1] کہتے تھے اور وہ سُن سن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ خود کہتے ہیں:-

منصورِ فرقۂ اسد اللّٰہیان منم
آوازۂ "انا اسدُ اللّٰہ" برافگنم (آبِ حیات صہ ۵۱۰)

اگر ان کے کلام کو ان کے دلی عقائد کا آئینہ قرار دیا جائے تو حضرت علیؓ کی شان میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کی بناء پر ہم ان کو بلاشبہ فرقۂ اسد اللّٰہیاں میں شامل کر سکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

غالبؔ نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللّٰہ ام و ہم اسد اللّٰہیم

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

---

[1] نصیری، شیعوں کا وہ فرقہ ہے جو حضرت علی کو خدا مانتا ہے۔

فصل سوم

مرزا کی تصنیفات

مرزا نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں حسب ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جن کی بدولت انہیں بقائے دوام کی نعمت حاصل ہوئی اور دونوں زبانوں کے ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

قسم اوّل (فارسی نثر)

(۱) پنج آہنگ:۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے:۔ آہنگِ اول میں القاب و آداب، آہنگِ دوم میں مصطلحات و لغات، آہنگِ سوم میں اشعار منتخب از دیوان غالب، آہنگِ چہارم میں تقاریط، آہنگ پنجم میں مکاتیب۔

(۲) مہر نیمروز:۔ جیسا کہ اُن کے سوانح حیات میں مذکور ہوا، بادشاہ نے اُن کو خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا تھا۔ چنانچہ حسب الحکم انہوں نے تیمور کے حالات سے کتاب کا آغاز کیا اور عہد ہمایوں تک تاریخ مرتب کی۔ اس کے بعد بادشاہ نے دوسرا حکم دیا کہ بمشورۂ حکیم احسن اللہ خاں آغازِ آفرینش سے تاریخ لکھی جائے۔ چنانچہ مرزا کی فرمائش پر حکیم مذکور نے حضرت آدم سے لے کر چنگیز خاں تک کے حالات پر مضمون مرتب کر دیا۔

جسے مرزا نے فارسی کا لباس پہنایا اور ۱۸۵۴ء میں قصیدہ کی تاریخ کا مسودہ پیش کیا جس میں ابتدائے عالم سے عہد ہمایوں تک کے حالات درج کیے۔

(۳) دستنبو:۔ یہ کتاب انقلاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لکھی گئی جس میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی کے علاوہ عربی یا کسی اور زبان کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔

(۴) قاطع برہان:۔ مولوی محمد حسین تبریزی نے فارسی لغت کی ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کا نام برہان قاطع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مرزا کو اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ انہیں اس کتاب میں بہت سی اغلاط نظر آئیں اس لیے انہوں نے اس پر اعتراضات مرتب کیے اور ۱۸۶۱ء میں اس کا پہلا ایڈیشن لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(۵) درفش کاویانی:۔ مرزا نے قاطع برہان کا دوسرا ایڈیشن باضافۂ اعتراضات ۱۸۶۵ء میں چھپوایا اور اس کا نام درفش کاویانی رکھا۔

قسم دوم (فارسی نظم)

(۱) کلیات نظم فارسی:۔ مرزا کا فارسی کلام میخانۂ آرزو کے عنوان سے ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا مگر اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن جس میں ۱۸۵۹ء تک کا فارسی کلام بھی شامل ہے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۹۳ء میں۔ اور چوتھا ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

(۲) سبد چین:۔ اس مختصر مجموعہ میں مرزا کی مثنوی ابر گہر بار اور دیگر

قطعات جو کلیات میں درج ہونے سے رہ گئے تھے، شامل ہیں۔ یہ مجموعہ سبد چین کے عنوان سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔

(۳) دعائے صباح :- عربی زبان میں جو دعاء الصباح، حضرت علیؓ سے منسوب ہے، اس کا منظوم ترجمہ مرزا نے اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر فارسی میں کیا تھا۔ یہ مثنوی جس میں ۱۳۱ اشعار ہیں مرزا کی زندگی میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ دوسرا ایڈیشن حال میں رامپور سے شائع ہوا ہے۔

(۴) متفرقات غالب :- یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں رامپور سے شائع ہوئی۔ اس میں کچھ خطوط، کچھ نظمیں اور مثنوی باد مخالف جو مرزا نے کلکتہ میں لکھی تھی، اور وہ مثنوی بھی جو مرزا نے ۱۸۵۳ء میں بہادر شاہ پر تشیع کے الزام سے برأت کے سلسلہ میں لکھی تھی، یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

قسم سوم (اردو نظم)

۱۔ دیوان اردو :- مرزا کو دراصل اپنے فارسی کلام پر ناز تھا۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے :-

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

لیکن کرشمۂ تقدیر دیکھو کہ ان کی شہرت اسی مجموعۂ اردو کی بدولت ہوئی جس کو وہ "بیرنگ" کہتے تھے۔

جب انہوں نے مولینا فضل حق خیر آبادی مرحوم اور دوسرے دوستوں کے مشورہ سے اپنا رنگ سخن بدلا تو اپنے کلام کا خود انتخاب کیا

اور یہی انتخاب پہلی مرتبہ ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اس میں اشعار کی تعداد ۱۱۵۹ ہے۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں اور چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں اور پانچواں ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔

افسوس یہ ہے کہ اگرچہ ۱۸۶۳ء سے لے کر تا ایندم اردو دیوان کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر کوئی ایڈیشن ایسا نہیں ہے جسے مستند کہا جا سکے۔ موجودہ زمانہ میں جس قدر ایڈیشن دستیاب ہوتے ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس اختلاف کی تفصیل بخوف طوالت نظر انداز کی جاتی ہے۔

قسم چہارم (اردو نثر)

۱۔ عودِ ہندی:۔ یہ مرزا کے اردو خطوط کا مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۸۶۸ء میں میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ:۔ یہ بھی اُن کے اردو خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا حصہ مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ دوسرا حصہ بشمول حصۂ اول ۱۸۹۹ء مولانا حالی کے اہتمام سے شائع ہوا۔

(۳) مکاتیبِ غالب:۔ دربار رامپور سے مرزا کی خط و کتابت بارہ سال تک رہی۔ اخی محترم مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور نے ان تمام خطوط کو مکاتیب غالب کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں شائع کیا۔ پانچواں ایڈیشن باضافۂ حواشی مفیدہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

(۴) نادراتِ غالب:۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرزا نے اپنے دوست منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے تھے ان خطوط کو میر مہدی مجروح اور

میر افضل علی نے جمع کیا تھا جن کو ۱۹۴۹ء میں آخر الذکر کے نواسے آفاق دہلوی نے کراچی سے شائع کیا ہے۔

(۵) نکاتِ غالب و رقعات غالب:- ماسٹر پیارے لال آشوب کی درخواست پر مرزا نے دو مختصر رسالے مرتب کئے تھے۔ نکاتِ غالب میں فارسی صرف کے قواعد اردو میں لکھے تھے اور رقعات میں اپنے پندرہ فارسی مکتوبات، پنج آہنگ سے منتخب کر کے درج کیے تھے۔ یہ کتابیں ۱۸۶۷ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھیں۔

(۶) قادر نامہ:- عارف کے بچوں کے لیے مرزا نے آٹھ صفحہ کا یہ مختصر رسالہ تصنیف کیا تھا جس میں خالق باری کی طرز پر فارسی لغات کا مفہوم اردو میں واضح کیا ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:-

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا
ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

فصل چہارم

عہد غالب کے سیاسی، تہذیبی اور تمدنی حالات

تمہید نقادانِ فن کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہر بلند پایہ شاعر کے کلام اور اس کی شخصیت کو پورے طور سے سمجھنے کے لیے اس کے عہد کی تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ غالب اٹھارہویں صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی سنہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے سنہ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی اس لیے ذیل میں ہم اس دور کے سیاسی، تہذیبی اور تمدنی حالات بطرز اختصار قلم بند کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ ہر دور، ادوار سابقہ سے مربوط ہوتا ہے۔ اس لیے انیسویں صدی کے حالات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتے جب تک کم از کم اٹھارہویں صدی کے حالات سے آگاہی نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ سیاسی ادارے کی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کا خاتمہ انیسویں صدی کے آغاز یعنی سنہ ۱۸۰۳ء میں ہوا۔ لیکن تاریخ دان حضرات سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اس زوال کا آغاز سو سال پہلے یعنی سنہ ۱۷۰۷ء سے شروع ہوا تھا۔ اور اس آغاز کا پہلا نظارہ ارباب بینش نے اپنی آنکھوں سے سنہ ۱۷۱۲ء میں اُس دن دیکھا تھا جب حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے نااہل اور نالائق بلکہ ننگِ خاندان پوتے جہاندار شاہ کی منظور نظر یعنی لال کنوار کی دوگانہ نے ہرہ نامی طوائف نے، جب کہ وہ ہاتھی پر سوار، سلطنت مغلیہ کے قابل ترین سپہ سالار اور

ہفت ہزاری منصب دار نظام الملک آصف جاہ کے برابر سے گزری تو اس نے نہایت حقارت انگیز اور طنز آمیز انداز میں اُن سے دریافت کیا:۔

"چین قلیچ خاں پسرِ کور تو ئی ؟"

غور سے دیکھا جائے، تو ایک بازاری عورت نے ایک رکنِ سلطنت کی توہین نہیں کی بلکہ اُس نے خود سلطنت مغلیہ کے سینہ میں ایسا زہر آلود تیر پیوست کیا جس کی سمیت سے وہ چھ سال کے اندر اندر، لاشۂ بیجان ہو گئی یعنی عالمگیر کے جانشین، سیدوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے!

۱۷۰۷ء سے ۱۷۹۶ء تک ہندوستان کی تاریخ سلاطین مغلیہ کی عیاشی اور غفلت شعاری، اور امرائے سلطنت کی باہمی رقابت اور غداری کی ایک مسلسل داستان ہے۔ یہ داستان اگر ایک طرف نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز ہے تو دوسری طرف لغایت پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے چونکہ اس مقدمہ کے محدود صفحات اس تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے میں بادل ناخواستہ، اس عہد کی تاریخ سے قطع نظر کر کے، شاہ عالم ثانی کے دورِ حکومت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے حالات نہایت مختصر طور سے قلم بند کرنے پر اکتفا کروں گا۔ کیونکہ غالب اسی عاقبت نا اندیش بادشاہ کے عہد نامسعود میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱) سیاسی حالات

شاہ عالم ثانی کا اصل نام مرزا عبد اللہ تھا۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی کا بیٹا اور رسوائے عالم جہاندار شاہ کا پوتا تھا۔ اس کی ماں کا نام بھی لال کنور تھا۔

۲۴ جون ۱۷۲۸ء کو محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں پیدا ہوا۔ چونکہ اس کی ماں ہندو تھی اس لیے جب تک آنکھوں میں دم رہا، تمام ہندو تہوار مثلاً ہولی، دیوالی، دسہرہ ــ بڑی دھوم دھام سے مناتا رہا۔ شاعری تو گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ رہ گئی موسیقی تو اس فن لطیف کو استاد نذر علی سے حاصل کیا۔ جو محمد شاہ کے استاد، شاہ سدارنگ کا نامور شاگرد تھا۔ اسی ذوق کی بناء پر کبھی کبھی خواجہ میر دردؒ کی محفل سماع میں بھی شرکت کیا کرتا تھا۔

۱۷۵۴ء میں بد باطن کور نمک عماد الملک نے شاہ عالم کے باپ مرزا عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے بادشاہ بنایا اگرچہ اس بدنصیب بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ مگر نظر بند شہزادہ یک لخت ہندوستان کا ولی عہد بن گیا۔

چونکہ عماد الملک کو ۱۷۵۷ء میں اس کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے اس نے شہزادہ کو دوبارہ نظر بند کرنے کی کوشش کی مگر وہ بمشکل تمام دلی سے نکل کر اپنی جاگیر ــ ہانسی حصار میں پناہ گزین ہو گیا۔ وہاں سے نواب نجیب الدولہ کی دعوت پر ۲۲ اگست ۱۷۵۷ء کو میراں پور پہنچا۔ نواب موصوف نے پچاس ہزار روپے ماہوار پیش کیے اور بہت خاطر و مدارات کی۔ نیز یہ کوشش کی کہ روہیلے اور جاٹ، ولیعہد کے طرفدار بن جائیں تاکہ عماد الملک سے انتقام لیا جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی اس لیے ایک سال قیام کے بعد شہزادہ وہاں سے روانہ ہو کر بریلی ہوتا ہوا ۱۷۵۸ء میں لکھنو پہنچا۔ شجاع الدولہ نے بظاہر بہت آؤ بھگت کی مگر عماد الملک کے ڈر سے قیام کی دعوت نہیں دی۔

چونکہ محمد قلی خاں صوبیدار الہ آباد، بنگال پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے مدعو کیا، شجاع الدولہ نے بھی تائید کی اس لیے ولیعہد الہ آباد پہنچا۔ ۱۷۵۹ء میں بہار پر حملہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ اسی اثناء میں خبر ملی کہ عماد الملک نے عالمگیر ثانی کو قتل کرا دیا۔ یہ سنکر ولیعہد نے ۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء کو موضع کھتولی (صوبہ بہار) میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نجیب الدولہ کو امیر الامراء اور شجاع الدولہ کو وزیر بنایا۔

اسی اثناء میں عماد الملک نے مرہٹوں کی امداد سے نجیب الدولہ کو سُکرتال میں محصور کر لیا مگر احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر سن کر محاصرہ اُٹھا لیا۔ اور بھرتپور میں پناہ گزیں ہو گیا۔ ابدالی کی واپسی پر مرہٹوں کے سپہ سالار سداشوراؤ بھاؤ نے دلی پر قبضہ کر لیا اور لال قلعہ پر پیشوا کا ترددپرچم لہرانے لگا بلکہ مرہٹے سارے ہندوستان پر "ہندو پد پادشاہی" کا خواب دیکھنے لگے کہ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ نمک حرام[1] حسین علی خاں اور عبد اللہ خاں (بادشاہ گروں) نے مرہٹوں کے جس قصر اقتدار کا سنگ بنیاد ۱۷۱۹ء میں اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا تھا، ۱۷۵۹ء میں عماد الملک نے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اہل بینش کو اس ایک فقرہ میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی پوری تصویر نظر آ سکتی ہے!

شاہ عالم ثانی کو ۱۷۶۱ء میں شجاع الدولہ نے اپنی حمایت میں لے لیا اور ۱۷۶۴ء میں میر قاسم کی دعوت پر تینوں نے مل کر آخری مرتبہ بہار پر حملہ کیا مگر بکسر کی جنگ میں ان کی قسمت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی

---

[1] ع سادات بودے نمک حرامی کردند (بیدل)

قسمت کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ اب تک انگریز اس ملک میں تجارت کرتے تھے لیکن اس کامیابی کے بعد اس ملک پر حکومت کرنے لگے کیونکہ مجبور شاہ عالم نے ۱۷۶۵ء میں ان کو بنگال، بہار اور اڑیسہ تینوں صوبوں کے دیوانی حقوق بھی عطا کر دئے۔ اس کے معاوضہ میں انگریزوں نے شاہ عالم کی ۲۶ لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی۔

اِدھر ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست فاش دی لیکن مشیت ایزدی یہ تھی کہ ہندوستان پر انگریز حکومت کریں اس لیے ابدالی دہلی کے تخت پر جلوس کرنے کے بجائے اپنے وطن کو واپس چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جاٹوں نے سر اٹھایا۔ سورج مل نے آگرہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے بیٹے جواہر سنگھ نے دشمنِ ملت عماد الملک غدار کی مدد سے ۱۷۶۳ء میں دلی کا محاصرہ کیا۔ نجیب الدولہ نے پھر ابدالی کو بلایا۔ اُس کے آنے کی خبر سُن کر جواہر سنگھ نے صلح کر لی اور پھر بھرتپور واپس چلا گیا۔

۱۷۶۹ء میں مرہٹوں نے پھر طاقت فراہم کر کے آگرہ پر حملہ کیا۔ اس زمانہ میں چونکہ سکھوں نے دوآبہ میں (از سہارنپور تا اٹاوہ) غارتگری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس لیے نجیب الدولہ نے مرہٹوں سے صلح کر لی اور سکھوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ۱۷۷۰ء میں اس مردِ مجاہد کی وفات ہو گئی۔

نجیب الدولہ کے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اتنی بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ شمالی ہند میں اسلام اور اہلِ اسلام دونوں کی آبرو تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا بہترین ہندی سپہ سالار ہی

نہیں تھا بلکہ شجاعت، عدالت، شرافت، دینداری اور انسانیت میں بھی عدیم المثال تھا۔

جادو ناتھ سرکار نے بھی جس نے اپنی تمام تصانیف میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر ممکن موقع پر اپنے عنادِ قلبی کا مظاہر کیا ہے[۱]، بادلِ ناخواستہ اس مردِ مومن کی ذاتی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ "زوالِ سلطنت مغلیہ" جلد دوم ص۱۵۱ پر لکھتا ہے:-

"نجیب الدولہ نے ۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء کو ہاپڑ کے نزدیک وفات پائی۔ آخری کام، جو بلاشبہ اس کی پوری زندگی کا آئینہ ہے، یہ کیا کہ اپنی فوج کے نام یہ حکم جاری کیا کہ جو ہندو گڑھ مکٹیشر میں گنگا اشنان کے لیے جمع ہوئے ہیں، ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

اس طرح اس شخص کی زندگی کا خاتمہ ہوا جس سے زیادہ طاقتور شخصیت ان دس سالوں میں سارے ہندوستان میں اور کوئی نہ تھی۔ وہ ایک سپاہی سے ترقی کر کے محض اپنی ذاتی قابلیت اور پختگیٔ سیرت کی بدولت، سلطنت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوا۔ اول درجہ کی حربی اور انتظامی قابلیت، سیاسی تدبر، دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے اعتبار سے اس زمانہ میں باستثنائے ابدالی، کوئی شخص اس کا مدمقابل نہ تھا۔ جاٹ، مرہٹہ اور

---

[۱] اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے دیکھو (۱) تاریخ اورنگ زیب پانچ جلدیں اور (۲) تاریخ زوال سلطنت مغلیہ چار جلدیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج تک کسی مسلمان نے اس کی غلط بیانی اور زہر چکانی کا جواب نہیں دیا۔

سکھ حملہ آوروں کے مقابلہ میں دلی کی مدافعت، سکھ حملہ آوروں کے تعاقب میں اپنی شجاعت کی نمائش اور توپوں کے بغیر قلعۂ بواناکی تسخیر۔ یہ تینوں کارنامے اس کی بے نظیر قائدانہ صلاحیتوں اور اعلیٰ درجہ کی سپہگری کا نہایت روشن ثبوت ہیں۔ ایک مؤرخ حیران ہے کہ اس کی کس بات کی سب سے زیادہ تعریف کرے۔ میدان جنگ میں سپہ سالار کی یا ہر معاملہ میں موقع شناسی کی یا عالم اضطراب میں صحیح طریق کار کے انتخاب کی؟"

آمدم برسر مطلب، نجیب الدولہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے دلی پر قبضہ کر لیا اور یہ سوچا کہ اگر بادشاہ اپنی مٹھی میں آ جائے تو سارا ہندوستان زیر نگیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے شاہ عالم کو لکھا کہ تخت دہلی آپ کا منتظر ہے۔ چنانچہ یہ بد قسمت بادشاہ انگریزوں کی غلامی سے نکل کر ۲۵، دسمبر ۱۷۷۱ء کو دلی پہنچا۔ بظاہر تخت سلطنت پر جلوس کیا مگر بباطن مرہٹوں کا غلام ہو گیا۔ میرے اس دعویٰ پر خود اس کا یہ شعر شاہد عادل ہے:۔

ملک و مال سب کھوئے کے پڑے تمہارے بس
مادہو ایسی کیجیو جو آوے تم کو جس

جب مرہٹے امور سلطنت میں دخیل ہو گئے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ بیگانۂ عقل و خرد شاہ عالم کو ضابطہ خاں ابن نواب نجیب الدولہ مرحوم کے خلاف فوج کشی پر آمادہ کیا تاکہ روہیلوں سے ۱۷۶۱ء کی شکست کا انتقام لیا جا سکے[۱]

---

[۱] تاریخ دان حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ (باقی صفحہ ۵۶ پر)

جنوری ۱۷۷۲ء میں شاہ عالم نے مرہٹوں کو خوش کرنے کے لیے بلا وجہ مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنے دوستوں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں کی بے حرمتی اور آبرو ریزی کا دل خوش کن نظارہ بھی دیکھا۔[1] مرہٹے تو اپنے دشمنوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے شاداں و فرحاں فتح کا پرچم اڑاتے ہوئے واپس آئے۔ کوئی پوچھے کہ اس ظلم و ستم سے شاہ عالم کو کیا فائدہ حاصل ہوا؟

اس کے بعد مرہٹوں نے مرزا نجف خاں سے ساز بازکی اور اُسے وزیر مقرر کرا دیا۔ اس شخص نے دوبارہ ضابطہ خاں پر حملہ کیا اور اسے بالکل بے دست و پا بنا دیا۔ مرہٹوں کو خوش کرنے کے لیے اس نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خاندان پر بہت سختیاں کیں۔ حتیٰ کہ ان کے فرزندان گرامی قدر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵ :۔ شجاع الدولہ کی کوشش سے ابدالی کا وزیر مرہٹوں سے صلح پر آمادہ ہو گیا تھا مگر نواب نجیب الدولہ نے انتہائی مخالفت کی تھی اور چونکہ درانی فوج کے قاضی (محمد ادریس) نے بھی نواب مرحوم کی تائید کی تھی اس لیے ابدالی نے صلح کی پیش کش رد کر دی اور اس کا نتیجہ مرہٹوں کی شکست فاش کی صورت میں ظاہر ہوا۔

[1] میں نے بنظرِ اختصار صرف اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ جو اصحاب تفصیل کے آرزو مند ہوں وہ سرکار کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ مورخ مذکور نے اپنی تاریخ زوال سلطنت مغلیہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "فتح حاصل کرنے کے بعد مرہٹوں نے ضابطہ خاں کے خاندان کی عورتوں کی آبرو ریزی کی۔ وہ ان شریف خواتین کو زبردستی گھسیٹ کر اپنے خیموں میں لے گئے ......"

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ شاہ صاحبؒ سے مرہٹوں کو یہ شکایت تھی کہ انھوں ہی نے نجیب الدولہ کو اسلام اور مسلمانوں کی حمایت پر آمادہ کیا تھا۔ شاہ صاحبؒ کا خاندان ۱۷۸۳ء میں نجف خان کی وفات کے بعد دلی واپس آیا تھا۔

نجف خاں کے بعد افراسیاب خاں کو عروج حاصل ہوا۔ اُس نے کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ کو آگرہ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ چنانچہ شاہ عالم نے ۱۷۸۴ء میں عید کی نماز آگرہ ہی میں ادا کی۔ وزیر کی قید سے نکلنے کے لیے بادشاہ نے مادھوجی سندھیا کو بلایا۔ اس نے افراسیاب خاں کو اپنے لشکر میں بلاکر دھوکہ سے قتل کرا دیا۔ اس کے صلہ میں بادشاہ نے پیشوا کو وکیل مطلق اور سندھیا کو نائب السلطنت کا عہدہ عطا کیا۔ مادھو نے دلی پر قبضہ کر کے بادشاہ کا ۶۵ ہزار روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔

جب ۱۷۸۷ء میں سندھیا، گوالیار واپس چلا گیا تو غلام قادر خاں ابن ضابطہ خاں نے مرہٹوں سے اپنی اور اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے دلی پر حملہ کیا اور منظور علی خاں ناظر کی مدد سے قلعہ پر قابض ہو گیا اس کے بعد اسمٰعیل بیگ کی مدد سے آگرہ کا محاصرہ کیا مگر اسی اثناء میں سکھوں نے اس کی آبائی جاگیر (سہارنپور) پر حملہ کر دیا۔ اس لیے وہ فوراً واپس ہو گیا۔ سکھوں کو شکست دے کر غلام قادر خان پھر دلی آیا، اور شاہ عالم سے کہا کہ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں مرہٹوں سے اس بے عزتی کا جو انھوں نے میرے خاندان کی خواتین کے ساتھ روا رکھی تھی، انتقام بھی لے لونگا۔ اور آپ کو ان کی غلامی سے رہائی بھی دلوا دوں گا۔ لیکن یہ بادشاہ تو دینی اور قومی حمیت سے بالکل بے گانہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے اس

صحیح مشورہ پر عمل کرنے کے بجائے سندھیا کو اپنی مدد کے لیے بلانے کا فیصلہ کیا۔

اس فیصلہ سے ساری سپاہ غلام قادر خاں کی ہمنوا ہو گئی۔ اس لیے مجبوراً اس نے پھر خان مذکور کو امیر الامراء کا منصب عطا کیا۔ اس نے پھر بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھے روپیہ دیجیے تاکہ میں مرہٹوں پر حملہ کرکے شمالی ہند سے ان کا نام و نشان مٹا دوں۔ لیکن سیتل داس خزانچی نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ غلام قادر خاں کو بادشاہ کی نیت پر شبہ ہوا اس لیے اس نے معاملہ کی تحقیق کی تو وہ خط دستیاب ہو گیا جس میں شاہ عالم نے سندھیا سے اپنی مدد کی درخواست کی تھی۔

جب روہیلہ سردار پر بادشاہ کا فریب آشکارا ہو گیا تو اس نے اُسے معزول کرکے بیدار بخت کو تخت نشین کیا اور معزول بادشاہ سے غوث گڑھ کی تباہی کا، جو اس کے ہاتھوں ۱۷۷۲ء میں واقع ہوئی تھی، انتقام لیا۔ تاریخ تیموری میں مرقوم ہے کہ جب چنبیلی دائی نے جو بیگیات کی تلاشی لینے پر مامور کی گئی تھی، خان مذکور سے یہ کہا کہ "عورتوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو" تو اس نے یہ جواب دیا کہ "مجھے یاد نہیں کہ ۱۷۷۶ء میں شاہ عالم نے میرے خاندان کی عورتوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ظلم و ستم روا رکھا تھا"۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے دوستوں نے ان بےگناہ عورتوں کی آبروریزی کی تھی۔"

شاہ عالم کی تذلیل کے بعد خان مذکور نے اپنے خنجر کی نوک سے اس کی آنکھیں نکالیں اور نکالتے وقت اس سے کہا کہ "اگرچہ تمہارا جرم تو اس کا متقاضی ہے کہ تمہارا بند بند جدا کرکے تمہارا گوشت چیل کوؤں کو کھلا دیا جائے لیکن

یہ میری خدا ترسی ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑے دیتا ہوں، ہاں اس میں شک نہیں کہ میں نے تم سے غوث گڑھ کی اس بدسلوکی کا جو تم نے میری ماں بہنوں کے ساتھ روا رکھی، پورا پورا انتقام لے لیا ہے۔"

یہ تفصیل میں نے اس لیے سپردِ قلم کی ہے کہ اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے جو غیر مسلم مؤرخوں نے غلام قادر خاں کے اس طرزِ عمل کی بنا پر پیدا کر دی ہے۔ اس مردِ غیور نے اپنے خاندان کی خواتین کی بے حرمتی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اس لیے اگر اس نے اپنے دشمن سے انتقام لیا تو برائی کیا کی؟

سیواجی اگر افضل خان (اپنے دشمن) کو دھوکہ سے قتل کر دے تو اس کا نام دیش بھگتوں کی فہرست میں لکھا جائے اور یہ کہا جائے کہ اُس نے ناموسِ وطن کی خاطر ایسا کیا اس لیے اس کا یہ فعل لائق تحسین ہے۔ لہٰذا غلام قادر خان اگر اپنے دشمن سے اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لے تو اُس کا یہ فعل کس طرح مذموم قرار دیا جا سکتا ہے؟

دو تین آدمی میجر ایلیس کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے جائیں تو مجرموں کے قبیلے کے سینکڑوں آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے اور انگریز کی پیشانیٔ عدل پر شکن تک نہ آئے۔ لیکن اگر غلام قادر خاں اپنے پورے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لے تو ظالم اور سفاک قرار پائے!

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

۱۷۸۸ء میں سندھیا نے غلام قادر خاں کو شکست دے کر قتل کرا دیا۔ شاہ عالم کو دوبارہ تخت نشین کر کے نو لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دیا اور زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اورنگ زیبؒ کے جانشین کی "وفاداری بشرطِ استواری" قابلِ داد ہے کہ آنکھیں نکلوانی گوارا کر لیں لیکن مرہٹوں کی محبت

دل سے نکالنی گوارا نہ کی۔ ثبوت درکار ہو تو اس کا یہ شعر کافی ہے:۔

مادہوجی سندھیا فرزند جگر بند من است
ہست مصروفِ تلافی ستمگاریٔ ما

۱۷۹۹ء میں مرہٹوں اور نظام کی وطن دشمنی کی بدولت انگریزوں نے سلطان ٹیپو پر فتح حاصل کی۔ سلطان شہید کا وجود انگریزوں کے پہلو میں وہ کانٹا تھا جو رات دن کھٹکتا رہتا تھا بلکہ ان کے عزائم مشئومہ کی تکمیل میں سدِ سکندری بنا ہوا تھا۔ چنانچہ جب جنرل ہیرس کو سلطان کی شہادت کی اطلاع ملی تو بے ساختہ پکار اٹھا "اب سارا ہندوستان ہمارا ہے۔"

ہندوستان کی آئندہ تاریخ گواہ ہے کہ جنرل مذکور کا یہ قول بالکل صحیح تھا۔ سقوطِ سرنگاپٹم کے بعد کوئی طاقت انگریزوں کی فتوحات کے سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دلی فتح کر لی یعنی ایک سیاسی ادارہ کی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا اور شاہ عالم اسی قوم کا محکوم بن گیا جس کو اس نے ۱۷۶۵ء میں اپنی جنبش قلم سے حکمران بنایا تھا۔

۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو شاہ عالم نے جو بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم ہو چکا تھا، جنرل لیک سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور اس نے "بترحم خسروانہ" اس شاہِ بے مملکت کا ۱۱½ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر کے بادشاہی کو قلعہ معلی کی چار دیواری تک محدود کر دیا۔ شاہ عالم نے اسی حالتِ بیچارگی میں ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

شاہ عالم کے سوانح حیات پڑھ کر شاید بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میں نے اس کا ذکر سراسر غیر ہمدردانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص کی عظمت کا معیار صرف یہ ہے کہ اس کی ذات سے دین اور ملت کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عالمگیر رح کے بعد شاہ عالم تک کسی بادشاہ کی ذات سے دین کو تو کیا فائدہ پہنچتا از ۱۷۰۷ء تا ۱۸۰۳ء اس طویل دور نامسعود میں یہ سوال خارج از بحث ہے۔ خود مسلمانوں کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اس دور میں غیر مسلموں کی چیرہ دستیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ خاص دلی میں کسی مسلمان میں یہ ہمت نہیں تھی کہ کسی غیر مسلم کو علانیہ دائرہ اسلام میں داخل کر سکے [1]

اس تلخ داستان کو بالتفصیل تو میں اپنی مجوزہ "تاریخ مسلمانان ہند" میں بیان کروں گا، سردست اپنے موقف کو واضح کرنے کے لیے قائم چاند پوری کی اس نظم کے چند بند ذیل میں درج کرتا ہوں جو اس نے شاہ عالم کے غیر اسلامی طرز عمل سے متاثر ہو کر سپرد قلم کی تھی جس کے مطالعہ سے ناظرین کو اس نفرت کا اندازہ ہو سکے گا جو اس بادشاہ کی ذات سے متعلق لوگوں کے دلوں میں کارفرما تھی:۔

کیسا یہ شہ کہ ظلم پہ اس کی نگاہ ہے ٭ ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے

---

[1] حضرت مولانا فخر الدین صاحب چشتی نظامی دہلوی متوفی ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۴ء کے سوانح حیات میں درج ہے کہ دلی کے کئی غیر مسلم اُن کے معتقد تھے اور خفیہ طریق پر اُن کے حلقۂ ذکر میں شامل ہوتے تھے۔ مگر حضرت نے مصلحتاً ان کو علانیہ دائرۂ اسلام میں داخل نہیں کیا کیونکہ فتنہ کا اندیشہ تھا اور نجف خاں وزیر جو سیاہ وسپید کا مالک تھا، سنی مسلمانوں کا مخالف تھا، شاہ ولی اللہ رح کے خاندان کو اسی نے جلاوطن کیا۔

یہ ایک آپ، ساتھ میں شتری سپاہ ہے ؎ ناموس خلق سایہ میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظلِ الٰہ ہے

نوٹ:۔ شتری سپاہ سے مرہٹوں کی فوج مراد ہے جس نے غوث گڑھ میں مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی تھی۔

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو[1] ؎ ہو ویگا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھو
تازہ مرے وہی ہوں سرِ نو وہی غنو ؎ پر آسماں نے لا کے مسلط کیا سو تو
جس کے ستم سے چار طرف آہ آہ ہے

لشکر میں مرہٹوں کے جو کوئی رہا ہے بند ؎ دیکھے ہیں ان کے ظلم کے سب پست اور بلند
اب نام فوج سن کے وہ اڑ جائے جوں پرند ؎ سچ ہے کہ جس کو مار سے پہنچے کبھی گزند
رسی کو جانتا ہے کہ مار سیاہ ہے

سمجھا تو اس قدر بھی اے ... خبیث خر ؎ کس[2] پہ ہوا یہ مظلمہ لوٹا کنھوں نے زر
ہر نیک و بد میں آدمی کرتا ہے یاں نظر ؎ تو ہے خدا کے فضل سے اس باپ کا پسر
جس کا خطاب شاہِ حماقت پناہ ہے[3]

---

[1] اس شعر میں اس طرف اشارہ ہے کہ ۱۷۵۹ء سے ۱۷۷۱ء تک دلی کا تخت خالی پڑا رہا۔ مسلمان اس زمانہ میں یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ یہ تخت کب آباد ہوگا جو ہمیں راحت نصیب ہوگی۔

[2] اس شعر میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب شاہ عالم مرہٹوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن گیا تو مسلمانوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

[3] عالمگیر ثانی کی طرف اشارہ ہے جو عماد الملک کے زیر اقتدار تھا۔ اس نمکحرام نے اس سادہ لوح بادشاہ سے کہا کہ کوٹلہ فیروز شاہ میں ایک "درویش کامل" مقیم ہیں، آپ کو یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بادشاہ اس فرضی درویش سے ملنے کے لیے گیا اور عماد کے آدمیوں نے اسے قتل کر دیا۔

دادِ تڑا جو لال کنور کا تھا مُبتلا ❖ کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو بر ملا[1]
اس خاندان میں حمق کا جاری ہے سلسلا ❖ وہ روش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھا پن ان کا، تڑا داد خواہ ہے

شاہ عالم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معین الدین، اکبر شاہ ثانی کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔ نہ سلطنت تھی نہ سپاہ، نہ حکومت تھی نہ عز و جاہ مگر جھوٹی مفاخرت کا یہ عالم تھا کہ گورنر جنرل سے محض اس لیے ملاقات منظور نہیں کی کہ اُس نے دربار میں کرسی پر بیٹھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی اس توہین کا انتقام اس طرح لیا کہ ۱۸۱۸ء میں اپنے دوسرے غلام، نواب وزیر اودھ کے سر پر تاج شاہی رکھ کر اسے بادشاہ کا ہمسر بنا دیا۔ بادشاہ بے چارہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کرتا بھی کیا؟

اکبر شاہ نے ۱۸۳۷ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سراج الدین، بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ بیشک اس میں بہت سے خوبیاں بھی تھیں مگر

ع عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

---

[1] جہاندار شاہ کی طرف اشارہ ہے جو لال کنور (دلی کی طوائف) کے عشق میں اندھا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس کی محبوبہ نے کہا کہ میں نے ڈوبتے ہوئے آدمیوں کا تماشا کبھی نہیں دیکھا۔ عالمگیرؒ کے اس ناخلف پوتے نے بہت سے بے گناہوں کو کشتی میں سوار کرایا اور ملاحوں کو حکم دیا کہ جب کشتی منجدھار میں پہنچے تو الٹ دینا تاکہ ملکۂ عالم یہ راحت فزا نظارہ دیکھ سکیں!

اس لیے وہ اپنا وقت شاعری اور اورادِ سحر گاہی میں صرف کرتا تھا۔ چونکہ اپنے آقاؤں کا یہ طرزِ عمل اس سے پوشیدہ نہ تھا کہ وہ اس ڈرامے کو جو لال قلعہ کے اسٹیج پر ۱۸۰۳ء سے دکھا رہے تھے، اب ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اس نے یہ پیشنگوئی خونِ جگر سے لکھ کر شائع کر دی۔

اے ظفر بس ہے تجھی تک اہتمامِ سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نامِ سلطنت

دنیا کی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ اس دور بین بادشاہ کی یہ پیش گوئی ۱۸۵۷ء میں حرف بحرف صحیح ثابت ہو گئی۔ انگریزوں نے اُسے اُسی دیوانِ عام میں جس میں وہ حکیم احسن اللہ خاں اور مرزا الٰہی بخش جیسے "وفاداروں" کے جھرمٹ میں دربار کیا کرتا تھا ایک مجبور اور بیکس ملزم کی حیثیت سے کھڑا کیا اور بغاوت کے جرم میں رنگون بھیج دیا۔

حیف ہے وہ بھی نہ چھوڑی تو نے او بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

(ب) ثقافتی اور تمدنی حالات

مذہبی اور تمدنی حالات

گذشتہ اوراق کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہے کہ غالب کی ولادت ایسے زمانہ میں ہوئی جب مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنی آخری منزل طے کر چکا تھا۔ چنانچہ جب ان کی عمر چھ سال کی تھی تو مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ زوالِ حکومت کا باعث عموماً یہ ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ اور اس کے ساتھ ساتھ امراء کا طبقہ بھی عیش و عشرت

میں منہمک ہو کر اپنے فرائضِ منصبی سے غافل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جو عیش پرستانہ تھا۔

صاحبِ ثروت مسلمان عموماً مسرفانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور انجام سے غافل ہو کر تن پرستی میں منہمک تھے۔ خواص اور عام دونوں لایعنی رسوم میں گرفتار تھے اور اپنی خاندانی روایات ہی کو دین سمجھتے تھے۔

ع دنیا تھی روایات کے پھندوں میں گرفتار

اگرچہ حکومت جا چکی تھی مگر اس کی لَو، ہنوز دماغوں میں باقی تھی۔ یا یوں سمجھو کہ رسی جل گئی تھی مگر بل ابھی تک نہیں جلا تھا۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہوتے جا رہے تھے مگر اخراجات میں کوئی کمی نہ تھی۔

انگریز آہستہ آہستہ مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور ذہنی اعتبار سے اپنا غلام بنا رہے تھے مگر وہ حالاتِ گردوپیش اور زمانہ کے تقاضوں سے بے خبر تھے اس لیے اپنا وقت ان لایعنی بحثوں میں صرف کر رہے تھے:۔

(ا) اللہ تعالیٰ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟

(ب) اللہ تعالیٰ، اپنے وعدوں سے تخلف کر سکتا ہے یا نہیں؟

(ج) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا یا نہیں؟

(د) استمداد عن القبور جائز ہے یا نہیں؟ وغیر ذالک

چونکہ دین کا صحیح تصور عوام کے دماغوں سے زائل ہو چکا تھا۔ اس لیے دینی شعائر کی بے حرمتی عام تھی۔ جامع مسجد دہلی کے حوض کے چاروں طرف بازار قایم تھا جس میں کبوتر اور بٹیریں، تیتر اور مُرغ فروخت ہوتے

تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ کبوتر بازی، مرغ بازی اور پتنگ بازی مسلمانوں کے محبوب مشغلے تھے۔

امراء کی اخلاقی پستی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو علمِ مجلسی حاصل کرنے کے لیے طوائفوں کے یہاں بھیجتے تھے۔

شاعری اور موسیقی کی ہر جگہ گرم بازاری تھی۔ ہر دولت مند آدمی کے یہاں باقاعدہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ بادشاہ سے لے کر تنبولی تک سب شاعری کے دلدادہ تھے۔ بزرگانِ دین کے مزاروں پر ہر روز قوالی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ لال قلعے میں جس قدر شہزادے تھے سب شاعری اور موسیقی میں منہمک تھے۔ آخر وقت کیسے گذارتے؟

غالب کی ابتدائی زندگی جیسا کہ خود انھوں نے کئی جگہ لکھا ہے، اس عیش پرستانہ ماحول کی آئینہ دار ہے۔

اس زمانہ کے مسلمان اپنا وقت زیادہ تر کھیل تماشوں اور پھول والوں کی سیر، میں صرف کرتے تھے۔

چونکہ وہ رسوم و روایات میں گرفتار تھے اس لیے جاہل پیروں اور شعبدہ بازوں کی بہت قدر تھی۔ دوا اور علاج سے زیادہ گنڈے تعویذوں اور عملیات میں اعتقاد رکھتے تھے جس کو دیکھو حُب کے عمل اور کیمیا کے نسخہ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اور جو نسخۂ کیمیا اُن کے پاس تھا اُسے جزدان میں لپیٹ کر سب سے اونچے طاق پر رکھ دیا تھا تاکہ بے حرمتی نہ ہو!

اقتصادی اور معاشی حالات

اگرچہ مرہٹہ گردی اور جاٹ گردی اور سکھ گردی نے مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت زبوں کر دی تھی مگر انیسویں صدی کے آغاز

تک ان کے پاس جائیدادیں بھی تھیں اور صنعت و حرفت میں بھی بڑا حصہ تھا اور ملازمتوں کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ لیکن جب انگریزوں کو اقتدار حاصل ہوا تو ان کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز اپنے ملک کی مصنوعات کو یہاں فروغ دینا چاہتے تھے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ہندی مصنوعات کو ختم کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو اس وقت اس بات کا کیا احساس ہو سکتا تھا کہ انگریز، ہندستان کو تجارتی منڈی بنانے کے انتظامات کر رہے ہیں!

سنہ ۱۸۱۵ء تک یہ صورت تھی کہ ہندستان میں ۵ لاکھ گز سے بھی کم ولایتی کپڑا آتا تھا لیکن سنہ ۱۸۲۵ء میں ۵ کروڑ گز ولایتی کپڑا اس ملک میں آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کی صنعت و حرفت پر زوال آگیا اور رفتہ رفتہ یہ ملک ایک زرعی ملک میں تبدیل ہو گیا۔ ہزاروں صناع بے کار ہو گئے۔

سنہ ۱۸۳۵ء میں فارسی کے بجائے انگریزی کو دفتری زبان بنا دیا گیا چونکہ ہندوؤں نے سنہ ۱۸۱۵ء ہی سے انگریزی زبان پڑھنی شروع کر دی تھی اور مسلمان اس زبان اور دیگر مغربی علوم سے متنفر تھے اس لیے رفتہ رفتہ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہوتے چلے گئے۔ انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے بے دست و پا بنا دیا جائے تاکہ وہ ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکیں۔ چونکہ انگریزوں نے یہ ملک مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے انہیں خطرہ بھی انہی سے تھا۔ اور یہی وجہ ہے سنہ ۱۸۵۷ء میں فاتح قوم کا نزلہ مسلمانوں پر ہی گرا۔ ہندو نسبتاً محفوظ رہے۔

فصلِ پنجم

غالبؔ کا فن

تمہید ہر بڑے شاعر کو سمجھنے کے لیے اس کی ذہنیت اور اس کے فن سے آگاہی ضروری ہے مگر غالبؔ نے اپنے فن کا اظہار بالعموم شاعری اور بالخصوص غزل کی صورت میں کیا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہم ان دونوں چیزوں کی وضاحت کریں گے بعد ازاں اپنے اصلی موضوع کی طرف متوجہ ہوں گے۔

شاعری کا مفہوم شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے اس لیے اس کی جامع اور مانع تعریف تو بہت مشکل ہے لیکن ذیل میں کچھ اشارات درج کیے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس کا مفہوم کسی حد تک ذہن میں جاگزیں ہو سکے گا:-

۱۔ شاعری نام ہے انسانی تجربات، خیالات اور جذبات کے اظہار کا۔

۲۔ شاعری کہتے ہیں موزوں الفاظ میں حقائق کی تصویر کشی کو۔

۳۔ بقول میتھیو آرنلڈ، شاعری، زندگی کی تفسیر ہے اور اس تفسیر یا ترجمانی میں شعریت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں تخیل اور جذبات دونوں موجود ہوں۔

۴۔ شاعری، ادب کی سب سے زیادہ مقبول صورت ہے۔

۵۔ بقولِ شیلے، شاعری، تہذیب، آئین اور مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔

۶۔ شاعری، موزوں الفاظ میں جذباتِ قلبی کے اظہار کا نام ہے۔

۷۔ سر فلپ سڈنی کا قول ہے کہ شاعری جملہ علوم وفنون کی دایہ ہے۔

۸۔ بقول کیٹس، شاعری ہمیں انتہائی درجہ کی حیرت سے ہم آغوش کردیتی ہے۔

۹۔ بقولِ شبلی، شاعری وہ فن ہے جس کی بدولت شاعر دوسروں کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔

۱۰۔ راقم الحروف کی رائے میں شاعری وہ ملکۂ فطری ہے جس کی بدولت ایک شخص معمولی سی بات کو ایسے مؤثر اور دل کش انداز میں ادا کر سکے جسے سُن کر ہر صاحب دل بے اختیار تڑپ اٹھے۔ اس پر ایک عالم کیف وسرور طاری ہوجائے اور وہ شعر بلاکوشش اس کے صفحۂ دِل پر نقش ہوجائے مثلاً :۔

ایک عاشق جو شاعر نہیں ہے، معشوق سے اپنے اتصال روحانی کی کیفیت زیادہ سے زیادہ ان لفظوں میں بیان کرے گا۔

"آپ میری حقیقت ہیں"

لیکن ایک شاعر اسی بات کو (جسے سن کر سامع پر کوئی کیفیت طاری نہیں ہوئی) اس دلکش انداز میں ادا کرے گا:۔

کہئے کہ اب میں اپنی حقیقت کو کیا کہوں
جو سانس لی وہ آپ کی تصویر ہوگئی

اس شاعر نے بھی وہی بات کہی ہے جو پہلے شخص نے بیان کی تھی، مگر

انداز بیان نے - کیا جانے دل کو بہاتے ہیں کیوں شعر میر کے (جس کو اصطلاح شعریت کہتے ہیں)، اس بات کو شعر بنا دیا۔ "ہر سانس کا معشوق کی تصویر ہو جانا" یہ وہ انداز بیان ہے جس پر سامعہ ہی غرق کوثر و تسنیم نہیں ہو گیا بلکہ سامع کی پوری شخصیت شعریت کے سیل بے پناہ میں بہ گئی۔

آخر میرؔ کے یہاں انداز بیان کے علاوہ اور دنیا سے نرالی بات کیا ہے جس کی وجہ سے سارا عالم اس کے کلام پر سر دھنتا ہے؟ میرؔ نے اس شعر میں خود اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

اس کا جواب صرف یہ ہے کہ آپ بیتی کہنے کا ڈھنگ ایسا دلکش ہے کہ جو سنتا ہے بے اختیار سر دُھنتا ہے۔ اسی وصف خداداد کو دیکھ کر ناسخؔ سے لے کر اکبر الہ آبادی تک سارے استادوں نے میرؔ کو خدائے سخن تسلیم کیا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

واضح ہو کہ یہ انداز یا اسلوب بیان (جسے میر نے سلیقہ سے تعبیر کیا ہے) شعر یا غزل میں "زور مارنے" سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ چیز مسلسل مشق سخن سے حاصل ہو سکتی تو آج وہ تمام شعرا میرؔ کے ہم پلہ اور ہمسر ہوتے جو ساٹھ ساٹھ سال سے اس کوچہ میں پاپڑ بیل رہے ہیں۔ اگر یہ انداز عقل و دانش یا مشق و مزاولت پر موقوف ہوتا تو غالبؔ جیسا شخص میر کی عظمت کا اعتراف

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

تاکہ یہ نکتۂ بلیغ ذہن نشین ہو جائے میر کے دو چار شعر اور سن لیجیے:۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

شعر کا مفہوم سب سے پہلے رئیس المتغزلین حسرت موہانی کی رائے درج کرتا ہوں فرماتے ہیں اور کس خوبی کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

(۱) یعنی شعر وہ کلام موزوں ہے جس کے ذریعہ سے شاعر اپنے خیالات کو ایسے دلکش انداز سے پیش کرتا ہے کہ سننے والے پر ایک عالم سرور طاری ہو جاتا ہے۔

بالفاظِ دگر شاعری بات کہنے کا فن ہے اور شعر اس فن کا خارجی مظہر ہے۔

(ب) شیلے کہتا ہے کہ شعر تخیل کی زبان ہے، یعنی شعر نام ہے قلبی جذبات کو موزوں الفاظ میں بیان کرنے کا۔

(ج) شعر وہ ہے جس کو پڑھ کر ہمارے تخیل اور جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے۔

(د) بقول اقبال:-

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

یعنی شعر نام ہے کسی سچائی (حق بات) کو اس انداز سے کہنے کا کہ اس میں کہنے والے کا سوزِ دل بھی شامل ہو جائے۔ اسی سوزِ دل کو اقبال نے "خونِ جگر" سے بھی تعبیر کیا ہے اور اقبال کی رائے میں یہی جوہر لطیف آرٹ کی اصلی بنیاد ہے:-

ع معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

(ہ) شعر میں "ظہور" کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بال کو شعر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ظاہر ہوتا ہے نیز ظاہری اطوار کو شعار کہتے ہیں۔ شعر کو شعر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ہمارے قلبی خیالات، جذبات اور احساسات کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قافیہ، ردیف اور وزن، شعر کے لوازم

یا اجزائے ترکیبی نہیں ہیں بلکہ شرائط ہیں۔

(۳) باعتبارِ حقیقت، شعر کے دو اجزا ہیں:۔ تخیل اور محاکات[1]

دو لوازم ہیں:۔ ذخیرۂ الفاظ اور مطالعۂ فطرت

دو شرائط ہیں:۔ وزن اور قافیہ

---

[1] تخیل:۔ یہ وہ قوت ہے جس کی بدولت شاعر نئی دنیائیں اور نئے نکتے پیدا کر سکتا ہے۔ نقادانِ فن کی رائے میں شاعری درحقیقت تخیل ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ قوت بیجان چیزوں میں جان پیدا کر دیتی ہے۔ صبح و شام، گلستان و صحرا، بہار و خزاں، بلبل و پروانہ ساحل و دریا سب چیزیں شاعر سے باتیں کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ اسی قوت کا کرشمہ ہے کہ موج، اقبال سے اور مٹی سعدی سے ہمکلام ہو گئی:۔

(۱) موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم، گر نروم نیستم (پیام مشرق)

(ب) بگفتا من گلے ناچیز بودم
دے یک مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشین در من اثر کرد (بوستاں)
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(ب) محاکات کی تعریف یہ ہے کہ کسی واقعہ یا حالت کو بذریعہ الفاظ اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ یعنی محاکات دراصل مصوری کا دوسرا نام ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ محاکات کے ذریعہ سے جذبات کی تصویر بھی کھینچ سکتے ہیں۔

ان امورِ ستہ کے علاوہ آٹھ باتیں اور بھی ہیں جن سے شعر کی دلکشی اور دلآویزی میں اضافہ ہو جاتا ہے :-

بلاغت، سلاست، اصلیت، جوش، تشبیہ، استعارہ، سوز و گداز اور حُسنِ بیان یا طرفگی ادا۔ ذیل میں ان الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے :-

(۱) بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ کلام، مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ اور فصیح بھی ہو یعنی جس حالت کا بیان مقصود ہے اگر کلام اس میں اس طرح ڈوبا ہوا ہو کہ کہنے والا کہہ رہا ہے اور سُننے والے کی آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ کھینچا جاتا ہے تو اسے کلام بلیغ کہتے ہیں۔ بالفاظِ دگر، مضمون ایسا دلآویز ہو کہ دوسروں کے دل پر بھی وہی اثر ڈالے جو مقرر یا مصنف یا شاعر کا منشا ہے اور جو کیفیت متکلم کے دل پر گذر رہی ہے، وہی سامع کے دل پر بھی طاری ہو جائے۔

(۲) سلاست سے مراد یہ ہے کہ الفاظ وہ ہوں جو روزمرّہ استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ ہو تو ایسا جو سب کی زبانوں پر جاری ہو۔ استعارہ یا تشبیہ ایسی ہو کہ سامع کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جائے۔ غالب نے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے :-

دیکھا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(۳) اصلیت سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کا بیان ہو وہ واقعہ کے اعتبار سے یا شاعر کے عندیہ میں یا مخاطب کے عقیدہ میں ویسی ہی ہو جیسا کہ الفاظ اُسے ظاہر کر رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو کلام بے اثر ہو جائے گا۔

(۴) جوش کا مطلب یہ ہے کہ شعر سُن کر یہ اثر مرتب ہو کر خود مضمون

نے شاعر کو اس کے اظہار پر مضطر کر دیا ہے یعنی اس نے کاوش کر کے مضمون پیدا نہیں کیا بلکہ خود مضمون نے اس کو شعر کہنے پر مجبور کر دیا۔
(۵) تشبیہ کہتے ہیں کسی خاص لحاظ سے ایک شئ کو کسی دوسری شئ جیسا ظاہر کرنا۔ تشبیہ ایک قسم کی تصویر ہے جس سے مشبہ کا اثر بڑھ جاتا ہے اور سامع کو حظ حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً:-

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

(۶) استعارہ کے لغوی معنی تو کسی شئے کو بطور عاریت طلب کرنا ہیں لیکن فن بیان کی اصطلاح میں استعارہ وہ لفظ ہے جو غیر وضعی معنوں میں مستعمل ہو اور حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا علاقہ ہو۔ مثلاً

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

(۷) سوز و گداز۔ چونکہ یہ وصف سراپا ذوقی اور وجدانی ہے اس لیے لفظوں کے ذریعے سے اس کی توضیح بہت مشکل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح چمن میں دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے اس طرح کلام میں سوز و گداز بھی وہ نعمت ہے جو کسی خوش نصیب ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے دلِ گداختہ شرطِ اولین ہے اس کے علاوہ زبان اور بیان پر قدرت بھی لازمی ہے۔ چند مثالیں لکھتا ہوں۔ یقین ہے ان کو پڑھ کر سوز و گداز کا مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔

وہ اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے

آپ نے دردِ سُن لیا ہوتا
درد کی کچھ دوا نہیں، نہ سہی

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

درؔد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یادِ اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

کوئی چٹکی سی کلیجہ میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

جو بھی شئے ہے ہمہ تن راز ہوئی جاتی ہے
زندگی دُور کی آواز ہوئی جاتی ہے

(و) حُسن بیان۔ اسی کو اندازِ بیان بھی کہتے ہیں اور اس کی مثالیں اوپر گذر چکی ہیں۔

(ز) شعر، حُسن کے شدید احساس سے وجود میں آتا ہے۔ بالفاظِ دگر، وہ شاعر کے اندرونی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برمحل استعمال پر موقوف ہے۔ اور اس کی روح رمز و کنایہ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!

(ح) شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں ہے نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں ہے۔ شعریت وہ حُسنِ کلام ہے جس کی بدولت ذہنِ سامع کو لطف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ یعنی شعر میں جذبات کی ایسی شدت ہو اور ایسی والہانہ کیفیت ہو اور ایسا چونکا دینے والا اسلوب ہو کہ خیالات کی ایک دنیا سامنے آجائے اور سُننے والا محوِ حیرت ہو کر رہ جائے۔

اسی وصف خاص کو بعض اربابِ فن، معنویت یا شعریت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی بناء پر شعر اور شاعر دونوں کی عظمت دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے بلکہ انسان اس کے اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غالب نے اسی معنویت یا شعریت کو "چیزے دگر ورائے شاعری" سے تعبیر کیا ہے جس کی بدولت سامع پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے:-

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

جس شعر میں شعریت اور معنویت اپنے کمال پر پہنچ جاتی ہے وہ شعر جادو بن جاتا ہے۔ مثلاً

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فاخ
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دیکھا تو ہو گا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

غزل غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے یا ان کے بارے میں باتیں کرنا اور ان سے اظہار عشق کرنا۔ اصطلاحی معنی ہیں واردات قلبی اور کیفیات عشق کا بیان۔

(۲) غزل کی شاعری بڑی حد تک داخلی شاعری ہے یعنی شاعر اپنے موضوع کی تلاش خود اپنی ذات میں کرتا ہے[۱] غزل میں حد درجہ کی دروں بینی پائی جاتی ہے۔ یعنی غزل گو شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اپنے من میں ڈوب کر کہتا ہے۔ غزل، شاعر کے اندرونی تجربوں کا دلکش انداز میں اظہار ہے۔[۲]

(۳) چونکہ پوری بات صرف دو مصرعوں میں کہنی ہوتی ہے اس لیے غزل کے اشعار میں تفصیل کے بجائے رمز و ایما (ایمائیت) سے کام لیا جاتا ہے :-

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

یہ ایمائیت جس قدر سلیقہ اور صداقت کے ساتھ برتی جائے گی، غزل

---

[۱] پروفیسر آل احمد سرور "جدید اردو شاعری"
[۲] ڈاکٹر یوسف حسین خاں "اردو غزل"

میں اسی قدر وسعت، تاثیر، گیرائی اور گہرائی پیدا ہوگی۔ ؎۱

(۴) داخلیت سے مراد ہے شاعر کا اپنی واردات قلبی کا اظہار کرنا مثلاً

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

(۵) خارجیت سے مراد ہے شاعر کا محبوب کے حسن و جمال کا ذکر کرنا مثلاً

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

(۶) غزل کا سب سے اہم موضوع عشق ہے تمام غزل گو شعراء نے عشق ہی کی مختلف کیفیات کا بیان کیا ہے مگر چونکہ ہر شاعر کی افتادِ طبع، طرزِ فکر اور ولادت قلبی کی نوعیت، ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اسی لیے موضوع کی یکسانیت کے باوجود ہر شاعر کا رنگ دوسروں سے جدا ہوتا ہے۔ حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ چاروں غزل گو ہیں مگر

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

(۷) ابہام اور اجمال غزل کی جان ہیں۔ ان کو رمز و ایما بھی کہتے ہیں غزل میں حسن و عشق کی داستان ایمائی انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ چونکہ غزل میں تفصیل یا توضیح کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے شاعر مجبوراً رمز و ایما سے کام لیتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں :-

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

؎۱ خواجہ احمد فاروقی "میر تقی میر"

؎۲ ڈاکٹر عبادت بریلوی "غزل اور مطالعۂ غزل"

(۸) غزل چونکہ داخلی صنفِ سخن ہے اور اس میں شاعر زیادہ تر کیفیاتِ عشق اور وارداتِ قلبی کی ترجمانی کرتا ہے اس لیے غزل کی شاعری بعض اوقات غیر شعوری طور پر فلسفیانہ اور متصوفانہ شاعری بن جاتی ہے۔[۱] چنانچہ بیدل، خواجہ میر درد، غالب، اقبال اور اصغر کا کلام اس حقیقت پر شاہد عادل ہے، اسی لیے تمام بالغ نظر نقادانِ فن کا نظریہ یہ ہے کہ غزل، شاعری کی شریف ترین اور پاکیزہ ترین صنف ہے۔

(۹) غزل کی دلکشی کا دارومدار زیادہ تر اندازِ بیان پر ہے اسی کو طرفگیٔ ادا بھی کہتے ہیں۔ اسی اندازِ بیان کی بدولت غزل میں تغزل پیدا ہوتا ہے جس کو بلاشبہ غزل کی رُوح کہہ سکتے ہیں۔ غزل اور تغزل لازم و ملزوم ہیں۔ اگر غزل میں تغزل نہ ہو تو وہ جسم بے رُوح ہے۔ جسے موجِ زندگی کہتے ہیں وہ اسی تغزل کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔[۲]

اصغر غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

(۱۰) غالب نے سخن محبوب کو بلائے جاں قرار دیا ہے اور اس کی شاعرانہ نظر نے اس کو تین اجزا میں تقسیم کیا ہے :-

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا،

یہی تینوں اجزائے تغزل کے اصلی عناصر ہیں۔ غزل محبوب سے اور محبوب

---

[۱] پروفیسر آل احمد سرور "جدید اُردو شاعری"
[۲] ڈاکٹر عبادت بریلوی "غزل اور مطالعہ غزل"

کی گفتگو ہے۔ اس کی خوبی تاثیر میں منحصر ہے۔ انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا اثر پیدا کرنا ہے (جسے تاثیر کہتے ہیں) اول الذکر مقصد کے لیے نثر کافی ہے۔ آخر الذکر مقصد کے لیے نظم (شاعری) وجود میں آئی اس لیے شعر کا سرمایہ تاثیر کے خمیر سے بنتا ہے۔ تغزل کی تاثیر کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ عبارت، اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبے کی تصویر کو دلکش بنایا جائے۔ ان مختلف رنگوں کی آمیزش کے لیے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ مثلاً اگر غزل کے کسی شعر میں صرف اشارے کی خوبی ہو لیکن عبارت اور ادا میں دلکشی نہ ہو تو شعر میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی تاثیر کو اصطلاح میں تغزل کہتے ہیں۔ یعنی دراصل تغزل ایک مخصوص انداز بیان کا دوسرا نام ہے۔[۱]

---

[۱] ڈاکٹر یوسف حسین خان "اردو غزل"

غالبؔ کی ذہنیت

کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے اور اس کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے اُس کی ذہنیت یا افتادِ طبع سے آگاہی بہت ضروری ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں چند اشارات درج کرتے ہیں :۔

(۱) غالب کا رجحانِ طبع فلسفیانہ تھا اسی لیے نقادانِ فن نے ان کو اردو زبان کا سب سے پہلا فلسفی شاعر قرار دیا ہے۔ فلسفی شاعر کا مفہوم سمجھنے کے لیے تصریحات ذیل پر غور کیجیے۔

شاعروں کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں :۔

(ا) خالص شاعر:۔ جو حسن و عشق کی واردات بیان کرے۔ بالفاظِ دگر جس کے کلام میں بلند پایہ تغزل پایا جائے۔ مثلاً مومنؔ، داغؔ، حسرتؔ اور جگرؔ وغیرہ۔

(ب) فلسفی شاعر:۔ جو اپنے کلام میں تغزل کے علاوہ فلسفیانہ حقائق و معارف بھی بیان کرے یعنی حیات اور کائنات سے متعلق مسائل پر اپنا مخصوص نقطہ نظر شاعرانہ انداز میں پیش کرے مثلاً غالبؔ، اصغرؔ اور فانیؔ۔

(ج) شاعر فلسفی:۔ جو شاعری کو اپنے مخصوص نظام فکر کی تبلیغ اشاعت کا ذریعہ بنائے مثلاً رومیؒ، بیدلؒ اور اقبالؒ۔

فلسفی شاعر کا نقطۂ نظر فنکارانہ یا شاعرانہ ہوتا ہے لیکن شاعر فلسفی کا زاویہ نگاہ حکیمانہ یا عارفانہ ہوتا ہے۔

(۲) چونکہ فلسفی شاعر کی طبیعت میں جستجو اور تحقیق کا مادہ ہوتا ہے اس لیے

وہ اپنے اسلاف کی کورانہ تقلید سے ہمیشہ گریزاں رہتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے:۔

با من میاویز اے پسر فرزند آذر را نگر!
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فن شاعری میں بھی مجتہدانہ بالغ نظری سے کام لے کر اپنے لیے جداگانہ اسلوب بیان پیدا کیا، اور ان کے کلام میں ہم کو قدم قدم پر اُن کی جدت طرازی کے شواہد نظر آتے ہیں۔

۳۔ ان کی رائے میں کسی شخص کی عظمت کا معیار یہ ہے کہ وہ جس بات کو صحیح سمجھے اس پر استواری کے ساتھ کاربند ہو جائے اور دوسروں کی مدح یا ذم کی پرواہ نہ کرے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو!

۴۔ یہ سچ ہے کہ وہ مسلمانوں میں پیدا ہوئے تھے مگر مذہب کی قبا اُن کے جسم پر کبھی موزوں نہ ہو سکی۔ تشکیک کا جذبہ رہ رہ کر اُن کی زندگی کی گہرائیوں سے ابھرتا رہا:۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ان کی شاعری اور ان کے خطوط میں خدا سے تمسخر اور استخفاف عقائد کا جو رنگ جھلکتا ہے وہ اسی ذہنیت کا نتیجہ یا ثمرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میر مہدی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "اگر آدمی بننا چاہے تو منطق اور فلسفہ پڑھ قرآن اور فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔"

یوں کہنے کی حد تک وہ لاموثر فی الوجود الا اللہ اور لا موجود الا اللہ سبھی کچھ کہتے تھے مگر جن لوگوں نے ان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس عقیدہ کا کوئی اثر ان کی زندگی پر مرتب نہیں ہوا اس لیے کہ ہو نہیں سکتا تھا۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اربابِ بینش اچھی طرح جانتے ہیں کہ توحید کا عقیدہ جس شخص کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے وہ کبھی کسی انسان کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کر سکتا۔ ثبوت درکار ہو تو بیدلؔ کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا:۔

(ا) جب شہزادہ اعظم نے اپنے ایک ندیم کی معرفت بیدلؔ کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر ہماری مدح میں قصیدہ لکھ کر پیش کرو تو ہم تمہیں گرانقدر انعام دیں گے۔ تو اس مردِ خود آگاہ نے جو "بیدلؔ" ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ دل بھی تھا، شہزادہ کی ملازمت ہی سے استعفا دے دیا۔

(ب) جب نظام الملک نے حیدر آباد آنے کی دعوت دی۔ تو یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

(ج) جب سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے جو تاریخ میں "بادشاہ گر" کے لقب سے مشہور ہیں فرخ سیر کو قتل کرایا تو سارے ہندستان میں بیدلؔ ہی وہ شاعر تھا جس نے اس حادثۂ فاجعہ کی تاریخ برآمد کرنے کے لیے یہ مصرع موزوں کیا۔

ع سادات بوئے نکحرامی کردند ۱۱۳۱ھ

۵۔ غالب اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے ایک رند لا ابالی تھے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں "ساری عمر میں ایک دن بھی نماز پڑھی ہو تو کافر اور ایک دن بھی شراب نہ پی ہو تو گنہگار پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزوں نے مجھے کیوں مسلمان سمجھا؟

یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر اتباع شریعت سے کوسوں دُور رہے اور جس زمانہ میں ہندستانی مسلمان سید احمد صاحب رائے بریلویؒ کے ساتھ تحریک جہاد میں حصّہ لے رہے تھے، وہ کلکتہ میں بیٹھے ہوئے انگریزوں کی شان میں قصیدہ خوانی کر رہے تھے۔

۶۔ چونکہ وہ عیش و عشرت کے دلدادہ تھے، بلکہ دنیا طلبی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس لیے ساری عمر اطمینان قلب سے محروم رہے۔ چنانچہ یہ شعر وہ آئینہ ہے جس میں اُن کی پوری زندگی نظر آسکتی ہے:۔

زندگی اپنی جب اس طرز سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک بے چینی بھی پائی جاتی ہے جو نتیجہ تھا خواہشات کے پورے نہ ہو سکنے اور ارمانوں کے نکل نہ سکنے کا:۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر خلعت اور خطاب کے لیے انگریزوں کے در پر جبہ سائی کرتے رہے۔

۷۔ وہ نام و نمود اور شہرت کے عاشق تھے۔ چنانچہ منشی شیو نرائن کو لکھتے

ہیں کہ "نواب اسد اللہ خاں لکھو یا مرزا اسد اللہ خاں، بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔" جہاں تک ان کی ذات کا سوال ہے یہ وہ لفظ ہے جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوا، اس کے باوجود وہ ساری عمر اس پوست بے مغز کو متاع گراں مایہ سمجھ کر سینے سے لگائے رہے!

۸۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ مصائب میں بسر ہوا اس لیے ان کی طبیعت میں مایوسی اور افسردگی کا رنگ تو ضرور پیدا ہو گیا۔ جو ہر جگہ ان کے کلام سے نمایاں ہے:۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

مگر چونکہ انھوں نے ان مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا اس لیے ان کے کلام سے قنوطیت مترشح نہیں ہوتی۔

۹۔ چونکہ بہت ذہین انسان تھے اس لیے ہمیشہ اپنے شئی نقائص اور عیوب کی اصلاح کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم اور مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم کے مشوروں پر عمل کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کے کلام میں وہ خوبیاں پیدا ہو گئیں جن کی بدولت وہ "غالب" بن گئے۔

۱۰۔ ان کے اندر تعصب بالکل نہ تھا۔ وہ سب کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے پُرآشوب زمانہ میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے ان کی امداد کی۔ حالی نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ان کا مشرب صلح کل تھا۔ اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں:۔

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

غالبؔ کی شاعری کا ارتقاء

تمہید غالبؔ کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے کلام میں چار قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں :-

(۱) بعض اشعار اس قدر پیچیدہ اور مغلق ہیں کہ چیستاں معلوم ہوتے ہیں ان کا مفہوم سمجھنے کے لیے بڑی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ اس کی تفصیل ان اشعار کی شرح کرتے وقت بیان ہوگی۔ یہ اشعار زیادہ تر وہ ہیں، جو انہوں نے بیدلؒ کے رنگ میں لکھے ہیں۔ ان کی نسبت وہ خود کہتے ہیں۔

طرز بیدلؒ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں! قیامت ہے

ان اشعار میں نہ شعریت ہے نہ معنویت، محض دماغی ورزش (جمناسٹک) ہے۔

(۲) بعض اشعار ایسے ہیں جن میں انہوں نے لفظوں کا طلسم باندھا ہے بالفاظِ دگر یہ اشعار کوہ کندن وکاہ برآوردن، کا مصداق ہیں بندش کے اعتبار سے بہت بلند ہیں مگر مضمون کے اعتبار سے پست ہیں۔ ان میں زیادہ تر ناسخؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔

(۳) بعض اشعار میں مضمون آفرینی بھی ہے اور انداز بیان بھی دلکش ہے۔ ان اشعار میں مومنؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(۴) بعض اشعار تیر و نشتر کا کام دیتے ہیں یعنی ان میں شعریت پائی جاتی ہے۔ زبان صاف ہے، بندش نہایت دلکش ہے اور خیالات کی دنیا آباد ہے۔ ان میں زیادہ تر میرؔ کا انداز نمایاں ہے۔

اسی حقیقت کو مدنظر رکھ ڈاکٹر عبداللطیف نے یہ لکھا ہے کہ ان کے کلام میں بڑی ناہمواری پائی جاتی ہے۔ یہ بات صحیح ہے مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ارتقائی منازل سے ہو کر گذری ہے۔ اگر وہ شروع سے آخر تک ایک وضع پر قائم رہتے تو یہ ناہمواری پیدا نہ ہوتی۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے ان کی شاعری کے پانچ دور قرار دیئے ہیں:۔

پہلا دور از ابتدا تا ۱۸۲۱ء
دوسرا دور از ۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۷ء
تیسرا دور از ۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۷ء
چوتھا دور از ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۷ء
پانچواں دور از ۱۸۵۷ء تا آخر

ہم پہلے ان کی شاعری پر ایک عمومی تبصرہ کریں گے بعد ازاں ہر دور کی خصوصیات بیان کریں گے:۔

غالب نے ابتدا میں فارسی شاعروں میں سے بیدلؔ، ظہوریؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کا اور اردو شاعروں میں سے ناسخؔ کا تتبع کیا۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ "میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ کا دیوان پہلے پہل دہلی میں پہنچا۔ شیخ کی سخن سنجی کی سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ میں نے اور مومن نے ان کا تتبع ہونا چاہا۔ ہم نے شیخ کے رنگ میں مشق کلام شروع کی مگر اُن کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا۔ مومن تو مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسا کہ ان کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میرؔ کے رنگ میں دو آئے۔"

اب رہے فارسی شعرا تو ان کی فارسی غزلوں میں ان سب کا رنگ جھلکتا

ہے مگر اردو میں انھوں نے ابتداءً بیدلؔ ہی کو سامنے رکھ کر مشق سخن کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہت سے اشعار میں ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے مثلاً

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیٔ بیدلؔ پسند آیا

غالبؔ نے بیدلؔ کا اندازِ بیان پیدا کرنے کی کوشش تو بہت کی مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

بیدلؔ کا کمالِ فن یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے اپنے کلام میں اوّل سے آخر تک وحدتِ وجود ہی کا فلسفہ پیش کیا ہے، اور اسی ایک بات کو سو طریقوں سے ادا کیا ہے مگر شعریت کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا۔ مثلاً

از موجِ تواں شنیدن اسرار محیط
در کام اگر کشد زبانِ خود را

تو سیرِ عالمِ دل غافلیم ورنہ حباب
سرے اگر بگریباں فرد برد، دریاست

بخوفِ طوالت صرف دو شعروں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان کی شرح کا یہ موقع نہیں۔ میں ناظرین کی توجہ صرف انداز بیان کی اس خوبی اور لطافت کی طرف مبذول کرنی چاہتا ہوں جو ان شعروں کے دوسرے مصرع میں پوشیدہ ہے بیدؔل نے ان شعروں میں فلسفہ وحدت الوجود کے دقیق مسائل نظم کئے ہیں مگر انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والے پر عالم وجد طاری ہو جاتا ہے۔

یہ ایک امرِ مسلمہ ہے کہ اگر کچھ کہنا مقصود ہو تو زبان کو متحرک کرنا لازمی ہے کیونکہ حرکت لسانی کے بغیر تکلم محال ہے، لیکن بیدؔل کا اعجاز سخن ملاحظہ ہو کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر موج اپنی زبان کو تالو سے لگالے یعنی سکوت اختیار کرے تو اس سے اسرار محیط سن سکتے ہیں! کیا ٹھکانا ہے انداز بیان کی ندرت اور طرفگی کا!

دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جسے تم موج کہتے ہو وہ درحقیقت محیط ہی کا ایک تعین ہے، دگر ہیچ، اسی تعین کی بنا پر محیط اور موج میں مغائرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر موج اس قیدِ تعین سے باہر آجائے (تعین کا پردہ اٹھ جائے) تو محیط بن جائے گی۔ اس بات کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے :-

ع در کام اگر کشد زبان نحو درا

بالفاظِ دگر اس حقیقت کے اظہار کے لیے انھوں نے انداز بیان وہ اختیار کیا ہے کہ فلسفہ اور شاعری دونوں آپس میں شیر وشکر ہو گئے۔ اور اس امتزاج کی بدولت شعر میں بلا کی شعریت اور معنویت پیدا ہو گئی۔

اب اس انداز بیان کے دوسرے پہلو یعنی تشبیہ کی ندرت پر غور کیجیے بیدل نے موج کو زبان سے تشبیہ دی ہے۔ موج کیا ہے؟ گویا زبان ہے اور اس زبان کا سکوت کیا ہے؟ اپنے تعین کی قید کو مٹا دینا، اور جب یہ قید مٹ گئی تو اسرارِ محیط واضح ہو گئے یعنی محیط ہی قید تعین میں آکر بصورت موج ظاہر ہوتا ہے۔ وجودِ موج، دراصل وجود محیط ہے جو متعین ہو گیا۔

محیط ہی متعین ہوا بصورت موج
وگرنہ موج کہاں، موج کا وجود کہاں (تسلیم)

اب دوسرے شعر پر غور کیجیے۔ بیدل کہتے ہیں کہ ہم اپنی حقیقت سے غافل ہیں۔ اسی غفلت کی بنا پر من و تو کا امتیاز پیدا ہوتا ہے ورنہ اگر حباب غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے کہ میں حباب نہیں ہوں دریا ہوں۔

اس بات کو انھوں نے "سرے اگر بگریباں فرو برد" کی دلکش ترکیب سے واضح کیا ہے اور اس انداز بیان نے شعر میں غضب کی معنویت پیدا کر دی ہے۔ اس ترکیب کے دو مطالب ہیں۔

"سر بگریباں فرو بردن" کو اگر محاورہ قرار دیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا غور و فکر کرنا۔ لیکن اگر اس کا لفظی ترجمہ مدنظر رکھیں تو اس کا مطلب ہوگا حباب کا اپنے وجود کو دریا کے وجود میں ضم کر دینا یا دریا میں مل کر دریا ہو جانا۔

حباب کیا ہے؟ محض دریا کا ایک تعین ہے۔ کیا حباب کا کوئی مستقل وجود ہے؟ کیا وہ قائم بالذات ہے؟ ہر شخص اس کا جواب نفی میں دیگا حباب کچھ نہیں مگر دریا ہے جو متعین ہو کر بشکل حباب ظاہر ہو رہا ہے۔

جس طرح موج اگر اپنی زبان (یعنی اپنے وجود) کو تالو سے لگالے تو محیط بن جائے گی۔ اسی طرح حباب اگر اپنا سر (اپنا وجود) اگر بیان میں ڈال دے تو

دریا بن جائے گا۔ دونوں جگہ وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ موج کا محیط سے جداگانہ کوئی مستقل وجود ہے نہ حباب کی دریا سے علیحدہ کوئی مستقل ہستی ہے۔

یہ ہے بیدؔل کا وہ انداز بیان جس کی سرحدیں اعجاز سے ملی ہوئی ہیں جس کی بدولت انہوں نے اپنے فلسفہ کو اپنی شاعری میں اس طرح سمو دیا ہے کہ دونوں مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اور یہی وہ "طرزِ بیدل" ہے جس میں ریختہ لکھنا بقول اسد اللہ خاں۔ قیامت ہے۔

اگرچہ غالبؔ کو طرزِ بیدل میں کامیاب نہ ہو سکی تاہم اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ان کے کلام سے بہت کچھ استفادہ کیا جس کا اعتراف انہوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ مثلاً

ہمچناں آں محیطِ بے ساحل
قلزم فیض میرزا بیدؔل!

غالبؔ نے بیدؔل کو "قلزم فیض" اس لیے قرار دیا کہ اُن کے بہت سے بلند پایہ اشعار دراصل بیدؔل کے تخیلات پر مبنی ہیں۔ مثلاً

بیدؔل کہتے ہیں:۔ آہم زنارسائی شد اشک و باعرق ساخت
پستیست گر خجالت شبنم کند ہوا را

غالبؔ کہتے ہیں:۔ ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

بیدؔل:۔ مطلبم از مے پرستی تر دماغیہا نہ بود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

غالب:- مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

بیدل:- سحر آہ و گلستاں نکہت و بلبل فغاں دارد
جہانے سوئے بیرنگی ز حسرت کارواں دارد

غالب:- بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بیدل خلقے بعدم دردِ دل و داغِ جگر برد
خاک ہمہ حرفِ گل و سنبل شدہ باشد

غالب:- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بیدل:- اے خوش آں جود کہ از خجلت وضعِ سائل
لب باظہار نیارند و بہ ایما بخشند

غالب:- بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

بیدل:- ساز ہستی غیر آہنگ عدم چیزے نداشت
ہر نوائے را کہ وادیدم خموشی می سرود

غالب:- نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

بیدل :- من و ساز دکان خود فروشیہا چہ حرف است ایں
جنونِ ایں فضولی در سر منصور می باشد

غالب :- قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

بخوف طوالت انہی اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔ ناظرین اگر بیدل اور غالب کے کلام کا تقابلی مقابلہ کریں تو غالب کے اور بہت سے اشعار ایسے مل سکتے ہیں جن کا تخیل، بیدل کے اشعار سے ماخوذ ہے۔

بیدل کی پیروی کے علاوہ غالب نے ناسخ کی تقلید بھی کی مگر اس کا رنگ ان کی طبیعت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے بعد چندے انہوں نے اس کی پیروی بھی ترک کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے مومن کا اتباع کیا اور اس میں شک نہیں کہ جو غزلیں ان کے رنگ میں لکھیں وہ بہت بلند پایہ ہیں :-

مومن کے علاوہ انہوں نے میر سے بھی استفادہ کیا۔ اور جو غزلیں "خدائے سخن" کے رنگ میں لکھیں وہ بلاشبہ سہل ممتنع کا مصداق ہیں۔ ان کے دل میں میر کی جس قدر عظمت تھی اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مذکورہ بالا اساتذہ سے فیض حاصل کرنے کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی جودتِ طبع اور مشق سخن کی بدولت اپنا انداز بیان خود ایجاد کیا جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے :-

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے ؎ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اس اجمالی تبصرہ کے بعد اب ہم ہر دور کی خصوصیات بیان کرتے ہیں:۔

پہلا دور

اس دور کی خصوصیت حسب ذیل ہیں۔

(۱) فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کی کثرت ہے۔

(۲) جو مضامین باندھے ہیں وہ دور از کار اور بعید از قیاس ہیں۔

(۳) شعر کو دانستہ مغلق اور پیچیدہ بنایا ہے۔

(۴) یہ اشعار، لطفِ زبان حسن ادا اور شعریت سے خالی ہیں۔

(۵) آمد بہت کم ہے، زیادہ تر آورد اور تصنع سے کام لیا ہے۔

(۶) مرزا نے خود تسلیم کیا ہے کہ "میں ابتدائے فکر سخن میں بیدل، شوکت اور اسیر کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو رد کیا، اوراق یک قلم چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دئے۔"

(۷) اس دور کی شاعری کا اندازہ اس مطلع سے ہو سکتا ہے:۔

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا

خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس شعر پر ان کا تبصرہ قابل غور ہے کیونکہ اس کو پڑھنے کے بعد اس دور کی خصوصیت بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔

"اس مطلع میں خیال ہے دقیق مگر کوہ کندن وکاہ بر آوردن والا معاملہ ہے یعنی لطف زیادہ نہیں ہے۔"

درحقیقت یہ تبصرہ اس دور کی پوری شاعری پر حاوی ہے۔

(۸) اس دور کے زیادہ تر اشعار بعید از فہم ہیں کیونکہ جیسا کہ انہوں نے

خود اعتراف کیا ہے اس دور کے اشعار کے بیشتر مضامین محض خیالی تھے۔

(۹) اس دور کے اشعار میں نہ تو واردات و جذبات قلبی کا بیان ہے نہ فطرت انسانی کی عکاسی ہے نہ ظرافت کا رنگ ہے نہ فلسفہ اور تصوف کی چاشنی ہے، محض دماغی ورزش ہے۔ مثلاً

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
جوں شانہ پشت دست بدنداں گزیدہ ہوں

اس امر سے قطع نظر کیجیے کہ اس شعر میں کوئی شاعرانہ خوبی ہے یا نہیں دوسرے مصرع کی بندش اس قسم کی ہے کہ اس کا پڑھنا طبیعت پر ایک بار معلوم ہوتا ہے۔

(۱۰) چونکہ اس دور میں انھوں نے ناسخ کا تتبع بھی کیا تھا اس لیے بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں ایہام یا رعایت لفظی کے علاوہ اور کوئی خوبی نہیں ہے مثلاً

کی اُس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

غالب نے یہ شعر اس لیے نہیں کہا کہ انہیں کسی جذبہ یا کیفیت قلبی کا اظہار مقصود تھا بلکہ محض اس لیے کہ کسی طرح "گرم" کے ساتھ "ٹھنڈا" جمع ہو جائے۔

دوسرا دور اس دور کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) اس دور میں انھوں نے اردو شاعری کی طرف کم توجہ دی
(۲) فارسی تراکیب اور ثقیل الفاظ کا استعمال کم ہو گیا۔
(۳) بیدل کے بجائے نظیری کا رنگ غالب ہے۔

(۴) خیالی مضامین کم نظر آتے ہیں۔
(۵) عاشقانہ رنگ نمایاں ہے۔
(۶) فطرت انسانی کی عکاسی بھی پائی جاتی ہے۔
(۷) زندگی کے حقائق پر توجہ مبذول کی۔
(۸) کلام میں بالغ نظری کے شواہد ملتے ہیں۔

تیسرا دور

اگرچہ اس دور میں بھی ان کی توجہ زیادہ تر فارسی شاعری پر مبذول رہی۔ لیکن اُردو شاعری بھی عروج پذیر نظر آتی ہے بعض بہترین اُردو غزلیں اسی دور میں لکھی گئیں۔ مثلاً

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

چوتھا دور
۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۱ء

چونکہ اس دور میں مرزا دربار شاہی سے وابستہ رہے۔ اس لیے انہوں نے اُردو شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی۔

(۱) زیادہ تر غزلیں لکھیں۔
(۲) اندازِ بیان میں پختگی پیدا ہو گئی۔
(۳) لطف زبان ہر جگہ نمایاں ہے۔
(۴) طنز، شوخی اور ظرافت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔
(۵) بعض غزلوں میں ذوق کا رنگ جھلکتا ہے یعنی روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ مثلاً

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

اس شعر میں طنز بھی ہے سلاست بھی ہے۔ لُطف زبان بھی ہے۔
اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر اشعار میں معانی کی

ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جذبہ میں تخیل کو اس طرح سمویا ہے کہ "ورائے شاعری چیزے دگر" وجود میں آگئی ہے۔ مثلاً

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

تیسری خصوصیت وہ شوخی اور ظرافت ہے جسے ہم مرزا کی شاعری کا طغرائے امتیاز کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح ابتدائی دور کا کلام پڑھنے سے طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا ہے اسی طرح اس دور کے کلام سے طبیعت میں انبساط پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

آخری دور ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۸ء | اس زمانہ کی شاعری چوتھے دور سے مشابہ ہے یعنی کلام سادہ اور سلیس ہے، بندش چست ہے، شوخی اور ظرافت نمایاں ہے، تشبیہات قرین فہم ہیں، کوئی غزل حسن بیان اور لطفِ زبان سے خالی نہیں ہے۔

چونکہ کثرت عوارض اور ضعف دماغی کی وجہ سے مرزا نئے نئے مضامین پیدا نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس کمی کو انھوں نے انتخاب الفاظ اور صنائع لفظی و معنوی سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً

غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

خصوصیّاتِ کلامِ غالبؔ

تمہید جب ہم کسی شاعر کے کلام پر تنقید کرتے ہیں تو حسب ذیل تین سوالات ہمارے مدِ نظر ہوتے ہیں :-

(۱) شاعر نے کیا کہا ؟

(۲) کیوں کہا ؟

(۳) کس طرح کہا ؟

ذیل میں ان سوالوں کا جواب درج کیا جاتا ہے :-

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ غالب نے اپنے کلام میں

(ا) زندگی کی عکاسی اور محبت کی ترجمانی کی ہے ۔

(ب) حسن و عشق کی کیفیات اس تفصیل سے بیان کی ہیں کہ شاید ہی کوئی گوشہ ان کی نگاہ سے اوجھل رہا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔

(ج) واردات قلبی کے علاوہ حقائق و معارف بھی بیان کئے ہیں ، اور حیات و کائنات کے مسائل بھی نظم کئے ہیں ۔

(د) تخیل کی تربیت اور روح کی بالیدگی کا سامان مہیّا کیا ہے ۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ملکۂ شاعری خود فطرت نے انہیں عطا کیا تھا ۔ وہ شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے ۔ انھوں نے شاعری رسماً نہیں کی ۔ ان کی طبیعت کا اقتضا یہی تھا ۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :-

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

تیسرے سوال کے جواب میں ہم ان کی شاعری کی کئی خصوصیات درج کرتے ہیں۔ جس کے مطالعہ کے بعد حقیقتِ حال عیاں ہو جائے گی۔

پہلی خصوصیت واضح ہو کہ ان کے کلام کی پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت ان کا وہ اندازِ بیان ہے جس پر ان کی شاعرانہ عظمت کا قصر تعمیر ہوا ہے، اور جس کی طرف خود انہوں نے بھی اپنے کلام میں اشارے کئے ہیں۔ مثلاً

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ کے تمام نقاد اس امر میں متفق ہیں کہ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اندازِ بیان ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی نے اس کو "طرزِ ادا" سے تعبیر کیا ہے، کسی نے "جدتِ ادا" سے، کسی نے "جدت طرازی" سے کسی نے کہا "طرفگی ادا" سے کسی نے "ادائے خاص" سے اور کسی نے "جدت بیان" سے۔

اب سوال یہ ہے کہ "اندازِ بیان" سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غالبؔ کے کلام اور ان کے ناقدین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ

جس بات کو انہوں نے "اندازِ بیان" سے تعبیر کیا ہے وہ دراصل ان کی وہ جدت طرازی ہے جو زبان، تراکیب، خیالات، محاکات، الفاظ، تشبیہات، استعارات، کنایات غرضکہ تمام لوازم شاعری میں پائی جاتی ہے۔

غالب کا مطمح نظر یہ تھا کہ پیش پاافتادہ افسردہ اور معمولی بلکہ سریع الفہم مضامین کو ایسے ڈھنگ سے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والا بآسانی مطالب تک نہ پہنچ سکے بلکہ خوب غور کرے تاکہ نفسِ مضمون (اگرچہ وہ بذاتِ خود معمولی ہی کیوں نہ ہو) اس کی نگاہوں میں وقیع ہو جائے۔ اور یہ بات ہر شخص جانتا اور مانتا ہے کہ جو چیز بہت غور و خوض یا جستجو کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ بہت قیمتی ہو جاتی ہے۔ جدتِ طرازی اسی بے پناہ جذبہ کا منطقی نتیجہ ہے جسے انہوں نے "اندازِ بیاں" اور "ادائے خاص" سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو غالبیت کہتے ہیں۔

چونکہ ہم دیوان کی شرح میں اس خصوصیت کو بار بار واضح کریں گے۔ اس لیے اس جگہ صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں:-

وا کر دئیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

کہنا تو یہ چاہتے ہیں کہ ظاہری نگاہ، اس کے حسن کو نہیں دیکھ سکتی یا اس کے جلوے کی تاب نہیں لا سکتی لیکن کہتے یوں ہیں کہ

ع غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

سچ یہ ہے کہ یہی ان کا اندازِ بیان ہے۔ جس پر ایک دنیا مٹی ہوئی ہے۔ اور جس پر خود انہیں بھی ناز ہے:-

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں!

اسی جدت طرازی نے انہیں اس بات پر مائل کیا کہ:۔

(۱) جدید (اچھوتے) خیالات اور تصورات نظم کئے جائیں تاکہ ارباب نظر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ جو بات غالب کے یہاں ہے وہ کسی کے یہاں نہیں ہے۔ بالفاظِ دگر، انہیں طبقۂ شعراء میں ایک امتیازی شان حاصل ہو جائے۔

کلام غالب کے سب سے بڑے نبض شناس خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ "مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی کہ وہ عام روشن پر چلنے سے ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے حتی الوسع اجتناب کرتے تھے۔" (یادگار غالب ص ۱۲۱)

ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن سے ان کے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے:۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(ب) اسی جدت طرازی کے شوق نے نئے الفاظ، نئی ترکیبیں اور نئی بندشیں اور زبان کے نئے سانچے وضع کرنے پر مائل کیا۔ یوں بھی غزل کی زبان ان کے خیالاتِ عالیہ کے اظہار کے لیے کافی نہیں تھی۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے :-

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

اس ضرورت نے بھی انہیں میدانِ شاعری کو وسیع کرنے پر راغب کیا اور نتیجہ ان تازہ کاریوں کا یہ نکلا کہ اُردو زبان کا دامن جواہرات سے مالامال ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ناقدین غالب اس بات پر بھی متفق ہیں کہ انہوں نے زبان کو آگے بڑھایا۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری لکھتے ہیں کہ "مرزا کے خیالات نے اپنے اظہار کے لیے خود الفاظ تیار کر لئے . . . الفاظ سازی کے فن میں مرزا اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ الفاظ ملاحظہ ہوں :-

دامِ شنیدن، خمارِ رسوم و قیود، آتشِ خاموش، جوہرِ اندیشہ، گلبانگِ تسلی، شبستاں، پہلوئے اندیشہ، خانہ زادِ زلف، جمع خرچ دریا، موجِ خرامِ یار، نبضِ خس، تشنۂ فریاد، صیدِ ز دام جستہ، خودداریٔ ساحل، گذرگاہ خیال، طالعِ خاشاک، آئینۂ انتظار، شہر آرزو، صحرا دستگاہ، دریاآشنا، محشرِ خیال، کنگرِ استغنا، دریائے بیتابی، وادیٔ خیال، نسیہ و نقدِ دو عالم، طلسمِ پیچ و تاب، طعنۂ نایافت، جنتِ نگاہ، فردوسِ گوش، شیرازہ

مژگاں، برخوردار بستر، قلزم خوں، شرارِ جستہ، جیبِ خیال، دعوتِ مژگاں، دامِ تمنا، لذتِ سنگ، غبارِ وحشت وغیرہ۔"

(ج) اسی جدت طرازی کے شوق نے انھیں نئی نئی تشبیہات اور نئے نئے استعارات و کنایات وضع کرنے پر راغب کیا اور اس باب میں ان کی طبع وقاد اور ذہن خداداد نے وہ گل کاریاں کی ہیں جن کو دیکھ کر شیخ محمد اکرام نے ان کو تشبیہات کا بادشاہ قرار دیا ہے اور ڈاکٹر لطیف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "ایک لفظی صنعت گر کی حیثیت سے غالب تمام اردو شاعری میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے۔" ذیل میں اس خصوصیت کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں :-

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد، یاں

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا

(د) اسی جدت طرازی کے شوق نے انہیں معمولی باتوں کو دلکش انداز سے کہنے پر مائل کیا۔ ذیل میں جدتِ طرزِ ادا کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا!

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

(۷) اسی جدت طرازی کے شوق نے انہیں جدت تخئیل پر آمادہ کیا۔ ذیل میں اس صنعت کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں :-

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے واں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو ﴿ دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب ﴿ رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

ہوں نشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

(د) اسی جدت طرازی کے شوق نے انہیں جدت محاکات پر راغب کیا۔ محاکات شاعرانہ مصوری کا اصطلاحی نام ہے۔ یعنی حسن و عشق کے معاملات اس طرح بیان کرنا کہ ان کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہوں دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عُذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر ﴿ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہمیں یقین ہے ان مختلف النوع مثالوں سے ناظرین پر جدت طرازی کا مفہوم واضح ہو گیا ہوگا جس کے بعد انہیں اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ کلام غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی جدت طرازی ہے اردو ادب کے سب سے بڑے نقاد پروفیسر آل احمد سرور کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"غالب کے قصرِ شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے اور اس جدت طرازی میں جدتِ تخیل، جدتِ طرزِ ادا، جدتِ استعارات وتشبیہات، جدتِ محاکات اور جدتِ الفاظ سب (محاسن شعری) آجاتے ہیں۔"

دوسری خصوصیت غالب کی دوسری بڑی خصوصیت دشوار پسندی ہے یعنی وہ معمولی مضامین کو عسیر الفہم انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اور اس کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) کبھی تو اس معمولی اور آسان مضمون کو استعاروں اور کنایوں کے پردے میں پوشیدہ کر دیتے ہیں مثلاً

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز ؂ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج ٭ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

(ب) کبھی اس آسان مضمون کے گرد لفظوں کا ایک طلسم باندھ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ شعر پڑھنے والے کی نظر میں چیستاں بن جاتا ہے۔ مثلاً

در خورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا ٭ نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

بہ نیم غمزہ ادا کر حق ودیعتِ ناز ٭ نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا ٭ تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

کمالِ گرمیٔ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ ٭ برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب ٭ پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے ٭ نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے ٭ داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

غالب کو خود بھی اپنی دشوار پسندی (مشکل گوئی) کا احساس تھا چنانچہ اس رباعی میں اسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے :-

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ٭ سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ٭ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

تیسری خصوصیّت ان کی شاعری کی تیسری نمایاں خصوصیت رمزیہ انداز ہے رمز دراصل کنایہ کی ایک قسم ہے۔ یعنی رمز، اس کنایہ کو کہتے ہیں جس میں ملزوم (حقیقی معنیٰ) تک پہنچنے کے لیے بہت سے واسطے تو نہ ہوں مگر کسی قدر خفاء ضرور ہو۔ مثلاً

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ؎ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر میں وہ کہنا تو یہ چاہتے ہیں کہ بڑی وحشت وا منگیر ہوئی یا بہت خوف معلوم ہوا مگر اس سیدھی سی بات کو رمز (کنایہ) کے پردے میں بیان کیا بالفاظِ دگر، رمزیہ شاعری میں، شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کے لیے مناسب اور مخصوص الفاظ استعمال نہیں کرتا بلکہ بالکل مختلف پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے۔ دوسری مثال ملاحظہ ہو:۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؎ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

شاعر کا اصل مدعا اس حقیقت کا اظہار ہے کہ عشق ایک لا علاج مرض ہے مگر اس نے اس بات کو استفہام کے پردے میں ادا کیا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالب کی شاعری کا کمال اُس کے اسی رمزیہ اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ صفِ اول کے تمام ناقدین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً

(۱) کلامِ غالب کے سب سے بڑے مبصر اور نقاد، ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:۔

"غالب کا کلام سرتاپا رمزیت کے لباس میں جلوہ گر ہوا ہے اور یہ ان کے آرٹ کا وہ پہلو ہے جس کے نظر انداز کر دینے سے ان کی ندرتِ فکر کے تمام محاسن ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔" فلسفۂ کلامِ غالب ص۲۳۶)

(ب) ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں :-

"غالب کی غزلیں کنایوں سے بھری پڑی ہیں۔ پھر یہ کنائے محض کنائے نہیں ہیں بلکہ لطفِ شعری میں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غالب کے کلام کا بیشتر حصہ رمز و کنایہ کی کیفیت میں رچا ہوا ہے۔" (اردو غزل ص۶۹)

(ج) ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں :-

"غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے ان تمام متنوع موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ مشاہدۂ حق کی گفتگو انھوں نے "بادہ و ساغر" میں اور ناز و غمزہ کی گفتگو "دشنہ و خنجر" میں کی ہے۔"

(غزل اور مطالعۂ غزل ص۳۲۵)

رمزیت اور ایمائیت غزل کے بنیادی لوازم ہیں۔ صنفِ غزل اس کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ رمزیت اور ایمائیت نہ ہو تو غزل میں نہ معنوی اعتبار سے بلندی پیدا ہوتی ہے نہ صوری اعتبار سے دلکشی

غالب کو خود بھی اس حقیقت کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ❊ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ❊ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

اب رمزیت کی تعریف اقبال کی زبان سے سنئے :-

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اب ہم غالب کے کلام سے رمز و ایما کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں :-

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ❊ زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ؛ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ؛ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

آئینہ دیکھ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے ؛ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ؛ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ؛ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

موت کا ایک دن معین ہے ؛ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چوتھی خصوصیت چوتھی خصوصیت ایجاز ہے جو دریا کو کوزے میں بند کر دینے کا دوسرا نام ہے۔ غالب کے اکثر اشعار ایسے ہیں کہ دو مصرعوں میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے۔ انہیں خود بھی

اس خصوصیت کا احساس تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں :-

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں :-

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو ٭ وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم ٭ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز ٭ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

پانچویں خصوصیت

ان کے کلام کی پانچویں خصوصیت ظرافت ہے جس میں ہم بغرضِ سہولتِ بیان، مزاح اور شوخی، طعن

اور طنز کو بھی شامل کئے لیتے ہیں، کیونکہ یہ سب ایک ہی شجر کے برگ و بار ہیں۔
غالب کے ہم نشین اور اُن کی شاعری کے نباض، مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں۔
"تیسری خصوصیت، کیا ریختہ میں، کیا فارسی میں، کیا نظم میں اور کیا نثر میں، باوجودِ سنجیدگی و متانت، اُن کی شوخی اور ظرافت ہے۔ مرزا سے پہلے دو شخص ظرافت اور شوخی میں بہت مشہور گذرے ہیں۔ ایک سودا دوسرا انشا، مگر ان دونوں کی تمام شوخی اور خوش طبعی (ظرافت) ہجو گوئی میں صرف ہوئی۔"

"ظرافت ان کے مزاج میں اس قدر تھی کہ اُن کو اگر بجائے حیوانِ ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔"

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "جس خصوصیت نے اس زمانہ کے اشعار کو امتیازی رنگ دے دیا ہے وہ مرزا کی ظرافت اور شوخی ہے۔ ان کی ظرافت بہت پاکیزہ تھی۔ تبسم زیرِ لب سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ لیکن اس میں رو رعایت کسی کی نہ تھی۔ گاہے گاہے اپنے اوپر بھی ہنس لیتے تھے۔"

پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں" اس نفسیاتی گہرائی کی وجہ سے اُن میں وہ لطافت یا شگفتگی پائی جاتی ہے جو ظرافت کی اساس و بنیاد ہے۔ ان کی شوخی کی اصلی بناء ان کی جدت طرازی کی عادت تھی۔ اُن کی ظرافت ایک ذہنی انبساط کا باعث ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ ظرافت، شوخی، مزاح، طنز اور طعن یہ سب خوبیاں ذہانت اور فطانت پر موقوف ہیں۔ چونکہ غالب بہت ذہین و فطین اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کے کلام میں یہ سب خوبیاں جمع ہو گئیں۔

ظرافت (بذلہ سنجی) ذہانت کی اعلیٰ صورت کا نام ہے۔ اس میں ادبی سنجیدگی اور جدت فکر دونوں باتیں پائی جاتی ہیں، جن کا اظہار کسی لطیف علمی نکتہ کو نظم کرنے میں ہوتا ہے۔

اردو زبان میں اکبر الہ آبادی کی شاعری، ظرافت (WIT) کی بہترین مثال ہے، ظرافت کی تعریف، خود ان کی زبان سے سنیئے:۔

لطف سخن تو ہے یہی ٹرس[۵۱] بھی ہو وِٹّی[۵۲] بھی ہو
ذہن کا وصف ہے یہی اوری جی نے لٹی[۵۳] بھی ہو

واضح ہو کہ ظرافت کے لیے جدت طرازی شرط ہے مگر مزاح کے لیے شرط نہیں کیوں کہ مزاح کا مقصد صرف انبساط خاطر ہوتا ہے۔ یہی دونوں میں فرق ہے

ظرافت کیا ہے؟ کسی لطیف علمی نکتہ کو جس میں جدت پائی جاتی ہو، ایسے سنجیدہ انداز سے نظم کرنا کہ پڑھنے والا محو حیرت ہو کر رہ جائے اور اس پر وجد و کیف کا عالم طاری ہو جائے اور وہ شاعر کی ذہانت اور پرواز تخیل اور رسائی ذہن کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے۔

مزاح کیا ہے؟ کوئی ایسی بات نظم کرنا جس کو پڑھ کر ہنسی آجائے یا دل خوش ہو جائے۔

طنز کا مقصد سوسائٹی کی اصلاح ہے۔ طنز نگار کچوکے دے دے کر قوم کے احساسات کو بیدار کرنا چاہتا ہے بالفاظِ دگر، ظرافت اور مزاح مقصود بالذات ہے، طنز مقصود بالعرض ہے۔

---

۵۱ TERSE بمعنی جامع، موجز، مختصر ۵۲ WITTY ظریفانہ

۵۳ ORIGINALITY بمعنی جدتِ فکر

ظرافت کی مثال:۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

اس میں ظرافت کا پہلو یہ ہے کہ شاعر اپنی مسلسل ناکامیوں پر خود ہنستا ہے اور اب اسے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کامیابی کا آخری سہارا یعنی دعا بھی بے کار ثابت ہوا لہٰذا اب اس کی جدتِ طبع اسے اپنے احساس کے ایک انوکھے انداز پر ابھارتی ہے جس میں بظاہر سنجیدگی ہے مگر اس کی تہ میں فکاہت پوشیدہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا نے ہماری کوئی آرزو پوری نہیں کی۔ اس لیے اب ہم اس سے اس چیز کی دعا کیا کریں گے جو قبل دعا ہی پوری ہو چکی ہے (یعنی عمر خضر) تاکہ ہماری دعا کی توہین تو نہ ہو۔

اب ظرافت (WIT) کا پہلو، جو پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ شاعر نے دعا کو توہین سے محفوظ رکھنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو خود مستلزم یا مستوجب توہین ہے۔ ظرافت کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب ٭ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے ٭ بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی ٭ سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام ٭ قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری ؂ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

(ب) مزاح کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں :۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ؂ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ؂ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں !
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(ج) طنز کی چند مثالیں :[1]

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ؂ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر ؂ نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ؂ کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ ؂ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے ؂ لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

---

[1] "اردو شاعری میں غالب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے خدا کو طنزیہ انداز میں مخاطب کیا ہے"۔ (رشید احمد صدیقی)

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ ✤ آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ✤ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ✤ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل ✤ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

(د) شوخی کی مثالیں :۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں ✤ بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ✤ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ✤ ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض ✤ اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی ✤ آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

چھٹی خصوصیت چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اکثر اشعار کا مضمون پہلو دار واقع ہوا ہے، یعنی بظاہر معنی کچھ نظر آتے ہیں۔

مگر غور کرنے سے دوسرے لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ٭ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

پہلے معنی:۔ دشت کی ویرانی کا یہ عالم ہے کہ اُسے دیکھ کر خوف طاری ہوگیا۔ "گھر یاد آیا" کنایہ ہے خوف طاری ہو جانے سے۔

دوسرے معنی:۔ یہاں دراصل گھر کی ویرانی کا بیان مقصود ہے کہ عاشقی میں ہمارا گھر اس قدر ویران ہوگیا ہے کہ جب صحرا کو دیکھا تو گھر کی ویرانی کا نقشہ سامنے آگیا۔

(۲) کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

پہلے معنی:۔ میرے مرجانے کے بعد اب کوئی شراب عشق کا خریدار (طلبگار) نہیں رہا اس لیے ساقی بار بار صلائے عام دے رہا ہے۔

دوسرے معنی:۔ پہلا مصرع ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور وہ اس مصرع کو مکرر (بار بار) پڑھ رہا ہے۔ پہلی مرتبہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ دوسری مرتبہ مایوسی کے عالم میں اسی مصرع کی تکرار کرتا ہے۔

(۳) کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز

کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

پہلے معنی:۔ محبوب پر جان نثار کرنا میرا ایمان ہے اس لیے اس سے اپنی جان عزیز نہیں رکھ سکتا۔

دوسرے معنی:۔ جان کو عزیز اس لیے نہیں رکھتا کہ اگر ایسا کروں گا تو وہ ایمان لے لے گا، اور ایمان جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

(۴) ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم

قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

پہلے معنیٰ:۔ ترے سروقامت سے فتنۂ قیامت بھی کمتر ہے۔

دوسرے معنیٰ:۔ چونکہ تیرا قد فتنۂ قیامت ہی سے بنایا گیا ہے اس لیے وہ (فتنۂ قیامت) بقدر "یک قدِ آدم" کم ہو گیا ہے۔

(۵) سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

پہلے معنیٰ:۔ تیرے سر کی قسم ہم تیرا سر ضرور اڑائیں گے۔

دوسرے معنیٰ:۔ تیرے سر کی قسم ہم تیرا سر ہرگز نہیں اڑائیں گے۔

(۶) اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

پہلے معنیٰ:۔ تم جیسے نازک مزاج اور خود بیں اگر دو چار اور ہوں تو سارے شہر میں قیامت برپا ہو جائے۔

دوسرے معنیٰ:۔ جب تم سے اپنے عکس کا وجود بھی برداشت نہیں ہو سکتا تو اگر شہر میں تم جیسے ایک دو حسین اور بھی موجود ہوں تو خدا جانے تم کیا قیامت برپا کر دو۔

(۷) کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

پہلے معنیٰ:۔ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر ہم بولنے پہ آجائیں تو تمہیں قائل کر دیں۔

دوسرے معنیٰ:۔ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں۔

(۸) زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

پہلے معنیٰ :- زندگی میں تو وہ مجھے محفل سے اٹھا دیا کرتے تھے ۔ لیکن مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے ۔

دوسرے معنیٰ :- اب دیکھوں میرا جنازہ کون اُٹھائے گا ؟

ساتویں خصوصیت ساتویں خصوصیت وہ دل نشینی ہے جسے اکثر نقادوں نے جذبہ اور تخیل کی آمیزش سے تعبیر کیا ہے ۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ غالب میں حکیمانہ تفکر اور شاعرانہ تخیل دونوں خوبیاں جمع ہو گئی تھیں ، جن کو انھوں نے اپنے اشعار میں ظاہر کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں غیر معمولی دلکشی اور دل نشینی پیدا ہو گئی ہے ۔

تفکر سے کلام میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور تخیل سے شعریت ۔ غالب نے حکیمانہ نکات کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ اسی سے کلام میں دل کشی پیدا ہو گئی ہے ۔ اگر کسی فلسفیانہ نکتہ کو شاعرانہ انداز میں بیان نہ کیا جائے تو اس شعر پر شعر کا اطلاق نہیں ہو سکے گا ۔ بلکہ ایک مبصر یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ "شعر گفتن چہ ضرور ، شاعر نے اس بات کو نثر میں کیوں نہ بیان کر دیا ؟ اسی لیے اقبال نے یہ کہا ہے :-

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

حکمت (فلسفہ) کیا ہے ؟ حق (سچائی) بغیر سوز و گداز (جذبہ) شعر کیا ہے ؟ حق مع سوز و گداز ۔

غالب خود کہتے ہیں :-

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

خلاصۂ کلام ایں کہ اگر حکیمانہ تفکر میں شاعرانہ تغزل کا رنگ شامل نہ ہو تو شعر بالکل روکھا پھیکا (پند نامہ) بن کر رہ جائے گا۔ اور اگر کسی شعر میں دل و دماغ (جذبہ اور فکر) کی یہ دونوں خوبیاں جمع ہو جائیں تو اس میں غضب کی دل کشی اور دل نشینی پیدا ہو جائے گی۔ اب ہم ذیل میں چند مثالیں درج کرتے ہیں:-

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم ⁂ کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت ⁂ دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ⁂ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ⁂ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ⁂ ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ⁂ تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ⁂ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں ⁂ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ؛ یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا ؛ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ؛ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہے تجلی تری سامان وجود ؛ ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال ؛ خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ؛ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب ؛ ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

آٹھویں خصوصیت آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ انہیں بعض الفاظ بہت محبوب و مرغوب ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان کو بار بار استعمال کیا ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی مدِ نظر رکھنے کے لائق ہے کہ یہ الفاظ وہ ہیں جن کو اُن سے پہلے شعرا نے بہت کم استعمال کیا ہے۔ مثلاً جوہر، آئینہ، جوہر آئینہ، عرض بمقابلۂ جوہر، رنگ، نیرنگ، جلوہ، موج، سیلاب، عدم، وجود، ہستی، خمیازہ، صیقل، برق، جادہ۔

واضح ہو کہ یہ الفاظ غالب نے بیدل سے مستعار لیے ہیں۔ ہم قبل ازیں

لکھ چکے ہیں کہ شروع میں غالب نے بیدلؒ کا تتبع کیا تھا۔ بیدل کی نازک خیالیاں بقول مولینا عبد المالک صاحب آروی، معجزانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ فارسی کے تمام دواوین کو ایک پلہ میں اور دیوان بیدل کو دوسرے پلہ میں رکھا جائے تو بھی بیدل ہی کا پلہ بھاری رہے گا۔ یہانتک کہ قصائد خاقانی میں بھی، بیدل کی سی معنوی باریکی اور دقیقہ سنجی نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب سا مشکل پسند بھی ہمت ہار بیٹھا۔ اس نے طرزِ بیدل کے تتبع کو قیامت سے تعبیر کر کے اپنا رُخ ظہوری کی طرف پھیر لیا۔"

لیکن بیدل کے محبوب الفاظ غالب کے ذہن میں اس طرح مرتسم ہو گئے کہ ساری عمر قائم رہے۔ فارسی کلام کے علاوہ اُردو کلام میں بھی مذکورہ بالا الفاظ بار بار آتے ہیں۔ بطور نمونہ صرف چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ؛ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ہیں لے رو کارات کو غالب وگرنہ دیکھتے ؛ اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ؛ ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز ؛ جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

یک الفت بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ؛ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ٭ چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ ٭ برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا ٭ نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں ٭ کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرواز

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے ٭ لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال ٭ ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ ٭ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے ٭ برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی ٭ ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی ٭ غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم ٭ حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں ؎ کس قدر خانۂ آئینہ ہے حیراں مجھ سے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ؎ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور ؎ جز وہم نہیں ہستی اشیا میرے آگے

حسن بے پردہ خریدارِ متاعِ جلوہ ہے ؎ آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے ؎ آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ غالب نے "آئینہ" کو اپنے کلام میں بکثرت استعمال کیا ہے اور یہی حال بیدل کا بھی ہے انہوں نے شاید ہی کوئی غزل ایسی لکھی ہو جس میں آئینہ کا لفظ نہ آیا ہو۔

اسی خصوصیت کے ضمن میں اس بات کی صراحت بھی خلاف محل نہ ہو گی کہ غالب کے کلام میں جس قدر فارسیت کا غلبہ ہے۔ وؔلی اور سؔراج سے لے کر ذوؔق و مومؔن تک کسی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ جو اشعار انہوں نے اپنے دوستوں کے مشورہ سے خارج کر دئیے وہ تو سر تا پا فارسی ترکیبوں سے معمور ہیں لیکن جو اشعار باقی رہنے دئے ان میں بھی بلشتر اشعار فارسیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مثلاً

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا!
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا!

اگر اس شعر میں "آیا" کے بجائے "آمد" لکھ دیا جائے تو پورا شعر فارسی کا ہو جائے گا۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

اس شعر میں صرف لفظ "ہے" اُردو ہے۔ اگر اس کی جگہ "است" لکھ دیا جائے تو یہ شعر بھی فارسی کا ہو جائے گا۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ع درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ع نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب
ع لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
ع ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار
ع سرنوشت دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار
ع فلک العرش ہجوم خم دوش مزدور

ان مصرعوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اُردو زبان کی غزلوں اور قصائد کے مصرعے ہیں؟

نویں خصوصیت کلام غالب کی نویں خصوصیت حقائق نگاری ہے یعنی انہوں نے انسانی فطرت کا بہت غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا اور اکثر و بیشتر ان واقعات و حالات کا نقشہ اپنے کلام میں کھینچا جو لوگوں کو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ان اشعار کو اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تحریر و تقریر میں جس قدر اُن کے اشعار مستعمل ہیں اور کسی شاعر کے نہیں ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ؎ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ؎ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ٭ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب ٭ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ٭ اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کیساتھ ٭ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ٭ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیا کیا خضر نے سکندر سے ٭ اب کسے رہنما کرے کوئی

بے خودی بے سبب نہیں غالب ٭ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن ٭ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ٭ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب ٭ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ٭ تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

دسویں خصوصیت

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے "رشک" کے پامال موضوع میں بڑی جدت طرازیاں کی ہیں اور اسی ضمن میں بڑی نازک خیالیوں کا ثبوت دیا ہے۔ جب تک کسی شاعر کا تخیل فلک پیمانہ ہو وہ یہ نازک مضامین پیدا ہی نہیں کر سکتا۔ رشک کا مضمون دوسرے شعراء نے بھی باندھا ہے مگر غالب نے اس میں حیرت انگیز تنوع پیدا کیا ہے یعنی رشک کے جس قدر مدارج ہو سکتے ہیں سب بیان کر دئے مثلاً

(ا) ابتدائی منزل یہ ہے کہ رقیب کے ساتھ ارتباط گوارا نہیں ہے۔

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

(ب) دشمن کے محبوب سے ہمکلام ہونے پر رشک ہوتا ہے۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے
وگرنہ خوف بدآموزیٔ عدو کیا ہے

(ج) محبوب کی زبان سے غیر کا ذکر سنکر رشک ہوتا ہے۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

(د) اب جذبۂ رشک میں ترقی ہوتی ہے (اسے درمیانی منزل کہہ سکتے ہیں) ا
نے غیر کے دل میں محبوب کی آرزو ہی کیوں پیدا کی!

نہیں گر ہم دلی آساں نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

(ہ) قاصد پہ رشک آتا ہے کہ وہ محبوب سے ہمکلام ہوا۔

گذرا اسد مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

(و) اغیار کو اس کی محفل میں بار نہیں ہے مگر اُسے دیکھتے تو ہیں۔

تکلف برطرف نظارگی ہی میں سہی لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

(ز) غیر پر ستم بھی موجب رشک ہے۔

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

(ح) رشک کی تیسری منزل شروع ہوتی ہے۔ اب شاعر معشوق کے ساتھ بیجان چیزوں کا رابطہ بھی گوارا نہیں کرتا۔

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک
آغوش خم حلقۂ زنّار میں آوے

(ط) اپنی زبان سے بھی معشوق کا تذکرہ گوارا نہیں ہے یعنی خود اپنی ہی ذات پر رشک ہوتا ہے! شاعر نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

(ی) غیر در کنار خود اپنے ہی دیکھنے پر رشک آتا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(ک) رشک کی چوتھی منزل شروع ہوتی ہے۔ محبوب کا، خود اپنی اداؤں سے لطف اندوز ہونا بھی گوارا نہیں ہے۔

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوک نازِ بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دل، آخری منزل یہ ہے کہ محبوب کو حوالۂ خدا بھی نہیں کر سکتے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

گیارہویں خصوصیت

گیارہویں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عشق و محبت کے تمام پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔

مختزمی سرور صاحب لکھتے ہیں "انہوں نے صبح و شام، دن رات، جاڑا گرمی، بندر ریچھ، ہولی دیوالی کی کیفیات نظم نہیں کیں بلکہ عاشق کے دل کی حالت اور معشوق کی اندرونی کیفیت نظم کی ہے۔ انہوں نے عاشق کے دل میں گھس کر ان کے جذبات (عاشقانہ) کی گہرائیوں کو ٹٹولا، اور ان (جذبات) کی شاعرانہ انداز میں عکاسی کی یعنی وہ داخلی کیفیات کے مصور ہیں" رنٹے اور پرانے چراغ صہ۱۸۲

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں "غالب نے شاید ہی حسن و عشق کی کسی کیفیت کو چھوڑا ہو۔ ان کی غزل اس سلسلہ کی تمام کیفیات کا ایک نگار خانہ معلوم ہوتی ہے۔ (غزل اور مطالعۂ غزل صہ۳۳۵)

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

کہنے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا ؛ دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

ہیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے ؛ وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی ؛ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی ٭ جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ٭ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ٭ کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے داماں کو

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے ٭ غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا!

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر ٭ دامن کو آج اُس کے حریفانہ کھینچیے

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار ٭ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ٭ بے نیازی تری عادت ہی سہی!

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ٭ غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو ٭ آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم ٭ کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک ٭ ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

کس منہ سے شکر کیجیے اس الطاف خاص کا ٭ پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ٭ یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی ٭ زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

بارہویں خصوصیت

بارہویں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو فلسفیانہ مسائل سے روشناس کیا۔ ان سے پہلے غزل میں تصوف تو موجود تھا مگر فلسفہ طرازی نہ تھی۔ "غالب نے تفکر کو تغزل کے سانچے میں ڈھال کر بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور ان کی اس خصوصیت نے غزل کو نئی راہ دکھائی" اور "اس اعتبار سے غالب اردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں"۔[1]

چونکہ آئندہ فصل میں اس موضوع پر بالوضاحت اظہار خیال کروں گا۔ اس لیے یہاں ان کی فلسفیانہ شاعری کی مثالیں درج کرنے سے اجتناب کرتا ہوں، اور آخر میں چند محاسن کلام کی طرف اشارہ کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

(۱) ایہام اور رعایت لفظی:۔ یہ رنگ ان کی شاعری میں ناسخ کی تقلید سے پیدا ہوا اور از اول تا آخر نمایاں ہے۔ تعجب ہے غالب نے اس ادنیٰ درجہ کی صنعت کو اپنے کلام میں کس طرح جگہ دے دی! شاید عوام کو خوش کرنا مقصود ہو۔

---

[1] غزل اور مطالعۂ غزل ص ۵۴۶، ص ۵۶۳

دلی مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا (ایہام)

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا (ایہام)

کی اس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے (ایہام)

زکوٰۃ حسن دے اے جلوہ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا (رعایت لفظی)

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے
تریاکیٔ قدیم ہوں دود چراغ کا (؍؍)

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغان شبستان دل پروانہ ہم (؍؍)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں (؍؍)

(۲) تجنیس :- چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں ٭ کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

تکلف بر طرف نظارگی ہی میں سہی لیکن ٭ وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ٭ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
الٰہی جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے ٭ کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر ٭ جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

(۳) سہل ممتنع :- چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(ا) ابن مریم ہوا کرے کوئی ٭ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

پوری غزل کا یہی انداز ہے۔

(ب) پھر اس انداز سے بہار آئی ٭ کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

پوری غزل سہل ممتنع کی مثال ہے۔

(ج) کوئی امید بر نہیں آتی ٭ کوئی صورت نظر نہیں آتی

یہ پوری غزل بھی اسی رنگ میں ہے۔

(د) دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے ٭ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

یہ پوری غزل بھی اسی انداز کی حامل ہے۔

(۴) استفہامیہ انداز بیان :- چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ غالب نے اس انداز کی بدولت اپنے کلام میں بڑی دل کشی پیدا کر دی ہے :-

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ٭ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ٭ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ٭ تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

(۵) حسن تقابل :- غالب نے تقابل کی بنا پر اپنے اشعار میں تاثیر پیدا کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست ٭ لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا ٭ اگر اس طرۂ پرپیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

نے مژدۂ جمال نہ نظارہ وصال ٭ مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم وگوش ہے

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں ٭ شب فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت ٭ یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ٭ جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

(۲) روزمرہ اور لطفِ زبان :۔ اگرچہ غالب نے ذوق کی طرح بکثرت محاورے نہیں باندھے تاہم چند اشعار اس قبیل کے بھی ان کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ٭ ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ٭ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ٭ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ٭ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ٭ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے ٭ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ ٭ آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ٭ کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ ٭ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں ٭ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(۷) استدلالی اندازِ بیان۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ ٭ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم ٭ آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے ٭ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ٭ جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ ٭ جفا میں اس کی ہے اندازِ کار فرما کا

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ٭ دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن ❊ غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں ❊ شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل ❊ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

(۸) نکتہ آفرینی :- چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی ❊ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو ❊ یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ❊ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ❊ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ❊ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج ❊ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ❊ ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

(۹) حسن بندش :- چند مثالیں درج کی جاتی ہیں :-

تو اور آرائش خم کاکل ❊ میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ؛ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ؛ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے ؛ کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے ؛ نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیئے ؛ ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیئے

گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے ؛ آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے ؛ غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

(۱۰) سوز و گداز :- چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں ؛ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے ؛ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب ؛ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ؛ اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ؎ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ؎ روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ؎ نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ؎ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فصل ششم

غالبؔ کا فلسفہ اور تصوّف

(ا) فلسفہ

تمہید ہم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں کہ غالبؔ شاعر فلسفی نہیں تھے۔ بلکہ فلسفی شاعر تھے یعنی انھوں نے بیدلؒ یا اقبالؒ کی طرح کوئی فلسفیانہ نظام اپنی شاعری کے ذریعہ سے دنیا کو نہیں دیا بلکہ فلسفہ کے بعض حقایق یا نکات اپنے کلام میں نظم کئے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے انہیں فلسفیانہ دماغ عطا کیا تھا۔

غالب نے زندگی کی ترجمانی ہی نہیں کی، اس پر تنقید بھی کی ہے اور اسی کی بدولت ان کے کلام میں فلسفیانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:۔

"غالب اُردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں۔" (غزل اور مطالعۂ غزل صہ ۵۶۳)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:۔

"غالب نہ فلسفی تھے نہ صوفی۔ ان کا سارا فلسفہ اور تصوف اُن کی فکر روشن کی کرشمہ سازی ہے۔" (نئے اور پرانے چراغ صہ ۱۸۰)

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:۔

"جب مرزا نے اپنے ذہن کو اپنی دلی کیفیات اور حیاتِ انسانی کی کشمکش بیان کرنے کے لیے استعمال کیا تو ان کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کثرت سے آ گئے لیکن ان کا مقصد کسی خاص فلسفہ کی ترجمانی نہیں تھا محض دل پر گذری ہوئی کیفیتوں کا اظہار مقصود تھا۔" (حکیم فرزانہ ص ۱۸۶)

ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں :۔

"غالب نے فطرت اور کائنات کے مطالعہ کے بعد اپنے نظریات قائم کیے تھے۔" (فلسفۂ کلام غالب ص ۱۱۴)

اب ہم وہ اشعار درج کرتے ہیں جن میں انہوں نے فلسفیانہ مسائل نظم کیے ہیں :۔

(۱) غالب خدا کی ہستی کے معترف ہیں :۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(۲) خدا واحد لاشریک لہ ہے :۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

(۳) ہستی، موجب آزار و رنج و ملال ہے :۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

(۴) غم زندگی کی ایک بنیادی حقیقت ہے بلکہ ہستی یا حیات اور غم ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں :۔

"غالب نے زندگی اور غم کو ایک ہی چیز قرار دیا ہے" (اردو غزل ص ۱۳۰)

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(۵) عقلِ انسانی، حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی :-

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

(۶) دنیا کی رونق اور اس کے ہنگامے، سب، فنا پر موقوف ہیں :-

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یہ کائنات ہر دم رو بفنا ہے :-

ہیں فنا آمادہ، اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد، یاں

بلکہ فنا، اوراقِ ہستی کی شیرازہ بند ہے :-

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(۷) خرابی، انسانی ہستی کی تعمیر میں پوشیدہ ہے :-

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

(۸) ہستی کی کشمکش سے کسی کو رہائی نہیں مل سکتی :-

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

(۹) تمام موجودات کی حقیقت ایک ہے (اور وہ حقیقت، ذاتِ باری ہے)

وہی اک چیز ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

نوٹ :۔ اقبال بھی یہی کہتے ہیں :۔

حقیقت ایک ہے ہر شئے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

(۱۰) اگر اپنی حقیقت سے آگاہی مطلوب ہے تو اپنی صفاتِ رذیلہ کو فنا کر دو اور ان کی جگہ صفاتِ حق پیدا کرو۔

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

(۱۱) وصل سے عشقِ حقیقی کو زوال نہیں ہو سکتا :۔

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

(۱۲) یہی وجہ ہے کہ عاشق کا سفر کبھی ختم نہیں ہو سکتا :۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

نوٹ :۔ اقبال بھی یہی کہتے ہیں :۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

زندگی جز لذتِ پرواز نیست
آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

حیات نام ہے انسانی ہستی کے اس سفر کا جو مسلسل جاری ہے :-

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(۱۳) غم چونکہ زندگی کا ایک بنیادی عنصر ہے اس لیے اس سے کسی کو مفر نہیں ہے :-

غم گرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا ، غمِ روزگار ہوتا

موت کے علاوہ غمِ ہستی کا اور کوئی مداوا نہیں ہے :-

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۱۴) عبادت کی غایت مشاہدۂ حق ہے ۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو!

(۱۵) طاعت وہ لائق تحسین ہے جو جنت کے لیے نہ ہو بلکہ محض خدا کے لیے ہو :-

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

زہد و تقویٰ کی خوبی اس وقت ہے کہ زاہد کا دل طمع سے پاک ہو :-

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

(۱۶) ہر شخص اپنی افتادِ طبع (سرنوشت) کے سامنے بے بس (مجبور) ہے

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو

(۱۷) عاقل وہ ہے جو تقلید اور پابندیٔ رسوم سے اجتناب کرے:-

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

لیکن حالت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو اہلِ خرد سمجھتے ہیں وہ بھی اس عیب سے پاک نہیں ہیں:-

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

(۱۸) انسان کو اپنا مطمحِ نظر بہت بلند رکھنا چاہیئے کیونکہ خدا نے اپنی نوازشات کو کسی خاص گروہ سے مختص نہیں کیا ہے:-

ہے کیا ضرور سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

(۱۹) ہر شخص حاملِ تجلیاتِ ربانی ہے۔ اس کی ذات کا جلوہ ہر شخص میں پوشیدہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک شخص اپنی نادانی کی وجہ سے اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے:-

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

(۲۰) انسان کو لازم ہے کہ جو راستہ اختیار کرے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ اس میں کسی خاص مذہب کی قید نہیں ہے۔ کافر وہ نہیں ہے جو بت پرستی کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو استواری کے ساتھ اپنے خیالات پر قائم نہیں رہا۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(۲۱) انسانی زندگی کا حسن و جمال بلکہ کمال اظہار و اعلان میں ہے نہ کہ مدت دراز تک گوشہ نشینی یا گمنامی کی حالت میں۔ یعنی قابل تحسین انسان وہ ہے جو اپنے جوہر ذاتی کی نمائش کر سکے یا اپنی زندگی میں کوئی کارنمایاں انجام دے سکے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

نوٹ:- اقبال نے بھی یہی لکھا ہے:-
زانکہ در عرض حیات آمد ثبات
از خدا کم خواستم طول حیات!

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیری به از صد سال میش

(۲۲) یہ کائنات کوئی مکمل شئے نہیں ہے ہر لحظہ نئی نئی چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

نوٹ :۔ اقبال نے بھی یہی لکھا ہے :۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

(۲۳) لطیف اشیاء اپنی جلوہ گری کے لیے کثیف اشیاء کی محتاج ہیں یعنی خالقِ کائنات نے خود یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

(۲۴) حُسنِ حقیقی ہر شئی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یعنی یہ کائنات مظہر ذات و صفات باری ہے۔ اگر کسی کو یہ حُسن نظر نہیں آتا تو خود اس کی نگاہ (نظر) کا قصور ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا

(۲۵) انسان چونکہ اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ دراصل خدا ہی سب کچھ کرتا ہے۔ یعنی اس کائنات کا سارا انتظام اسی کے دستِ قدرت میں ہے اس لیے وہ غلطی سے اپنے آپ کو فاعل یا مدبر الامور سمجھتا ہے۔

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

(۲۶) آدمی بظاہر ایک حقیر شئی ہے لیکن دراصل ساری کائنات، بطرزِ

اجمال، اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ اگر وہ تنہا بھی ہو تو خیالات کی ایک دنیا اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی خلوت میں بھی جلوت (انجمن) کا رنگ مخفی ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

نوٹ:۔ غالب نے یہ نکتہ حضرت علیؓ سے سیکھا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

یَا بُنَیَّ! اِنَّکَ جِسْمٌ صَغِیْرٌ وَّفِیْکَ عَالَمٌ کَبِیْرٌ ٥

اے میرے بیٹے! بظاہر تو ایک جسم صغیر ہے۔ مگر تیرے اندر ایک عالم کبیر پوشیدہ ہے۔

(۲۷) خدا بھی انہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یعنی ہمت سے کام لیے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

(۲۸) ہستی اور کائنات کی ساری رونق عشق سے ہے۔ عشق نہ ہوتا تو یہ دنیا ہی وجود میں نہ آتی۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

نوٹ:۔ یہ نکتہ مرشد رومی کی تعلیمات سے ماخوذ ہے:۔

دور گردوں را ز فیض عشق داں
گر نبودے عشق بفسردے جہاں

(۲۹) زندگی کا لطف عشق ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

نوٹ :- یہ نکتہ مرشد رومی کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
دے طبیعت جملہ عارت ہائے ما

(۳۰) حقیقی معنی میں موحد وہ ہے جو رسوم ظاہری سے بالاتر ہو۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(۳۱) "نفس امارہ کی تربیت" بہت دشوار ہے۔ "من" بڑی مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ اس کے لیے مسلسل جد و جہد درکار ہے۔ سالک کو قدم قدم پر دشواریاں لاحق ہوتی ہیں :-

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

(۳۲) انسان مجموعۂ اضداد ہے مثلاً عشق کرنا اس کی طبیعت کا اقتضاء ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عشق میں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے زندگی سے بھی الفت ہے۔ یعنی وہ زندگی سے ہاتھ دھونا بھی نہیں چاہتا :-

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

(۳۳) انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس کا دل مدعا

درحرص) سے خالی ہو جائے۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

(۴۴) جب تک انسان ناکامیوں سے دوچار نہ ہو، رجوع الی اللہ، ناممکن ہے۔ بلکہ خدا کی ہستی کا یقین ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کے سارے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

(۴۵) انسان بننا بہت مشکل ہے۔ یعنی سیرت کی تکمیل کے لیے بڑی جدوجہد درکار ہے:۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۴۶) اگر انسان اپنی باطنی آنکھ میں روشنی پیدا کرے یعنی دیدۂ دل وا کرے تو اس کو ہر شئی میں خدا کا جلوہ نظر آ سکتا ہے:۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

(۴۷) واقعات وحادثات زندگی سب تابع مشیت ایزدی ہیں:۔

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

(۴۸) جب ایک انسان پر مصائب کا نزول پے درپے ہوتا ہے تو وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے۔ یعنی پھر اسے ان سے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی:۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

(۳۹) عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی کا احسان نہ اٹھائے کیونکہ احسان اٹھانا پستی ہمت کی دلیل ہے:-

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال!
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

(ب) تصوف

تمہید اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ غالب نے اپنی نظم اور نثر دونوں میں اپنے وجودی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ ان کے تمام ناقدین اس حقیقت کے معترف ہیں مثلاً

(۱) مولانا حالی لکھتے ہیں" تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی۔ حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعہ سے گذرے تھے اور سچ پوچھئے تو انہی متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔"

"مرزا توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ توحید وجودی ان کی شاعری کا جزو بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انہوں نے جس قدر اصناف سخن میں بیان کیا ہے نظیریؔ اور بیدلؔ کے بعد کسی نے بیان نہیں کیا۔"

(ب) فنا فی الغالب ڈاکٹر بجنوری لکھتے ہیں " غالب وحدت الوجود کے

قائل ہیں ۔ وہ خدا کو ماسوا سے علیحدہ خیال نہیں کرتے بلکہ ان کا مذہب "ہمہ اوست" ہے ۔

(ج) شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "نفی اور اثبات کی کشمکش کا مستقل فلسفیانہ حل، مرزا نے وحدت الوجود میں تلاش کیا یعنی لا موجود الاّ اللہ اور لا مؤثر فی الوجود الا اللہ ۔ (حکیم فرزانہ صـ۱۹۵)

"جیسا کہ ابتدائی اردو فارسی قصائد کے اقتباسات سے ظاہر ہے، وحدت الوجود کا تصور ان کے کلام میں شروع سے تھا اور غالباً بیدل سے ماخوذ تھا ۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے "عرفاء کے کلام سے حقیقت حقہ، وحدت الوجود کو اپنے ذہن نشین کیا تھا ۔" (حکیم فرزانہ صـ۱۹۷)

(د) واقف رموز غالب ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں :-

"اسلامی تصوف کا عقیدۂ وحدت الوجود اور ویدانت کا اُدویت (بنیادی طور پر) دونوں ایک ہیں ۔ غالب نے ہستی کی جو تشریح پیش کی ہے وہ نتائج کے اعتبار سے ویدانت کے نظریہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے ۔"

(فلسفۂ کلام غالب صـ۳۱)

"قرآن حکیم نے انسان اور باقی حیوانات کی زندگی کو غیر حقیقی قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹-۶۴)

اور بے شک گھر آخرت کا (زندگانی) آخرت، یقیناً وہی ہے حقیقی زندگی ۔ اس کے مقابلہ میں اس دنیا کی زندگی کو ہم زندگی کے نام سے پکار ہی نہیں سکتے ۔ اس قرآنی تصریح کے بعد شاید اس باب میں کوئی شبہ نہ رہے کہ اس دنیا کا وجود کوئی حقیقی وجود نہیں ہے ۔ یعنی اس کی ہستی خالص اعتباری ہستی

ہے۔ اس سے زیادہ وحدت الوجود کا اور کوئی مفہوم نہیں ہے اور غالب نے بھی اسی وحدت الوجود کی تلقین کی ہے ؟ (فلسفۂ کلام غالب ص۳۲)

لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ تصوف یا وحدت الوجود سے ان کی دلچسپی محض علمی، سطحی اور شاعرانہ تھی۔ چونکہ انہوں نے لاموجود الا اللہ صرف زبان سے کہا دل سے نہیں کہا اس لیے اس "حقیقت حقہ" کا کوئی اثر ساری عمر ان کی زندگی کے کسی شعبہ پر مرتب نہ ہو سکا، چنانچہ ان کے تمام ناقدین کا بھی یہی خیال ہے مثلاً

(ا) ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں :۔

"غالب کے ذہنی ارتقاء میں بیدل کے متصوفانہ کلام کو بڑی قدر و قیمت حاصل ہے۔ غالباً یہ اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ وہ بڑے والہانہ انداز میں تصوف کے مسائل کی تشریح فرماتے ہیں اور ان پر تبصرے بھی کرتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ تصریحیں اور تبصرے، ذہنی مشق سے آگے نہیں بڑھنے پاتے۔ خود تصوف کا ان کی فطرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ مسائل ان کے دماغ میں ضرور جاگزیں ہیں لیکن کبھی ان کے دل تک اترنے نہیں پائے۔ (فلسفہ کلام غالب ص۱۵)

(ب) پروفیسر سرور لکھتے ہیں :۔

"غالب کی مقبولیت کا باعث ان کا تصوف نہیں ہے بلکہ ان کے نفسیاتی حقایق ہیں۔ وہ نہ فلسفی تھے نہ صوفی۔ ان کی طبیعت فلسفیانہ مضامین کی طرف ایک کلیاتی نظر کی وجہ سے مائل تھی اور تصوف سے دلچسپی بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔" (نئے اور پرانے چراغ ص۱۸۰)

(ج) شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں :۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توحید وجودی کے متعلق ان کی دلچسپی زیادہ تر اس کے علمی، سطحی اور شاعرانہ پہلوؤں تک محدود رہی اور اسے انہوں نے اپنی اور اپنے ماحول کی روح فرسا کشمکش اور اختلافات کا حل ڈھونڈنے کے لیے استعمال کیا" (حکیم فرزانہ ص ۱۹۸)

(د) ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:۔

"غالب کو اپنے مسائل تصوف کے بیان پر بڑا فخر تھا۔ وہ تو یہ کہئے کہ ان کی بادہ خواری آڑے آگئی ورنہ انہیں اپنے ولی ہونے کا یقین ہو جاتا:۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ غالب نے تصوف کے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی مگر ان میں یہ صلاحیت[1] نہیں تھی کیونکہ ان کا مزاج تصوف سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سب کچھ ہو سکتے تھے لیکن صوفی ہونا یا ایک سچے صوفی کی طرح تصوف سے نسبت پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی" (غزل اور مطالعہ غزل ص ۴۲)

---

[1] میرے عزیز دوست نے یہ تبصرہ سپرد قلم کر کے بلاشبہ اپنی ژرف نگاہی اور نکتہ سنجی کا ثبوت دیا ہے۔ غالب نے تصوف کے مسائل محض رسماً یا تقلیداً نظم کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں نہ خواجہ میر درد کی سی تاثیر ہے نہ حضرت بیدل کی سی دلکشی نہ اندازِ بیان ہے نہ لطف زبان ہے، نہ سوز و گداز ہے نہ لذتِ پرواز ہے! اگر تصوف کا پرتو بھی پڑ جاتا تو میر مہدی مجروح کو یہ نصیحت کرنے والا کہ "علی علی کہا کر اور فارغ البال رہا کر" خود ساری عمر انگریز! انگریز! نہ کرتا رہتا۔ ۱۲

(ھ) پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں :۔

"غالب کے دل میں وحدت الوجود کا عقیدہ گھر کیے ہوئے تھا... وحدت الوجود کی طرف ان کا میلان، کچھ تو مسائل کائنات کو سمجھنے کے سلسلہ میں پیدا ہوا اور کچھ مذہبی رسوم سے آزادی حاصل کرنے کا ایک (عمدہ) بہانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محض زبانی صوفی تھے۔

(و) آخر میں خود غالب کا اعتراف قابل غور ہے :۔

"آرائش کلام کے لیے کچھ تصوف، کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونئ طبع کے اور یہاں کیا رکھا ہے۔"

تصوّف اور وحدتُ الوجُود سے دلچسپی کے اسباب

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب تصوف کی تعلیمات ان کی زندگی میں داخل نہ ہو سکیں (ان کی پوری زندگی اس صداقت پر شاید ہے) تو پھر ان کو اس فن سے دل چسپی کیوں اور کیسے پیدا ہوئی ؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ

(ا) مسئلہ وحدت الوجود کشت شاعری کے لیے نہایت زرخیز میدان ہے۔

(ب) بقول مولانا شبلی نعمانی "گو مسئلہ وحدتِ وجود کی اصلی حقیقت کچھ ہو لیکن صورۃً وہ سرتا پا حیرت ہے اور شاعری کی یہی چیز (بنیاد) ہے۔ ہر چیز جو دل پر... تعجب کا اثر پیدا کرتی ہے، حقیقی شعر ہے، فضائے غیر محدود۔ بحرِ بیکراں، سیارہ ہائے غیر متناہی، گلہائے چمن، امواج دریا، سب مجسم شعر ہیں اور اس بناء پر وحدتِ وجود کا مسئلہ سرتا پا شاعری ہے۔" (شعر العجم ص۱۳۴)

(ج) تصوف سے شاعری میں حسن، دل کشی، سنجیدگی اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے مشہور شاعر اور اردو ادب کے بہت بڑے ناقد

پروفیسر فراق گورکھپوری لکھتے ہیں کہ :-

"انسان کی عظمت کا شعور، عرفان نفس اور کائنات کے روحانی پہلو کا احساس . . . . یہ تمام باتیں غزل میں تصوف ہی کے لگاؤ سے آتی ہیں۔
(نگار۔ مئی ۱۹۳۸ء)

(د) ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں :-

"تصوف نے صنف غزل کو تنوع، گہرائی اور گیرائی کی خصوصیات سے آشنا کیا۔ تصوف کے متعلق جو یہ بات کہی گئی ہے کہ برائے شعر گفتن خوب است، کچھ ایسی غلط تو نہیں ہے۔" (غزل اور مطالعۂ غزل ص۴۴)

"تصوف نے غزل کی صنف کو حیات اور کائنات کے مسائل سے آگاہ کیا . . . . اس رجحان نے غزل کو عظمت اور بلندی سے قریب کیا ہے" (ایضاً ص۵۲)

(ہ) وحدت الوجود کا مضمون دہلی کے دبستانِ شاعری کی خصوصیت ہے مومن کو چھوڑ کر شاید ہی کسی بڑے شاعر کا کلام تصوف کی چاشنی سے خالی ہو۔ ذیل میں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :-

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ ؛ ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تیئں ؛ معلوم یہ ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ ؛ آئینہ تھا تو، مگر قابل دیدار نہ تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر ؛ سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(میر تقی میر)

اس سے لے ہستی تک اپنی تفرقہ یک مو نہیں ٭ نقطۂ خط دو ہیں جو آئے ہیں لیکن دو نہیں

ختم ہیں نیرنگیاں تجھ پر کہ تیرے حسن سے ٭ اتنی بیرنگی پہ کس کس رنگ کا دھوکا ہوا

(قائم چاندپوری)

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے ٭ کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

(سودا)

معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں ٭ مخلوق ہوں یا خالق مخلوق نما ہوں!

ہوں شاہد تنزیہہ کے رخسار کا پردہ ٭ یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں

یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا ٭ ہر چند کہ خود عقدہ ہوں خود عقدہ کشا ہوں

اے مصحفیؔ شانیں ہیں مری جلوہ گری میں ٭ ہر رنگ میں میں مظہر آثار خدا ہوں

(مصحفی)

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے ٭ تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے؛

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم ٭ کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

ڈھونڈے ہے تجھے تمام عالم ٭ ہر چند کہ تو کہاں نہیں ہے

(خواجہ میر درد)

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا ٭ از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

(نیاز بریلوی)

خورشید وہی نورِ سحر گاہ وہی ہے ٭ شعلہ ہے وہی شمع وہی ماہ وہی ہے

خارا میں شرر ہے وہ ظفر لعل میں وہ رنگ ٭ واللہ وہی سب میں ہے باللہ وہی ہے

(بہادر شاہ ظفر)

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا (درد؎)

یہ عالم شہود ہے آئینہ ذات کا ؎ یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا
(شیفتہ)

جس طرح عورت اور اس کی جسمانی خوبیاں لکھنؤ کے دبستان شاعری کی خصوصیت ہیں، اسی طرح تصوف اور اس کے لوازمات، یہ دلی کے دبستانِ شاعری کی خصوصیت ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح شاہان اودھ کی عیاشی کی وجہ سے شعرائے لکھنو کے اعصاب پر عورت سوار ہوگئی تھی اسی طرح خواجگان چشت" کے دم قدم کی برکت سے شعرائے دہلی کے قلوب بادہ تصوف سے سرشار ہو گئے تھے۔

تاریخ داں حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں دہلی کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور اس وقت سے لے کر غالب کے زمانہ تک اس شہر میں چشتی سلسلہ کی شمع روشن رہی۔

اکبر مرتد کے عہد حکومت میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے دہلی میں نقشبندی سلسلہ قائم کیا اور اس سلسلہ نے بھی چشتی سلسلہ کے دوش بدوش مسلمانوں میں صوفیانہ خیالات کی اشاعت کی۔ جس زمانہ میں مرزا اپنی پنشن میں اضافہ کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب نقشبندیؒ کی خانقاہ میں صدہا اشخاص دینی اور روحانی تربیت حاصل کر رہے تھے۔

خلاصۂ کلام ایں کہ چشتی اور نقشبندی حضرات نے اپنی مسلسل جد و جہد سے

تصوف کو باشندگانِ دہلی کی تمدنی زندگی کا جزو لاینفک بنا دیا تھا۔ اندریں حالات یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دہلی کے دبستانِ شاعری نے تصوف کی آغوش میں پرورش پائی۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ خوش قسمتی سے غالب کو خاتم الحکماء فرید الدہر وحید العصر مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی مرحوم کی صحبت میسر آگئی جو بلاشبہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے منطقی، فلسفی اور متکلم تھے، عربی ادب میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے اور فلسفۂ وحدت الوجود کے مسلم الثبوت امام تھے۔ ہندوستان کی سرزمین نے ان کے بعد، ابھی تک معقولات میں ان کا ہمسر پیدا نہیں کیا۔ مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ چونکہ اپنے اسلاف کے ورثہ سے یکسر محروم ہو چکا ہے اس لیے نہ وہ ان کے علمی مقام سے آگاہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ؎

؎ یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد اکرام نے اپنی تالیف "حکیم فرزانہ" میں ص۵۲ پر یہ گل فشانی کی ہے :-

"غالب نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ علم و ادب کی اعلیٰ منزلوں میں کوئی راہنما ساتھ نہ تھا۔ (یہ صحیح ہے کہ مولوی فضل حق کی صحبت سے انہیں فائدہ حاصل ہوا۔ لیکن ادب اور حکمت کی جن بلندیوں پر مرزا پہنچے وہاں فضل حق یا شیفتہ کیسے ساتھ دے سکتے تھے) نتیجہ یہ کہ اپنا راستہ انہیں خود بھٹک بھٹک کر ڈھونڈنا پڑتا تھا۔"

اب شیخ محمد اکرام (ایم۔ اے، سابق آئی۔ سی۔ ایس حال سی۔ ایس پی) کو کوئی کیونکر سمجھا سکتا ہے کہ ادب اور حکمت کی جن بلندیوں پر (باقی صفحہ ۱۶۲ پر)

مولانائے موصوف کی صحبت سے غالب کو یہی فائدہ نہیں ہوا کہ ان کی شاعری گمراہی سے محفوظ ہوگئی اور وہ اپنی شاعرانہ صلاحیت کا صحیح استعمال کرسکے بلکہ انہیں تصوف کے مسائل اور وحدۃ الوجود کے مبادی سے بھی واقفیت حاصل ہوگئی۔

مولانائے موصوف کی صحبت کے علاوہ غالب نے جس شاعر کے کلام سے وحدت الوجود کے اسرار و رموز حاصل کئے وہ خلاق المعانی بیدل کی ذات گرامی ہے جس نے اپنی نظم و نثر میں اس فلسفہ کے دریا بہا دئے ہیں۔

غالب نے وحدت الوجود کی کون سی تعبیر پیش کی ہے

ہندستان میں وحدت الوجود کا نظریہ اگرچہ اپنشدوں کے زمانہ سے مروج ہے مگر شری شنکر اچاریہ (وفات ۸۲۰ء) اس نظریہ کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ مغرب میں افلوطین (متوفی ۲۶۵ء)، اسپنوزا (م ۱۶۷۷ء) اور ہیگل (م ۱۸۳۱ء) نے اس نظریہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ لیکن غالب نے ان میں سے کسی کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس

(بقیہ حاشیہ) مولانا فضل حق خیر آبادی پہنچے، غالب ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے ان کی حیثیت مولانا کے سامنے ایک طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہے ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک جو شخص "نمود" اور "ثبوت" میں بھی امتیاز نہ کرسکے اسے خاتم الحکماء مولانا فضل حق مرحوم پر فضیلت دینا شیخ صاحب ہی کا حوصلہ ہے! اگر اکرام صاحب مولانا کا حاشیہ پر قاضی مبارک" پڑھ لیتے تو اس جسارت کا ارتکاب کبھی ہرگز نہ کرتے، سچ تو یہ ہے کہ جب تک فضلِ حق شامل حال نہ ہو، انسان مولانا فضل حق کے مرتبہ سے آگاہ نہیں ہوسکتا ۱۲

لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اس کی وہی تعبیر پیش کی جو کلام بیدل سے مترشح ہوتی ہے اور بیدل جیسا کہ معلوم ہے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے خوشہ چیں ہیں۔ گمان غالب ہے کہ بیدل کے علاوہ غالب نے مرشد رومی اور عارف جامی کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ لیکن انہوں نے بھی شیخ اکبرؒ ہی سے استفادہ کیا ہے۔

اب ہم غالب کی تصانیف نظم و نثر سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ انہوں نے وحدت الوجود کی وہی تعبیر پیش کی ہے جو مسلمانوں میں مروج اور مقبول تھی۔

نوٹ :۔ واضح ہو کہ وحدت الوجود کی اصولی تعلیم میں اختلاف نہیں ہے افلوطین، شنکر اچاریہ، شیخ اکبرؒ، اسپنوزا اور ہیگل، یہ تمام وجودی اس بات میں متفق ہیں کہ

(ا) درحقیقت صرف ایک ذات موجود ہے۔ حقیقی معنی میں "وجود" کا اطلاق اسی پر ہو سکتا ہے یعنی اس کا وجود، حقیقی (REAL) ہے ہر فلسفی نے اس کے لیے اپنی اصطلاح وضع کی ہے مثلاً

افلوطین اسے الواحد کہتا ہے۔

شنکر اسے برہمن کے نام سے یاد کرتا ہے۔

شیخ اکبرؒ اسے الحق سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسپنوزا اسے جوہر قرار دیتا ہے۔

ہیگل اسے مطلق سمجھتا ہے۔

(ب) یہی موجود حقیقی، اصل یا مصدر یا منبع کائنات ہے۔

(ج) کائنات نہ حقیقی معنی میں موجود ہے۔ معدوم محض ہے۔ بلکہ موہوم ہے۔ یعنی کائنات کا وجود وہمی واقعی ہے۔ یا ایک نمود

بے بود ہے۔

اختلاف باہمی جو کچھ ہے وہ اس نظریہ کی تعبیر میں ہے۔ اور تعبیر پر ہر فلسفی کا ذاتی رجحان، اندازِ فکر، ماحول اور خاندانی مذہب اثر انداز ہوا ہے۔

غالب کی تصریحات

غالب نے اس مسئلہ پر نظم و نثر دونوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہم پہلے نظم سے چند اشعار پیش کریں گے پھر نثر سے بعض اقتباسات درج کریں گے۔

ہستی ہمہ جزئی است حقیقی کہ مراد را ❊ وحدت ہمہ حدلیست معین کہ نخود از وے
چوں پردہ برافتد نہ نہانست نہ پیدا ❊ پیدا و نہاں مشغلۂ حب ظہور است

باگردِ فرش و سینہ بالوان برابر است ❊ جاروب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
بزم جہاں بہ جمع، اعیاں برابر است ❊ ذاتِ حق است واحد و ہستی است عین ذات

حرف الآن کما کان زیں صفحہ برخواں ❊ ہستی محض تغیر نہ پذیرد زنہار
لوجودے کہ ندارند ز خارج، اعیاں ❊ ہمچناں در تتقِ غیب ثبوتے دارند
صور علمیہ کز علم نباید بعیاں ❊ نتواں گفت کہ عین است چرا نتوں گفت
موج و گرداب نسنجی کہ بود جز عماں ❊ پرتو و لمعہ ندانی کہ بود جز خورشید

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں ❊ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے ❊ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے ٭ جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

شاہد ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم ٭ لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

ہے تجلی تری سامان وجود ٭ ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم ٭ کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور ٭ جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

(ا) حقیقت از روئے مثال ایک نامۂ پیچیدہ و سربستہ ہے جس کے عنوان پر لکھا ہے "لا مؤثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے ۔ لا موجود الا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نام اور ہے جس پر رسالت ختم ہوئی" (دیباچہ سراج المعرفت)

(ب) "اے آنکہ از قدم و حدوث عالم سخن رانی یک رہ بحلقۂ آزادگان درآئی تا دانی کہ عالم خود در خارج وجود ندارد ۔ ہماں ذاتِ اقدس و مقدس کہ صفاتِ عینِ اوست و عالم از روے چوں پرتو از مہر جدا نیست ۔ در ہر عالم از اعیان ثابتہ تا صور محشورہ از خویش بر خویش جلوہ گر است" (مہر نیمروز)

(ج) ہستیٔ ذرہ جز پندار نیست ہر چہ ہست تاب آفتاب است و بس ۔ دریا را ہر کجا رواں بینی ہر آئینہ موج و حباب و کف و گرداب میاں بینی ۔ ایا آں طراز صورت اصلی دریاست یا ہر یک از آں پیکر در ہستی و پیدائی

با دریا انبار؟

ع دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست

(۵) مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب اور ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں۔ اور دل میں لا موجود الا اللہ اور لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔" (خط بنام علاؤالدین احمد خاں)

(۶) "خود اس نمایش گاہ کی سیر سے، جسے دنیا کہتے ہیں، جی بھر گیا ہے۔ اب عالم نیرنگی کا مشتاق ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ و لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔" (خط بنام قاضی عبدالجلیل بریلوی)

ان اقتباسات سے حالی مرحوم کے اس قول کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ تصوف سے انہیں خاص مناسبت تھی۔ وہ توحید وجودی کے قائل تھے بلکہ وہ ان کی شاعری کا جزو لاینفک بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انہوں نے جس قدر بیان کیا ہے (خصوصاً فارسی کلام میں) بیدل کے بعد کسی شاعر نے بیان نہیں کیا۔

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر

سوی اللہ و اللہ ما فی الوجود

نیز ان اقتباسات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ وہ وحدۃ الوجود میں شیخ اکبرؒ کے مقلد ہیں۔ شیخ موصوفؒ دنیائے اسلام میں پہلے فلسفی ہیں، جنہوں نے اس صداقت عظمیٰ کو قرآن حکیم اور احادیث سے ثابت کیا۔ شیخ صدرالدین قونویؒ، مرشد رومیؒ، عارف جامیؒ، شیخ عراقیؒ، شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ، شیخ امان اللہ پانی پتیؒ، شاہ عبدالرحمٰن

لکھنویؒ، ملا بحر العلوم لکھنویؒ، مولا فضل حق خیر آبادیؒ، شاہ مبارک العلی حیدر آبادیؒ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، ان تمام حضرات نے شیخ اکبرؒ ہی سے استفاضہ واستفادہ کیا ہے۔

میں نے یہ صراحت اس لیے کی ہے کہ آئندہ اوراق میں اس مسئلہ کی وہی تعبیر پیش کروں گا جو مسلمان صوفیہ نے سپرد قلم فرمائی ہے۔

وحدة الوجود کی تعبیر بہت دشوار ہے

اگرچہ اس مسئلہ کی بدولت شاعری کے لیے نہایت دلچسپ موضوع مہیا ہو سکتا ہے مگر اس کی صحیح تعبیر بہت دشوار ہے۔ اگر شاعر اس مسئلہ کے مالہٗ وما علیہ سے بخوبی آگاہ نہ ہو اور اظہار مطالب پر غیر معمولی قدرت نہ ہو، تو غلط فہمیوں ہی کا دروازہ نہیں کھلتا، خود یہ نظریہ ہی الحاد و زندقہ بن جاتا ہے

اس مسئلہ کی صحیح تعبیر کی دشواری کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی جیسے فاضل نے نادانستگی میں اس کی وضاحت بالکل غلط طریق پر کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال وحدتِ وجود کی حد تک جا پہنچا۔ یعنی یہ کہ درحقیقت خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا یوں کہو کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔"

(شعر العجم حصہ پنجم ص ۱۳۷)

جس طرح غالبؔ نے اپنے محبوب کی مژگاں کو سرشک آلود دیکھ کر یہ کہا تھا:-

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا!
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

اسی طرح جب میں نے شعر العجم میں یہ عبارت پڑھی تو بے ساختہ یہ شعر میری زباں سے ادا ہو گیا۔

نہیں معلوم کس کس کا یقین زائل ہوا ہوگا
حقائق دوست شبلی کے قلم کی ایک جنبش سے

شعر العجم کو گذشتہ پچاس سال میں بلا مبالغہ ہزاروں آدمیوں نے پڑھا ہوگا چونکہ ان کی ادبی عظمت اور علمی قابلیت کا نقش تمام اردو داں حضرات کے دل پر بیٹھا ہوا ہے اس لیے ہر شخص نے یہی سمجھا ہوگا کہ جب شبلی جیسا فاضل یہ کہہ رہا ہے کہ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ

"جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے"

تو یقیناً شیخ اکبرؒ نے یہی تعلیم دی ہوگی یا وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔

وحدت الوجود کا یہ مفہوم ذہن میں مرتسم ہونے کے بعد ایک ذہین آدمی قدرتی طور پر یوں استنباط کرے گا۔

"اگر یہ صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہے کیونکہ علامہ شبلی نے لکھا ہے اور وہ بڑے عالم تھے اس لیے غلط بیانی نہیں کر سکتے) تو پھر پتھر بھی خدا اور جامن بھی خدا، طوطا بھی خدا اور گھوڑا بھی خدا، لیلیٰ بھی خدا اور مجنوں بھی خدا، مَیں بھی خدا اور تُو میں بھی خدا!

اور اگر نتیجہ صحیح ہے تو پھر عقیدۂ وحدت الوجود کے غلط ہونے میں کیا شبہ ہے؟ پھر وحدت الوجود اور زندقہ میں کیا فرق ہے؟

لیکن یہ ساری غلطی مذکورہ بالا غلط فقرے سے پیدا ہوئی ہے۔ قائلین وحدۃ الوجود (خصوصاً وہ حضرات جو مسلمان ہیں) کبھی ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ

"جو کچھ موجود ہے، سب خدا ہی ہے" کیونکہ جو مفہوم اس جملہ کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے وہ بلاشبہ الحاد و زندقہ ہے۔

واضح ہو کہ دنیا کا ہر فلسفہ اعتبارات پر مبنی اور موقوف ہے۔ اسی لیے حکماء میں یہ قول مسلم ہے " لولا الاعتبار لبطل الحکمۃ " یعنی اگر قضایا میں اعتبارات قائم نہ کیے جائیں یا اعتبارات کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ساری حکمت (سارا فلسفہ) باطل ہو جائے گا۔

اس کلیہ کی روشنی میں مولانا شبلی کے جملہ پر غور کرو۔ چونکہ انہوں نے غیر محتاط انداز میں، اعتبار قائم کیے بغیر، ایک بات لکھ دی اس لیے مفاسد کا دروازہ کھل گیا، سوال یہ ہے کہ

جو کچھ موجود ہے، یہ کس اعتبار سے " سب خدا ہی ہے ؛ بحسب الوجود یا بحسب الذوات ؛ بالفاظِ دگر، وجود کے اعتبار سے یا تعینات کے اعتبار سے ؟

چونکہ مولانا شبلی نے اپنے جملہ میں اعتبار کی وضاحت نہیں کی اس لیے اس کا مفہوم لازمی طور سے منجر بضلالت ہو گیا۔ یہ جملہ یوں لکھنا چاہیے تھا:۔ جو کچھ موجود ہے اگرچہ باعتبار وجود سب خدا ہی ہے مگر باعتبار ذات خلق یا باعتبار تعینات کوئی شی بھی خدا نہیں ہے۔" یہ سچ ہے کہ جو کچھ موجود ہے من حیث الوجود (باعتبار وجود) خدا ہے مگر آپ کسی شئ کی طرف اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ چیز خدا ہے یا وہ چیز خدا ہے۔ کیونکہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اگرچہ باعتبار وجود خدا ہے مگر باعتبار تعینات خدا نہیں ہے بلکہ غیر خدا ہے۔ اور جو شئ بھی نظر آتی ہے وہ متعین ہے اور وجود متعین خدا نہیں ہے اس لیے کوئی شئ خدا نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قائلین وحدت الوجود یہ تو کہتے ہیں کہ "ہمہ اوست" مگر یہ نہیں کہتے کہ "ہر یک اوست" کیونکہ یہ کلمہ تو کفر صریح ہے (اعوذ باللہ من ھٰذہٖ الھفوات)

اس نازک منطقی فرق کو ذہن نشین کرنے کے لیے ہم دوسری مثال پیش کرتے ہیں:-

حضرت صوفیہ یہ نہیں فرماتے:-

کہ "یہ کائنات، جلوۂ ذات ہے"

بلکہ اس بات کو یوں ادا فرماتے ہیں:-

"جلوۂ ذات یہ کائنات ہے"

جو شخص فلسفۂ وحدت الوجود کے اسرار سے یا اس کے مبادی و مطالب سے آگاہ نہیں ہے اس کی نگاہ میں تو یہ دونوں جملے یکساں ہیں مگر جو لوگ اس کوچہ سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

غور کیجیے جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "یہ کائنات" تو آپ پہلے اپنے ذہن میں بھی اور سامع کے ذہن میں بھی کائنات کی ہستی کا اثبات کرتے ہیں، پھر اسے جلوۂ ذات قرار دیتے ہیں۔ اس طرح آپ کائنات اور ذات دو ہستیوں یا دو وجودوں کو تسلیم کر لیتے ہیں اور ارباب علم جانتے ہیں کہ یہ وحدت الوجود نہیں ہے بلکہ اتحاد الوجود ہے۔ جو اسلام کی رُو سے کفر و الحاد ہے۔

کائنات، جلوۂ ذات نہیں ہے کیونکہ کائنات کا بذاتِ خود وجود ہی کہاں ہے جو اُسے مبتدا، قرار دیا جائے؛ ہاں یہ ضرور ہے کہ جلوۂ ذات بسبب تعینات بشکل کائنات نظر آرہا ہے۔ چونکہ ذات (حق)، فی الحقیقت موجود ہے

اس لیے اس کا اثبات نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف شرع۔

جس طرح نثر میں غیر محتاط انداز اختیار کرنے سے مفاسد کا دروازہ کھل جاتا ہے اسی طرح نظم میں بھی اگر اس اصول کو مدِ نظر نہ رکھا جائے تو شعر غلط فہمی کا منبع بن جاتا ہے بلکہ شاعر فلسفۂ وحدت الوجود کا نادان دوست بن جاتا ہے۔

وحدت الوجود کے متعلق جو غلط فہمیاں انگریزی دان طبقہ میں پائی جاتی ہیں اس کے بڑے سبب تین ہیں۔

ایک تو یہ کہ اس طبقہ کے اکثر و بیشتر افراد عربی اور فارسی سے بیگانہ ہوتے ہیں اور حضرات صوفیہ نے اس نظریہ کی وضاحت انہی دو زبانوں میں کی ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے تاریخ فلسفۂ یورپ اردو یا انگریزی زبان میں پڑھ کر افلوطین، اسپنوزا اور ہیگل کے افکار سے کسی قدر واقفیت حاصل کر لی ہے۔ چونکہ ان حضرات کو یہ علم نہیں ہے کہ شیخ اکبرؒ نے نہ افلوطین سے استفادہ کیا نہ شنکر کا مطالعہ کیا۔ بلکہ قرآن و حدیث سے یہ عقیدہ مستنبط کیا ہے۔ اس لیے یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ شیخ اکبرؒ نے بھی (PANTHEISM) کی تعلیم دی ہے حالانکہ اسپنوزا اور ہیگل کے نظریہ وحدت الوجود اور شیخ اکبرؒ کے نظریۂ وحدت الوجود کی تعبیر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ [1]

---

[1] ہاں یہ صحیح ہے کہ شری شنکر اور شیخ اکبرؒ کے خیالات میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن شیخ سنسکرت سے بیگانہ تھے اس لیے شنکر کے فلسفیانہ افکار سے استفادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ:-

"صداقت ہر زمانہ میں اور ہر جگہ ایک ہی ہے صرف تعبیر کا فرق ہے۔"

(حسنک واحد و عباراتنا شتیٰ)

تیسرا اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نظریۂ وحدت الوجود کو بعض ایسے شعرا نے بھی موضوعِ سخن بنا لیا جو اس کوچہ سے بیگانہ تھے یعنی جنہوں نے اس دقیق فلسفہ کا بامعانِ نظر مطالعہ نہیں کیا تھا۔

بعض شعرا اس کے اسرار سے تو آگاہ تھے مگر بحر، وزن اور قافیہ کی پابندی کی وجہ سے انہوں نے اس کو مجمل طور پر پیش کیا۔ اجمال سے ابہام اور ابہام سے غلط فہمیوں کا دروازہ کھل گیا۔ مثلاً

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

غالباً مولانا شبلی نے اسی شعر کو مدِنظر رکھ کر یہ بات لکھ دی کہ "جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے" یہاں بھی شاعر نے یہی لکھا ہے کہ

"ہر ذرہ عین اوست"

اگرچہ اس نے دوسرے مصرع میں غلط فہمی کے ازالہ کی کوشش کی ہے مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ شاعر کا مطلب دراصل یہ ہے :۔

"تقریرِ مسئلہ وحدت الوجود خیلے مشکل حکایتے است، اگرچہ بحسب الوجود، ہر ذرہ عین اوست۔" الخ

یہاں بھی شاعر "بحسب الوجود" کی ترکیب داخل مصرع نہ کر سکا، اس لیے ایک مبتدی یا فلسفۂ وحدت الوجود سے ناآشنا یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ ہر ذرہ عین اوست تو پھر اس کائنات میں ہر شئی خدا ہے۔

حالانکہ یہ عینیت صرف وجود کے اعتبار سے ہے۔ ذاتِ شئی کے اعتبار سے غیریت ہے اس لیے کوئی شئی خدا نہیں ہے۔

جبتک تعینات کا پردہ پڑا ہوا ہے کوئی شئی خدا نہیں ہے کیونکہ جو نہیں

سکتی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

(و) ہر تعین ایک گونہ تقید ہے یعنی ہر متعین شئ مقید ہو جاتی ہے۔

(ب) خدا ہر قید سے بری ہے، یعنی مطلق ہے۔

(ج) مقید اور مطلق میں تباین ہے۔

اس لیے ذاتِ حق اور ذواتِ اشیاء میں غیریت (تباین) ہے۔ یعنی کسی شئ کو خدا نہیں کہہ سکتے۔ اب پڑھو اس مصرع کو:

ع اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وجود کے اعتبار سے ہر شئ عین خدا ہے مگر ذات کے اعتبار سے ہر شئ غیر خدا ہے اس لیے کسی شئ کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے کہ وہ شئ خدا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس شعر کے پڑھنے والوں میں کتنے لوگ فلسفۂ وحدت الوجود سے واقف ہیں جو اس کو پڑھتے وقت اس نکتہ کو ملحوظ رکھیں گے؟

یہ دشواری تو ان شعراء کے کلام کو پڑھتے وقت لاحق ہوتی ہے جو اس فلسفہ سے آگاہ ہیں۔ بعض شعرا ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس فلسفہ کا بطور خود مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن محض "آرائش کلام" کے لیے بعض اشعار میں اس فلسفہ کو نظم کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پڑھنے والے غلط فہمی ہی میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ خود وحدت الوجود کا فلسفہ ان کی نادانی کی وجہ سے موردِ اعتراضات بن گیا۔ مثلاً

کرشمہ سازی حسن ازل، ارے توبہ
مرا ہی آئینہ مجھ کو دکھا کے لوٹ لیا

اس شعر میں شاعر نے بزعم خویش، وحدت الوجود کا فلسفہ بیان کیا ہے مگر لاعلمی کی وجہ سے آئینہ کو اپنی طرف مضاف کر لیا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ دو ہستیاں موجود ہو گئیں :۔

(۱) ایک ہستی وہ جس کی طرف آئینہ مضاف ہے۔

جب شاعر نے کہا "میرا آئینہ" تو گویا اس نے اپنے وجود کا اثبات کر دیا۔

(۲) دوسری ہستی وہ جس نے آئینہ دکھایا۔

لیکن لاموجود الا اللہ کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسری کوئی ہستی موجود بالذات نہیں ہے۔ چونکہ شاعر نے دو ہستیوں کا اثبات کر دیا اس لیے اس نے نادانستہ طور پر وحدت وجود کے بجائے اتحادِ وجود کی تعلیم دی اور وحدت الوجود اور اتحاد الوجود میں زمین و آسمان کا فرق ہے اگر شاعر وحدت الوجود سے آگاہ ہوتا تو "میرا ہی آئینہ" کبھی ہرگز نہ کہتا۔

اسی غلطی کا اعادہ اس شعر میں بھی کیا ہے :۔

نقاب حسن دو عالم اٹھائی جاتی ہے
مجھی کو میری تجلی دکھائی جاتی ہے

یہ وضاحت میں نے اس لیے کی کہ ناظرین کو اس حقیقت سے آگاہی ہو جائے کہ اگرچہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" لیکن ہر شاعر وحدت الوجود کا فلسفہ نظم نہیں کر سکتا۔

ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہی حال ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اس فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا، لیکن اس کی توجیہہ پر کمربستہ ہو گئے۔ مثلاً پروفیسر ممتاز حسین صاحب اپنی تالیف

"انتخاب غالب" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :۔

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیا عدم سے کوئی شئ وجود میں آسکتی ہے کہ نہیں ؟ وحدت الوجودیوں کا خیال ہے کہ نہیں۔ اسی لیے وہ مانند یونانیوں کے مادہ کو بھی اتنا ہی قدیم تصور کرتے ہیں جتنا کہ حق کو"
(انتخاب غالب صہ ۳۹)

اس عبارت میں پروفیسر صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ قائلین وحدت الوجود، خدا (حق) اور مادہ دونوں کو قدیم تصور کرتے ہیں! یہ عبارت اُن حضرات پر ایک بہتان عظیم ہی نہیں ہے بلکہ مستلزم اجتماع ضدین بھی ہے۔

اولاً یہ کہ جہاں تک میں نے ان حضرات کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے میں علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ شیخ اکبرؒ سے کر مولانا فضل حق خیر آبادیؒ تک کسی نے بھی یہ مہمل بات نہیں کہی ہے۔

ثانیاً ؛ کہ اگر کوئی قائل وحدت الوجود ایسی بات کا اقرار کرے تو وہ خود اپنے مسلک کا ابطال کر دے گا کیونکہ اس مسلک کی رُو سے دوسری تو کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے، تا بہ قدامت او چہ رسد ؟

دوسری ہستی کے قدیم ہونے کا سوال تو اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس دوسری ہستی کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔

پروفیسر صاحب نے یہ غلط بیانی محض اس لیے کی کہ نہ انہوں نے فتوحاتِ مکیہ کا مطالعہ کیا نہ فصوص الحکم کا اور نہ اس فن کو کسی ماہر سے حاصل کیا۔

پروفیسر صاحب اور ان کے ہمنیالوں کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "وحدت الوجودیوں" کو قدامتِ مادہ کا قائل قرار دینا اتنا ہی غلط ہے جتنا دہریوں کو "ہستی باری تعالیٰ" کا معترف قرار دینا !

قائلین حدوث عالم کے لیے وحدت الوجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے

جو لوگ خدا کے ساتھ روح اور مادہ کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں ان کے لیے تو یہ بات عقلاً ممکن ہے کہ وہ کائنات (ماسوی اللہ) کے وجود کو بھی حقیقی قرار دیں بلکہ وہ خدا کے وجود کا بھی انکار کر سکتے ہیں جیسا کہ ہندوؤں میں سانکھ درشن کے پیرو یا جین دہرم کے پیرو، خالق کائنات (خدا) کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ حدوثِ عالم کے قائل ہیں ان کے لیے ازروئے عقل، وحدت الوجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

چنانچہ مولانا شبلی نعمانی اپنی تالیف سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:۔

"وحدت الوجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور اہل ظاہر کے نزدیک تو اس کے قائل کا وہی صلہ ہے جو منصور کو دار پر ملا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے پہلے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہیے:۔

(۱) خدا قدیم ہے۔

(۲) قدیم حادث کی علت نہیں ہو سکتا، کیونکہ علت اور معلول کا وجود ایک ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر علت قدیم ہو گی تو معلوم بھی قدیم ہو گا۔

(۳) عالم، حادث ہے۔ اس لیے خدا، عالم کی علت نہیں ہو سکتا۔

(دیکھو مقدمہ ۲)

اس اعتراض سے بچنے کے لیے اہل ظاہر نے یہ پہلو اختیار کیا کہ خدا کا ارادہ یا اس ارادہ کا تعلق حادث ہے۔ اس لیے وہ عالم کی علت ہے۔ لیکن سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے ارادہ کے تعلق کی کیا علت ہے۔ کیونکہ جب

ارادہ یا اس کا تعلق حادث ہے تو وہ ضرور کسی علت کا محتاج ہوگا اور ضروری ہے کہ یہ علت بھی حادث ہو کیونکہ حادث کی علت، حادث ہی ہوتی ہے چونکہ یہ علت حادث ہے تو اس کے لیے بھی علت کی ضرورت ہوگی۔ اب اگر یہ سلسلہ الیٰ غیر النہایہ چلا جائے تو غیر متناہی کا وجود لازم آئے گا۔ جس سے متکلمین اور ارباب ظاہر دونوں کو انکار ہے اور اگر یہ سلسلہ کسی علت پر ختم ہو تو ضرور ہے کہ وہ علت قدیم ہو ورنہ پھر سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اور قدیم ہونے کی صورت میں لازم آئے گا کہ قدیم کسی حادث کی علت ہو جائے اور یہ بات پہلے ہی باطل ثابت ہو چکی ہے۔ اس لیے تین صورتوں سے چارہ نہیں ہے۔

(ا) یا تو یہ مانو کہ عالم قدیم ہے، اس کے باوجود خدا کا پیدا کردہ ہے لیکن جب خدا کے ساتھ عالم بھی قدیم ہے تو ازلی چیزوں میں سے ایک کو علت اور دوسری کو معلول قرار دینا ترجیح بلا مرجح کا مصداق ہے۔

علاوہ بریں یہ تو مشائین (پیروانِ ارسطو) اور بعض ہندو حکماء کا مذہب ہے۔ مسلمان متکلمین تو عالم کو حادث قرار دیتے ہیں وہ کس طرح اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر سکتے ہیں۔

(ب) یا یہ تسلیم کرو کہ عالم قدیم ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔ یہ مادہ پرستوں اور دہریوں کا مذہب ہے۔ مسلمان اسے کیسے تسلیم کر سکتے ہیں!

(ج) آخری صورت یہ رہ گئی کہ عالم قدیم ہے لیکن وہ ذات باری سے علیحدہ نہیں ہے بلکہ ذات باری ہی کے مظاہر کا نام عالم ہے (جلوۂ ذات کا دوسرا نام عالم ہے) حضرات صوفیہ کا یہی مذہب ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ کیونکہ تمام مشکلات کی بنیاد یہ ہے کہ عالم اور خالق عالم، دو جدا گانہ

چیزیں ہیں اور اُن میں علت و معلول کا رشتہ ہے۔ غرض فلسفہ کی رُو سے تو صوفیہ کے مذہب کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ البتہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوص قرآنی اس کے خلاف ہیں۔ لیکن یہ شبہ بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی آیات بکثرت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اول و آخر، ظاہر و باطن، جو کچھ ہے خدا ہی ہے (کما قال اللہ تعالیٰ :-)

هو الاول والاٰخر والظاهر والباطن وهو بكل شیءٍ عليم ه (۵۷-۳)

وہی ذاتِ حق ہر شئی کا اول ہے وہی ہر شئی کا آخر ہے، وہی ہر شئی کا ظاہر ہے (ہر شئے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے) اور وہی ہر شئی کا باطن ہے اور وہ ذات پاک ہر شئی کا علم رکھتی ہے (کوئی شئی اس کے احاطہ علمی سے باہر نہیں ہے)

نوٹ :- مولانا نے بنظر اختصار صرف ایک آیت پر اکتفا کیا ہے۔ ناظرین کی آگاہی کے لیے ذیل میں مزید آیات درج کی جاتی ہیں۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی لکھتے ہیں " اللہ کی وحدانیت کے دو معنیٰ ہیں۔ علماء ظاہر کے نزدیک وحدانیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ معبود صرف ایک ہے، دوسرا کوئی معبود نہیں ہے۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک معنی یہ ہیں کہ موجود صرف ایک ہے، دوسرا کوئی موجود نہیں ہے۔ آیاتِ قرآنی میں دونوں قسم کی آیات کا ذکر موجود ہے۔ منجملہ ان آیات کے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صرف ایک ذات حق موجود ہے۔

پہلی آیت یہ ہے :- فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ه

پس تم جس طرف رُخ کرو، وہیں اللہ کی ذات موجود ہے

دوسری آیت :- وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى

(اے رسولؐ) جب آپؐ نے کنکریاں پھینکیں تو آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں۔

تیسری آیت :- كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ

اللہ کی ذات کے سوا ہر شی ہالک ہے یعنی بالفعل معرض فنا میں ہے امام غزالیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ہالک اسم فاعل ہے اور اسم فاعل میں زمانہ نہیں پایا جاتا۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شئی زمانۂ آئندہ میں فنا ہو گی، بلکہ اس وقت بھی معرض فنا میں ہے۔ یعنی دراصل ذاتِ حق کے علاوہ کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

چوتھی آیت :- اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ ہی نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ (نور کا معنی ہے وہ شئی جو بذاتِ خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کر دے) یعنی اللہ ہی اس کائنات کی حقیقت ہے۔

پانچویں آیت :- اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ٥

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہی ہر شئی کا احاطہ کرنے والا ہے۔

چھٹی آیت :- وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ

اور وہ (اللہ) تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔

ساتویں آیت :- نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

ہم انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

آٹھویں آیت :- مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَمَا كَانُوْا

نہیں ہوتی ہے کوئی سرگوشی (خفیہ بات) تین شخصوں میں مگر یہ کہ اللہ کے درمیان چوتھا ہوتا ہے۔ اور نہیں ہوتی کوئی سرگوشی پانچ آدمیوں میں مگر یہ کہ اللہ ان کے درمیان چھٹا ہوتا ہے۔ خواہ لوگ کم ہوں یا زیادہ۔ اللہ ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوا)۔

نویں آیت :- لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا اِلٰہ (واجب الوجود) بھی ہوتا تو زمین و آسمان دونوں تباہ و برباد ہو جاتے۔

دسویں آیت :- لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

اُس اللہ کے علاوہ (کائنات میں) اور کوئی دوسرا اللہ نہیں ہے۔ (ترجمہ فتاوائے عزیزیہ جلد دوم ص۵۸ تا ص۶۲)

نیز شاہ صاحبؒ اسی جلد کے ص۲۴۰ میں یوں فرماتے ہیں :-

"جاننا چاہیے کہ وحدت الوجود کا قائل ہونا اس طور پر کہ احکام شرع کے خلاف نہ ہو عین ایمان و اسلام ہے۔ اس میں کفر کا شائبہ بھی نہیں ہے یعنی تمام موجودات کو مظاہر حق جانے اور یہ سمجھے کہ وجود ایک ہے (یعنی وجود حضرت اللہ کے لیے ثابت ہے) لیکن وجود کے ہر مرتبہ کے لیے جداگانہ حکم ہے۔ مثلاً وجود بعض مراتب میں عبدیت کے ساتھ موصوف ہے اور بعض مراتب میں الوہیت کے ساتھ۔ بعض مراتب میں حرام کے ساتھ موصوف ہے اور بعض مراتب میں حلال کے ساتھ۔ بعض مراتب میں طاہر کے ساتھ موصوف ہے اور بعض مراتب میں نجس کے ساتھ۔ یعنی وجود کے مراتب میں خلط نہ کرے اور یہ عقیدہ رکھے :-

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر حفظِ مراتب نکنی، زندیقی (جامیؒ)

میرا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب قبلہؒ کی ان تصریحات کے بعد کسی کو اس بات میں شک باقی نہیں رہ سکتا کہ وحدت الوجود کا عقیدہ قرآن مجید سے ثابت ہے۔ بشرطیکہ اس کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ نصوص قرآنیہ کے خلاف نہ ہو۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مفہوم

مناسب ہے کہ وحدت الوجود کی تشریح سے پہلے اس نکتہ کی وضاحت کر دوں کہ لا الٰہ الا اللّٰہ یا لا الٰہ الا ھُو سے وحدت الوجود کس طرح مستنبط ہوتی ہے اس کے بعد ناظرین کی سمجھ میں یہ بات بآسانی آجائے گی کہ حضرات صوفیہ لا الٰہ الا اللّٰہ سے لا موجود الا اللّٰہ کیوں مراد لیتے ہیں۔ علاوہ بریں خود مسئلہ وحدت الوجود کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

(۱) واضح ہو کہ کلمۂ لا اِلٰہ الا اللّٰہ میں دو لفظ قابل غور ہیں۔ (ا) اِلٰہ (ب) اللّٰہ۔ ترجمہ اس کلمہ کا یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ نہیں ہے۔ یعنی ساری کائنات میں ایک ہی ہستی اِلٰہ ہے اور اس کا نام اللّٰہ ہے۔

(۲) جس ہستی کو حکماء اپنی اصطلاح میں واجب لذاتہٖ یا واجب الوجود کہتے ہیں، قرآن اُسے اپنی اصطلاح میں اِلٰہ سے تعبیر کرتا ہے اور اُس کا نام اللّٰہ رکھتا ہے۔

(۳) اِلٰہ وہ ہے جو واجب الوجود ہو۔

اللّٰہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔

یعنی اللّٰہ کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں ہے۔

(۴) واجب الوجود اسے کہتے ہیں جو از خود موجود ہو۔ جس کا ہونا ضروری ہو اور نہ ہونا محال ہو۔ جس کا وجود خانہ زاد ہو یعنی جسے کسی غیر نے وجود عطا نہ کیا ہو

جو اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو۔ جس کا وجود مستقل بالذات اور حقیقی ہو۔

(۵) چونکہ واجب کا وجود ذاتی ہوتا ہے اس لیے اس کے کمالات بھی ذاتی ہوں گے۔ یعنی وہ غنیؔ ہوگا۔ اُسے کسی اعتبار سے بھی غیر کی احتیاج نہیں ہوگی۔ احتیاج تو عند الحکماء منافیٔ وجوب ہے۔

(۶) وجوب وجود کی بنا پر واجب الوجود میں حسب ذیل صفات کا پایا جانا لازمی ہے:۔

(ا) واجب کی ذات میں وحدت لازمی ہے کیونکہ ترکیب مستلزم حدوث ہے اور حادث تو ممکن ہوتا ہے اور ممکن واجب کی ضد ہے۔

(ب) واجب میں ذات، حقیقت، وجود، تعین، تشخص اور وجوب سب ایک دوسرے کا عین ہوں گے اُن میں کوئی مغائرت نہیں ہوگی کیونکہ مغائرت سے ترکیب لازم آتی ہے اور ترکیب مستلزم حدوث ہے۔

(ج) واجب الوجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی تعدد وجیا، عقلاً محال ہے۔ اگر دو ہستیوں کو واجب تسلیم کیا جائے تو ان میں وجوب تو مابہ الاشتراک ہوگا۔ اور دونوں میں کوئی شیٔ ایسی بھی ہوگی جس کی بنا پر ایک دوسرے سے متمیز ہو سکے۔ لہذا دونوں واجب، مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز سے مرکب ہو گئے اور ہر مرکب حادث ہوتا ہے اور حدوث منافیٔ وجوب ہے۔

(د) واجب الوجود ہر جہت اور ہر اعتبار سے واجب ہوتا ہے یعنی وہ اپنے کمالات وجود میں کسی غیر کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کی ذات ہی اُس کے کمالات کا منبع ہوتی ہے۔

(ہ) بالفاظِ واضح تر، واجب الوجود، بتقاضائے ذات، قادرِ مطلق، خیرِ مطلق، عالم الغیب والشہادۃ، ہمہ جا حاضر و ناظر، فعال لما یرید، علیٰ کُلِّ شیئٍ

شہید، صاحب مشیت کاملہ و مطلقہ، صاحب اقتدار کامل و مطلق، جواد، کریم، غفورٌ رحیم، علیمٌ بذات الصدور، خالق، صانع، مبدع، فاطر، رب، رحمٰن، رحیم، مالکِ یوم الدین، رازق، باسط، حاکم اور حکیم علی الاطلاق ہوتا ہے

(و) دلیل عقلی اس پر یہ ہے کہ اگر کمالات وجود اور صفات محمود میں سے کوئی کمال یا کوئی صفت اس میں نہ پائی جا سکے تو وہ ناقص ہو جائے گا اور نقص مستلزم ضعف و عجز و احتیاج ہے اور عجز و احتیاج منافی وجوب ہے۔

(ز) اگر ناظرین قرآن حکیم کا مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ جتنے کمالات اور جس قدر صفات حکماء نے واجب الوجود سے منسوب کی ہیں وہی صفات، الکتاب نے اللہ سے منسوب کی ہیں۔ بطور نمونہ چند آیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

یا ایہا الناس انتم الفقرآء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید

اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی اور حمید ہے یعنی کسی کا محتاج نہیں ہے۔

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوئیں:۔

(ا) اللہ تو غنی اور حمید ہے یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں واجب لذاتہٖ ہے۔

(ب) انسان (کائنات) محتاج الی اللہ ہے یعنی کائنات کی ہر شی اللہ کی محتاج ہے۔ یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں ممکن الوجود (مجمع عیوب و نقائص) ہے

اللہ لا الٰہ الا ھو ج الحی القیوم ج لا تاخذہٗ سِنۃٌ و لا نوم ط لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض ط

اللہ وہ ہے کہ ساری کائنات میں اس کے سوا کوئی اِلٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے یعنی اس کی الوہیت کا اقتضاء یہ ہے کہ:۔

(ا) وہ خود بخود زندہ ہے اور ساری کائنات اسی کے سہارے سے قائم ہے
(ب) اگر وہ نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی۔
(ج) اُسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ یعنی وہ تمام مادی اور جسمانی نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔
(د) ساری کائنات اس کی خادم، مطیع، مملوک اور فرمانبردار ہے۔

قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ

آپ اعلان کر دیں کہ اللہ ہی ساری چیزوں کا خالق ہے اور وہ واحد لاشریک ہے اور تمام کائنات پر قابض اور متصرف ہے۔

ذَالِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ھُوَ الْبَاطِلُ ط

یہ اس لیے کہ بلاشبہ اللہ ہی الحق ہے اور (یہ کافر) اس کے سوا جس شئی کو بھی اِلٰہ سمجھ کر پکارتے ہیں وہ باعتبار ذاتِ خویش باطل (غیر حقیقی) ہے
اس آیت سے ثابت ہوا کہ

(ا) ساری کائنات میں صرف اللہ ہی الحق ہے۔ یعنی وہی ایک ذات ہے جو واجب الوجود، از خود موجود، مستقل بالذات، ازلی ابدی، قائم بنفسہٖ اور مطلق ہے۔ الحق سے مراد ہے وہ ہستی جو فی الحقیقت موجود ہو، جس کا وجود ثابت و قائم و دائم ہو جو کسی کے مٹائے مٹ نہ سکے۔ جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ موجود رہے یعنی (REAL)۔

(ب) ہر وہ شئی جسے لوگ اِلٰہ سمجھ کر پکارتے ہیں فی نفسہٖ اور بنفسہٖ باطل ہے۔ اور چونکہ انسانوں نے اپنی جہالت (اَوْدِیا) کی وجہ سے ہر شئی کو اِلٰہ سمجھ کر پکارا ہے۔ اس لیے ہر شئی باطل ہے۔

چونکہ باطل ضد ہے حق کی اس لیے باطل کا مطلب ہے وہ شی جس کا وجود غیر حقیقی ہو، مٹ جانے والا ہو، ناقص ہو، عارضی ہو، فانی ہو، محض نمود بے بود ہو، جس کی حقیقت نہ ہو۔ یعنی جو بذاتِ خود قائم نہ ہو، جسے ثبات و دوام نہ ہو، جو حادث ہو، بالفاظِ دگر موہوم ہو۔

فی الجملہ اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اللہ حق ہے، ماسوی اللہ باطل ہے۔ اسی کو فلسفہ کی اصطلاح میں یوں کہیں گے کہ اللہ واجب الوجود ہے ماسوی ممکن الوجود ہے جس طرح باطل حق کی ضد ہے۔ اسی طرح ممکن، واجب کی ضد ہے۔

یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی اِلٰہ یا واجب نہیں ہے۔ اور جب اللہ ہی اِلٰہ ہے، الحق ہے، واجب الوجود ہے۔ اس کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں ہے تو ساری کائنات یقیناً ممکن الوجود ہے جسے فلسفہ میں ممکن الوجود کہتے ہیں قرآن اسے مخلوق کہتا ہے۔ اور اس کی وہی تعریف کرتا ہے جو حکماء نے ممکن کی بیان ہے۔ ممکن وہ ہے جس کا وجود ذاتی نہ ہو، جس کی حقیقت وجود نہ ہو بلکہ عدم ہو، جس کا وجود، کسی دوسرے پر موقوف ہو۔ جو کسی (واجب) کے موجود کرنے سے موجود ہو گیا ہو۔

اللہ واجب ہے اُس کی ذات کا تقاضا وجود ہے۔ ماسویٰ اللہ ممکن ہے اس کی ذات کا تقاضا عدم ہے۔ اسی لیے قرآن نے اللہ کو حق اور ماسویٰ اللہ کو باطل قرار دیا ہے [1]

---

[1] بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن
تیغِ لا موجود الا ھو بزن

قرآن کی رو سے ماسوی اللہ چونکہ مخلوق ہے، بذاتہٖ معدوم ہے، اس لیے واجب (الحق) کا محتاج ہے۔ یعنی ممکن الوجود ہے۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

کیا کوئی اور خالق بھی ہے اللہ کے سوا؟ اللہ ہی تم کو آسمانوں اور زمین میں سے رزق دیتا ہے۔ یاد رکھو اس کے سوا کوئی الٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے

اس آیت شریفہ سے ثابت ہوا کہ

(ا) اللہ کے سوا کوئی ہستی اس ساری کائنات میں، خالق نہیں ہے۔

(ب) اللہ کے سوا کوئی ہستی رازق نہیں ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی اِلٰہ نہیں ہے۔

واجب اور ممکن کی تشریح کے بعد اب آخری بات یہ لکھتا ہوں کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ واجب کی حقیقت وجود ہے اور ممکن کی حقیقت عدم ہے تو اب یہ سمجھو کہ جس کی حقیقت عدم ہے۔ جب واجب اسے موجود کرتا ہے یعنی خلعت وجود عطا کرتا ہے تو اس کا وجود محض عارضی یا ظلی یا مجازی یا اعتباری یا وہمی ہوتا ہے۔ بروئے حقیقت وجود کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ اس کا وجود کیا ہے؛ محض ظلی یا موہوم۔ کوئی ممکن حقیقی معنیٰ میں موجود نہیں ہوتا کیونکہ ہو نہیں سکتا۔ حقیقی معنیٰ میں صرف اللہ ہی موجود ہے۔ جیسے قرآن اللہ کہتا ہے۔ ارباب تصوف اسی صداقت کو جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں بیان ہوئی ہے اپنی اصطلاح میں یوں کہتے ہیں:۔

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ

خلاصۂ کلام اینکہ :-

لا اِلٰہ الا اللہ کا مطلب ہے :-

(ا) لا واجب الوجود الا اللہ یعنی

(ب) لا موجود فی الحقیقۃ الا اللہ یعنی

(ج) لا موجود الا اللہ

اب ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ غالب نے اپنے خط میں یہ بات کیوں لکھی کہ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا اِلٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں" ؟ یا یہ کہ "حقیقت ایک نامہ سربستہ ہے جس کے عنوان پر لکھا ہے لا مؤثر فی الوجود الا اللہ، اور خط میں لکھا ہے۔ لا موجود الا اللہ ؟

وحدتُ الوجود کی تعریف

لغوی معنیٰ تو یہ ہیں کہ وجود، واحد ہے۔ منطقی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ وجود، جزئی حقیقی ہے کلی مشکک نہیں ہے۔ بالفاظِ دگر، وجود، فردِ واحد میں منحصر ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں مراد اس سے یہ ہے کہ فرش سے لے کر عرش تک ایک وجود باری تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ تمامی تعینات عالم فرش سے عرش تک، خواہ محسوس ہوں خواہ معقول، مثل امواج و حباب، اس بحرِ وجودِ حق سے منتزع ہیں اور اعتبارات و موہوماتِ محض ہیں بایں طور کہ خارج میں ان کے لیے وجودِ حق کے سوا اور کوئی وجود نہیں ہے۔ کما قال شیخ اکبرؒ

"الحق محسوسٌ والخلق معقولٌ"

یعنی عوام اپنی کم فہمی کے باعث، حق کو معقول اور خلق کو محسوس سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ محسوس ہے اور جملہ مخلوقات معقول ہیں۔

ہمہ اوست کی تعریف

حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ صفات اور افعال اور آثار کا وجود اور ظہور، بدونِ ذات ممکن نہیں ہے۔ اور یہ سب کبھی کسی حال میں ذات سے جدا نہیں ہیں یعنی ہر صفت اور ہر فعل اور ہر اثر میں ذاتِ حق جلوہ گر اور کارفرما ہے، اگرچہ یہ جلوہ گری بلا ظرفیت ہے اور بدونِ ذات کسی صفت یا فعل یا اثر کی نمود نہیں ہے۔ اس لیے صفات، افعال اور آثار کا وجود، ازروئے حقیقت، عین وجود حق ہے

مرشد رومیؒ نے اس رباعی میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے:۔

ما ہے کہ نہ زیر و نے بہ بالاست کجاست ❊ جانے کہ نے بے ماو نہ باماست کجاست
اینجا آنجا مگو بگو راست کجاست ❊ عالم ہمہ اوست آنکہ بیناست کجاست

عارف جامیؒ نے اسی صداقت کو یوں بیان کیا ہے:۔

ہمسایہ و ہم نشین و ہمرہ ہمہ اوست ❊ در دلق گدا و اطلس شاہ ہمہ اوست
در انجمن فرق و نہانخانۂ جمع ❊ باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

مسلک شیخ اکبرؒ متعلق وجود

واضح ہو کہ شیخ اکبرؒ اپنے فلسفہ کی ابتداء وجود کی بحث سے کرتے ہیں۔ ذیل میں اس بحث کا خلاصہ درج کرتا ہوں:۔

(۱) لفظ وجود کو دو معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے:۔

(ا) وجود کا ایک تو مصدری مفہوم ہے جس کا ترجمہ بودن، ہستی یا ہونے سے کیا جاتا ہے۔ یہ مصدری مفہوم تمام مفاہیم مصدریہ کی طرح ایک اعتباری مفہوم ہے اور ان معقولات ثانیہ میں سے ہے جو ظرف خارج میں منشا کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہاں تصور ذہنی کے اعتبار سے اشیاء کو عارض ہوتا ہے۔ حکماء اور متکلمین نے اسی مفہوم مصدری کے پیش نظر، وجود کو اعتباری قرار دیا ہے۔

(ب) وجود کا دوسرا مفہوم وہ حقیقت ہے جو بذاتِ خود یعنی بلا احتیاج و افتقار، بلا حلول و قیام، بلا مکان و زمان موجود ہے۔ اور اس کا وجود عینِ ذات ہے۔ یعنی حکماء کی اصطلاح میں وہ وجود، واجب الذاتہ ہے اور تمام موجوداتِ خارجیہ اسی کی وجہ سے اور اسی کی جانب انتساب کی بدولت موجود ہیں۔ یعنی ممکنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ عکس یا ظل ہے، اس وجود حقیقی کا جو حق تعالیٰ میں منحصر ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وجود اصل ہے اور تمام ماہیاتِ اشیاء اس کے عوارض ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ وجود کے دو معنی ہیں:۔

(ا) وجود بالمعنی مصدری یعنی بودن یا ہونا۔ جب ہم یہ لفظ بولتے ہیں تو ہمارے ذہن میں وجود یا ہستی کا ایسا تصور پیدا ہوتا ہے جس کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے یعنی جس کا مصداق خارج میں کہیں موجود نہیں ہے۔

(ب) وجود بمعنی موجود یعنی وہ شئی جو قائم بالذات ہے یا در حقیقت موجود ہے۔

وجود سے کیا مراد ہے

مسئلہ وجود میں شیخ اکبرؒ نے پہلی بحث یہ کی ہے کہ وجود سے کیا مراد ہے یعنی جب ہم یہ لفظ بولتے ہیں تو اس سے کیا سمجھتے ہیں:۔

(ا) ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ وجود ایک بدیہی حقیقت ہے۔ یعنی اس کے اثبات کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ وجود کا ادراک ہر شخص کرتا ہے۔ مگر اس کی شدتِ بداہت نے لوگوں کو مبہوت کر دیا ہے۔

(ب) دوسرا گروہ اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ وجود اس قدر نظری ہے کہ

عقل کی دسترس سے بالاتر ہے اس کی حقیقت کا سمجھنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

(ج) تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اگرچہ وجود نظری ہے مگر کسب و اکتساب سے حاصل ہو سکتا ہے۔

شیخ اکبرؒ کا نظریہ یہ ہے کہ وجود بدیہی ہے اس میں کوئی خفا نہیں ہے جو کچھ خفاء نظر آتا ہے وہ ہماری نظر کی کمزوری ہے۔ مثلاً آفتاب کی روشنی واضح ہے لیکن دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہ خیرگی آفتاب نے پیدا نہیں کی، ہماری نظر کا فتور ہے۔ اسی طرح وجود ایک بین حقیقت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج یہ وجود، یہ تمام کارخانۂ قدرت جو نظر آتا ہے ہرگز موجود نہ ہوتا۔

ہر نظری کی انتہا جب اُسے حاصل کرنا چاہیں وجود ہی ہوتی ہے۔ غور و فکر کا آخری نتیجہ عدم نہیں ہوتا بلکہ وجود ہوتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ ہر فکر و نظر کی ابتدا بھی وجود ہے اور انتہا بھی وجود ہے۔ لہذا جو شئی نظر کی حرکت کا مبداء اور منتہا قرار پائے، ضروری ہے کہ بدیہی ہو، نظری نہ ہو۔

اس کے بعد شیخ اکبرؒ نے ان حکماء کے خیالات کا رد کیا ہے جو وجود کو غریق فی النظریۃ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ یہ گروہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ انواع پر جو خاص آثار مرتب ہوتے ہیں ان کا منشاء صورت نوعیہ ہے، اور یہی صورتِ نوعیہ، حرکاتِ طبیعہ کا مبدا ہوتی ہے اور روح، مبداء حرکات ارادیہ اور منشاء شعور و ادراک ہے۔ نیز یہ کہ موجودات میں صورتِ نوعیہ کارفرما ہے جو ارادی اور شعوری حرکات کا سرچشمہ ہے۔ لیکن یہ گروہ صورتِ نوعیہ میں اس قدر منہمک ہو گیا ہے کہ اسے روح اکبر یا صفیض الارواح (حق تعا) کا ادراک

نہیں ہوتا۔ اسی لیے عاجز ہو کر رہ گیا۔ اگر اس گروہ کے افراد مجاہدات کی بدولت حجابات اٹھا سکتے یعنی روح کو دیکھ لیتے تو وجود کو نظری نہ کہتے۔

وجود کیا ہے

دوسری بحث یہ اٹھائی ہے کہ وجود کیا ہے؟ اس کی تعبیر کیا ہے؟ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ وجود، موجودات میں مشترک ہے یا نہیں؟ اشتراک سے ان کی مراد یہ ہے کہ

(ا) کیا وجود ایک کلّی طبعی ہے اور تمام موجودات اس کلّی کے افراد ہیں؟

(ب) یا یہ کہ وجود کو ایک لفظِ مشترک قرار دیا جائے جس کے بہت سے معانی ہیں اور ہر وہ شئی جس پر آثار وجود مرتب ہو رہے ہیں، جداگانہ حقیقت رکھتی ہے؟

(ج) یا وجود کو ایک معین شئی مانا جائے اور تسلیم کیا جائے کہ دنیا میں جس "قدر امتیازات ہیں وہ سب وجود معین ہی کے تعینات ہیں یعنی وجود جزئی حقیقی ہے؟

اس موضوع پر انہوں نے طویل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(ا) اگر وجود کو ایک کلی تصور کیا جائے تو وجود لازماً لا وجود ہو جائے گا۔ اس لیے کہ کلی کا وجود بحیثیت کلی، خارج از ذہن متحقق نہیں ہو سکتا۔ یعنی کلی موجود فی الخارج نہیں ہے۔

(ب) اگر وجود کو مشترک لفظی تسلیم کیا جائے اور اس کا اطلاق حقائق مختلفہ پر ایک مشترک لفظ کی حیثیت سے کیا جائے تو یہ کتنی بڑی نا اہلیت ہو گی کہ بے شمار اشیاء کے لیے صرف ایک لفظ بولا جائے۔

(ج) اس لیے وجود یقیناً شی واحد ہے اور معین ہے۔ نہ اس میں ابہام ہے نہ اجمال ہے نہ اشتراک ہے۔ اشتراک اگر ہے تو ایسا ہی جیسا کہ مختلف

آئینوں میں روشنی کا اشتراک ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ وجود ایک حقیقت مبہمہ کی طرح جزئیات میں مشترک ہو۔ کیونکہ وجود دراصل جزئی حقیقی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہم وجود کو کبھی اعتباری مفہوم میں بھی بولتے ہیں۔ جیسے قعود و قیام۔ اس اعتبار سے وجود کو جو چاہو کہو، کلی یا جزئی، اہل حقیقت اسے وجود نہیں کہتے۔ ان کی نظر میں وجود ایک حقیقت واحدہ معینہ ہے جو سرچشمہ ہے تمام آثار کے ترتب کا اور وہ منحصر ہے ایک ذات میں، جسے ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق ایک خاص نام سے موسوم کرتا ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاء اسے اللہ کہتے ہیں دراصل وجود اسی ذات واحد میں منحصر ہے اور یہ کائنات اسی وجود کے آثار و اظلال کا دوسرا نام ہے۔ (ماخوذ از فتوحات مکیہ جلد اول)

خلاصۂ بحث وجود چند لفظوں میں اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ (ا) وجود حقیقی ناقابل تعدد و تکثر ہے۔

(ب) وہ وجود حقیقی، وجود حق میں منحصر ہے۔

(ج) اس کے سوا کوئی شئی حقیقی معنیٰ میں موجود نہیں ہے۔

(د) کثرت ممکنات (کائنات) فریب نظر یا دھوکہ نہیں ہے بلکہ جلوۂ وجود حق ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں شیخ اکبرؒ ہی کے نظریہ کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ کائنات اپنی تفصیل کے اعتبار سے، سالمات مادی کی غیر شعوری حرکت سے لے کر، انسانی انا کی بالارادہ حرکت فکر تک انائے کبیر (حق تعالیٰ) کا جلوۂ ذات ہے۔" (لیکچر سوم ص۱۷)

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا مسلک

حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں:۔
(ا) وجود، حقیقتِ حق سبحانہٗ ہے۔
(ب) اس کے وجود میں کسی شئی کی آمیزش نہیں ہے۔
(ج) وجود حق تعالیٰ ہر خیر و کمال کا منشاء ہے اور ہر حسن و جمال کا مبدا ہے۔
(د) وجود حق تعؔ کلی طبعی نہیں ہے بلکہ جزئی حقیقی ہے۔
(ہ) وجود حق تعؔ بسیط ہے یعنی اس میں اجزاء نہیں ہیں نہ ذہناً نہ خارجاً۔
(و) وجود حق تعؔ کا حمل ذات حق تعؔ پر بالمواطات ہے نہ کہ بالاشتقاق۔
(مکتوب ص۲۳۴ جلد اوّل)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔
(ا) وجود صرف واجب تعؔ ہی کے لیے ثابت ہے۔
(ب) واجب تعؔ کے علاوہ کسی اور شی پر وجود کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔
(ج) ممکن کی ماہیت عدم ہے۔
(د) ممکن کے لیے وجود ثابت کرنا اور خیر و کمال کو اس سے منسوب کرنا دراصل ممکن کو واجب کی ملک اور اس کے ملک میں شریک کرنا ہے۔
(ہ) اگر ممکن کو بھی موجود تسلیم کیا جائے تو شرک فی الوجود لازم آجائے گا۔ لہ

لہ غالب نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

جاروبِ لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
باگردِ فرشِ سینہ بایواں برابر است

(۱) اگر علمائے ظاہر اس نکتہ سے آگاہ ہوتے تو ممکن کے لیے کبھی وجود ثابت نہ کرتے۔ (مکتوب اول جلد ثانی)

کائنات معدوم نہیں بلکہ موجود ہے مگر اُس کا وجود حقیقی نہیں بلکہ ظلّی ہے۔

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں:- اِعْلَمْ اَنَّ الْمَقُوْلَ عَلَیْہِ سِوَی الْحَقِّ اَوْ مُسَمَّی الْعَالَمِ ھُوَ بِالنِّسْبَۃِ اِلَی الْحَقِّ کَالظِّلِّ لِلشَّخْصِ فَھُوَ ظِلُّ اللہِ فَھُوَ عَیْنُ نِسْبَۃِ الْوُجُوْدِ اِلَی الْعَالَمِ لِاَنَّ الظِّلَّ مَوْجُوْدٌ بِلَا شَکٍّ فِی الْحِسِّ۔ الخ۔ (فیض یوسفیہ)

اے طالب حق! اس نکتہ کو سمجھ لے کہ جس چیز پر لفظ ماسوی اللہ صادق آتا ہے یا جس کا نام عالم رکھا جاتا ہے وہ الحق (خدا) کی نسبت سے شخص کے لیے اس کے ظل (سایہ) کی مانند ہے۔ پس یہ عالم حق تعالیٰ کا ظل ہے۔ پس وہ سایہ عین نسبت وجود اضافی کی ہے عالم کی طرف۔ کیونکہ یہ ظل بلا شک علم شہادت میں موجود ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا اتفاق رائے

حضرت مجدد صاحبؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ کائنات کا وجود ظلّی ہے۔ نیز یہ کہ اگرچہ یہ ظل خارج میں موجود ہے مگر اس کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ وہمی ہے۔ یعنی مجدد صاحبؒ کائنات کے وجود کو ظلّی بھی قرار دیتے ہیں اور وہمی بھی (مطلب دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے)

"نزد فقیر، عالم ان عدمات سے عبارت ہے جن میں اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ منعکس ہو گئی ہیں۔ اور خارج میں بایجاد حق تعالیٰ، وہ عدمات، ان عکوس کی بناء پر بوجودِ ظلّی موجود ہو گئے ہیں۔" (مکتوب اول جلد ثانی)

"بود اشیاء باعتبار نمود خیالی ہے۔ لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے اس نمود (کائنات) کو استقرار و ثبات عطا فرما دیا ہے، ناچار اشیائے کائنات کا وجود وہمی اور ثبوت خیالی، نفس الامر ہو گیا ہے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشیاء کا خارج میں نفس الامر کے اعتبار سے وجود ہے بھی اور نہیں بھی۔"

(مکتوب ۴۴ جلد دوم)

میں عالم کو موہوم کہتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عالم میرے وہم کا کرشمہ ہے۔ بلکہ حق تعالیٰ نے اس عالم کو مرتبۂ وہم میں پیدا کیا ہے۔"

(مکتوب ۶۸ جلد سوم)

"یہ عالم، عالم وہم ہے اور یہ صور و اشکال، ممکنات کی صور و اشکال ہیں جنہوں نے قدرتِ خداوندی سے مرتبۂ وہم میں ثبوت پیدا کر لیا ہے" [1]

(مکتوب ۶۷ جلد سوم)

خواص کی غلط فہمی کا سبب علمائے ظاہر کو لفظِ وحدت الوجود سن کر جو وحشت سی ہونے لگتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدت الوجود اور اتحاد الوجود میں جو بیّن فرق ہے، یہ حضرات اسے مدِنظر رکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے، بلکہ ان دونوں لفظوں کو مترادف سمجھ لیتے ہیں اور چونکہ اتحاد الوجود کی بناء پر بہت سے مقاسد کا دروازہ کھل جاتا ہے مثلاً عبادت اور ہدایت، دونوں بے کار ہو جاتی ہیں

---

[1] غالب نے اس شعر میں اسی حقیقت کو نظم کیا ہے:۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستئ اشیاء میرے آگے

اس لیے وہ بجا طور پر لفظِ وحدت الوجود سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔
لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ شیخ اکبرؒ اور شیخ مجددؒ اور ان کے متبعین میں سے کوئی بھی اتحاد الوجود کا قائل نہیں ہے بلکہ بلا استثنائے احدے تمام حضرات اسے الحاد اور زندقہ قرار دیتے ہیں۔ کما قال محمود شبستریؒ:۔

حلول و اتحاد ایں جا محال است
کہ در وحدت دوئی عینِ ضلال است

جملہ حضرات، خواہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہوں یا وحدۃ الشہود کے وجود کو فرد واحد (حق تعؔ) میں منحصر یقین کرتے ہیں اس لیے دوئی یا کثرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور اتحاد کے لیے دوئی (ایک سے زیادہ وجود) کا ہونا شرطِ اولین ہے۔ اس تصریح کے بعد اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علمائے ظاہر کی اس غلط فہمی کا مبنیٰ کیا ہے؟

واضح ہو کہ منطق کی بعض کتابوں میں لفظ اتحاد کی شرح، اس مقام کے اعتبار سے، لفظ وحدت سے کی گئی ہے مثلاً منطق کی مشہور درسی کتاب تہذیب میں، علامہ تفتازانی یوں رقمطراز ہیں:۔

ان اتحد معناہ فمع تشخصہ وضعاً علم

یعنی اگر اسم کا معنی متحد ہو تو اس معنی کے متشخص ہونے کی صورت میں وہ اسم "عَلَم" ہوگا۔

اس کی شرح ملا عبداللہ یزدی (شارح تہذیب) نے یوں کی ہے:۔
اے ان وحد معناہٗ یعنی اگر ایک ہو اس کا معنی تو بر تقدیر تشخص وہ اسم عَلَم ہوگا۔ چونکہ شارح تہذیب نے فقط اتحاد کی شرح، لفظ وحدت سے کی ہے۔ اور ابتدائے زمانہ طالب علمی میں ذہن میں یہ بات مرتکز ہوگئی کہ اتحاد کا

معنی وحدت ہوتا ہے اس لیے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب علمائے ظاہر تصوف کی کتابوں میں وحدت الوجود کا لفظ پڑھتے ہیں تو غیر شعوری طور پر ان کا ذہن اتحاد الوجود کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور چونکہ اتحاد الوجود مستلزم قبائح عقلیہ ومفاسد کثیرہ ہے اس لیے یہ حضرات وحدت الوجود سے بھی متنفر ہو جاتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں قبل ازیں واضح کر چکا ہوں قائلین وحدت الوجود میں سے کوئی شخص بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ حق تعالیٰ اور کائنات دونوں موجود بالذات ہیں یا حق تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسری ہستی بھی در حقیقت موجود ہے۔

جو لوگ شیخ اکبرؒ یا حضرت مجددؒ پر اتحاد یا حلول کا الزام عائد کرتے ہیں انہوں نے یا تو ان بزرگوں کی تصانیف کا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے یا اگر کیا ہے تو ان کے ارشادات (افکار) کو سمجھ نہیں سکے۔

یہ دونوں بزرگ اس بات میں متفق ہیں کہ حق تعالیٰ کے علاوہ کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ اختلاف صرف ممکنات کی حقیقت میں ہے۔

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حقائقِ ممکنات، تجلیاتِ اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ ہیں۔

شیخ مجددؒ فرماتے ہیں کہ حقائقِ ممکنات، عکوس اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ بات تو دونوں بزرگوں نے ایک ہی کہی ہے مگر طرزِ تعبیر مختلف ہے۔ ان تصریحات کے بعد اب میں وحدت الوجود کی تشریح ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

مسلکِ وحدتُ الوجُود کی تشریح

(۱) تصوف اسلامی کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ خالق اور مخلوق میں مغائرت ہے چنانچہ کلمۂ شہادت اس پر دال ہے اگر اللہ اور رسول اللہ، دونوں ایک ہوتے تو "محمد" "رسول اللہ" بالکل بیکار ہوتا۔

(۲) نصوص قرآنی سے ثابت ہے کہ حق تعؐ واحد اور احد ہے، واجب الوجود اور واجب لذاتہ ہے۔ قدیم ہے، باقی ہے، ہمیشہ سے موجود ہے علام سے منزہ ہے۔ بیچون وبے چگون ہے۔ جہت یا مکان اور مقدار نہیں رکھتا۔ بے حد اور بے نہایت ہے۔ ان تمام امور کی صراحت سورۂ اخلاص میں موجود ہے۔

(۳) بندہ ممکن الوجود ہے، فانی ہے، حادث ہے، معدوم فی ذاتہ ہے۔ حق تعالیٰ نے اسے خلعت وجود عطا کیا ہے۔ اس کا وجود اس کی ذات پر زائد ہے۔ اس کی ذات، حق تعؐ کی ذات سے جدا ہے، مقدار اور اندازہ رکھتی ہے۔ جس طرح ذاتِ واجب تعؐ ہر قسم کے کمالات سے متصف ہے۔ اسی طرح ذات ممکن ہر قسم کے نقصان سے ملوث ہے۔

(۴) بالجملہ ذات وصفات اور خواص کے اعتبار سے خالق اور مخلوق (خدا اور انسان) میں غیریت ہے۔ ذاتِ واجب تعؐ، وجود مستقل رکھتی ہے ذات ممکن وجود مستقل نہیں رکھتی۔ اس کا وجود، واجب تعؐ کے وجود سے مستناد ہے۔

(۵) جملہ حضرات صوفیہ (خواہ وجودی ہوں یا شہودی)، اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جو بات شریعت حقہ سے ثابت ہو وہ ہمیں لبسر و چشم

قبول ہے۔ کیونکہ شریعت سے سرمو انحراف، عین ضلالت ہے۔ "وَکُلُّ ضلالۃٍ فی النّار"

لیکن علمائے ظاہر کی پیش کردہ توحید سے شرک کی وہ قسم جو اخفیٰ ہے دفع نہیں ہو سکتی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

(۶) علمائے ظاہر (متکلمین و معتزلہ) شریک فی الوہیت کو بالاتفاق ممتنع یقین کرتے ہیں مگر شریک فی الوجود کو ممکن ہی نہیں بلکہ واقعی جانتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی مخلوق الوہیت میں خدا کی شریک نہیں ہو سکتی مگر کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ اس مخلوق کو وجود میں خدا کا شریک یقین کرتے ہیں!

(۷) حضرات صوفیہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ممکن الوجود کو وجود میں واجب الوجود کا شریک قرار دیا جائے یعنی اگر واجب اور ممکن دونوں مستقل بالذات ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مابہ الموجودیت کو دونوں میں مشترک تسلیم کرنا پڑے گا۔

(ا) اب اگر یہ اشتراک ذاتی ہے تو واجب الوجود کی ذات، وجوب اور مابہ الموجودیت سے مرکب ہو جائے گی اور ہر مرکب حادث ہوتا ہے اور حدوث منافیٔ وجوب ہے۔

(ب) اگر یہ اشتراک عرضی ہے تو واجب الوجود کا وجود سے معریٰ ہونا لازم آجائے گا۔ کیونکہ ہر عرضی کا مرتبہ، معروض کے مرتبہ سے متاخر ہوتا ہے۔

پس ضروری ہے کہ ممکن کو واجب کے ساتھ وجود میں شریک تسلیم نہ کیا جائے بلکہ اسے معدوم اقرار دیا جائے۔ تاکہ واجب اور ممکن میں مغائرت قائم رہے، اور کسی قسم کا شرک بھی لازم نہ آئے۔ بالفاظِ دگر ضروری ہے کہ ممکن کو صاحب ذات نہ مانا جائے کیونکہ اگر ممکن بھی صاحب ذات ہے تو

واجب اور ممکن دونوں نفسِ ذات میں شریک ہو جائیں گے۔ اور مذکورہ بالا خرابی پھر لازم آجائے گی یعنی اگر یہ اشتراک ذاتی ہے تو ذاتِ باری مرکب ہو جائے گی اور اگر یہ اشتراک عرضی ہے تو ذاتِ باری، معری عن الذات ہو جائے گی۔ اور یہ دونوں صورتیں ناقابلِ تسلیم ہیں۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ واجب تعالیٰ بحسب الذات، ممکن سے منبائن ہے۔ بایں معنی کہ واجب الوجود، صاحبِ ذات ہے اور ممکن الوجود، ذات سے محروم ہے اور یہ بات کسی صورت سے بھی مخالفِ شرع نہیں ہے بلکہ عین شرع ہے کما قال اللہ تعالیٰ

کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ

(۷) علمائے ظاہر تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ واحد لاشریک لہٗ ہے یعنی وہ واحد و یکتا ہے اور کوئی ہستی ذات یا صفات میں اس کی شریک نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شئی نہ الوہیت میں حق تعالیٰ کی شریک ہو سکتی ہے نہ وجود میں۔

چونکہ مسلک ہمہ از وست سے یہ شرکِ اخفی (شرک فی الوجود) دفع نہیں ہو سکتا اس لیے مسلک ہمہ اوست اختیار کرنا انسب اور اولیٰ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وجود درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے باقی تمام مخلوقات کا وجود انتسابی یا اضافی یا ظلی ہے۔

(۸) اس دعویٰ کے اثبات سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ مسلک ہمہ اوست کے بعض متبعین نے اس مسلک کی توجیہہ غلط طریق پر کی جس کی وجہ سے مفاسد کبیرہ کا دروازہ کھل گیا یعنی انہوں نے اپنی کم علمی کے باعث وحدت الوجود کے بجائے اتحادِ ذاتین یا اتحاد وجودین یا اتحاد ذات و وجود کی تعلیم دی اور یہ تینوں صورتیں محال ہیں، تفصیل اسکی یہ ہے کہ:۔

(۱) بعض نادانوں نے یہ تعلیم دی کہ خالق اور مخلوق دونوں موجود ہیں مگر دونوں

مل کر ایک ہو گئے یعنی دونوں کا وجود متحد ہو گیا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کائنات میں حلول کر گیا جس طرح شکر پانی میں حلول کر جاتی ہے۔ اسی کو اتحاد الوجود بھی کہتے ہیں اور یہ صورت کفر صریح ہے۔ کوئی وجودی اس کا قائل نہیں ہے کیونکہ کائنات کا تو کوئی مستقل وجود ہی نہیں ہے۔ لھذا اتحاد کا تصور ہی محال ہے۔

حلول و اتحاد ایں جا محال است

کہ در وحدت، دوئی عین ضلال است

(ب) بعض کم فہموں نے جب اہل منطق سے یہ سنا کہ کلی، موجود فی الخارج نہیں ہے وہ تو اپنے افراد کے ضمن میں پائی جاتی ہے تو انہوں نے یہ غلط قیاس قائم کر لیا کہ حق تعالیٰ بھی افرادِ ممکنہ ہی کے ضمن میں پایا جا سکتا ہے اور اس کا وجود بھی افراد کے وجود میں منحصر ہے۔ یہ عقیدہ بھی سراسر الحاد ہے۔

(ج) بعض سفہاء نے یہ کہا کہ جب حق تعالیٰ نے تجلی فرمائی اور اپنے آپ کو بصورتِ اغیار ظاہر فرمایا تو اس کا مستقل وجود باقی نہ رہا بلکہ تمام ممکنات میں مخفی یا ساری ہو گیا اور اب ممکنات کے علاوہ حق تعالیٰ کا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے یہ تلقین بھی سراپا زندقہ ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ وحدۃ الوجود کے ان تینوں گروہوں یا "نادان دوستوں" کی ہرزہ سرائی اور حماقت مآبی کی بدولت، کفر و زندقہ و الحاد کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رح نے اپنے مکتوبات میں ان تینوں گروہوں کی تکفیر کی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بجا طور پر کی ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھو مکتوب چہل و چہارم جلد دوم)

(۸) حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ وجود مطلق ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو وجود حقیقی حاصل نہیں ہے۔ یہ عالم، اسماء و صفات باری تعالیٰ کا ظل یا عکس یا

مظہر ہے یعنی مخلوقات، اظلال و عکوس و مظاہرِ اسماء و صفات ہیں ۔ عالم کا وجود ظلی ہے ۔

(۹) یہ وجود مطلق، وجود شخصی ہے اور اس کے علاوہ تمام مخلوقات اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہیں ۔ کما قال لبعض العارفین ۔

"الحق سبحانہٗ واجب الوجود فاذوجب وجودہٗ عدم ماسواہٗ فان الذی یظن ما سواہٗ لیس بسواہٗ لانہٗ منزہٌ ان یکون غیرہٗ سواہٗ بل غیرہٗ ھو فلا غیر والی ھذا اشار النبی صلعم لا تسبوا الدھر فان اللّٰہ ھو الدھر"۔

یعنی حق سبحانہٗ واجب الوجود ہے اور چونکہ اس کے وجود کے لیے وجوب ثابت ہے (عقلاً بھی اور نقلاً بھی) اس لیے ازروئے عقل و نقل ماسوی اللہ معدوم ہے (ورنہ تعدد وجباء لازم آجائے گا) پس جس چیز کو اس کا ماسوی گمان کیا جاتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور (ماسوی اللہ) کے لیے بھی وجود ثابت کیا جا سکے (اگر ایسا ہوگا تو شرک فی الوجود لازم آجائے گا) بلکہ وہ وہی ہے یعنی وجود ماسوی اسی ذات حق کے وجود کا ظل ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا اپنے اس قول سے "اے لوگو! دہر (زمان) کو برا مت کہو کیونکہ بیشک خود اللہ تعالیٰ ہی دہر ہے"

(۱۰) تمام ممکنات (مخلوقات) اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہیں ۔ ان کو وجود حقیقی حاصل نہیں ہے ۔ البتہ وجود وہمی حاصل ہے ۔ جیسا کہ حضرت مجدد فرماتے ہیں ۔

"ہیچ چیز غیر از حق جل و علا در خارج موجود نیست، چہ اعیان و چہ آثارِ اعیان، بلکہ ثبوت ایں ہا در مرتبہ حس و وہم است و انیں، ہیچ محظور لازم نمی آید چہ ایں نہ موہومیست کہ باختراع وہم ثبوتے کردہ

است کہ بارتفاع وہم مرتفع گردد بلکہ ثبوت آں بصنعِ خداوندی در مرتبۂ وہم است" (مکتوب پنجاہ وہفتم جلد سوم)

وجودِ وہمی کی تشریح حضرت موصوف نے یوں فرمائی ہے :۔

مثالِ آں نقطۂ جوالہ ودائرۂ موہوم است کہ موجود ہمان نقطہ است ولبس، دائرہ درخارج معدوم است۔ نامے ونشانے در خارج ندارد مع ذالک آں دائرہ درمرتبۂ وہم ثبوتے پیدا کردہ است" (ایضاً)

یعنی وجود وہمی کی مثال، نقطۂ جوالہ اور دائرہ پر غور کرنے سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ دائرہ کے مقابلہ میں صرف نقطہ، موجود ہے۔ دائرہ تو اصلاً موجود نہیں ہے وہ تو خارج میں معدوم ہے۔ اس کا تو خارجی دنیا میں کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس دائرہ نے صرف مرتبۂ وہم میں ثبوت، پیدا کر لیا ہے یعنی نظر تو آتا ہے مگر دراصل موجود نہیں ہے۔ دراصل نقطہ موجود ہے اور وہی نقطہ سرعت گردش کی وجہ سے دائرہ نظر آتا ہے۔

ہمہ از وہم تست ایں صورت غیر
کہ نقطہ دائرہ ست از سرعت سیر (شبستری)

(۱) اس جگہ لفظ وہمی کی تشریح نامناسب نہ ہوگی :۔

واضح ہو کہ کائنات کیلئے صرف ثبوت علمی ہے، وجود خارجی نہیں ہے۔ وہ تو صرف حق تعالیٰ کے لیے ثابت ہے۔ عقل اشیاء کو خارج میں موجود سمجھتی ہے مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی طفل ناداں، آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر یہ یقین کرلے کہ وہ صورت درحقیقت آئینہ میں موجود ہے۔ ارباب عقل جانتے ہیں کہ جو کچھ آئینہ میں نظر آرہا ہے وہ وجود وہمی سے زیادہ نہیں ہے۔

صورت وہمی ہستی تہمت داریم ما
چوں حباب آئینہ برطاق عدم داریم ما (بیدل)

صورت وہمی کا مطلب ہے وہ صورت جسے دیکھو تو ہے مگر غور کرو تو کچھ نہیں! بالفاظِ دگر بظاہر موجود ہے بباطن معدوم ہے۔

جو لوگ اس کے اصطلاحی مفہوم سے آشنا نہیں ہیں وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر انسان کا وجود وہمی ہے (ہمارے وہم کا اختراع یا کرشمہ ہے) تو پھر شرع اور قانون سب بے سود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "وہمی" کی دو قسمیں ہیں :-

(ا) وہمی اختراعی - یعنی ایک من گھڑت بات جسے محض ہماری قوتِ واہمہ نے ایجاد کیا ہو اور جس کا منشاء خارج میں کہیں موجود نہ ہو۔ جیسے گدھے کے سینگ گھوڑے کے پر یا کوہ قاف کی پریاں۔

اگر کوئی صوفی (خواہ وہ وجودی ہو یا شہودی) کائنات کو اس معنیٰ میں وہمی سمجھے تو بیشک معترض کا یہ اعتراض صحیح ہے مگر کوئی صوفی کائنات کو اس معنی میں "وہمی" نہیں کہتا۔ ناظرین کی آگاہی کے لیے لکھتا ہوں کہ فرقہ سوفسطائیہ بیشک اس بات کا قائل ہے۔

(ب) وہمی نفس الامری یا واقعی - یعنی وہ شئی جو اگرچہ خارج میں مستقل وجود نہیں رکھتی مگر اس کا منشاء خارج میں موجود ہوتا ہے اور اس وجود وہمی کو اس منشائے خارجی سے منتزع کرتے ہیں مثلاً دائرہ آتشیں کہ اگرچہ اس کا وجود وہمی ہے مگر اس کا منشاء (یعنی نقطۂ آتشیں) تو خارج میں موجود ہے۔ اس دائرہ کا وجود اگرچہ وہمی ہے مگر ہمارے تصور پر موقوف نہیں ہے۔ جب تک نقطۂ جوالہ موجود ہے اس کا وجود اس نقطہ سے منتزع ہوتا رہے گا۔

لیکن وہمی اختراعی کا وجود ہمارے تصور پر موقوف ہے۔ مثلاً فرزندزنِ عقیمہ کا وجود وہمی اختراعی ہے، ہمارے وہم کا پیدا کردہ ہے۔ اس کا منشاء

خارج میں کہیں موجود نہیں ہے لیکن کائنات کا وجود وہمی واقعی ہے ۔ کیونکہ اس کا منشاء (ذاتِ حق) خارج میں موجود ہے ۔ فافہم وتدبر

(۱۲) تمام ممکنات باعتبار ذاتِ خویش معدوم ہیں ۔ البتہ وجود وہمی رکھتی ہیں یعنی انہیں وجودِ حقیقی کے ساتھ ایک گونہ نسبت حاصل ہے چنانچہ درخت کا سایہ کہ بظاہر وجود رکھتا ہے لیکن درحقیقت موجود نہیں ہے ۔ معہذا اس سایہ کے کچھ احکام اور آثار ہیں جو صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ شجر سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مثلاً درخت کا سایہ مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن درخت اپنی جگہ قائم رہتا ہے ۔ اسی طرح مخلوقات بھی بعض ایسے احکام اور آثار رکھتی ہیں جو انہی کے ساتھ مخصوص ہیں ، واجب تعالیٰ کیلئے ثابت نہیں ہو سکتے ۔

(۱۳) ممکنات فی حد ذاتہم نہ جواہر ہیں نہ اعراض ۔ اگر انہیں اعراض کہتے ہیں تو اس معنی میں کہ قائم بالغیر ہیں اور اس معنی میں تمام عالم مجموعۂ اعراض ہے مگر نہ اس معنی میں جس میں حکماء اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں ۔ پس دراصل ممکنات معدومۃ الذوات اور معلومۃ الآثار ہیں ۔ اور وجود ظلی کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ معدومۃ الذات اور معلومۃ الآثار ہوتا ہے ۔

(۱۴) وجود اور ماہیت میں فرق یہ ہے کہ وجود متعین ہوتا ہے اس لیے وہ ہمیشہ جزئی ہوتا ہے ۔ اور اس میں تعدد یا تکثر کی قابلیت ہی نہیں ہوتی ۔ اس کے برعکس ماہیت ہمیشہ مبہم ہوتی ہے اس لیے وہ ہمیشہ کلی ہوتی ہے اور اشتراک بین الکثرین کی قابلیت بھی رکھتی ہے ۔

وجود ، تعین کی بناء پر ہمیشہ خارج میں موجود ہوتا ہے اور ماہیت اپنے ابہام کی وجہ سے وجود خارجی کی لیاقت ہی نہیں رکھتی ہاں تعقل ذہنی میں

اسے ثبوت ضرور حاصل ہوتا ہے، اگرچہ وجود نہیں رکھتی۔

(۱۵) حق تعا چونکہ محض وجود خارجی ہے اس لیے خارج میں پایا جاتا ہے ممکنات چونکہ ماہیات ہیں اس لیے نہ انہیں وجود خارجی حاصل ہے نہ وجود ذہنی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ثبوت علمی کے مقابلہ میں خارج میں انہیں وجود وہمی حاصل ہے۔ یعنی وجود حقیقی کہ وجود مطلق ہے ان سے ایک گونہ نسبت رکھتا ہے اور اس نسبت کی بنار پر ہم ممکنات کو بھی موجود فی الخارج کہہ دیتے ہیں، مثلاً اظلال کہ دراصل موجود نہیں ہیں مگر اصل سے نسبت کی وجہ سے ہم انہیں بھی موجود فی الخارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) ان عکوس و اظلال کو مظاہر بھی کہتے ہیں۔ اور یہ اظلال یا مظاہر سب ممکن ہیں۔ وجود مطلق بحیثیت اطلاق غیب میں ہے کسی پر ظاہر نہیں ہے۔ کائنات اس وجود مطلق کا ظل ہے۔ اس کی موجودیت کا مطلب یہ ہے کہ اس پر وجود حقیقی کا پرتو پڑ گیا ہے یا وجود حقیقی کا ظہور اس تعین یا ظل میں ہوا ہے یعنی یہ ظل وہ لباس ہے جس میں وجود حقیقی کا ظہور ہوا یا یوں کہو کہ وجود حقیقی لباس ممکن میں ظاہر ہوا۔

(۱۷) حق تعا وجود مطلق ہے اور اس کے اظلال و تعینات، ممکن ہیں۔ نیز حق تعا اور اس کے اظلال متغائر بالذات ہیں۔ نہ اصل کو ظل کہہ سکتے ہیں اور نہ ظل کو اصل۔ واجب تعا ہمیشہ واجب (حق تعا) ہی رہے گا اور ممکن ہمیشہ ممکن ہی رہیگا یہ محال ہے کہ ممکن کبھی ترقی کر کے واجب بن جائے۔ بالفاظِ دگر انسان کبھی خدا نہیں بن سکتا۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبیں
زمیں خاک شود و آدمی خدا نہ شود (بیدلؔ)

(۱۸) صوفیہ جب یہ کہتے ہیں کہ ممکن لباس واجب ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ ممکن واجب بن گیا یا واجب ممکن بن گیا - یہ تو قرآن حکیم کے خلاف ہے اس لیے کفر صریح ہے - بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرتبۂ احدیت تو غیب الغیب میں ہے - ہاں اس کا ظہور اظلال و مظاہر میں ہوا ہے - [1]

مثلاً اگر یہ فرض کرلیں کہ ایک درخت ہے جو ہماری نظروں سے غائب ہے لیکن اس کا سایہ (ظل) ہمیں نظر آرہا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شجر کا ظہور، سایہ کے لباس میں ہو رہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ حقیقت شجر یہ، سایہ میں تبدیل ہو گئی - بلکہ صرف یہ مطلب ہے کہ ہمیں شجر کے وجود کا علم سایہ کے ذریعہ سے ہوا - اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ واجب کا ظہور، ممکن کے لباس میں ہوا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ واجب کی حقیقت، ممکن کی ذات میں تبدیل ہو گئی یا واجب ممکن بن گیا -

(۱۹) چونکہ قائلین وحدت الوجود کو یہ کہتے ہیں کوئی باک نہیں ہوتا کہ واجب، ممکن کے لباس میں ظاہر ہوا اس لیے مورد اعتراضات ہو جاتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی واضح کیا ہے ان حضرات کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ :-

(ا) واجب بذات خود ممکن میں حلول کر گیا یا

(ب) واجب اور ممکن دونوں متحد الوجود ہو گئے -

---

[1] غالب نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :-

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یہ دونوں باتیں کفر صریح ہیں۔ کوئی وجودی ان کا قائل نہیں ہے بلکہ جب وہ یہ کہتے ہیں :-

ہر دم بلباسِ دگر آں یار بر آمد
کہ پیر و گہ جواں شد (رومیؒ)

یا

گہے در کسوتِ لیلیٰ فرو شد
گہے در صورتِ مجنوں بر آمد (مغربیؒ)

تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں مخلوقات سے خالق کے وجود کا علم حاصل ہوتا ہے یعنی واجب تعالیٰ جو غیب الغیب ہے ممکنات کے لباس میں ظاہر ہو رہا ہے لفظِ لباس سے مراد یہ ہے کہ مخلوقات اس کی تجلیات کا مظہر ہیں۔ علمائے ظاہر اس لفظ سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اہل وحدت الوجود کا عقیدہ یہ ہے کہ خود واجب تعالیٰ (خدا) ممکنات (مخلوقات) کے لباس (وجود) میں پوشیدہ ہے (جس طرح ہندو یہ یقین کرتے ہیں کہ خدا، رام یا کرشن کے جسم میں پوشیدہ تھا) بایں معنی کہ ممکن ظاہر میں انسان ہے باطن میں خدا ہے۔ لیکن یہ عقیدہ تو کفر صریح ہے۔ اہل وحدت الوجود (حضرات صوفیہ) جس طرح حلول اور اتحاد کو الحاد و زندقہ قرار دیتے ہیں اسی طرح تجسم کو بھی کفر سمجھتے ہیں۔ ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ممکن مظہر واجب ہے خود ممکن کی نہ کوئی اصل ہے نہ حقیقت نہ ہستی، نہ وجود خارجی، کیونکہ اگر خدا کے ساتھ ساتھ ممکن کو بھی موجود مانا جائے تو شرک فی الوجود لازم آجائے گا۔ حضرات صوفیہ تو واجب (خدا) کے علاوہ کسی ہستی کو موجود ہی نہیں جانتے۔ وحدت الوجود کی بنیاد ہی اس عقیدے پر ہے کہ لاموجود الا اللہ۔

(۲۰) پس ثابت ہوا کہ ممکن اپنی ذات کے اعتبار سے دو معنی میں واجب کا غیر ہے

(۱) اول یہ کہ واجب تعین ذات رکھتا ہے لیکن ممکن ذات سے معریٰ ہے۔
(ب) دوم یہ کہ واجب تعین وجود مطلق ہے لیکن ممکن باعتبار ذات معدوم ہے مگر چونکہ اسے واجب سے ایک نسبت یا تعلق ہے اس لیے اگر اسے بھی موجود کہہ دیں تو مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن وہ فی نفسہٖ وجود نہیں رکھتا اس کا وجود دراصل یہی وجودِ مطلق ہے۔ پس اگر بحسب الوجود، ہم یہ کہہ دیں کہ ممکن، عین واجب ہے یعنی وجود مطلق ہی وجود ممکنات ہے تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ اور وحدت الوجود کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔

(۲۱) اسی لیے محققین صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ واجب اور ممکن میں بحسب الذات (ذات کے اعتبار سے) غیریت ہے اور بحسب الوجود عینیت ہے یعنی وجود واحد مطلق، وجود حقیقی ہے اور عین واجب ہے۔ اور یہی وجود مطلق ممکنات کی طرف بھی منتسب ہے (ظاہر ہے کہ ممکنات کا کوئی ذاتی وجود تو ہے ہی نہیں) اس نکتہ کی منطقی توضیح یہ ہے کہ ذاتِ واجب نور مطلق اور عین وجود ہے ممکن ظلمتِ محض اور عدم خالص ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ نور کا اتحاد ظلمت کے ساتھ اور وجود کا اتحاد عدم کے ساتھ محال عقلی ہے اور جب اتحاد ہی ناممکن ہے تو دونوں کی وحدت خارج از بحث ہے۔ پس لامحالہ ذات کے اعتبار سے (اگر لفظِ ذات کا اطلاق ممکنات پر، جو سلب محض ہیں، بر سبیل ذکر، روا ہو سکے) واجب اور ممکن قطعی طور پر مغائر ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وجود حقیقی، عین واجب ہے اور یہی وجودِ حقیقی، ممکنات پر شعاع، عکس اور تجلی ریز ہے۔ اس لیے ممکنات کی ہستی صرف اس قدر ہے کہ انہیں وجودِ حقیقی سے ایک گونہ نسبت حاصل ہو گئی ہے۔ اسی لیے ممکنات کے وجود کو وجود اضافی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فی الجملہ چونکہ ممکنات مغائرت کلی کے باوجود، وجود مطلق کو

نسبت بھی رکھتے ہیں اس لیے عرفاء یہ کہہ دیتے ہیں کہ واجب اور ممکن میں ذات کے اعتبار سے مغائرت ہے اور وجود کے اعتبار سے عینیت ہے۔

علمائے ظاہر نے اس نازک فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس لیے اہل وحدت الوجود کو مورد اعتراض بنا دیا۔ یعنی یہ کہا کہ وجودی، خدا اور انسان میں کوئی فرق یا تمیز نہیں کرتے۔ حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔

علمائے ظاہر کو یہ مغالطہ اس لیے لاحق ہوا کہ انھوں نے شیخ اکبرؒ کے انداز بیان یا اسلوب نگارش کو ملحوظ نہیں رکھا۔ شیخ اکبرؒ کا اسلوب یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ کسی مسئلہ کو بالوضاحت بیان کر دیتے ہیں یعنی اُسے جامع و مانع طور پر قیود و شرائط کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں تو وہ طالب حق سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ آئندہ ان تمام قیود و شرائط کو مدنظر رکھے گا۔ اس لیے جب وہ اُسی مسئلہ کا اعادہ کرتے ہیں تو اجمال سے کام لیتے ہیں یعنی دوبارہ اس مسئلہ کو قیود و شرائط کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ مثلاً انھوں نے ایک دفعہ لکھ دیا کہ موجود بالذات خدا کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ مخلوقات موجود ہیں مگر موجود بالعرض ہیں۔ آئندہ جب اس کا اعادہ کرتے ہیں تو صرف اتنا لکھ دیتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ اس جملہ سے شیخؒ کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ حقائق اشیاء

---

[1] دنیا میں ہر بڑے شاعر اور ہر بڑے فلسفی کا ایک خاص انداز بیان ہوتا ہے۔ غالب نے اس شعر میں اسی صداقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

افسوس یہ ہے کہ اکثر و بیشتر انگریزی داں حضرات شیکسپیئر (باقی بر صفحہ ۲۱۱)

باطل ہیں یا عبد اور رب میں کوئی فرق نہیں ہے یا کائنات کا مطلق کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہ خدا موجود بالذات ہے اور مخلوقات بالعرض ہیں یا خدا کا وجود حقیقی ہے اور مخلوقات کا وجود اضافی ہے۔

اسی طرح اگر ایک جگہ شیخ اکبرؒ نے یہ فرمایا ہے کہ واجب، عین ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وجود کے لحاظ سے عین ہے مگر ذات کے لحاظ سے غیر ہے۔ چونکہ شیخؒ اس سے پہلے یہ تصریح فرما چکے ہیں کہ عینیت کے ساتھ ساتھ مغائرت بھی ہے۔ اس لیے آئندہ صرف اجمال پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

وجود کے لحاظ سے اگر عینیت ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کسی شی کا وجود حقیقی مستقل یا بالذات نہیں ہے۔ بلکہ ظلی اور اضافی ہے لہٰذا اگر وجود کے اعتبار سے عینیت ہے تو ذات کے اعتبار سے غیریت بھی تو ہے اور اس غیریت پر دلیل یہ ہے کہ حق تعہ کا وجود، حقیقی اور بالذات اور مطلق ہے خلق کا وجود بالعرض اور اضافی اور ظلی ہے۔

اسی طرح کبھی کبھی حضرات صوفیہ اسی صداقت کی تعبیر بایں الفاظ کر دیتے ہیں کہ واجب اور ممکن (حق اور خلق) میں بحسب الذات غیریت ہے مگر بحسب الظہور عینیت ہے یعنی تمام ممکنات (مخلوقات) ایک ہی وجود کے مختلف مظاہر ہیں۔ سعدیؒ نے ان شعروں میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

لہ بقیہ حاشیہ: ملٹن، براؤننگ، کالرج، ہیوم، کانٹ، ہیگل اور برگساں کے انداز بیان سے تو آگاہی حاصل کر لیتے ہیں مگر چونکہ عربی نہیں جانتے اس لیے شیخ اکبرؒ کے اسلوب نگارش سے ناآشنا رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ غلط فہمی اور غلط بیانی کے سوا اور کچھ نہیں ۱۲۔

دوست نزدیک تر از من بمن است[1]

ویں عجب بیں کہ من از وے دورم

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ از روئے ظہور، دوست (خدا) مجھ سے میری رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے یعنی بحسب الظہور میرا عین ہے، مگر بحیثیت ذات میں اس سے دور (مغائر) ہوں۔ یعنی وہ واجب ہے میں ممکن ہوں اس کا وجود حقیقی ہے میرا وجود اضافی ہے۔

مجھ سے وہی ظاہر ہو رہا ہے[2] اس اعتبار سے وہ مجھ سے قریب ہے لیکن میرا وجود حقیقی نہیں ہے ظلی ہے۔ اس لیے اعتبار سے میں اُس سے دُور ہوں۔

چہ کنم؟ با کہ تواں گفت کہ دوست

در کنار من و من مہجورم

یعنی ظہور کے اعتبار سے وہ ہر وقت میری بغل میں ہے (وہ میرا عین ہے) مگر وہ بذاتِ خود چونکہ تعینات کے پردوں میں پوشیدہ ہوگیا ہے اس لیے میں اس کے دیدار سے محروم ہوں (میں اس کا غیر ہوں) خلاصۂ کلام ابں کہ شیخ سعدیؒ

---

[1] یہ مصرع اس آیت کا ترجمہ ہے :-

نحن اقرب الیہ من حبل الورید

ہم انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں

[2] ظہور حق پر یہ آیت شاہد ہے :-

ھُوَ الاوّلُ وَالآخرُ وَالظّاھِرُ وَالبَاطِنُ

وہی ذاتِ حق ہر شی کی ابتدا بھی ہے انتہا بھی۔ وہی ہر شئے سے ظاہر ہو رہی ہے اور وہی ہر شی کا باطن ہے ۱۲

نے ان شعروں میں عینیت اور غیریت دونوں کا بیک وقت اثبات کر دیا ہے
یعنی خالق اور مخلوق میں اگر وجود کے اعتبار سے عینیت ہے تو ذات کے اعتبار
سے غیریت ہے۔

اس ضمن میں چند اشعار اور بھی پیش کئے جاتے ہیں:۔

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست ٭ بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست
تواں گفت ایں با حقایق شناس ٭ دلے خردہ گیرند اہل قیاس
کہ پس آسمان و زمیں چیستند ٭ بنی آدم و دام و دو کیستند
پسندیدہ پرسیدی اے ہوشمند ٭ جوابت بگویم کہ آید پسند
کہ ہامون و دریا و کوہ و فلک ٭ بنی آدم و دیو و حور و ملک

ہمہ گرچہ ہستند زاں کمتر اند
کہ با ہستی اش نام ہستی برند

یعنی اشیائے کائنات کی ہستی اضافی ہے اور واجب تعالیٰ کی ہستی حقیقی ہے
اب ہم اس دعوی پر دلیل پیش کرتے ہیں جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔

(۱) مقدمہ اول یہ ہے کہ تمام عرفاء و علماء و جمیع اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حق تعالیٰ وحدہٗ لا شریک لہٗ ہے۔ اس کی ذات میں ہر نوع کی شرکت محال ہے خواہ شرکت در ذات ہو یا در صفات یا در افعال۔ وجہ یہ ہے کہ شرکت تو افتقار و احتیاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اور افتقار منافیٔ وجود ذاتی ہے۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ شرکت منافیٔ الوہیت ہے۔ چنانچہ حق تعالے ارشاد فرماتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ

اے لوگو! تم سب (اپنے وجود کے لیے) اللہ کے محتاج ہو یعنی تمہاری

حقیقت افتقار ہے) اور اللہ! وہ تو غنی (واجب الوجود) ہے اور لائق حمد ہے (یعنی اس کی حقیقت وجوب ہے، تم سب اس کے محتاج ہو مگر وہ کسی شئے کا محتاج نہیں ہے)

چونکہ حق تعؐ غنی (واجب الوجود) ہے یعنی اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے اس لیے شریک باری عقلاً ونقلاً محال ہے۔ بلکہ اس کا تصور عقلاً ممتنع ہے۔ وجوب کے ساتھ شرکت کا اجتماع لاریب اجتماعِ ضدین کا مصداق ہے اور اجتماع ضدین عقلاً محال ہے۔

(۲) دوم یہ کہ وجودِ حقیقی کو واجب تعؐ کے ساتھ عینیت کی نسبت ہے بایں معنی کہ واجب تعؐ نفس وجودِ حقیقی ہے۔ اگر عینیت تسلیم نہ کی جائے تو عقلاً دو صورتیں ممکن ہیں:۔

(ا) یا تو وجود، ذاتِ حق پر زائد ہوگا تو یہ لازم آئے گا کہ حق تعؐ غیر سے استفادہ وجود کر رہا ہے اور استفادہ یا استکمال بالغیر منافیٔ وجوب ہے۔

(ب) یا وجود، جز ذاتِ باری ہوگا اور اس صورت میں اس کی ذات مستلزم ترکیب ہو جائے گی اور ترکیب بھی منافیٔ وجوب ہے۔

اس لیے وجود حقیقی اور واجب تعؐ میں عینیت تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اور عینیت بایں معنی مراد ہے کہ واجب تعؐ، بذاتِ خویش، وجود مطلق حقیقی ہے اس کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہے۔ اگر واجب اور ممکن میں وجود کا اشتراک تسلیم کیا جائے تو واجب میں شانِ افتقار ثابت ہو جائے گی۔ اور افتقار منافیٔ وجوب ہے۔ جو مفتقر ہے وہ واجب نہیں ہو سکتا اور جو واجب ہے وہ مفتقر نہیں ہو سکتا۔

بالجملہ وجودِ مطلق کی طبیعت ہی قابل اشتراک نہیں ہے اگر کسی قسم کا

اشتراک بھی متصور ہو تو واجب اپنے مرتبۂ وجوب پر قائم نہیں رہ سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ ماسوائے واجب کوئی موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماسوی اللہ کو واجب (وجود مطلق) سے ایک نسبت ہو گئی ہے۔

(۳) سوم یہ کہ ظاہر ہے کہ وجود مطلق سے زیادہ عام (اعم) کوئی چیز نہیں ہے نقیض کے علاوہ کوئی شئی وجود کے احاطہ سے باہر نہیں ہے حتیٰ کہ نظر ظاہر میں یہ حکم لگاتی ہے کہ وجود، واجب اور ممکن دونوں کو شامل ہے۔ لیکن غور و فکر کے بعد کوئی عاقل اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کا شمول نہ ذاتی ہے نہ عرضی۔ لہٰذا اشتراک نہیں ہو سکتا۔ پس یا واجب تو موجود کہہ سکتے ہیں یا ممکن کو دونوں کو موجود نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ وہی شرکت فی الوجود لازم آ جائے گی جس کا بطلان قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔ پس لامحالہ وجود مطلق حقیقی صرف واجب تعالیٰ میں منحصر ہو گا اور اسی طرح وجود عینی بھی واجب اور ممکن میں مشترک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ باری تعالیٰ بوجود مطلق حقیقی، وجود عینی اور وجود ذہنی دونوں کو محیط ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:۔

واللّٰہ بکلِّ شیءٍ مُحیط۔ اور اللہ ہر شئی کو محیط ہے۔

چونکہ وجود حقیقی، وجود عینی میں منحصر ہے اس لیے وجود ذہنی اس کے لیے ممتنع ہے وجود ذہنی تو دراصل ثبوت ہے نہ کہ وجود۔

(۴) چہارم این کہ ہر گاہ واجب تعالیٰ وجود حقیقی اور موجود حقیقی ہے اور وجود مطلق، ذات واجب میں منحصر ہے تو ثابت ہوا کہ ممکنات باعتبار ذات خویش، معدوم ہیں۔ وجود اصلی تو اسی ذات واجب کا وجود ہے۔ وجود ظلی، فی الواقع وجود نہیں ہے اسی لیے حضرات صوفیہ اس وجود ظلی کو ثبوت کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اعیان ثابتہ نے وجود کی خوشبو بھی نہیں سونگھی ہے۔

نیز فرماتے ہیں کہ خارج میں ذواتِ معدومہ کے آثار و احکام کے علاوہ بوجود اضافی، کوئی شئی موجود نہیں ہے۔ نیز یہ کہ عالم از قبیل اعراض ہے کیونکہ آثار اور احکام یہ سب اعراض ہیں اور اعراض، قائم بالغیر ہوتے ہیں۔ حق تو ان سب کا قیّم اور قیوم ہے اس نے اپنی قدرت سے ممکنات کو جو معدومۃ الذوات ہیں موجود اضافی عطا فرمایا ہے۔

(۲۲) فی الجملہ واضح ہو گیا کہ واجب الوجود وجود مطلق ہے اور ممکنات ذواتِ معدومہ ہیں انہیں وجود سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ مگر صوفیہ چونکہ ممکنات کو مظاہر وجود بھی کہتے ہیں۔ اس لیے مظہریت کی تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ جس طرح واجب اور ممکن میں غیریت ضروری ہے اسی طرح ظاہر اور مظہر میں بھی تغائر لازمی ہے خواہ وہ تغائر ذاتی ہو یا عرضی جیسے اجزاء میں کل کا یا جزئیات میں کلی کا ظہور۔ ظہور کی ان صورتوں میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ یعنی حکما بھی ظہور کی ان صورتوں کو تسلیم کرتے ہیں اور صوفیہ بھی۔ ظہور کی جو صورت مابہ النزاع ہے وہ یہ ہے کہ ظاہر کسی شئی پر اس طرح تجلی فرمائے کہ نہ تو حلول اور سریان کا علاقہ پیدا ہو اور نہ مذکورہ بالا صورتوں کا بلکہ یہ صورت ہو کہ ظاہر کی جانب سے مظہر پر ایک کیفیت غیر مدرک طاری ہو جس کی رو سے ظاہر ہے اپنی حقیقت پر قائم رہے اور مظہر اپنی ماہیت پر لیکن حقیقت ظاہرہ کے آثار، مظہر کی ماہیت میں پیدا ہو جائیں، خواہ ماہیت مظہر کے لیے قبل از تجلی، ثبوت بلا وجود ہو (جیسا کہ ظہور اول میں) یا مظہر بوجود اضافی موجود ہو (جیسا کہ قسم ثانی میں)

پہلی قسم کی مثال ایسی ہے جیسے بعض آدمیوں کی صورت میں بعض اولیاء اللہ کا ظہور، اور دوسری قسم کی مثال ایسی ہے جیسے دحیہ کلبی کی صورت میں جبرائیل

کا ظہور یا بشر کی صورت میں فرشتے کا ظہور۔ (دیکھو سورۂ مریم)

(۲۳) وجوب اور امکان میں ظاہر اور مظہر کا اختلاف، ظہور میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ مثلاً شجر اور نار کی صورت میں باری تعالیٰ کی تجلی۔ ان اقسام میں ظاہر اپنی حقیقت پر باقی رہتا ہے اور مظہر اپنی حقیقت پر۔ لیکن ظاہر، مظہر پر ایسا غلبہ حاصل کر لیتا ہے کہ اپنے تمام آثار مظہر میں ظاہر کر دیتا ہے اور مظہر کے آثار کو منتفی کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب حق تعالیٰ نے شجر پر تجلی فرمائی تو یہ نہیں ہوا کہ واجب تعالیٰ شجر بن گیا یا اس میں کسی قسم کا تغیر آگیا بلکہ شجر اپنی حقیقت پر قائم رہا مگر اس پر ایسی حالت طاری ہوگئی کہ اس سے انا اللہ لا الٰہ الا انا کی صدا بلند ہوگئی۔ اس بات کا کہنے والا درخت نہیں تھا خود خدا تھا لیکن نہ اس نے درخت میں حلول کیا نہ سریان۔

پس یہ کلمہ جس کا صدور باری تعالیٰ سے بطریق حکایت ہوا، شجر میں پیدا ہوا اور اس وقت اس کی بناء پر اس درخت سے عدم تکلم (سکوت) کی صفت جو آثار شجر سے ہے، منتفی ہوگئی۔

(۲۴) بالجملہ ظاہر کے احکام و آثار و خواص، مظاہر میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس ممکنات معدومۃ الذوات اور معلومۃ الآثار ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام اجسام سے خواہ وہ مرکب ہوں یا مفرد، بجز اعراض، اور کچھ مشاہدہ نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ جب چاہتا ہے کہ کسی ماہیت کو خارج میں موجود کر دے تو اپنی قدرت کاملہ سے، جس کی کنہ حیطۂ علم انسانی سے باہر ہے اس ماہیت پر تجلی فرماتا ہے جس کی وجہ سے وجود مطلق کے آثار اس ماہیت میں نمایاں ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ ماہیت نہاں خانۂ علمی سے باہر آجاتی ہے پس اشیائے کائنات کے احکام و آثار، وجود حقیقی کے پرتو سے (جس کی کنہ

معلوم نہیں ہو سکتی، موجود ہو جاتے ہیں۔ حضرات صوفیہ ان اشیاء کو وجود اضافی سے موسوم کرتے ہیں۔ ان میں موجودیت کا رنگ، وجود حقیقی سے اضافت (نسبت) کی بناء پر پیدا ہو جاتا ہے ورنہ بذاتِ خود وہ موجود نہیں ہیں۔

(۲۵) وجود حقیقی جو ان مظاہر میں ظاہر ہوتا ہے ان مظاہر سے مغائر بالذات ہے کیونکہ ذات رکھتا ہے اور مظاہر ذات نہیں رکھتے۔ مگر یہ مظاہر، وجود اور ظہور کی حیثیت سے ظاہر کے ساتھ عینیت کا علاقہ رکھتے ہیں بایں معنی کہ ظاہر ظاہر کا وجود ہی دراصل ان مظاہر کا وجود ہے یا یوں کہو کہ مظاہر کا وجود دراصل وجود ظاہر ہے دگر ہیچ۔ ہو الظاہر کے علاوہ اور کوئی شی تو موجود ہی نہیں۔

لہذا صوفیہ یوں کہتے ہیں کہ واجب اور ممکن میں ذات کے اعتبار سے مغائرت ہے اور وجود کے اعتبار سے عینیت ہے۔ ممکنات، پرتو وجود حقیقی کی بدولت موجود ہو جاتے ہیں ورنہ وجود کجا اور یہ معدومات کجا!

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں (غالب)

(۲۶) جب حضرات صوفیہ یہ کہتے ہیں کہ واجب تعالیٰ، ممکن کے لباس ظاہر ہوا تو ان کی مراد وہ نہیں ہوتی جو علمائے ظاہر بیں سمجھتے ہیں کہ واجب اور ممکن متحد الوجود ہو گئے یا دونوں مل کر ایک ہو گئے۔ یہ تو کفر ہے۔ بلکہ اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ

(ا) حضرت وجودِ مطلق جب بفحوائے "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ" (وہ ہر لحظہ اپنی صفات کی جلوہ گری میں مصروف ہے) اپنی صفات کمالیہ میں سے کسی صفت کو ظاہر فرماتا ہے۔

(ب) تو اس کی بدولت اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مثلاً حیّ یا علیم پیدا ہو جاتا ہے۔

(ج) اس اسم کی تجلی سے اس کی صور علمیہ پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شان مربیٔ اسم ہے اور ہر اسم مربیٔ صورت علمیہ ہے۔

(د) ان صور علمیہ کو اصطلاح میں اعیان ثابتہ کہتے ہیں۔

(ہ) صورت علمی سے وجود عینی اضافی پیدا ہوتا ہے۔

(و) پس تمام موجوداتِ اضافیہ، اسمائے حسنیٰ کے مظاہر ہیں۔

(۲۷) خلاصۂ کلام ایں کہ عالم عبارت ہے تجلیاتِ حق تعالیٰ سے اور اس بات پر اہل وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کا اتفاق ہے کہ حق تعالیٰ وجود مطلق ہے اور ماسوی باعتبار ذاتِ خویش معدوم ہے۔ جیسا کہ حضرت مجدد رح خود فرماتے ہیں کہ

(ا) "وجود، مبدأ ہر خیر و کمال است و عدم، منشاء ہر نقص و شرارت پس وجود مر واجب را ثابت باشد و عدم نصیب ممکن بود ...... اگر علمائے ظواہر ازیں دقیقہ آگاہ می گشتند ہرگز ممکن را وجود ثابت نمی کردند"۔ (مکتوب اول دفتر ثانی ص۴)

(ب) "تا دو موجود است و عالم ماسوائے او تعالیٰ موہوم" (مکتوب ۹۸ دفتر ثانی)

(ج) "ہیچ چیز غیر از حق جل و علا در خارج موجود نیست۔ چہ اعیان و چہ آثار اعیان۔ بلکہ ثبوت اینہا در مرتبہ حس و وہم است" (مکتوب ۵۷ جلد سوم)

(د) "پس در نفس خارج جز یک ذات احدیت جل سلطانہا ہیچ چیز موجود نباشد" (مکتوب ۱۰۸ جلد سوم)

حضرت مجدد رح نے شیخ اکبر رح سے صرف ممکنات کی ماہیت میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ خود حضرت مجدد نے اس اختلاف کو واضح فرما دیا ہے:۔

نزدِ ایں فقیر حقائقِ ممکنات، عدمات اند کہ در غایت علم واجب تمیز د

تعین پیدا کردہ اند و بصنع خداوندی در مرتبۂ حس و وہم ثابت گشتہ"

"نزد شیخ اکبرؒ حقائق ممکنات، صور علمیۂ اسمائے الٰہی است کہ یکے از تنزلات خمسۂ حضرت وجود است"

"بالجملہ نزد فہم ایں فقیر، حقائق ممکنات، عدمات اند و نزد حضرت شیخؒ وجودات متنزلہ" (مکتوب ۸۷ جلد سوم صفحہ ۹۶)

حضرات وجودیہ یہ فرماتے ہیں کہ حقائق ممکنات، اسماء وصفات ہیں۔ ان اسماء وصفات نے تجلی فرمائی۔ یہ تجلی حقائق ممکنات میں ظاہر ہوگئی۔ اس ظہور کا دوسرا نام کائنات ہے:۔

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

حضرات شہودیہ یہ فرماتے ہیں کہ ممکنات کے حقائق وہ عدمات ہیں جنہوں نے علم الٰہی میں تمیز و تعین پیدا کر لیا ہے اور صنعتِ خداوندی کی بدولت مرتبۂ حس و وہم میں ثابت ہو گئے ہیں۔

بات ایک ہی ہے محض تعبیر کا اختلاف ہے۔

(ا) وجودیوں کے نزدیک حقائق ممکنات کیا ہیں؟ تجلیاتِ اسماء وصفات باری

(ب) شہودیوں کے نزدیک حقائق ممکنات کیا ہیں؟ اظلالِ اسماء وصفات باری

اب میں اپنے قول کی تائید میں امام الہند جامع شریعت و طریقت حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ کا فیصلہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں:۔

"عبارۃ الامام الائمہ الشیخ ابن عربی رضی اللہ عنہ ان حقایق الممکنات ھی الاسماء والصفات متمیزۃً فی مرتبۃ العلم

عبارۃ الشیخ المجدد رضؓ ان حقایق الممکنات ھی عکوس

الاسماء والصفات المنطبعة فی الاعدام المقابلة لها ولا فرق بین العبارتین الا فرقاً ضعیفاً .... فالقول بان حقایق الممکنات عکوس الاسماء المنطبعة المقابلہ لیس مخالفاً لکلام الشیخ ابن عربی واتباعہ الخ

(مکتوب مدنی)

"شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حقایق ممکنات وہ اسماء و صفات ہیں جو مرتبۂ علم میں متمیز ہیں۔ اور شیخ مجدد فرماتے ہیں کہ حقایق ممکنات وہ عکوس اسماء و صفات ہیں جو اعدام مقابلہ میں منطبع (منقوش) ہو گئے ہیں اور ان دونوں تعبیروں میں محض ایک ضعیف سا فرق ہے ...... یہ بات کہ حقایق الممکنات، عکوس اسماء ہیں، شیخ اکبرؒ کے مسلک سے مخالف نہیں ہے۔"

نوٹ :۔ میں نے بنظر اختصار اس مسئلہ کی صرف فلسفیانہ بنیاد کی توضیح پر اکتفا کیا ہے جو حضرات اس کی قرآنی بنیاد سے آگاہی کے طالب ہوں وہ اس عاجز کم سواد کی "شرح اسرار خودی" کا از صـ۲۰۷ تا صـ۲۲۵ مطالعہ فرمالیں ۱۲۔

فصل ہفتم

غالب کی مقبولیت کے اسباب
اور
شعرائے مابعد پر اُن کا اثر

زندگی میں ناقدری کی شکایت

اگرچہ غالب کی زندگی میں بھی ان کے کمالِ فن کی بہت قدر ہوئی مگر وہ خود بھی قدر و منزلت کا مستحق اپنے آپ کو سمجھتے تھے اس سے محروم رہے۔ اس محرومی یا ناقدری کا اظہار انہوں نے بار بار کیا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس قدر بلندی بخشی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہیں سمجھا۔"

اس شعر میں بھی در پردہ اسی ناقدری کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

بیا در ید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخنائے گفتنی دارد

اس کے باوجود مرزا کو یہ یقین تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب میرے کلام کی قدر ہوگی۔

ع شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

مقام مسرت ہے کہ غالب کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی۔ موجودہ زمانہ میں، باستثنائے اقبال، مقبولیت کے اعتبار سے کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے۔ ڈاکٹر بجنوری، شیخ محمد اکرام، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے

(۲) معنی آفرینی اور نازک خیالی کے بہترین نمونے ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

(۳) ان کا کلام شوخی، طنز، اور ظرافت کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔

(۴) اپنے اشعار میں انسانی فطرت کی دلچسپ داستان بیان کی ہے۔ جو پڑھتا ہے اسے آپ بیتی کا لطف آتا ہے۔

(۵) چونکہ ان کا کلام مشاہدات قلبی کا آئینہ ہے اس لیے ہر شخص متاثر ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو ترجمان حقیقت، لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:-

نظم اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

(۶) ان کی مقبولیت کا راز، ان کے فلسفہ و تصوف میں نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کے اشعار تو عوام کی فہم سے بالاتر ہیں۔ بلکہ داخلی (باطنی) کیفیات کی مصوری، رنگین جذبات کی تصویر کشی، نفس انسانی کی دھیمی آوازوں اور قلب انسانی کی دھڑکنوں کو حسین الفاظ کے پیکر میں پیش کرنے میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انہیں عالم رنگ و بو کے حقایق بیان کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

(۷) میخوار ہو یا محتسب، عاشق مزاج ہو یا فلسفی، ظرافت کا دلدادہ ہو یا غمزدہ دلدادۂ فن ہو یا جاں دادۂ معنی، پرستار حسن و شباب ہو یا جویائے حقیقت،

زاہد شب زندہ دار ہو یا رند بادہ خوار، لاہوتی ہو یا ناسوتی اُن کے کلام میں ہر شخص کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ اس تنوع کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کہ جو شخص حق پرستوں کا ہمنوا ہو کر یہ نکتۂ معرفت بیان کر رہا ہو:۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

وہی شخص مادہ پرستوں کا ہم مشرب ہو کر اپنی پیش دستی کا یوں اعتراف کر رہا ہو

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایکدن

(۸) ایک بڑی وجہ ان کی مقبولیت کی یہ ہے کہ وہ نئی طرز کے آدمی تھے۔ عصرِ حاضر ان کے اندازِ فکر اور اسلوبِ تخیل کی تائید کر رہا ہے۔ ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز، تقلید سے نفرت اور جدت سے الفت ہے اور اس زمانہ میں یہی دونوں باتیں مرغوب خاص و عام ہیں۔ ہر شخص الا ماشاء اللہ یا تو مجتہد بنا ہوا ہے یا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اتباعِ سلف سب کی نظروں میں مذموم ہے اور غالبؔ! طرزِ فکر در کنار، مذہب کے باب میں بھی تقلید و اتباع سے نفور تھے۔

با من میاویز اے پسر فرزند آذر را نگر!
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

(۹) انھوں نے اپنی شاعری میں اسرار حیات بیان کئے ہیں اور چونکہ ہر شخص جویائے اسرار ہے اس لیے جسے دیکھو غالبؔ کا پرستار ہے۔

(۱۰) ان کے دوستوں خصوصاً حضرت علامۂ دوراں مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم اور حضرت مفتی صدر الدین آزردہ مرحوم نے ان کے کلام کا انتخاب ہی نہیں کیا! بلکہ ان کو قدم قدم پر صحیح مشورے دئے جن کی بدولت ان کے کلام کو چار چاند لگ

گئے۔ اگر یہ حضرات انہیں بروقت متنبہ نہ فرماتے تو ان کے جام شاعری کا خط سراسر رشتۂ گوہر" ہو کر رہ جاتا۔[۱]

(۱۱) ان کی شاعری میں خلاقی، معنی آفرینی، صنعت گری، گرمیٔ اندیشہ، بلندیٔ تخیل، اسلوب بیان، طنز و مزاح، شوخی و ظرافت، نفسیاتی گہرائی اور حسن ادا یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم جمع ہوگئی ہیں اور ان کا لازمی نتیجہ مقبولیت ہے۔

غالب کی مقبولیت کا اظہار تین صورتوں میں ہوا ہے:۔

(ا) ان کے بہت سے اشعار ضرب المثل یعنی زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں اور کسی شاعر کے کلام کی مقبولیت، دلکشی اور تاثیر کی اس سے بڑی اور واضح دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

(ب) تمام نقادان فن، باستثنائے معدودے چند، ان کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہیں اور اس زمرۂ عالیہ کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے بلکہ آج کل ان کے کلام سے شیفتگی کا اظہار، حلقۂ ارباب ذوق میں اعتبار حاصل کرنے کا ایک مجرب نسخہ بن گیا ہے۔

(ج) عصر حاضر کے بعض بہترین شعراء نے ان کا تتبع کیا ہے یعنی اپنے طرزِ عمل سے ان کی استادی، عظمتِ فکر اور اسلوب بیان کی دلکشی کا اعتراف کیا ہے۔

ذیل میں ان تینوں صورتوں کی قدرے وضاحت کی جاتی ہے:۔

(ا) اس خصوصیت کی طرف چونکہ ہم گذشتہ صفحات میں اشارہ کر چکے ہیں۔

---

[۱] قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
مرزا نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ شعر کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہے ۱۲

اس لیے یہاں اس کا اعادہ ضروری ہے۔ صرف اتنی صراحت کافی ہے کہ غالب چونکہ شیکسپیئر کی طرح فطرتِ انسانی کے بہت بڑے نبض شناس تھے اس لیے انہوں نے جذبات و کیفیاتِ قلبی کی اس قدر گوناگوں تصویریں کھینچ دی ہیں کہ جب کسی کو اپنے جذبات و احساسات کا بیان مقصود ہوتا ہے تو اُسے ان کے کلام سے ایک نہ ایک شعر حسبِ حال ضرور مل جاتا ہے، خواہ وہ شخص واعظ ہو یا خطیب، مومن ہو یا کافر، ایڈیٹر ہو یا ملیڈر، انشاء پرداز ہو یا فنکار، قاضی ہو یا مفتی، مدرس ہو یا منشی، وکیل ہو یا دادخواہ، ایکٹر ہو یا افسانہ نگار۔

(ب) اس ضمن میں ہم سب سے پہلے علامۂ اقبال کے کلام سے چند اشعار پیش کرتے ہیں:۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ؎ ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے ؎ بن کے سوزِ زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار ؎ تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ دار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں ؎ تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر ؎ خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ؎ ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے[1]

---

[1] اقبال نے اس نظم میں کلامِ غالب کی حسبِ ذیل خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔ رفعتِ تخیل، حقیقت پژدہی، عکاسیٔ فطرتِ انسانی۔ شوخی اور ظرافت مضمون آفرینی۔ فارسیت کا غلبہ۔ شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر کا دلکش امتزاج۔

ڈاکٹر بجنوری لکھتے ہیں :۔

" دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو وہ شعرائے المانیہ (جرمنی) کا سرتاج گوئٹے ہے۔ دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ قدیم اور جدید خیالات، حقیقت اور مجاز، قدرت اور حیات کی کثرت اُن کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے۔ دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں۔ تہذیب، تمدن، تعلیم تربیت، زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو"

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں :۔

" غالب نے شعر و ادب کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن معاملہ فقط شعر و ادب کا نہیں ہے۔ غالب کا مطمح نظر بہت بلند تھا اور اقبال کو چھوڑ کر باقی تمام اردو شعرا پر غالب کی بنیادی فوقیت اور ان کے کلام کی دوامی کشش کا ایک راز یہ ہے کہ ان کا منتہائے مقصود فقط الفاظ کے خوش رنگ طوطے مینا بنانا نہ تھا، بلکہ حقیقت کو بے نقاب کرنا "

(حکیم فرزانہ ص ۵۳)

ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں :۔

" جام شاعری میں جو بادۂ گلفام بھری گئی ہے وہ شاعر کا فلسفہ ہے اور خمِ چشم ساقی آرٹ کی تیر نگیاں ہیں جو شراب میں تحلیل ہو کر شاعری سے الگ "چیز دگر" کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ یہی "چیز دگر" غالب کی شاعری ہے جو دراصل شاعری نہیں بلکہ فطرت کی ترجمانی ہے، آرٹ اور فلسفہ کا امتزاج ہے۔ یہ بات کم سے کم اردو شعرا میں غالب کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔"

(فلسفۂ کلام غالب ص ۱۸۲)

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :۔

"مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین چیزیں دیں، غالبؔ، اُردوؔ، اور تاجؔ محل۔ غالب نے غزل کو تہذیب کا درجہ دیا اور اس کو ایک ایسی فضا دی جہاں اُردو کے تمام ممکنات شعری و شاعری کو برگ و بار لانے کے لیے سہولتیں فراہم کی ہیں۔ غالب ہی کا تصرف تھا جس نے غزل کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو غزل بنا دیا۔"

ان چند اقتباسات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ صفِ اول کے نقادانِ فن کی اکثریت غالب کی مدح و ثنا میں رطب اللسان اور عذاب البیان ہے اس کے بعد اب ہم ان کی مقبولیت کے تیسرے پہلو کو قدرے تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

چونکہ غالب کا کلام، محاسنِ شعری کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے اس لیے عصرِ حاضر کے بعض نامور شعراء نے وہ خصوصیات اپنے کلام میں پیدا کیں۔ ذیل میں ان شعراء کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین کو غالب کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہو سکے کیونکہ کسی بڑے شاعر کی عظمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعد میں آنے والے شعرا اس کی طرزِ ادا یا اس کے اندازِ بیان کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔ بالفاظِ دگر اس کے رنگ میں کہنے کی کوشش کریں۔

(۱) ثاقب لکھنوی (مرزا ذاکر حسین، ولادت اکبر آباد ۱۸۶۹ء وفات لکھنؤ ۱۹۴۹ء)

سنائیں کیا تمہیں نیرنگ عشق کا قصہ ؎ تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا
شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو ؎ جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا
کوئی بات ایسی ہے جو دل میں ترا تیر جم کے بیٹھا ؎ نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا
اس کے سننے کے لیے جمع ہوا ہے محشر ؎ رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے ؛ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
یہ ہے بہتے ہوئے دریا کی آواز ! ؛ وہیں جانا ہے آئے تھے جہاں سے
نظر کر غور سے آئینہ اسرار ہستی پر ؛ جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ؛ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے !
کہے جا بندھ چلا ہے داستاں کا رنگ محفل میں ؛ مری سننے لگے ہیں رو ئے جاناں دیکھنے والے

---

(۲) وحشت کلکتوی (خان بہادر رضا علی، ولادت کلکتہ ۱۸۸۱ء)

نہیں آئین استغنا حریف عجز مشتاق ؛ دل آئینہ محو بے قراری ہائے جوہر تھا
تیرے ہی ذوق جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم ؛ یاں ورنہ امتیاز وجود و عدم نہ تھا
میں سادہ لوح واقف رسم بتاں نہ تھا ؛ اقرار عشق کر کے گنہ گار ہو گیا
معاذ اللہ ! اتنی نا امیدی ؛ کہے گی وہ نگار آشنا کیا
خفا تم جرم الفت پر خجل میں جرم الفت سے ؛ نہ تم ملنے پہ آمادہ نہ میں ملنے کے قابل ہوں
اس دل نشین ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے ؛ جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دئے ہیں
بیخودی عشق نے مجھ کو دیا درس خودی ؛ میں ہی میں ہوں ہر طرف میرے سوا کوئی نہیں
وحشت مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر ؛ جس میں کہ حسن معنی و لطف زباں نہ ہو
گو میں ہوں تجھ سے دور تری آرزو تو ہے ؛ تیرا پتہ ملے نہ ملے جستجو تو ہے
پروانے کی ہے موت پہ اے شمع مجھ کو رشک ؛ تیرا شہید ناز تیرے روبرو تو ہے
جفا کے بعد وہ آمادہ ہیں وفا کے لیے ؛ اک اور ظلم سہی جان مبتلا کے لیے

---

(۳) عزیز لکھنوی (مرزا محمد ہادی ولادت لکھنو ۱۸۸۲ء وفات لکھنو ۱۹۳۵ء)

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن ؛ بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

زبان دل کی حقیقت کو کیا بیان کرتی ∴ کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا
ہے ان کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں ∴ کسی کا راز کسی پر عیاں نہیں ہوتا
اٹھائیے جا کے کہاں لطفِ جستجو کوئی ∴ جگہ وہ کون سی ہے تو جہاں نہیں ہوتا
اب کھل رہا ہے نزع میں یہ رازِ حسن و عشق ∴ وہ شوخ دل میں تھا میں سمجھتا تھا درد تھا
بے حقیقت دل کی ہستی کو سمجھتے تھے مگر ∴ اس لہو کی بوند نے عالم تہ و بالا کیا
عشق ہے اک طلسمِ رازِ بقا ∴ مٹ گیا دل مگر فنا نہ ہوا
پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا ∴ ہوتا اگر یہ دل ہی مرے اختیار میں
اس کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات ∴ جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
بیکار یہ غصہ ہے کیوں اس کی طرف دیکھو ∴ آئینہ کی کیا ہستی، تم اپنی طرف دیکھو
دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال ∴ ہاں ہاں محبت آپ نے کی اور ضرور کی
کوئی کیا اشکِ ندامت کی حقیقت سمجھے ∴ یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل کوئی

---

(۴) فانی بدایونی (شوکت علی خاں، ولادت بدایوں ۱۸۷۹ء، وفات حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء)

نشانِ مہر ہے ہر ذرہ ظرفِ مہر نہیں ∴ خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر ∴ بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا
آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے ∴ تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ∴ بات پہنچی تیری جوانی تک
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ∴ رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں ؛ آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا
کیا ہے خلق مجھے باوجودِ علمِ گناہ ؛ یہ ابتداء ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے
اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ؛ زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
جیتے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی ؛ ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں
اٹھا بھی دے نگہِ ماسوا نگر کا حجاب ؛ یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے دیکھنا کیا ہے
ہے وہ مختار سزا دے کہ جزا دے فانی ؛ دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہ گار ہیں ہم
دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے ؛ دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی
محشر میں ہجرِ دوست سے طالب ہوں داد کا ؛ آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

---

(۵) اصغر گونڈوی (شیخ اصغر حسین، ولادت گونڈہ ۱۸۸۴ء وفات الہ آباد ۱۹۳۶ء) :-

ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے ؛ موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا
نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم ؛ بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم
اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا ؛ اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں
سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی ؛ کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے
میں ہوں ازل سے گرم رو عرصۂ وجود ؛ میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے
خستگی نے کر دیا اس کو رگِ جاں سے قریب ؛ جستجو ظالم کہے جاتی تھی منزل دور ہے
یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری ؛ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر ؛ تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا!
نمودِ جلوۂ بیرنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں ؛ کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا ؛ جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

عرش تک تو ساتھ اپنے لے گیا تھا حسن کو ❊ پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

---

(۶) اثر صہبائی (عبد السمیع پال ایم۔ اے خلف حضرت مولوی احمد دین صاحب مرحوم سیالکوٹی، ولادت ۱۹۰۱ء) :-

تم اب دل کو پوچھ رہے ہو تم کو کیا معلوم نہیں ❊ وہ شیشہ تو مدت گذری ٹوٹ کے چکنا چور ہوا

بیچارے انساں کا مقدر زنجیروں میں جکڑا ہے ❊ اس پر اپنے کو مختار سمجھنے پر مجبور ہوا

دل کو ایک خرابہ پا کر ناداں اس کو چھوڑ گیا ❊ ہم نے لیکن ڈھونڈ لیا ہے گنج اس ویرانے میں

ہر اک ذرہ کے آئینہ میں خود ہی جلوہ آرا ہوں ❊ مجھے ہر شے یہاں کی آشنا معلوم ہوتی ہے

خدا کو ڈھونڈنے والے! خدا کو دل ہی میں ڈھونڈھ ❊ جو خودنگر نہ ہوا مرد با خدا نہ ہوا

لب خموش، نگاہ محموش، اشک خموش ❊ عجیب شئے ہیں یہ اظہار مدعا کے لیے

میری ہی کم نگہی مانع دیدار رہی ❊ تو تو بے پردہ رہا تو نے تو پردہ نہ کیا

کہیں تھا پردۂ کعبہ کہیں تھا پردۂ دیر ❊ ہر ایک پردے میں آخر وہی چھپا نکلا

---

(۷) آزاد دہلوی (شری جگن ناتھ خلف الرشید شری تلوک چند محروم میانوالی ۱۹۱۸ء) :-

زندگی ہے تمام سوز و گداز ❊ اے غم دوست! تیری عمر دراز

مرے درد کی لطافت ہے تری نظر کا پرتو ❊ مرے پردۂ سخن میں ترا نطق ہے غزلخواں

میں نے پوچھا جو زندگی کیا ہے ❊ ہاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا!

تجھے بھلا نہ سکوں تجھ کو یاد رکھ نہ سکوں ❊ یہ راہ عشق میں آیا عجب مقام اے دوست

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے ❊ معلوم نہیں روح کو یہ کس نے پکارا

عشق اور خرد میں جو تفاوت ہے تو یہ ہے ❊ عشق ایک حقیقت ہے خرد ایک افسانہ

پردے دل و نگاہ پہ ہیں حسن پر نہیں ؛ اپنے دل و نگاہ سے پردے اٹھا کے دیکھ
کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے ؛ ایسے کٹے ہوئے ہیں کسی داستاں سے ہم
سب اپنے دل کی تجلی تھی جو نظر آئی ؛ کمال شوق تھا سارا کمال طور نہ تھا

---

(۸) فراق گورکھپوری (شری رگھوپتی سہائے ایم اے خلف منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت، ولادت گورکھپور ۱۸۹۶ء) :-

میں ہوں دل ہے، تنہائی ہے ؛ تم بھی ہوتے اچھا ہوتا!
جہاں کو دیگی محبت کی تیغ آب حیات ؛ ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں ؛ اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا ؛ کون ہے صبح ازل سے خراماں
یوں ہی فراق نے عمر بسر کی ؛ کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں
وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا ؛ اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے بیگانہ
دیار دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں ؛ حریم عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے ؛ نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گذر پھر بھی

بخوف طوالت ان اشعار پر کوئی تبصرہ تو نہیں کیا جا سکتا مگر اتنا کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ ناظرین ان جواہر پاروں کو غور سے پڑھیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان تمام شعراء کے کلام میں حسب ذیل خصوصیات مشترک ہیں :-

رمز و کنایہ، جذبات قلبی کی عکاسی، سنجیدگی، سوز و گداز، رفعت تخیل، پاکیزگی، انداز بیان کی دلکشی، محدود شرف النسانی، روحانیت اور تصوف اور اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ غالب کی شاعری انہی عناصر سے مرکب ہے،

محترمی فراقؔ نے کتنی اونچی بات کہی ہے کہ :-

"انسان کی عظمت کا احساس، عرفانِ نفس اور کائنات کے روحانی پہلو کا احساس یہ تمام باتیں غزل میں تصوف ہی کے لگاؤ سے آتی ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ تصوف کا رنگ اس دورِ مادیت میں بھی ان تمام شعراء کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ مثلاً اگر اثرؔ صہبائی رازِ وحدت الوجود کو یوں فاش کرتے ہیں۔

انجم و مہر و ماہ میں جلوے دکھا رہا ہے کون
جلوے دکھا دکھا کے پھر خود کو چھپا رہا ہے کون

تو جگن ناتھ آزاد اسی حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں :-

ایک سمجھتا ہے دیوانہ کعبہ ہو یا بت خانہ!
یہ اک خلوتِ جانانہ ہے وہ اِک جلوتِ جانانہ

اسی یک رنگی کو دیکھ کر کسی نے یہ سوال کیا تھا :-

در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں چرا ست
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

شرح دیوانِ غالب

(ردیف الف)

(۱)

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ٭ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

حل لغات:- نقش کنایہ ہے مخلوقات سے۔ تحریر کنایہ ہے تخلیق سے۔ شوخی، یہ لفظ تشریح طلب ہے۔ کئی معنوں میں مستعمل ہے۔

(ا) شوخی بمعنی شرارت، بے حیائی، دل لگی، گستاخی۔

(ب) شوخی بمعنی رعنائی یا دلکشی۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ٭ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

(ج) شوخی بمعنی دو متضاد چیزوں کا اجتماع جن کا انفکاک نہ ہو سکے، اور یہاں یہی معنی مراد ہیں[1]۔ شوخیٔ تحریر (تخلیق) کیا ہے؟

(ا) ہر مخلوق صانع کے کمال پر گواہ ہے یعنی صانع نے ہر شی کی تخلیق میں اپنے کمال کا اظہار کیا ہے مگر ہر شی روبزوال ہے۔ کسی کو ثبات نہیں ہے۔

(ب) ہستی موجب آزار بھی ہے اس کے باوجود ہر شخص کو ہستی سے پیار بھی ہے۔

---

[1] معشوق کو شوخ اسی لیے کہتے ہیں کہ اگرچہ اس کے طرز عمل سے عاشق کو ایذا پہنچتی ہے اس کے باوجود وہ اس کے طرز عمل (جفا و ستم) کو محبوب رکھتا ہے۔

(ج) ہر انسان فانی ہے مگر ہر شخص میں بقا کی آرزو بھی کارفرما ہے۔

(د) ہر شئی کی تعمیر میں تخریب کا سامان پوشیدہ ہے۔

کاغذی پیرہن۔ (۱) کنایہ ہے فریادی سے، کیونکہ فریادی، کاغذ کا لباس پہن کر حاکم کے سامنے جایا کرتا تھا۔ (۲) کنایہ ہے ضعف یا کمزوری یا عدم ثبات سے۔

پیکرِ تصویر۔ کنایہ ہے مخلوقات کے وجود ظاہری سے۔

مطلب :۔ غالب نے اس شعر کا مطلب خود بیان کیا ہے :۔

" ایران میں یہ رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلاتا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کرے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے۔ کہ جو صورتِ تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو، (اشیائے کائنات کی ہستی اگرچہ محض اعتباری ہو) موجب رنج و ملال و آزار ہے۔" (خط بنام عبدالرزاق شاکر گورکھپوری)

تبصرہ :۔ نقش، شوخیٔ تحریر کا فریادی ہو یا نہ ہو، غالب کا یہ شعر جو سر مطلع دیوان ہے، ان کی شوخیٔ فکر کا بلا شک و شبہ آئینہ دار ہے۔ اگرچہ انہوں نے عام شعراء کی تقلید میں اپنے دیوان کا آغاز حمد باری سے کیا ہے مگر یہاں بھی اپنی شوخیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ بایں طور کہ حمد کے پردے میں خدا سے گلہ کیا ہے کہ اے خدا! جب تو نے ہر مخلوق کو فنا کے لیے پیدا کیا تو پیدائش میں اس قدر کمال کا اظہار کیوں کیا؟ بالفاظ دگر، جب ہست کر کے مٹانا منظور تھا تو ہست کرنا ہی کیا ضرور تھا؟

غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں غالب نے اپنا نظریۂ حیات پیش کر دیا

ہے کہ ہستی خواہ وہ اعتباری (غیر حقیقی) ہی کیوں نہ ہو، بہر حال موجب آزار ہے اس نظریہ کی تائید دوسرے اشعار سے بھی ہوتی ہے مثلاً

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ÷ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ÷ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک[1]

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے ÷ غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

بنیادی تصور :- ہستی موجب رنج و ملال ہے۔

---

(۱) یہ توارد بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ غالب کے جرمن ہمعصر شوپن ہاور (۱۷۸۸ء تا ۱۸۶۰ء) نے بھی ہستی سے متعلق یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ ہستی سراپا کشمکش اذیت اور شر ہے۔ ہستی کی تہ میں "ارادہ" کارفرما ہے اور سارا فساد اسی کا پیدا کردہ ہے۔ انسانی زندگی اس لائق نہیں کہ اس کی آرزو کی جائے کیونکہ وہ دکھ اور اذیت سے معمور ہے۔ اس لیے خواہش زیست (جینے کی آرزو) کو ختم کر دو۔ تاکہ دکھ سے نجات حاصل ہو سکے۔

(تفصیل کے لیے دیکھو "کائنات بحیثیت ارادہ و تصور" باب چہارم فصل پنجاہ و ہفتم)

شوپن ہاور نے یہ نظریہ بودھ دھرم سے اخذ کیا جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے۔ "سَروَم دُکھم" یعنی ساری کائنات یا ہستی سراسر دکھ اور موجب آزار ہے

نوٹ :۔ غالب کے شارحین میں سے صرف نظم طباطبائی نے اس شعر کو بے معنی قرار دیا ہے مگر مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ ایک شخص کو اس نظریہ سے تو اختلاف ہو سکتا ہے جو غالب نے اس شعر میں پیش کیا ہے، مگر خود شعر کو بے معنی یا مہمل کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔۱۲

---

(۲) کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ ❊ صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

حل لغات :۔ کاوکاو (مصدر کاویدن بمعنی کھودنا، تلاش کرنا، محنت کرنا) تلاش جستجو، محنت شاقہ۔ خوبی اس لفظ میں یہ ہے کہ اگلے مصرع میں جوئے شیر کا ذکر کیا ہے جو فرہاد کی کاوش کا مظہر ہے۔ تنہائی، کنایہ ہے شب فراق سے "صبح کرنا شام کا" یعنی شب فرقت بسر کرنا۔ "جوئے شیر کا لانا ہے" یعنی اتنا ہی دشوار اور روح فرسا ہے جتنا پہاڑ کھود کر نہر نکالنا۔

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ حالت فراق میں مجھے مرجانا چاہیئے تھا۔ زندہ اسلئے ہوں کہ سخت جان ہوں مگر جس مصیبت سے ہجر کی رات کاٹتا ہوں وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ رات کاٹنا پہاڑ کھودنے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

(بنیادی تصور :۔ عاشق کو شب ہجر بسر کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا فرہاد کے لیے پہاڑ کھودنا دشوار تھا۔

---

(۳) جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے ❊ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

شوق سے شوقِ شہادت یا اشتیاق قتل مراد ہے۔ دم (۱) اگر سینہ کی رعایت ملحوظ ہو تو دم کے معنی سانس۔ (۲) اگر شمشیر سے مناسبت مدنظر ہو تو دم کے معنی باڑھ۔ یہ شعر غالب کی اس خصوصیت کا مظہر ہے جس کی بدولت وہ "غالب"

ہو گئے یعنی اس میں شاعرانہ خیال بندی بھی ہے اور حسنِ تعلیل بھی۔

مطلب :- (۱) میری آرزوئے قتل میں اتنی کشش ہے کہ تلوار کے سینہ سے اس کا دم باہر نکل آیا ہے یعنی وہ خود مجھے قتل کرنے کے لیے بیتاب ہے (دم سینہ سے باہر آجانا، کنایہ ہے شدید آرزو یا بیتابی سے)

(۲) دوسری خوبی یہ ہے کہ غالب نے ایک امرِ واقعی کی شاعرانہ توجیہہ کی ہے کہ میرے قتل کے لیے تلوار کی باڑھ، تلوار سے باہر آگئی ہے (حالانکہ باڑھ اندر ہوتی ہی نہیں ہمیشہ باہر ہوتی ہے)

بنیادی تصور :- (شدتِ آرزوئے قتل یا جذبۂ شوقِ شہادت)۔

---

(۴) آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ؛ مدعا، عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

حل لغات :- آگہی (آ گ ہی) بمعنی عقل و فہم۔ دامِ شنیدن کنایہ ہے، سمجھنے کی کوشش سے۔ عنقا کنایہ ہے معدوم یا ناپید سے (عنقا ایک فرضی پرندے کا نام ہے جس کا وجود خارج میں کہیں نہیں ہے) عالمِ تقریر یعنی تقریر یا بیان۔

مطلب :- عقل کو صیاد فرض کر کے کہتے ہیں کہ وہ جتنے چاہے جال بچھائے میری تقریر کا مفہوم چونکہ عنقا یعنی معدوم ہے (اور معدوم شئی جال میں پھنس نہیں سکتی) اس لیے مدعا عقل کی گرفت میں نہیں آسکتا یعنی عقل میرے کلام کی تہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

بنیادی تصور :- (میرے کلام کو سمجھنا بہت مشکل ہے) چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :-

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ؛ سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ؛ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

---

(۵) بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا ٭ موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

بسکہ بمعنی چونکہ۔ آتش زیر پا سے مراد ہے اضطراب یا بیتابی۔ موئے آتش دیدہ سے مراد ہے ضعف یا کمزوری۔

مطلب :- اس شعر کی ساری عمارت لفظِ "آتش" پر قائم ہے یعنی یہ شعر مرزا کی خیال بندی کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ "آتش زیر پا" کے دو معنی ہیں اور انہی دو معنوں کے جمع ہو جانے سے شعر میں غالبیت پیدا ہو گئی ہے۔ واضح ہو کہ مرزا ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ شعر میں ایسا لفظ لائیں کہ جس کے دو معنی ہوں ایک لفظی یا لغوی اور دوسرے مرادی یا اصطلاحی اور یہ وہ خصوصیت ہے۔ جو شروع سے آخر تک ان کے کلام (دیوان) میں موجود ہے۔ "آتش زیر پا" کی مناسبت سے "موئے آتش دیدہ" لائے ہیں جس کی وجہ سے لطفِ کلام دوبالا ہو گیا ہے موئے آتش دیدہ (جلا ہوا بال) بل کھا کر حلقہ کی طرح گول ہو جاتا ہے۔ اس لیے شعر میں تشبیہ کی صنعت بھی پیدا ہو گئی ہے۔

آتش زیر پا کے دو معنی ہیں :-

(۱) محاورہ کے اعتبار سے اس کے معنی ہیں مضطرب، بیتاب یا بیقرار ہونا۔

(۲) لغوی اعتبار سے اس کا مطلب ہے وہ شخص جس کے پاؤں کے نیچے آگ ہو۔

اسی طرح موئے آتش دیدہ کے دو معنی ہیں :-

(۱) جلا ہوا بال۔

(۲) نہایت کمزور (کیونکہ جلنے کے بعد بال خاکستر ہو جاتا ہے)

مطلب :- کیا ہے؟ بہت پیش پا افتادہ، مگر اسے تشبیہ اور اندازِ بیان کے پردوں میں پوشیدہ کر دیا ہے یعنی صرف اس قدر کہ چونکہ میں حالتِ اسیری میں

بھی بہت مضطرب اور بیتاب ہوں اس لیے میری وحشت اور جوشِ جنوں کے سامنے زنجیر کے حلقوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ عاشق جوشِ جنوں میں زنجیر کو ایک جھٹکے میں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بالفاظِ دگر، عاشق کو پابزنجیر کر دینے سے جذبۂ عشق فنا نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی ❊ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

تبصرہ بظاہر اس غزل کا ہر شعر منفرد اور غیر مربوط نظر آتا ہے لیکن اگر پوری غزل کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو تمام اشعار مربوط نظر آئیں گے۔

(۱) لفظِ نقش سے اگرچہ تمام کائنات مراد ہو سکتی ہے لیکن دراصل انسان مراد ہے کیونکہ تمام مخلوقات میں شعورِ ذاتی کی صفت صرف اسی میں پائی جاتی ہے اور کوئی حیوان اس حقیقت کا احساس یا ادراک نہیں کر سکتا کہ "ہستی موجبِ آزار ہے"

(۲) چونکہ ہستی موجبِ آزار ہے اس لیے ہر شخص آزار (دکھ) سے بچنے کے لیے دن رات کاوش کرتا رہتا ہے اور یہ کاوش ہر شخص کو انفرادی طور پر کرنی پڑتی ہے۔ بظاہر ایک گھر میں پانچ بھائی رہتے ہیں مگر کوئی بھائی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اس لیے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہر شخص تنہا ہے۔ نیز اس عالم میں ہر شخص کو دکھ سے بچنے کے لیے ایسی ہی جدوجہد کرنی پڑتی ہے جیسے فرہاد کو جوئے شیر لانے کے سلسلہ میں کرنی پڑی۔ اور جو لوگ جدوجہد (کادکاد) نہیں کرتے ان کی زندگی سراپا "رنج وملال و آزار" بن جاتی ہے۔

(۳) دمِ شمشیر کی طرح، حصولِ راحت اور دفعِ آزار کے سلسلہ میں ہر شخص کا

دم سینہ سے باہر ہی نظر آتا ہے یعنی ہر شخص راحت کا متمنی ہے اور اذیت سے گریزاں۔ بالفاظِ دگر ہر شخص کو مختلف قسم کی تمنائیں ہر لحظہ سرگرم اضطراب رکھتی ہیں۔

(۴) ہر شخص اپنے ہی عالم میں زندگی بسر کرتا ہے۔ بظاہر تمام انسان ایک ہی عالم میں رہتے ہیں جسے دنیا کہتے ہیں مگر بباطن ہر شخص اپنی دنیا میں رہتا ہے اور ایک انسان خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے دوسرے کی دنیا (دوسرے کے قلبی احساسات، معتقدات، خیالات اور ارادوں) سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) جس بات کو مطلع میں بیان کیا تھا اسی کو باندازِ دگر مقطع میں پیش کیا ہے یعنی اگرچہ ہر سوسائٹی (معاشرہ) نے ایسے قوانین وضع کر دئے ہیں جن کی وجہ سے انسان پر پابندیاں عائد ہو گئی ہیں (یہی اسیری ہے)، مگر ان پابندیوں کے باوجود ہر شخص حصول راحت اور دفع آزار کے لیے آتش زیر پا ہے (بیتاب ہے) اور اس کے ذاتی مفاد کے سامنے وہ زنجیریں بہت کمزور (موئے آتش دیدہ) ثابت ہوئی ہیں ۱۲

۲

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ ✤ مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

حل لغات: جراحت بمعنی زخم، الماس بمعنی ہیرا۔ مشہور ہے کہ ہیرا کھا لینے سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے چنانچہ داغ کہتے ہیں۔

آنسو نہ پیے جائیں گے اے حضرت ناصح
ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہیں جاتی

ارمغان بمعنی تحفہ یا ہدیہ۔ مبارکباد میں طنز کا پہلو مضمر ہے۔

مطلب: غمخوار سے عشق بھی مراد ہو سکتا ہے اور ناصح بھی، لیکن گمان غالب

یہ ہے کہ یہاں عشق ہی مراد ہے، کیونکہ یہ تحفے عاشق کو عشق ہی کی بارگاہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ مطلب واضح ہے کہ عشق کے کوچہ میں قدم رکھنے کے بعد عاشق کو خون جگر، زخم جگر اور داغ جگر کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہوتا۔

بنیادی تصور: عشق انسان کے حق میں بلائے جان ثابت ہوتا ہے۔

۳

(۱) جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ٭ صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

تشریح الفاظ: قیس، مجنوں کا اصلی نام ہے جو نجد (عرب) کے مشہور قبیلہ بنی عامر سے تھا۔ اسی لیے اس کو قیس عامری بھی کہتے ہیں۔ عشق میں اس کے ہم پلہ تو اور بھی گذرے ہیں مگر شہرت کے اعتبار سے کوئی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ بروئے کار نہ آیا یعنی ناموری حاصل نہ کر سکا۔ مگر بمعنی شاید۔ بہ، یہ حرف یہاں مماثلت کے معنی دیتا ہے۔ بہ تنگیٔ چشم حسود تھا یعنی چشم حاسد کی طرح تنگ۔ حاسد بہت تنگ نظر اور تنگ دل ہوتا ہے، دوسروں کی شہرت یا عزت گوارا نہیں کر سکتا۔

مطلب: کہتے ہیں کہ یہ بات بہت حیرت انگیز ہے کہ دنیائے عشق میں قیس کے سوا اور کسی عاشق کو اس درجہ شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے عاشقی بھی چشم حاسد کی طرح بہت تنگ نظر تھی جو دوسروں کی شہرت گوارا نہ کر سکی۔ صحرا بہت وسیع اور فراخ ہوتا ہے لیکن شاعر نے اسے چشم حاسد سے تشبیہ دے کر تنگ ثابت کر دیا۔ اس شاعرانہ تخیل کے علاوہ اور کوئی خاص بات اس شعر میں نہیں ہے۔

بنیادی تصور: شہرت یا ناموری بخت و اتفاق پر موقوف ہے۔ مثلاً ہینی بال

نے سکندر سے کچھ کم فتوحات حاصل نہیں کیں۔ اس کے باوجود سکندر کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے لیکن ہینی بال کو آج بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

---

(۲) آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست ؛ ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تشریح الفاظ :- آشفتگی بمعنی سرگشتگی یا پریشانی۔ سویدا، سیاہ نقطہ جو دل کے اندر ہوتا ہے۔ درست کیا۔ یہ نقش درست کردن کا لفظی ترجمہ ہے جس کے معنی ہیں تصویر بنانے کے بعد اسے نوک پلک سے درست کرنا۔ فوٹو گرافی کی اصطلاح میں اسے RETOUCHING کہتے ہیں۔ سرمایہ بمعنی علت یا سبب۔

مطلب :- شاعر نے آشفتگی کو دود سے اور سویدا کو داغ سے تشبیہ دی ہے اور شعر کی بنیاد اسی تشبیہ پر رکھی ہے۔ آشفتگی کو پریشانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ آشفتگی اور دود (دھویں) میں مناسبت یہ ہے کہ دود بھی پریشان ہوتا ہے اور آشفتگی بھی موجب پریشانی ہوتی ہے [۱]

پریشانی کے دو معنی ہوتے ہیں (۱) حالتِ انتشار یعنی کسی شئ کا فضا میں پھیل جانا۔ (۲) ہجوم افکار یعنی وہ حالت جس میں انسان کے خیالات میں انتشار پیدا ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری آشفتگی (پریشانی) سویدا (قلب کی سیاہی) کا موجب ہے۔ دوسرا مصرع بطور تمثیل ہے۔ یعنی ثابت ہوا کہ داغ (سویدا) کی علت، دود (آشفتگی) ہے۔ بالفاظ دگر داغِ سویدا ہماری آشفتگی (پریشانی)

---

[۱] بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

سے پیدا ہوا ہے۔

بنیادی تصور :- آشفتگی علتِ سویدا ہے۔

نوٹ :- ایسے اشعار جن کی بنیاد استعارات پر رکھی جائے یا جو واقعیت سے دور ہوں ان میں تاثیر یا شعریت پیدا نہیں ہو سکتی ۱۲

---

(۲) تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ؂ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

تشریح الفاظ :- معاملہ بمعنی تعلق یا ربط۔ زیاں کنایہ ہے صدمہ ہجر سے اور سود کنایہ ہے لطفِ وصل سے۔ معاملہ کی رعایت سے "سود و زیاں" لائے ہیں۔

مطلب :- اگر تجھ کا مخاطب محبوب کو قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ عاشق چونکہ ہر وقت خیال جاناں میں مستغرق رہتا ہے اس لیے جب وہ سویا تو اُس نے قدرتی طور پر اپنے محبوب کو خواب میں دیکھا (قاعدہ ہے کہ انسان جس بات کا تصور ہر وقت کرتا ہے خواب میں بھی وہی نظر آتی ہے) اور اس عالم میں لطفِ وصال بھی اُٹھایا اور صدمۂ ہجر بھی برداشت کیا لیکن جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں تھا۔

ع: خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

اب نہ لطفِ وصل ہے نہ صدمۂ ہجر۔ وہی عاشق ہے، اور وہی اُس کا عالم تنہائی۔

(ب) اگر "تجھ" کا مخاطب دنیا کو قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ درحقیقت دنیاوی زندگی ایک دھوکہ ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص خواب دیکھ رہا ہو۔ انسان اپنی غفلت یا نادانی سے فریب نظر کو حقیقت سمجھ لیتا ہے اور ساری عمر اس دنیا کے حاصل کرنے میں ضائع کر دیتا ہے لیکن جب موت آتی

ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے اور اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری عمر سراب کے پیچھے دوڑتا رہا۔ وہ دولت جس کے لیے تمام عمر جدوجہد کرتا رہا سب یہیں رہ جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کو دس لاکھ کا منافع ہوا دوسرے کو دس لاکھ کا نقصان لیکن اگر اگر دونوں کو بیک وقت موت آجائے تو دونوں برابر ہوجائیں گے۔ فی الجملہ مرتے وقت جب آنکھ کھلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ زیاں تھا نہ سُود تھا، سب دھوکا تھا۔

بنیادی تصور:۔ دنیاوی زندگی ایک دھوکا یا فریب نظر ہے، درحقیقت نہ زیاں ہے نہ سود۔ شیخ سعدیؒ نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

چو آہنگِ رفتن کند جان پاک
چہ بر تخت مُردن چہ بر روئے خاک

---

(۴) لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ❊ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مطلب:۔ زمانۂ عاشقی سے پہلے دل بھی پہلو میں تھا اور ہر طرح کا عیش بھی حاصل تھا لیکن عشق اختیار کرنے کے بعد دونوں سے محروم ہو گیا۔ اب ہر وقت یہی "سبق" پڑھتا رہتا ہوں کہ دل بھی ہاتھ سے گیا اور عیش زندگی بھی۔ کبھی دل بھی میرے پہلو میں تھا اور عیش بھی حاصل تھا۔

بنیادی تصور:۔ عالم عشق میں انسان اپنے دل اور اپنے عیش کا ماتم کرتا رہتا ہے اور کہتا رہتا ہے کہ دل از دست من رفت آں دل کہ در پہلوئے من بود۔

---

(۵) ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی ❊ میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تشریح الفاظ:۔ برہنگی لفظی معنی عریانی۔ مگر یہاں برہنگی کنایہ ہے معصیت یا

گناہوں کی کثرت سے جس کی بنا پر انسان، وجود کے لیے باعث شرم بن جاتا ہے[1]۔ لباس۔اس لفظ کے دو معنی ہیں (ا) عرفی معنی پوشاک (ب) وضع یا حالت۔

واضح ہو کہ غالب دانستہ ایسے الفاظ اپنے کلام میں لاتے ہیں جن میں ابہام ہوتا ہے۔علم معنی کی اصطلاح میں ابہام سے مراد ہے ایسا لفظ لانا جس کے دو معنی ہوں ایک معنی قریب دوسرا معنی بعید۔ اور شعر میں معنیٰ بعید کا ارادہ کرنا۔ یہاں لباس کے دو معنی ہیں اور شاعر نے معنی بعید یعنی وضع مراد لیا ہے لباس کیوں لائے؟ اس لیے کہ پہلے مصرع میں لفظ "برہنگی" ہے اور برہنگی اور لباس میں مناسبت ہے۔اسی کو اصطلاح علم بدیع میں رعایت لفظی کہتے ہیں میں نے اسی جگہ اس بات کی صراحت اس لیے کردی کہ یہ رنگ ہر غزل میں موجود ہے۔ ناظرین کلام غالب کا مطالعہ کرتے وقت اس نکتہ کو ملحوظ رکھیں ۱۲

مطلب:۔ چونکہ میں نے ساری عمر گناہوں میں بسر کی اس لیے میں لباس تقویٰ سے محروم ہو کر برہنہ یعنی ننگ وجود ہو گیا۔ میری اس برہنگی (معصیت) پر کسی حالت (کسی لباس) سے پردہ نہیں پڑ سکتا تھا۔ اس لیے میں ساری عمر لباس یعنی ہر حال میں انسانیت کے لیے باعث ننگ رہا۔ یہ حالت اس وقت دور ہوئی

---

[1] برہنگی میں اس آیت کی طرف تلمیح ہے:۔

بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا

(جب آدم اور حوا نے اس شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا اور بہشتی لباس اُن کے جسم سے اتر گیا یعنی وہ برہنہ ہو گئے تو ظاہر ہو گئے ان پر ان کے پوشیدہ مقامات اس لیے برہنگی کا لفظ کنایہ ہو گیا گناہ یا نافرمانی سے ۱۲

جب میں مر گیا، اور کفن میرے عیوب کا پردہ پوش بن گیا۔
بنیادی تصور:۔ انسان جب تک زندہ رہتا ہے ہر حال میں گناہ کرتا رہتا ہے (برہنہ رہتا ہے) اس کے گناہوں کا سلسلہ موت ہی سے منقطع ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ کفن پوش ہو جاتا ہے۔ شاعرانہ لطف اس میں یہ ہے کہ مُردے کے برہنہ جسم یعنی اس کی برہنگی کو کفن ہی ڈھانپتا ہے۔ شعر کی بنیاد لفظ برہنگی پر قائم ہے یعنی شاعر نے اس ایہام سے شعر میں یہ لطف پیدا کیا ہے جو لفظ برہنگی میں پایا جاتا ہے۔

---

(۶) تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ ؎ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا
تشریح الفاظ:۔ تیشہ بمعنی تبر یا بسولا یا کلھاڑی۔ سرگشتہ بمعنی مدہوش یا خارج العقل۔ خمارِ رسوم و قیود سے یہاں پابندیٔ رسوم کا نتیجہ مراد ہے۔
مطلب:۔ فرہاد پر طنز کیا ہے کہ وہ عشق میں کامل نہ تھا اسی لیے اس نے اپنی موت کے لیے اسباب ظاہری اور آلاتِ قتل کا سہارا لیا اگر وہ کامل ہوتا تو تیشہ کے بغیر ایک آہ سرد کھینچ کر ہی مر جاتا۔
ع کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
بنیادی تصور:۔ عشق اگر کامل ہو تو انسان، رسوم و قیود ظاہری سے آزاد اور بالاتر ہو جاتا ہے۔ یا عشق حقیقی انسان کو رسوم ظاہری سے آزاد کر دیتا ہے۔
نوٹ:۔ اس غزل کے اشعار میں محض لفظی صنعت گری ہے۔ ایسے اشعار سے دماغ تو لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن دل پر چوٹ نہیں لگ سکتی۔ ۱۲

---

(۴۰)

(۱) کہتے ہو، نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا ٭ دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

مطلب:- معشوق، عاشق سے کہتا ہے کہ "اگر تمہارا دل ہمیں کہیں پڑا مل گیا تو ہم تمہیں نہیں دیں گے"، عاشق کہتا ہے کہ میرے پاس دل ہے کہاں جو اسے کہیں ڈال دوں اور تم اُٹھالو؟ لیکن تمہاری اس لگاوٹ سے میں تمہارا مطلب سمجھ گیا کہ میرا دل تمہارے ہی پاس ہے۔

بنیادی تصور:- معشوق کے ناز معشوقانہ یا اس کی لگاوٹ کا اظہار مقصود ہے۔

---

(۲) عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ٭ درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

مطلب:- یہ شعر ظہوری کے اس شعر سے ماخوذ ہے:-

شد طبیب ما محبت منتش بر جانِ ما ٭ محنتِ ما راحتِ ما، درد ما درمان ما

اور ظہوری کا یہ شعر مرشد رومی کے اس شعر سے مقتبس ہے:-

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما ٭ دے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

غالب نے ان دونوں شعروں کو سامنے رکھ کر شعر کہا ہے اور "دردِ لا دوا" کہہ کر لطفِ بیان میں اضافہ کیا ہے کہ عشق کرنا انسان کی ذات کا تقاضا ہے وہ پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ عشق اختیار کرے، اس لیے جب تک انسان عشق نہیں کرتا اس کی زندگی بے کیف رہتی ہے اسے لطفِ زندگی حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرے مصرع میں عشق کی ماہیت واضح کی ہے کہ عشق بذاتِ خود تو دردِ لا دوا ہے یعنی یہ وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں مگر یہ ایسا مرض ہے کہ ہر درد (مرض) کی دوا ہے۔ خود لاعلاج ہے مگر ہر مرض کا علاج ہے۔

بنیادی تصور:۔ عشق کی بدولت انسان تمام علتوں (بیماریوں) اور برائیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ عشق، انسان کو تمام غموں سے نجات عطا کرتا ہے اور تمام عیوب سے پاک کر دیتا ہے۔ ۱۲

---

(۳) دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم ✤ آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

تشریح الفاظ:۔ دشمن کنایہ ہے محبوب سے۔ اعتمادِ دل معلوم کا مطلب یہ ہے کہ دل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

مطلب:۔ چونکہ ہمارا دل محبوب کا دوست ہے اس لیے ہم اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ نہ اس کی آہ میں اثر ہے نہ اس کا نالہ رسا ہے

بنیادی تصور:۔ عاشق کا دل بھی معشوق ہی کا طرفدار ہوتا ہے۔

---

(۴) سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری ✤ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

تشریح الفاظ:۔ سادگی بمعنی بھولاپن۔ پرکاری بمعنی چالاکی۔ بیخودی بمعنی تغافل شعاری یا بے پروائی۔ حسن بمعنی صاحب حسن یا محبوب۔

مطلب:۔ حسینوں کی سادگی اور بے پروائی یعنی بظاہر تغافل ورزی اس لیے ہے کہ وہ عاشقوں کی جرأت اور ہمت کا امتحان لیتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارا ظلم و ستم کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں ورنہ بباطن وہ بہت چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں

بنیادی تصور:۔ حسینوں کی فطرت واضح کی ہے۔

---

(۵) غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل ✤ خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

مطلب:۔ جب غنچہ کھلا تو اسے دیکھ کر ہمیں اپنا خوں گشتہ اور گم شدہ دل یاد

آ گیا کہ اس کی شکل و صورت بھی ایسی ہی تھی اور ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ یہ ہمارا ہی دل ہے جو بصورت غنچہ ظاہر ہو گیا ہے۔
بنیادی تصور :- دل کو غنچہ سے مشابہت دی ہے۔

---

(۶) حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی ٭ ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پا پایا
مطلب :- ہمیں اپنے دل کا مدتوں سے کچھ حال معلوم نہیں ہے بس اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی اس کی تلاش کی، ہمیں تو نہ ملا لیکن تمہیں مل گیا۔
بنیادی تصور :- عاشق کا دل ہمیشہ معشوق کے پاس ہوتا ہے۔

---

(۷) شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ٭ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
تشریح الفاظ :- شور بمعنی (۱) شور و غل (۲) نمک۔ شور، نمک، اور مزے میں مناسبت ہے۔ اسی کو رعایت لفظی بھی کہتے ہیں جو غالب کے اکثر اشعار میں پائی جاتی ہے۔ زخم پر نمک چھڑکا یعنی بہت اذیت پہنچائی۔ آپ میں طنز کا پہلو مضمر ہے۔ کیا مزا پایا یعنی کیا فائدہ حاصل ہوا۔
مطلب :- واعظ اور ناصح پر طنز و تشنیع، مشرقی شاعری کی روایات میں داخل ہے۔ کہتے ہیں کہ ناصح کی نصیحت سے مجھے بہت اذیت پہنچی۔ ان بزرگوار سے کوئی پوچھے کہ اس دل آزاری سے تمہیں کیا نفع حاصل ہوا۔
بنیادی تصور :- عاشق کی فطرت واضح کی ہے کہ اسے پند و نصیحت سے بہت اذیت ہوتی ہے۔

---

(۵)

(۱) دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ⁂ آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

تشریح الفاظ:- سوزِ نہاں کنایہ ہے تپشِ عشق سے + بے محابا، بے تامل + آتشِ خاموش۔ وہ آگ جو اندر ہی اندر سلگتی رہے + گویا کے دو معنی ہیں (۱) کلمۂ تشبیہ ہے جو لبطور تمہید کلام مستعمل ہے (۲) خاموش کی ضد ہے۔ اسی لیے یہ لفظ یہاں لائے ہیں ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

مطلب:- آتشِ عشق نے جو آتشِ خاموش کی مانند اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے میرے دل کو بڑے بے دردی سے جلا کر راکھ کر دیا۔ ؎۱

بنیادی تصور:- سوزِ نہاں کی تاثیر واضح کی ہے

---

(۲) دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ⁂ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مطلب:- عشق کی آگ نے میرے دل کو اس قدر پھونک دیا کہ کچھ باقی نہ رہا۔ حد ہے کہ ذوقِ وصل اور یادِ محبوب بھی باقی نہ رہی۔

واضح ہو کہ دوسرے مصرع میں "جو تھا" کی ترکیب غیر فصیح ہے۔ بولہٰرا دل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "جو تھا" جل گیا۔ حالانکہ شاعر کا مطلب ہے سب کچھ جل گیا۔ ؎۲

بنیادی تصور:- آتشِ عشق کی تباہ کاری کا بیان کیا ہے۔

؎۱ آتشِ الفت بھی کیا ہی آتشِ خاموش ہے
اڑ گئے دل کے دھوئیں لیکن دھواں کوئی نہیں

؎۲ عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھنک گیا

نوٹ:۔ اگر گھر کے لفظ کو وسعت دی جائے یعنی دل کے بجائے سلطنت دہلی کو اس کا مشارٌ الیہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں پر ایسی تباہی نازل ہوئی ع کہ یاراں فراموش کردند عشق

---

(۳) ہیں عدم میں بھی پسِ پردہ ہوں ورنہ غافل! بارہا ٭ میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

مطلب:۔ اس شعر کا مطلب لکھنے سے پہلے تین باتیں بطور تمہید لکھنی چاہتا ہوں اگر ناظرین ان کو مدنظر رکھیں گے تو اس شعر کے علاوہ اس قبیل کے دیگر اشعار کا مطلب بھی باسانی سمجھ میں آجائے گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ مشرقی شاعری میں مبالغہ کو غلو بلکہ اغراق کی حد تک پہنچا دینا، محاسن کلام میں داخل ہے۔

(۱) مبالغہ کہتے ہیں کسی ایسی بات کے نظم کرنے کو جو بعید از عقل اور دور از قیاس ہو۔

(ب) غلو کہتے ہیں ایسی بات کو جو محالِ عادی ہو۔

(ج) اغراق کہتے ہیں ایسی بات کو جو محال عادی بھی ہو اور محال عقلی بھی ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار کو منطق یا عقلی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاتا۔ کیونکہ اغراق پیدا ہی اس وقت ہو سکتا ہے جب شاعر اپنے شعر میں ایسی بات کا ادعا کرے جو مستلزم محال ہو یعنی مسلمات منطق کے خلاف ہو مثلاً تمام عقلائے دہر کا اس پر اتفاق ہے کہ اجتماع نقیضین اور ارتفاع نقیضین دونوں محال ہیں۔ اول الذکر کی مثال یہ ہے کہ زید موجود بھی ہے اور معدوم بھی ہے۔ آخر الذکر کی مثال یہ ہے کہ زید نہ موجود ہے نہ معدوم ہے۔

اگر غالب کے اس شعر کو منطق کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ

انھوں نے اس شعر میں نقیضین کو مجتمع بھی کیا ہے اور مرتفع بھی جیسا کہ پہلے مصرع کے اس فقرے سے (میں عدم سے بھی پرے ہوں) سے مستنبط ہے۔

(ا) میں عدم سے بھی پرے ہوں یعنی موجود نہیں ہوں۔

(ب) اس کے باوجود ایسی منزل میں ہوں جو عدم سے بھی پرے ہے یعنی معدوم نہیں ہوں۔

بالفاظِ دگر نہ موجود ہوں نہ معدوم ہوں اور یہ ارتفاع نقیضین ہے جو محال ہے۔ اسی فقرے کو پھر سامنے رکھئے:

(ا) میں عدم سے بھی پرے ہوں یعنی معدوم ہونے کے لحاظ سے درجۂ عدم سے بھی آگے ہوں۔

(ب) اس کے باوجود ایسی منزل میں ہوں جو عدم سے بھی آگے ہے یعنی موجود ہوں بالفاظِ دگر معدوم بھی ہوں موجود بھی ہوں اور یہ اجتماع نقیضین ہے۔

چونکہ نظم طباطبائی نے اپنی شرح میں اس شعر کو منطق کی کسوٹی پر آزمایا ہے اسی لیے انھوں نے اسے بے معنی قرار دیا ہے۔

میں یہ عرض کروں گا کہ اگر منطق کو معیار محاسن شاعری قرار دیا جائے، تو غالب کے اسی شعر پر کیا موقوف ہے اکثر شعرا کے کلام کا بیشتر حصہ مہمل اور لایعنی قرار پائے گا۔ بقول شخصے:

ع ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہونگے

تیسری بات یہ ہے کہ دیگر شعرائے اردو کے مقابلہ میں غالب کے یہاں اغراق کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ ان کے اُردو دیوان کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت بالکل عیاں ہوگئی ہے کہ وہ مبالغہ پر شاذ و نادر ہی اکتفا کرتے ہیں ان کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ مبالغہ کو اغراق کی حد تک پہنچا دیا جائے

اگر استقصاء کیا جائے تو بلا مبالغہ نصف دیوان نقل کر دینے کی نوبت آ جائے گی، اس لیے چند مثالوں سے زیادہ درج نہیں کر سکتا۔

ع کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ع مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب

اس تمہید کے بعد اب شعر کا مطلب لکھتا ہوں:-

کہتے ہیں کہ عشق نے میرے خرمن ہستی کو جلا کر بالکل فنا کر دیا۔ اس فنائیت کی بدولت میں عرصۂ وجود سے نکل کر ملکِ عدم میں داخل ہو گیا۔ لیکن عدم میں بھی عشق کی کارفرمائی بدستور قائم رہی چنانچہ میری آہِ آتشیں کی شدت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کی تاثیر سے بارہا عنقا کے پر جل گئے یعنی میری آہ کی گرمی سے موجودات تو درکنار معدومات بھی متاثر ہو گئے (عنقا ملک عدم میں رہتا ہے) لیکن اب میں فنائیت یا نیستی کے اعتبار سے عدم سے بھی آگے ہوں۔

اس شعر میں غالب نے اپنی پرواز تخیل کا کمال دکھایا ہے کہ عدم کو وجود اور معدوم کو موجود میں تبدیل کر دیا۔ عنقا چونکہ معدوم ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کا مسکن عدم میں ہے یعنی وہ عدم میں موجود ہے اور چونکہ موجود ہے اس لیے غالب نے ملک عدم میں پہنچ کر اس کے پر جلا دیے اور اس بیچارے کو نذرِ آتش کر کے روانہ ہو گئے!

اب اگر کوئی شخص اس شعر کو منطقی ترازو میں تولنے کی کوشش کرے گا تو غالب کی دل آزاری کے علاوہ اور کیا ہاتھ آ سکتا ہے؛

بنیادی تصور:- اپنی نیستی یا فنائیت کے بیان میں مبالغہ فرمایا ہے، دگر ہیچ۔

(۴) عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں ❖ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

تشریح الفاظ:۔ عرض (عین پر زبر کے ساتھ) کسی شئے کو ظاہر کرنا، چوڑائی، سامان اسباب وغیرہ (۲) (عین اور رے دونوں پر زبر کے ساتھ) جو کسی دوسری شئے کے ساتھ قائم ہو مثلاً رنگ یعنی جوہر کی ضد ہے (۳) (عین کے نیچے زیر کے ساتھ) آبرو + غالب اس لفظ کو جوہر کی رعایت سے یہاں لائے ہیں لیکن صرف املا، کا اعتبار کیا ہے + وحشت کنایہ ہے صحرا نوردی سے +

مطلب:۔ عشق نے میری طبیعت میں جو گرمی پیدا کر دی ہے اس کا اظہار ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحرا نوردی کا خیال دل میں آنے سے تو صحرا جل گیا، اگر صحرا نوردی کرتا تو خدا معلوم کیا ہو جاتا یعنی سارا عالم جل کر خاک ہو جاتا!

دوسرا مطلب یہ ہے کہ صحرا تو خیال صحرا نوردی سے ہی جل گیا اب میں اپنی طبیعت کی گرمی کا مظاہرہ کروں تو کہاں کروں؟

بنیادی تصور:۔ اس شعر میں بھی اغراق کا رنگ ہے۔ شاعر نے اپنے اندیشہ (خیال) کی گرمی کے بیان میں مبالغہ کیا ہے، دگر ہیچ۔

---

(۵) دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ، داغوں کی بہار ❖ اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

تشریح الفاظ:۔ چراغاں۔ چراغ کی جمع نہیں ہے بلکہ خوشی کے موقع پر بکثرت روشن کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ کارفرما۔ کنایہ ہے دل سے۔

مطلب:۔ دکھاتا کا فاعل "دل" ہے جو آتش عشق میں جل گیا۔ دوسرے مصرع میں اسی کو "کارفرما" سے تعبیر کیا ہے۔ داغوں کی بہار کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں کہ افسوس ہے کہ میرا دل جو داغوں کی بہار (یعنی اس چراغاں) کا منتظم تھا، جل گیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو تجھے یہ دلکش نظارہ دکھاتا۔

بنیادی تصور:۔ کنایۃً مقصود ہے کہ دل تو جل چکا ہے صرف داغ باقی رہ گئے ہیں۔

(۶) میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل ٭ دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

تشریح الفاظ:۔ تپاک بمعنی گرم جوشی یا ذوق و شوق + طرزِ تپاک سے ظاہری محبت لیکن باطنی نفرت یعنی منافقانہ روش مراد ہے۔

مطلب:۔ چونکہ میرے دل کو اہلِ دنیا کی منافقانہ روش سے کہ ظاہر میں محبت سے پیش آتے ہیں مگر باطن میں حسد کرتے ہیں، سخت اذیت پہنچی ہے۔ اس لیے میں ہر وقت افسردہ خاطر رہتا ہوں بلکہ افسردگی میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ ؎۱

بنیادی تصور:۔ دنیا والوں کی منافقانہ روش پر قائم کیا ہے۔ یعنی آپ بیتی بیان کی ہے ۱۲

---

(۶)

(۱) شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا ٭ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

تشریح الفاظ:۔ شوق بمعنی عشق + ہر رنگ بمعنی ہر صورت میں یا ہر حال میں + رنگ کا لفظ، تصویر کی مناسبت سے لائے ہیں، ورنہ یوں بھی کہہ سکتے تھے "شوق ہر طرح رقیبِ سروساماں نکلا۔" رقیب بمعنی دشمن یا مخالف + سروساماں بمعنی اسبابِ معیشت + نکلا بمعنی نظر آتا ہے۔

؎۱ گردم شرح ستم ہائے عزیزاں غالبؔ
رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

مطلب :۔ عشق خواہ مجازی ہو یا حقیقی، اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق کو اسباب معیشت، سامان آسائش اور لوازمِ زندگی سے بے نیاز کر دیتا ہے عاشق اپنے معشوق کے حصول میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے سر و پا کا ہوش نہیں رہتا۔ دوسرے مصرع میں اس نکتہ کو قیس کی زندگی سے واضح کیا ہے۔ کہ دیکھو اس مصور نے بھی اس کی تصویر بنائی اُسے عریاں ہی دکھایا۔

تبصرہ :۔ لفظ پردہ میں ایہام ہے یعنی اس کے دو معنی ہیں (۱) پردہ بمعنی آڑ یا حجاب مثلاً زن پردہ نشین (۲) پردہ بمعنی پردۂ تصویر یعنی وہ کپڑا یا کینوس جس پر تصویر بنائی جائے۔ غالب نے اس ایہام سے شعر میں لطفِ معنوی پیدا کیا ہے۔ تصویر کے پردے سے ہمارا ذہن، پردہ بمعنی حجاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، حالانکہ تصویر، پردے میں نہیں ہوتی بلکہ پردے پر ہوتی ہے۔ لہٰذا دوسرا مطلب یہ ہو گیا کہ دیکھو اقیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نظر آتا ہے۔ یعنی اس اندازِ بیان سے عشق کی خاصیت کو واضح کر دیا کہ وہ اس درجہ دشمنِ ساماں ہے کہ تصویر کا پردہ بھی قیس کی عریانی کو پوشیدہ نہ کر سکا۔ یہ شاعرانہ اندازِ بیان غالب کی وہ خصوصیت ہے جو ہر غزل میں پائی جاتی ہے۔

بنیادی تصور :۔ عشق انسان کو علائق دنیوی سے بیگانہ کر دیتا ہے۔

نوٹ :۔ غالب نے اس شعر کا مطلب خود بیان کیا ہے:۔

"رقیب بمعنی مخالف۔ یعنی شوق، سر و ساماں کا دشمن ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا تھا، تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر جہاں کھینچتی ہے، باقی عریاں ہی کھینچتی ہے"

(۲) زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب ٭ تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

تشریح الفاظ:۔ زخم نے تنگیٔ دل کی داد نہ دی یعنی زخم نے تنگیٔ دل کو زائل نہیں کیا + پر افشاں۔ بی بیتاب +

مطلب:۔ غالب نے اس شعر کا مطلب خود بیان کیا ہے:۔

"یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے۔ جیساکہ اس شعر میں ہے:۔

نہیں ذریعۂ راحت، جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے

یعنی زخم تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پر افشاں بمعنی بیتاب،" اور یہ لفظ تیر کے مناسب حال ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ تیر، تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا (زخم کو کشادہ کرکے تنگی کو زائل کیا کرتا)، وہ تو خود ضیق مقام (تنگیٔ دل) سے گھبرا کر پرفشاں (سراسیمہ) ہو کر نکل گیا۔" ؎۱

تبصرہ:۔ میں غالب کی تشریح پر کوئی اضافہ تو نہیں کر سکتا صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ انھوں نے حسب معمول اس شعر کی ساری عمارت صرف ایک لفظ یعنی "تنگیٔ دل" پر قائم کی ہے اور حسب عادت اس ایہام سے فائدہ اٹھایا ہے جو اس لفظ میں موجود ہے یعنی تنگیٔ دل کے دو معنی ہیں۔ (۱) تنگیٔ دل بمعنی

؎۱ شرح اسباب گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

افسردگی یا رنج وغم (۲) تنگیٔ دل بمعنی ضیق مقام (یہاں تنگی ضد ہے فراخی کی) غالب کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ کاوشِ بلیغ کے بعد اپنے اشعار میں ایسے الفاظ لاتے ہیں جن کے دو یا زیادہ معنی ہوں تا کہ کلام میں شاعرانہ لطف پیدا ہو جائے اور اکثر اوقات اسی ایہام کی بدولت مضمون آفرینی کرتے ہیں بالفاظِ دگر وہ قافیہ سامنے رکھ شعر نہیں کہتے بلکہ

(ا) پہلے ایک مفید مطلب لفظ (جس میں ایہام ہو) منتخب کرتے ہیں۔

(ب) پھر مضمون آفرینی کرتے ہیں یعنی ایہام پر عمارتِ شعری قائم کرتے ہیں۔

(ج) آخر میں اس مضمون کو شعر کے سانچہ میں ڈھال دیتے ہیں۔

یہ بات ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والوں پر بآسانی منکشف ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ خود ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"بھائی! شاعری معنی آفرینی کا نام ہے نہ کہ قافیہ پیمائی کا"

لہذا شعر کے بھی دو مطلب ہو گئے:۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ تیر، زخم کو کشادہ کر کے تنگیٔ دل (ضیق مقام) کو زائل کیا کرتا وہ تو خود مقام تنگ سے گھبرا گیا اس لیے سراسیمہ ہو کر باہر نکل گیا۔ لفظ "پرافشاں" ایسا لائے ہیں جس نے تیر کی حالتِ سراسیمگی کی تصویر کھینچ دی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں نے معشوق کے تیر کو اس لیے اپنے دل میں جگہ دی تھی کہ وہ میری تنگیٔ دل (افسردگیٔ خاطر) کا ازالہ کرے گا مگر اے خدا! تیر نے بھی میری تنگیٔ دل (افسردگیٔ خاطر) کے ازالہ کی کوئی تدبیر نہ کی۔ اگر وہ وہاں جاگزیں ہو جاتا تو میں بیکاں کی خلش سے لطف اندوز ہوتا اور اس طرح میری افسردگیٔ خاطر کا ازالہ ہو جاتا۔ لیکن افسوس کہ وہ تو میری تنگیٔ دل (افسردگیٔ خاطر) سے مضطرب ہو کر باہر نکل گیا۔

بنیادی تصور :- اپنی بدنصیبی کا اظہار کیا ہے کہ زخمِ تیر سے بھی تنگیٔ دل کا ازالہ نہ ہو سکا۔

---

(۳) بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ٭ جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مطلب :- غالب نے لفظِ پریشاں پر شعر کی عمارت قائم کی ہے۔ یعنی اس ایہام سے مضمون پیدا کیا ہے جو "پریشاں میں موجود ہے۔

(۱) پریشاں بمعنی منتشر (۲) پریشاں بمعنی شاکی یا آشفتہ حال اور آشفتگی کنایہ ہے عشق سے

پہلا مطلب یہ ہے کہ تری بزم سے جو بھی نکلا وہ پریشاں (تیری کج ادائی کا شاکی) ہو کر نکلا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تیری محفل میں جو بھی آجاتا ہے خواہ وہ ذی شعور (انسان) ہو یا غیر ذی شعور (بو، نالہ، دود) وہ تجھ پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب تیری محفل سے نکلتا ہے تو آشفتہ حال (عاشق) ہو کر نکلتا ہے شاعرانہ خوبی لفظِ پریشاں سے یہ پیدا کی ہے کہ بوئے گل، نالۂ دل اور دودِ چراغ کی خاصیت ہی یہ ہے کہ یہ چیزیں فضا میں منتشر (پریشاں) ہو جاتی ہیں۔ یعنی شاعر نے ایہام سے فائدہ اٹھا کر شعر میں حسنِ تعلیل کی صنعت بھی پیدا کر دی کہ ان کے پریشاں (منتشر) ہونے کا باعث یہ ہے کہ یہ چیزیں محفلِ جاناں میں بار پا گئی تھیں، وہاں حسنِ جاناں سے متاثر ہو گئیں اس لیے پریشاں (آشفتہ حال) ہو کر نکلیں۔ خلاصۂ کلام ایں کہ سارا لطف اس ایہام سے پیدا ہوا ہے جو لفظِ پریشاں میں پایا جاتا ہے۔

بنیادی تصور :- حسنِ محبوب کی تاثیر کا عالم دکھانا مقصود ہے کہ ہر شئی اس سے متاثر

ہو جاتی ہے۔

(۴) دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد ٭ کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تشریح الفاظ:۔ مائدہ بمعنی دستر خوان۔ دلِ حسرت زدہ کنایہ ہے ذات شاعر یعنی اس کے کلام سے "کام نکلا" سے استفادہ مراد ہے۔ بقدرِ لب و دنداں بمعنی استعداد کے مطابق۔

مطلب:۔ جس طرح دستر خوان پر مختلف انواع و اقسام کے کھانے موجود ہوتے ہیں اسی طرح میرے کلام میں مختلف النوع کیفیات کا بیان مرقوم ہے میرے دوستوں یعنی شائقین کلام نے اپنی اپنی لیاقت کے مطابق میرے کلام سے فیض حاصل کیا۔

اگر دل حسرت زدہ کو غالب کی ذات سے مختص نہ کیا جائے تو یہ مفہوم بھی نکل سکتا ہے کہ جو دل بھی حسرت زدہ ہے وہ درد و غم کی مختلف النوع لذتوں اور نعمتوں کا گنجینہ ہے اور ہر شخص ان نعمتوں سے اپنی صلاحیت کے مطابق لذت اندوز ہوتا ہے ۱۲

بنیادی تصور:۔ ایک بلند پایہ شاعر کے کلام سے ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ہی استفادہ کرتا ہے۔

---

(۵) تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند ٭ سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

تشریح الفاظ:۔ "تھی" کی جگہ بعض نسخوں میں "آئے" اور بعض میں "ہے" مرقوم ہے، مگر میری رائے میں "تھی" بہتر ہے۔ نو آموزِ فنا سے وہ شخص مراد ہے جو ابتدائے عشق ہی میں "فنا" کا درس لے رہا ہو۔ ہمت دشوار پسند، بمعنی مشکل پسند طبیعت +

مطلب :- مقام فنا، عشق کی آخری منزل ہے مگر میری مشکل پسند طبیعت نے وہ مقام ابتدائے عشق ہی میں حاصل کر لیا جو دوسرے لوگ برسوں کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا اب میرے لیے مشکل یہ آن پڑی کہ اپنی ہمت دشوار پسند کی تسکین کے لیے کون سا مرحلہ تلاش کروں ؟ مقام فنا کا حصول تو بہت آسان نکلا اور اس سے بالاتر کوئی مقام نہیں ہے !!

بنیادی تصور :- عاشق صادق کے لیے مقام فنا بالکل آسان ہے ۔ وہ ابتدائے عشق ہی میں فنا فی المحبوب ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتے ہیں :-

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانہ سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

---

(۲) دل میں پھر گریہ نے ایک شور اٹھایا غالب ؎ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

مطلب :- شاعر کہتا ہے کہ قبل ازیں جب مجھ پر جوشِ گریہ غالب ہوا تو میں نے ضبط سے کام لیا یعنی آنسو پی لیے مگر اب مجھ میں ضبط کی تاب نہیں ہے یعنی جوش گریہ طوفان اشک کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ پہلی گریہ وزاری کے بعد جو قطرہ نہیں نکلا تھا، اس نے اس مرتبہ طوفان کی شکل اختیار کر لی یعنی وہ قطرہ بذاتِ خود طوفان ثابت ہوا۔

بنیادی تصور :- جوش گریہ کی شدت کا اظہار کیا ہے ۔

---

(۷)

(۱) دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا ؎ عشقِ نبرد پیشہ، طلبگارِ مرد تھا

تشریح الفاظ :۔ باب نبرد (معنی لائق نبرد یا جنگ جو+ نہ باب نبرد) کی ترکیب مستحسن نہیں ہے + مرد کنایہ ہے عاشق صادق سے جو عشق کی سختیاں برداشت کر سکے۔

مطلب :۔ جو شخص عاشق صادق نہیں ہوتا وہ آغاز مصائب ہی میں اس کوچہ کو ترک کر دیتا ہے۔ (دھگی ہی میں مرجاتا ہے) عشق خود بہادر ہے۔ اس لیے بہادروں (سچے عاشقوں) ہی کو پسند کرتا ہے۔ بقول شاعر

میدان عاشقی میں نہیں بزدلوں کا کام
اس معرکہ میں فتح، بہادر کے ہاتھ ہے

بنیادی تصور :۔ عشق اسی کو زیبا ہے جو ہر مصیبت کو بخوبی برداشت کر سکے۔

---

(۲) تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا ✽ اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تشریح الفاظ :۔ مرگ کی جگہ "موت" بہتر ہوتا کیونکہ "مرگ کا" میں گاف اور کاف کا اجتماع موجب ثقالت ہے، تلفظ میں دشواری پیدا ہو گئی ہے۔ علاوہ بریں "کا کھٹکا" "میں" "کا" کی تکرار بھی مستحسن نہیں ہے + "اڑنے سے پیشتر" یہاں اڑنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں (ا) طائر روح کے اڑنے سے پیشتر (ب) رنگ کے اڑنے سے پیشتر۔ رنگ اڑنا کنایہ ہے وقت مرگ سے یعنی مرنے سے پیشتر۔ غالب یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ مرنے سے پیشتر بھی الخ مگر پھر ایہام کا رنگ پیدا نہ ہوتا "رنگ کی رعایت سے اڑنا ہی موزوں ہے۔

مطلب :۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں ان پر ہر وقت مردنی چھائی رہتی ہے۔ ان کا رنگ مرنے سے پہلے بھی زرد ہوتا ہے۔ دوسرا اور بلیغ مطلب یہ ہے کہ اس شعر میں شاعر نے "مُوتوا قبلَ

اَنْ تموتوا" (مرنے سے پہلے مر جاؤ) کے صوفیانہ مفہوم کو نظم کیا ہے یعنی ہم نے زندگی ہی میں اپنے اوپر فنا کا رنگ طاری کر لیا تھا۔ بالفاظِ دگر، نفس امارہ کو فنا کر دیا تھا۔

بنیادی تصور :۔ تلقین درسِ فنا۔

---

(۳) تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں ؛ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

تالیف، لغوی معنی الفت ڈالنا یا الفت دلانا۔ اصطلاحی معنی کتاب لکھنا + نسخہ ہائے وفا معنی وفا کے موضوع پر کتابیں + مجموعۂ خیال میرا انتظامِ افکار یا میرے خیالات بحیثیت مجموعی + مجموعۂ خیال فرد فرد تھا یعنی ابھی میرے خیالات میں ربط پیدا نہیں ہوا تھا۔ چونکہ بچوں کے خیالات غیر مربوط ہوتے ہیں اس لیے مجموعۂ خیال فرد فرد تھا کنایہ ہے عہدِ طفلی سے +

مطلب :۔ عہدِ طفلی ہی سے وفا شعار ہوں۔ جس زمانہ میں میرے خیالات غیر مربوط تھے اور میری عقل خام تھی اس وقت بھی وفا پر کتابیں لکھ رہا تھا۔ یعنی فن عاشقی میں مبتدی ہوتے کے باوجود وفا شعار تھا۔

بنیادی تصور :۔ "ابتدا ہی سے بندۂ وفا ہوں" (حسرت موہانی)

---

(۴) دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب ؛ اس رہ گذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

مطلب :۔ اگرچہ اس وقت یہ حالت ہے کہ دل سے لے کر جگر تک تمام سینہ میں خون کا دریا بہہ رہا ہے مگر کبھی یہ رہگذر اس قدر دلکش تھی کہ اس کے سامنے باغ بھی ہیچ تھا یعنی جفائے محبوب سے پہلے ہم بھی شگفتہ مزاج تھے۔

بنیادی تصور :۔ عشق انسان کو موردِ آلام بنا دیتا ہے۔

(۵) جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی ÷ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

مطلب:- دل کے درد پر شعر کی عمارت قائم کی ہے اس کے دو معنی ہیں:-

(ا) جو لفظوں سے ظاہر ہیں (ب) وہ چیز یا بات جو موجب کلفت یا آزار ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ اندوہِ عشق سے کسی طرح نجات نہیں مل سکتی۔ اگر دل سینہ میں موجود ہے تو اس کا ہونا بےچینی کا موجب ہے اور اگر اُسے سینہ سے نکال دیا جائے تو اس کا جانا بجائے خود موجب رنج والم ہے۔

بنیادی تصور:- اندوہِ عشق سے رہائی ناممکن ہے۔

---

(۶) احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے ÷ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

چارہ سازی بمعنی علاج + وحشت بمعنی انسانوں سے نفرت، تنہائی کی طرف میلان کنایہ ہے صحرانوردی سے۔

مطلب یہ ہے کہ دوستوں نے میری وحشت کا ازالہ کرنے کے لیے مجھے محبوس کر دیا۔ مگر قید سے چارہ سازیٔ وحشت نہ ہو سکی کیونکہ میں نے تصور میں صحرانوردی شروع کر دی۔ جسم، زنداں میں رہا تو کیا ہوا؛ خیال تو بیاباں نورد تھا۔

بنیادی تصور:- عاشق کی وحشت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

---

(۷) یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے ÷ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مطلب:- "آزاد مرد" اس شعر کی جان ہے کیونکہ اسی کی رعایت سے لاش کو بے کفن باندھا ہے اور ارباب ذوق جانتے ہیں کہ اس لفظ بے کفن میں بے کسی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اسد حقیقی معنی میں عاشق تھا۔

کہ مرنے کے بعد بھی علائقِ دنیوی (کفن) سے آزاد رہا۔
بنیادی تصور:۔ عاشقِ صادق علائق دنیوی سے آزاد ہوتا ہے۔
استاد ذوق نے اس شعر میں ملتا جلتا مضمون باندھا ہے:۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے

---

(۸)

(۱) شمارِ سبحہ، مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ٭ تماشائے بیک کف بُردن صد دل پسند آیا

شمار سبحہ۔ تسبیح کے دانوں کی گنتی + بیک کف بردن صد دل۔ ایک ہی مرتبہ ہاتھ مار کر سو دل یعنی سیکڑوں دلوں پر قابض ہوجانا۔ تسبیح کے دانوں کی رعایت سے "صد دل" لائے ہیں۔ دل کو دانۂ تسبیح سے تشبیہ دی ہے:۔

مطلب:۔ یہ شعر غالب کے ان اشعار میں سے ہے جن پر کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مثال صادق آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ

(ا) ہمارا محبوب اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنا جلوہ دکھائے تو سیکڑوں آدمیوں کے دل اس کی مٹھی میں آجائیں۔

(ب) تسبیح پھراتے وقت سارے دانے بیک وقت قبضہ میں آجاتے ہیں

(ج) یہ حالت "تماشائے بیک کف بردن صد دل" سے مشابہ ہے۔

(د) اس لیے محبوب کو شمار سبحہ (مالا پھیرنا) پسند ہے۔

بنیادی تصور:۔ شمار دانہ ہائے تسبیح کو، بیک کف بردنِ صد دل سے تشبیہ دینی مقصود ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خاص نکتہ مضمر نہیں ہے۔

(۲) بفیضِ بیدلی، نومیدیٔ جاوید آساں ہے ؛ کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

بفیض بیدلی بمعنی وجہ ناکامی یا مایوسی یا نا امیدی + نومیدیٔ جاوید یعنی دائمی ، نا امیدی + کنایہ ہے سکون دل سے + کشائش بمعنی کشود کاری یا کشودگی۔ کنایہ ہے رحصول مقصد سے ، غالب نے کشائش کو جو غیر ذی روح ہے ۔ مشخص یا ذی روح فرض کر لیا ہے اسی لیے اسے "پسند آیا" کا فاعل قرار دیا ہے۔ عقدۂ مشکل کنایہ ہے تمنائے وصال سے جس کا پورا ہونا مشکل ہے۔

مطلب :۔ کشائش کی صورت پیدا ہو تو عقدۂ مشکل کی کشود ممکن ہو سکتی ہے مگر ہماری بد نصیبی سے خود کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آگیا ہے یعنی وہ چاہتی ہے کہ ہم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں ۔ اس لیے ہم کو یقین ہو چکا ہے کہ ہم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے ۔ اس یقین کی بدولت ہمیں ایک گونہ اطمینان قلب حاصل ہو گیا ہے یعنی نومیدیٔ جاوید، جس پر عام حالات میں راضی ہونا مشکل ہے ، ہمارے لیے آسان ہو گئی ہے

بنیادی تصور :۔ غایتِ مایوسی کا اظہار کیا ہے۔

---

(۳) ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریٔ قاتل ؛ کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوائے سیر گل بمعنی پھولوں کے نظارے کی خواہش ۔ آئینۂ بے مہریٔ قاتل بمعنی محبوب کے جفا شعار اور ستم کیش ہونے کی دلیل + پہلے مصرع میں "ہے" محذوف ہے ۔

مطلب :۔ پہلے مصرع میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ محبوب کی بے مہری سیر گل کی آرزو کا سبب ہے ۔ دوسرے مصرع میں دلیل دی ہے ۔ کہ پھولوں میں عاشق کے خون میں غلطاں ہونے کا انداز پایا جاتا ہے اور

محبوب کو یہ نظارہ پسند ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہار جفاکیشیٔ محبوب۔

---

(۹)

(۱) دہر میں نقشِ وفا، وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

مطلب:۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو یہ توقع کرتا ہے کہ اس کی قدر و منزلت کی جائے گی اور یہی قدردانی اس کی نظر میں صلہ یا وجہ تسلیٔ خاطر بن جاتی ہے۔

اس کلیہ کو مدنظر رکھ کر شاعر کہتا ہے کہ افسوس! اس دنیا میں کوئی بھی وفا کا قدرداں نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری وفاشعاری میرے لیے وجہ تسلی نہ ہو سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا والوں کی نگاہ میں یہ لفظ بے معنی ہے!

شعر کی ساری خوبی اس کے اندازِ بیان میں مضمر ہے۔ دنیا والوں کو موردِ الزام بنانے کے بجائے حسنِ تعلیل سے کام لے کر یہ کہتے ہیں کہ ان کا کیا قصور؟ شاید یہ لفظ ہی بے معنی ہے۔ اگر اس کا کوئی مفہوم ہوتا تو لوگ ضرور اہلِ وفا کی قدر و منزلت کرتے! اس مصرع میں جو لطیف طنز مخفی ہے اسے لفظوں کے ذریعہ سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ اندازِ بیان ہے جس پر غالب کو ناز ہے۔

بنیادی تصور:۔ شکوۂ ناقدریٔ دنیا

(۲) سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا ٭ یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

کاکل بمعنی زلف + سرکش میں دو خوبیاں مضمر ہیں (۱) لفظی خوبی یہ ہے کہ کاکل کو سر سے نسبت ہے (۲) معنوی خوبی یہ ہے کہ زلف میں بھی سرکشی (پیچ و تاب)

کا انداز پایا جاتا ہے + سبزۂ خط کو زمرد اور کاکل کو افعی سے تشبیہ دی ہے + حریف بمعنی مدِ مقابل - نہ دبا یعنی مغلوب نہ ہوا مراد یہ ہے کہ اس کی دلکشی میں فرق نہ آیا - دم افعی بمعنی سانپ کی پھنکار + مشہور ہے کہ زمرد کو دیکھ کر سانپ اندھا ہو جاتا ہے چونکہ زلف کو افعی سے تشبیہ دی ہے اس لیے کاکل کو زمرد سے مشابہ قرار دیا ہے -

مطلب :- کہتے ہیں کہ زمرد کو دیکھ کر سانپ اندھا ہو جاتا ہے یعنی پھر وہ کسی کو ایذا نہیں پہنچا سکتا لیکن تعجب کی بات ہے کہ تیرا سبزہ خط (جو مثل زمرد ہے) تیری کاکل کا (جو مانند افعی ہے) کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکا یعنی اسے مغلوب نہ کر سکا -

بنیادی تصور :- آغازِ سبزہ خط کے باوجود، زلفِ جاناں کی دلفریبی یا دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا -

---

(۳) میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں ٭ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اندوہِ وفا کا مطلب یہ ہے کہ محبوب نے وفا کی مطلق قدر نہ کی اس لیے وہ موجب اندوہ بن گئی -

مطلب :- مصائبِ عشق سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں نے مر جانے کا فیصلہ کیا تھا مگر افسوس کہ محبوب نے مجھے خودکشی کی اجازت بھی نہ دی - چونکہ میں وفا سرشت ہوں اس لیے اس کی خاطر سے یہ ستم بھی گوارا کر لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ اندوہِ وفا میں گرفتار ہوں اور اس کی بے وفائی کے صدمے برداشت کر رہا ہوں -

بنیادی تصور :- اظہارِ ستم کیشی محبوب -

(۴) دل گذر گاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی ✣ گر نفس، جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

گذر گاہ خیالِ مے بمعنی شراب کے تصور کا راستہ + نفس، لغوی معنی سانس مگر یہاں نفس کنایہ ہے ذات یا طبیعت سے + جادۂ سر منزلِ تقویٰ بمعنی پرہیز گاری یا نکوکاری کی منزل کا راستہ۔ تقویٰ کے لغوی معنی ہیں اجتناب کرنا یا بچنا مرادی معنی ہیں پارسائی۔

مطلب:۔ تقویٰ سے مقصود یہ ہے کہ انسان ہر وقت مسرور رہے۔ چونکہ مجھے یہ کیفیت مے نوشی کے تصور سے حاصل ہے اس لیے اگر میری طبیعت، تقویٰ کی طرف مائل نہیں ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ میرے دل میں مےنوشی کی آرزو تو ہر وقت موجزن رہتی ہے۔

طرزِ ادا کی جدت اور مضمون کی شوخی دونوں خوبیاں قابل داد ہیں۔ زہد و تقویٰ پر در پردہ طنز بھی ہے اور رندی کو تقویٰ کا ہم پلہ بھی ثابت کر دیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہیے۔ اگر متقی نہ بن سکے تو رند ہی بن جائے۔

ہوں تمہیں وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی

(۵) گوش، منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

منت کش بمعنی احسان مند + گلبانگ بمعنی دلپذیر آواز۔

مطلب:۔ شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اگر تو نے مجھ سے وعدۂ وصل نہیں کیا تو اس میں بھی خوشی کا پہلو مضمر ہے کیونکہ میرے کان تیری تسلی بخش آواز کے احسان مند ہونے سے محفوظ ہے۔

بنیادی تصور:۔ غیور عاشق، محبوب کا احسان بھی گوارا نہیں کرتا۔

(۶) کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے ٭ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مطلب:۔ ہم اس قدر بدنصیب ہیں کہ تنگ آ کر مرنے کی آرزو کی مگر وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ حالانکہ موت تو ایسی شی ہے کہ بغیر آرزو بھی میسّر ہو جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ گلۂ محرومیٔ قسمت۔

---

(۷) مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ٭ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

مطلب:۔ اس شعر میں غالب نے حسب عادت مبالغہ کو اغراق کی حد تک پہنچا دیا ہے کہتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ نے مجھے صحت عطا کرنے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دی تو میں بوجہ ضعف اس حرکت کی تاب نہ لا سکا اور قبل ازیں کہ وہ مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکتے میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

شوخی کا پہلو اس شعر میں یہ ہے کہ دمِ عیسیٰ کو اپنی موت کا سبب قرار دیا ہے!

بنیادی تصور:۔ اظہارِ شدتِ ضعف و ناتوانی۔

---

(۱۰)

ستائشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ستائشگر بمعنی تعریف کرنے والا۔ باغِ رضواں بمعنی بہشت۔ طاقِ نسیاں بمعنی وہ طاق جس میں کوئی شی رکھ کر فراموش کر دیں۔ کسی شی کو بالائے طاق رکھ دینا محاورہ ہے بمعنی بھول جانا۔ طاقِ نسیاں پر رکھ دینا، فراموشی میں مبالغہ کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔

مطلب :۔ زاہد جس باغ کی اس قدر توصیف کر رہا ہے۔ ہماری نگاہ میں اس کی حیثیت اس گلدستہ سے زیادہ نہیں ہے جیسے کوئی شخص طاق میں رکھ کر بھول جائے۔ امیر مینائی نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

بہار تازۂ دل دیکھ! اگر ذوق تماشا ہے
بہشت اک پھول مرجھایا ہوا ہے اس گلستاں کا

بنیادی تصور :۔ بے توقیریٔ بہشت

نوٹ :۔ حالی لکھتے ہیں کہ "بہشت کو گلدستہ طاق نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں لکھی گئی۔"
(یادگار غالب ص ۱۲۵)

(۲) بیان کیا کیجئے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

مژگان سے مژگانِ محبوب مراد ہے + کاوش بمعنی چھید کرنا۔ مرجان بمعنی مونگا جس کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اسی لئے قطرۂ خون کو دانۂ مرجان سے تشبیہ دی ہے۔
مطلب :۔ مژگاں (پلک) کو سوئی قرار دے کر کہتے ہیں کہ سوزنِ مژگاں کی کاوشوں کے ظلم کا کیا بیان کروں بس یوں سمجھ لو کہ انہوں نے میرے ہر قطرۂ خون میں سوراخ کر کے اسے تسبیح مرجاں کا دانہ بنا دیا ہے۔
بنیادی تصور :۔ کمالِ کاوشِ مژگانِ جاناں۔

---

(۳) نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت بمعنی رعب و داب + دانتوں میں تنکا لینا پہلے زمانہ میں اعترافِ

شکست کا یہ طریقہ تھا کہ مغلوب اپنے دانتوں میں تنکا دبا لیا کرتا تھا۔ یہیں سے محاورہ بن گیا مراد ہے مغلوبیت کا اقرار کیا۔ نیستاں کا ریشہ بمعنی بانسری ریشہ کنایہ ہے بنے سے۔

مطلب :۔ محض لفظی طلسم باندھا ہے جسے حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہے ایسے اشعار قوت تخیل کا کرشمہ ہوتے ہیں، ان میں نہ دلکشی ہوتی ہے نہ شعریت نہ تاثیر ہوتی ہے نہ معنویت۔

کہتے ہیں کہ میرے نالوں کی شدت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ قاتل کا رعب بھی مجھے نالہ و فریاد سے باز نہ رکھ سکا۔ حالانکہ انسان جب کسی صاحب سطوت انسان کے سامنے جاتا ہے تو فرط ہیبت سے آہ و نالہ کرنا بھول جاتا ہے۔

دوسرے مصرع میں اس کا ثبوت دیتے ہیں کہ جب میں دانتوں میں تنکا لے کر طالب رحم ہوا تو فرط آرزوئے نالہ کشی کی وجہ سے وہ تنکا بانسری میں تبدیل ہو گیا اور اس سے بے اختیار نالے سرزد ہونے لگے۔

بنیادی تصور :۔ اپنے سراپا نالہ و فریاد ہونے کا اظہار کیا ہے۔

---

(۴)
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانہ نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سرو چراغاں کا

مطلب :۔ داغ کو تخم سے تشبیہ دی ہے اور اسی تشبیہ سے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ میرے دل کے ہر داغ میں سرو چراغاں بننے کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ اگر زمانہ نے مجھے ان داغوں کی تربیت اور پرورش کا موقع دیا تو ایک دن

ہر داغ سے اس قدر شرارے نکلیں گے کہ دنیا والوں کو سرو چراغاں کا تماشا نظر آئے گا۔

بنیادی تصور :۔ داغہائے دل کی آتش بدامانی کا اظہار مقصود ہے۔

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
(۵)
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مطلب :۔ جس طرح آفتاب کے پرتو سے شبنم کے ہر قطرہ میں آفتاب نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب تو آئینہ خانہ میں جلوہ گر ہوا تو ہر طرف تو ہی تو نظر آنے لگا۔

دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح قطرۂ شبنم آفتاب کی تاب نہیں لا سکتا، چند لمحوں کے بعد فنا ہو جاتا ہے اسی طرح آئینہ خانہ بھی تیرے جلوے کی تاب نہیں لا سکتا۔ تیری تجلی کے سامنے سب آئینے ماند پڑ گئے۔ یعنی ان کی آب و تاب اس طرح اڑ گئی جس طرح آفتاب کے سامنے قطرۂ شبنم اڑ جاتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ فروغ حسن جاناں کا اظہار مقصود ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
(۶)
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

ہیولیٰ۔ اصل یا مادۂ اشیاء۔ ارسطو کے فلسفہ میں ہیولیٰ اور صورت یہ دونوں لفظ بطور اصطلاح مستعمل ہیں، اور لازم و ملزوم ہیں کوئی ہیولیٰ (مادہ) بغیر صورت نہیں پایا جا سکتا اور صورت بغیر ہیولیٰ مشہور نہیں ہو سکتی۔

مطلب :۔ غالب نے اس شعر میں فلسفہ کا وہ نکتہ نظم کیا ہے جس پر مشہور جرمن فلسفی ہیگل نے اپنے نظام فکر کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر اثبات میں اس

کی نفی مضمر ہے۔ یعنی بقا اور فنا، تعمیر اور تخریب یا زندگی اور موت متضاد حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو نشانیں ہیں۔

غالبؔ کہتے ہیں کہ ہر تعمیر میں تخریب کا پہلو پوشیدہ ہے۔ بہار میں خزاں اور خزاں میں بہار کے عناصر مخفی ہیں۔ یہ کائنات بقا اور فنا کے امتزاج ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہاں زندگی سے موت اور موت سے زندگی رونما ہوتی رہتی ہے اسی لئے دنیا کو عالم کون و فساد کہتے ہیں۔ غالبؔ نے اس شعر میں جو حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تخریبی عناصر، خارج سے نہیں آتے بلکہ خود اسی شئے میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی شئے کی تعمیر شروع ہوتی ہے اس کی تخریب بھی شروع ہو جاتی ہے اور جب فعل تخریب مکمل ہو جاتا ہے تو وہ شئے فنا ہو جاتی ہے۔

دوسرے مصرع میں اس نکتہ کو ایک مثال سے واضح کیا ہے جو بجائے خود قابل تحسین اور غالبؔ کی ژرف نگاہی پر دال ہے۔ کہتے ہیں کہ جو بجلی خرمن دہقاں پر گرتی ہے اس کا ہیولیٰ، دہقان کے خون گرم سے تیار ہوتا ہے۔

اس میں حکیمانہ خوبی یہ ہے کہ جدید طبیعات کی رُو سے ثابت ہو گیا ہے کہ بجلی اور گرمی کی ماہیت ایک ہے۔

شاعرانہ خوبی یہ ہے کہ جب دہقان اپنے خرمن کی تعمیر کرتا ہے تو اس کے لیے اسے محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ محنت کرنے سے خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ غالبؔ نے اپنے وجدان شعری کی بدولت یہ نکتہ دریافت کیا ہے کہ یہی گرمی خون اُس برق کا ہیولیٰ (مادہ) ہے جو عنقریب خرمن پر گر کر، دہقان کی تعمیر کو تخریب میں مبدل کر دے گی۔

ان مقدمات کو مد نظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالبؔ کے اس شعر

میں فلسفیانہ حقائق نگاری اور شاعرانہ نازک خیالی کا بڑا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔
بنیادی تصور:۔ ہر تعمیر (کون) میں تخریب (فساد) کا پہلو مضمر ہے ۔ؔ

---

(۷) اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر!
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

مطلب:۔ عشق نے مجھے اس درجہ تباہ اور برباد کر دیا ہے کہ میرے گھر میں گھاس اُگی ہوئی ہے یعنی میرا گھر صحرا بن گیا ہے اور میرے دربان کا کام، گھر کی حفاظت کے بجائے صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ ہر وقت گھاس کھودتا رہتا ہے!
دوسرے مصرع میں ایک لطیف طنز مضمر ہے ۔ؔ۲
بنیادی تصور:۔ کارفرمائی عشقِ خانہ ویراں ساز۔

---

(۸) خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں، گورِ غریباں کا

مطلب:۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی پر بے اندازہ مصائب اور پریشانیوں کا نزول ہوتا ہے اور وہ ان کے ازالہ کی کوئی تدابیر نہیں کر سکتا تو اسے چُپ لگ جاتی

ؔ۱ نعمت خاں عالی نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے۔
وارد نفسم آمد و شد از پے کشتن
ہر لحظہ بمن می کشد ایں تیغ دودم را

ؔ۲ اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ہے۔ کہتے ہیں کہ میری خاموشی میں لاکھوں خوں گشتہ آرزوئیں پوشیدہ ہیں۔ گویا میں بے زبان، گور غریباں کا چراغ مردہ ہوں۔

غالبؔ نے اس شعر میں تشبیہات اور مناسبات لفظی سے شاعرانہ خوبی پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

خموشی اور بے زبانی میں خوں گشتہ اور مردہ میں، گور اور مردہ میں، چراغ مردہ اور بے زباں میں مناسبت ظاہر ہے۔

بنیادی تصور :۔ ماتم بیکسئ عشق۔

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
(۹) دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

مطلب :۔ اس شعر میں خیال یار کو یوسف سے اور دل افسردہ کو حجرۂ زنداں سے تشبیہ دی ہے۔ لفظ ہنوز سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خیال یار کا نقش مٹا دینے کے باوجود اس کا پرتو ابھی تک باقی ہے اور یہ اس پرتو کا کرشمہ ہے کہ میرا دل افسردہ حجرۂ زندان یوسف کی طرح دلکش نظر آتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ دلکشی تصور جاناں۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
(۱۰) سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا تصور عشق آسمانی اور افلاطونی نہیں ہے بلکہ زمینی اور جنسی ہے۔ نیز ان کا معشوق، پردہ نشین نہیں ہے بلکہ کسی ستم پیشہ ڈومنی، کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون میں بھی

عریانی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ تبسم ہائے پنہاں سے وہ حجاب آمیز مسکراہٹ مراد ہے جو بوقتِ وصل چہرے پر نمودار ہوتی ہے۔

مطلب:۔ غالب کا محبوب، خواب میں ان کے سامنے، شرمگیں انداز سے مسکرا رہا ہے۔ اس طرز تبسم سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ میرا محبوب ضرور غیر کی بغل میں سو رہا ہے اور مجھے جلانے کے لیے اس مخصوص انداز سے مسکرا رہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تبسم ہائے پنہاں کی دلکش شاعرانہ توجیہہ۔

---

(۱۱)
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا!
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

"لہو پانی ہونا" کنایہ ہے غم سے خواجہ آتش کہتے ہیں:۔

رُلاتا ہے فراق یار کا شوق ٭ فراق، اپنا لہو کرتا ہے پانی

مطلب:۔ اے محبوب! تجھے کیا خبر ہے کہ جب تیرے عاشقوں نے تیری آنکھ میں آنسو دیکھے تو ان کے دلوں پر کیا قیامت گزر گئی اور انہیں کس قدر رنج لاحق ہوا۔

بنیادی تصور:۔ عاشق اپنے معشوق کو رنجیدہ روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

---

(۱۲)
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

جادہ بمعنی راہ باریک کہ در صحرا از آمد و رفت مردم پدید می آید (غیاث) اردو میں اسے لیکھ یا پگڈنڈی یا بیٹا کہتے ہیں۔ لہٰذا جادہ اور راہ دونوں میں سے کسی ایک لفظ کو حشو قرار دینا پڑے گا۔

مطلب :۔ اس شعر میں غالبؔ نے یہ فلسفیانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جادۂ فنا وہ شیرازہ ہے جو عالم کے اجزائے پریشاں کو باہم مربوط کر دیتا ہے۔ بالفاظِ دگر، حوادثِ عالم کو اگر اوراقِ منتشر قرار دیا جائے تو فنا ان کے حق میں بمنزلۂ شیرازہ ہے۔ بظاہر تمام اشیائے کائنات مختلف النوع نظر آتی ہیں مگر فناء سب کو ایک ہی مسلک میں منسلک کر دیتی ہے۔ مثلاً مرنے کے بعد شاہ اور گدا دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

بنیادی تصور :۔ فنا اوراق کائنات کی شیرازہ بند ہے۔ یعنی ہر شئی کا انجام فنا ہے۔ انسان، حیوان، شجر اور حجر بعد مرگ برابر ہو جاتے ہیں۔

---

(۱۱)

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا!

یک بیاباں ماندگی سے افراطِ ماندگی (تکان) مراد ہے ذوق سے ذوقِ صحرانوردی مراد ہے نقشِ قدم کو حباب اور رفتار کو موج سے تشبیہ دی ہے

مطلب :۔ میرا نقش قدم بمنزلۂ حباب ہے جس طرح حباب کا ذوق سفر کبھی کم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خواہ میں کتنا ہی تھک جاؤں مگر میرا ذوقِ صحرانوردی بھی کم نہیں ہو سکتا۔ لہ

لہ استاد ذوق نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے :۔

وہ ہوں میں رہ نوردِ شوق، میرے ساتھ جاتا ہے
برنگِ سایۂ مرغ ہوا، نقشِ قدم میرا

بنیادی تصور :۔ ماندگی سے عاشق کے ذوق صحرا نوردی میں کمی نہیں آسکتی۔ کیونکہ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق میں مسلسل جد و جہد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بیدماغی کنایہ ہے بیزاری یا نفرت سے + ناک میں دم محاورہ ہے بمعنی بیزار یا متنفر ہو جانا۔ لیکن "بوئے گل" کی وجہ سے اس محاورے میں ایہام پیدا ہو گیا ہے۔

(ا) پہلے معنی تو وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے ہیں نفرت یا بیزاری، مجازی معنی ۔

(ب) جب ہم پھول سونگھتے ہیں تو واقعی ناک میں دم آجاتا ہے (لفظی معنی) غالب نے معنی تو مجازی ہی مراد لئے ہیں مگر ایہام کی وجہ سے شعر میں لطف پیدا ہو گیا۔ جب تک دم (سانس) ناک میں نہ آئے کوئی شخص خوشبو سونگھ نہیں سکتا۔

مطلب :۔ دورِ عاشقی سے پہلے جب مجھے کوئی غم نہ تھا تو میں سیرِ چمن سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا لیکن اَب مصائب عشق کی وجہ سے اس قدر افسردہ خاطر ہو گیا ہوں کہ سیرِ باغ در کنار پھول سونگھنے سے بھی نفرت سی ہو گئی ہے

بنیادی تصور :۔ فطرت انسانی کی عکاسی کی ہے کہ جب دل رنجیدہ ہو، تو کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ جس کے باطن میں موسیقی نہ ہو اس کے لئے خارج میں بھی موسیقی کا وجود نہیں ہوتا۔

---

(۱۲)

(۱) سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی ٭ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

سراپا رہنِ عشق، یعنی عشق کرنے پر مجبور ہوں (جس میں ہر قدم پر جان کا خطرہ ہے) ناگزیرِ الفتِ ہستی یعنی اپنی جان (ہستی) سے محبت کرنے پر مجبور ہوں۔ اس مصرع میں لفظ "ہوں" محذوف ہے۔ حاصل بمعنی خرمن۔ عشق کو برق سے اور ہستی کو حاصل سے تشبیہ دی ہے +

مطلب:۔ اس شعر میں غالب نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان میں متضاد اوصاف پائے جاتے ہیں۔ وہ غیر سے بھی محبت کرتا ہے اور اپنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک مستقل کشمکش میں مبتلا رہتی ہے۔ بلکہ یہ کشمکش، زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت ہے، اور زندگی کے تمام ہنگامے اسی کشمکش پر موقوف ہیں۔ اگر یہ کیفیت نہ ہو تو زندگی میں یکسر جمود پیدا ہو جائے گا۔ یعنی ارتقاء ختم ہو جائے گا اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہستی، کشمکش ہی کا دوسرا نام ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی طبیعت کے اقتضاء سے مجبور ہوں کہ غیر سے بھی عشق کروں اور اپنی جان کو بھی محبوب رکھوں۔ میں غیر کی محبت میں اپنی ہستی کو فنا کر دینا بھی چاہتا ہوں لیکن اس کے باوجود اپنی ہستی کی بقاء کا بھی آرزومند ہوں! یعنی میری حالت اس شخص کی مانند ہے جو برق کی پرستش بھی کرتا ہے اور جب وہی برق اس کے خرمن کو جلا دے۔ تو اس پر افسوس بھی کرے۔

بنیادی تصور:۔ عکاسی فطرتِ انسانی یا بیانِ کشمکش ہستی۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی!
(۲) جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

بقدر ظرف ، حوصلے کے مطابق + خمار، نشہ کا اتار + خمیازہ، انگڑائی + شعراء کا دستور ہے کہ وہ ساحل کو خمیازہ سے تشبیہ دیتے ہیں کیونکہ انگڑائی کی طرح اس میں بھی خمیدگی اور کجی ہوتی ہے۔ شعراء اپنی قوت تخیل کی بناء پر اس کجی کی توجیہہ اس طرح کرتے ہیں کہ ساحل کو بوجہ خمار، انگڑائیاں آرہی ہیں یعنی وہ طالب آب ہے جس طرح مے نوش طالب مے ہوتا ہے۔ شاعر نے اپنے آپ کو خمیازۂ ساحل قرار دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ ساحل کی طرح میں بھی تشنہ کام ہوں۔ اس لیے طالب شراب ہوں۔

مطلب :۔ ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ اے ساقی! جس طرح مے نوشی میں میرا ظرف بہت عالی ہے یعنی مے نوشی کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح میری تشنہ کامی بھی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ جس طرح ساحل ہر وقت دریا سے فیض یاب ہوتے رہنے کے باوجود تشنہ ہی رہتا ہے اسی طرح تو مجھے جس قدر پلائے گا خمار تشنہ کامی بھی اسی قدر بڑھتا جائے گا۔ اگر تو پلانے کے اعتبار سے دریا ہے۔ یعنی اگر تیرے پلانے کی کوئی حد نہیں ہے تو میں بھی پینے کے اعتبار سے ساحل ہوں۔ یعنی میرے پینے کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اگر ساقی سے خدا مراد لی جائے تو مفہوم میں بہت گہرائی پیدا ہو جائے گی اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے خدا اگر تیری بخشش کی کوئی انتہا نہیں ہے تو میری تمناؤں کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ تیری نوازشیں لامحدود ہیں تو میری آرزوئیں بھی غیر متناہی ہیں۔

بالفاظِ دگر شاعر نے اس شعر میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان کی

فطرت یہ ہے کہ وہ "ھل من مزید" کی صدا لگاتا رہتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ انسان خواہ دنیا کا طالب ہو یا خدا کا دونوں صورتوں میں اس کی تمناؤں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اگر وہ دنیا کا طالب ہے تو ہر وقت نئی لذت کا طلبگار نظر آتا ہے اور اگر خدا کا عاشق ہے تو ہر لحظہ نئی تجلی سے ہمکنار ہونے کے لیے بیقرار رہتا ہے۔ تسکین نہ اسے حاصل ہے نہ اسے نصیب ہے

اقبال کا یہ شعر شاید خلاف محل نہ ہو۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی ❊ اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

---

(۱۳)

(۱) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ❊ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

محرم۔ آشنا + نوا۔ آواز، نغمہ، راگنی + راز بمعنی پوشیدہ بات۔ چونکہ حقیقت بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اس لیے اُسے بھی راز سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت کنایہ ہے ذات باری سے + نواہائے راز۔ حقیقت کے نغمے یعنی وہ مظاہر کائنات جن کے ذریعہ سے حقیقت (ذات باری) اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے حقیقت کو اگر ساز فرض کیا جائے تو "مظاہر" وہ نغمے ہیں جو اس ساز سے نکل رہے ہیں اور اس طرح اس کے وجود خارجی کا اعلان و اثبات کر رہے ہیں + حجاب بمعنی پردہ یا آڑ جو کسی شی کو پوشیدہ کر دے + پردہ اس لفظ میں ایہام ہے اور اسی ایہام نے اس لفظ کو اس شعر کی جان بنا دیا ہے۔

(ا) پردہ بمعنی وہ پردہ جو کسی ساز مثلاً ستار پر بندھا ہوتا ہے (عموماً ستار میں سولہ پردے ہوتے ہیں) پردے پر انگلی رکھ کر تار کو چھیڑتے ہیں تو مخصوص سُر پیدا ہوتا ہے۔

(ب) پردہ بمعنی حجاب۔

شاعر نے دراصل پہلے معنی مراد لیے ہیں۔ دوسرے معنی کی طرف ایہام کیا ہے اور اسی سے شعر میں شاعرانہ خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

اس شعر میں نوا، حجاب، پردہ اور ساز میں مناسبت لفظی و معنوی پائی جاتی ہے اور اس رعایتِ لفظی نے بھی شعر کی خوبی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

غالب نے دوسرے مصرع میں حجاب کو پردۂ ساز قرار دے کر اپنی بلند پروازی نکتہ سنجی، معنی آفرینی اور حسن ادا کا ایسا دلکش مظاہرہ کیا ہے کہ اُن کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے :

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

مطلب :- اے مخاطب! چونکہ تو محرم نوا ہائے راز نہیں ہے اس لیے تو یہ سمجھتا ہے کہ حقیقت سراپا مستور ہے۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہے حقیقت مستور ہونے کے باوجود عریاں بھی ہے۔ بلکہ مستوری بھی اس کے جلوے ہی کی ایک ادا ہے :-

میں تو ان مجبوریوں پر بھی سراپا دید ہوں!
اس کے جلوے کی ادا، اِک شانِ مستوری بھی ہے (اصغر مرحوم)

دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے (اقبال)

پردہ پوشی جسے تو حجاب یعنی وہ آڑ یا پردہ سمجھتا ہے جو کسی شئی کو پوشیدہ کر دے، وہ دراصل حجاب نہیں ہے بلکہ وہ پردۂ ساز ہے جس سے نوا ہائے رازِ حقیقت

کے نغمے) سرزد ہو رہے ہیں یعنی اشیائے کائنات جن کو تو حجابات سمجھ رہا ہے
دراصل وہ مظاہر ہیں جن سے حقیقت ظاہر ہو رہی ہے۔ اور ہر مظہر زبانِ حال سے
اس کی ہستی پر گواہی دے رہا ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست زمعرفت کردگار (سعدیؒ)

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا (نیاز بریلویؒ)

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا! (دردؒ)

ساز سے جو نغمے نکلتے ہیں وہ پردے ہی کی بدولت نکلتے ہیں۔ پردہ نہ ہو
تو نغمہ نہیں نکل سکتا۔ اس لیے پردۂ ساز کا مطلب ہوا وہ شئی جو ساز کی ہستی پر گواہی
دے۔ اس نکتہ کو ملحوظ رکھنے سے دوسرے مصرع کا مطلب واضح ہو سکتا ہے
کہ: ہر حجاب، بظاہر حجاب ہے مگر دراصل پردۂ ساز ہے۔ یعنی خدا کی
ہستی پر گواہی دے رہا ہے۔ خواجہ میر دردؒ نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:-

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب، کوئی پردہ نہ دیکھا

خلاصۂ کلام این کہ اے مخاطب! ہر وہ شئی جسے تو حجاب (مانع دیدار) سمجھتا
ہے دراصل اک پردۂ ساز (مظہرِ ذات) ہے جس سے نوا ہائے راز سرزد ہو رہی ہیں۔
بنیادی تصور:- ع ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست

نوٹ :۔ حالی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "راز کے نغموں سے تو خود ہی نا آشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجابات نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے ہیں یعنی اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں"۔

(یادگار غالب ص ۱۲۵)

(۲) رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے ؎ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

رنگِ شکستہ بمعنی رنگ پریدہ۔ کنایہ ہے عاشق کی آشفتہ حالی اور پریشانی سے۔ صبحِ بہارِ نظارہ پہلے نظارہ کو بہار فرض کیا، پھر بہار کے لیے "صبح" ثابت کی۔ پھول عموماً صبح کے وقت کھلتے ہیں اس لیے صبح بہار کا منظر بالخصوص لائق دید ہوتا ہے۔ شگفتنِ گلہائے ناز کنایہ ہے محبوب کے اظہارِ ناز و ادا سے۔ لفظِ "صبح" میں ایہام ہے۔

(ا) صبح بمعنی معروف یعنی وقت صبح جب کہ پھول کھلتے ہیں۔ (معنیٔ قریب) (ب) صبح، کنایہ از دلکشی۔ (معنی بعید)

شاعر نے پہلے مصرع میں صبح سے معنیٔ بعید اور دوسرے مصرع میں معنیٔ قریب مراد لیے ہیں اسی ایہام کی بدولت اس شعر میں شاعرانہ نازک خیالی پیدا ہو گئی ہے اور یہی وہ اندازِ بیان ہے جس پر غالب کو ناز ہے۔

مطلب :۔ اے محبوب! چونکہ تیرا عدیم المثال حسن و جمال میری آشفتہ حالی کا سبب ہے اس لیے تجھے حق حاصل ہے کہ تو اپنے حسن کی دلکشی پر ناز کرے۔

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ حسنِ محبوب۔

---

(۳) تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز ؎ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

مطلب :۔ اے محبوب! تو رقیب کو بار بار محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے

اور چونکہ تیرے اس طرزِ عمل سے تیری (نازک) پلکوں کو دکھ پہنچ رہا ہے اس لیے مجھے ان کے دکھ سے دکھ ہو رہا ہے۔

دوسرا مطلب :۔ چونکہ تو رقیب کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے اس لیے فرطِ جذبۂ رقابت سے تیری پلکیں میرے دل میں چبھ رہی ہیں۔

دکھ کے لفظ کو اگر مژہ سے وابستہ کیا جائے تو پہلا مطلب برآمد ہوتا ہے۔ اور اگر عاشق سے متعلق کیا جائے تو دوسرا مفہوم پیدا ہو سکتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ (ا) پاسِ زحمتِ مژگانِ یار (ب) اظہارِ جذبۂ رقابت خویش۔

---

(۴) صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں ٭ طعمہ ہوں ایک ہی نفَس جاں گداز کا

صرفہ بمعنی فائدہ + طعمہ بمعنی نوالہ یا لقمہ + جاں گداز بمعنی جان کو پگھلانے والا۔

مطلب :۔ آہوں کو اس لیے ضبط کر رہا ہوں کہ اس میں سراسر میرا ہی فائدہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شدتِ آتشِ عشق سے میرے سینہ میں اس قدر گرمی پیدا ہو چکی ہے کہ ایک ہی آہ میری ہستی کو فنا کر دینے کے لیے کافی ہے۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ آتشِ عشق۔

---

(۵) ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ٭ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

بساط بمعنی فرش + شیشہ باز بمعنی نٹ جو بوتل سر پر رکھ کر ناچتا ہے مگر گرنے نہیں دیتا۔

مطلب :۔ موسمِ بہار میں شراب میں بھی اس قدر جوش پیدا ہو گیا ہے کہ بوتلیں اچھل رہی ہیں۔ گویا محفل کے ہر گوشہ میں شیشہ باز اپنے کرتب دکھا رہے ہیں۔

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ موسمِ بہار۔

(۶) کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ٭ ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

کاوش بمعنی کرید نا کھودنا ۔ یہاں گرہ کھولنے کی کوشش مراد ہے ۔ گرہ نیم باز کنایہ ہے دل سے ۔ دل کو گرہ اس لیے قرار دیا کہ تنگی یا فرطِ غم سے دل گرہ بن کررہ گیا ہے ۔ نیم باز سے یہ اظہار مقصود ہے کہ اس سے پہلے گرہ کشائی کی کوشش ہو چکی ہے ۔ شعر کی نثر یوں ہو گی :-

میرا دل ناخن سے دوبارہ کاوش کا تقاضا کر رہا ہے کیونکہ ہنوز اس گرہ باز (دل) کا قرض ، ناخن پر واجب ہے ۔

مطلب :- نثر سے مطلب واضح ہو گیا ہے کہ میرا دل ناخن سے کاوشِ مزید کا اس طرح تقاضا کر رہا ہے جس طرح قرض خواہ ، مقروض سے قرض کی وصولیابی کا تقاضا کرتا ہے ۔ گویا کاوش بمنزلہ قرض ہے جو ناخن پر واجب ہے مطلب یہ ہے کہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ ناخن غم ، زخم دل کو اپنی کاوش سے اتنا بڑھاوے کہ دل سراپا زخم بن جائے تاکہ عاشقی کی معراج نصیب ہو جائے ۔

بنیادی تصور :- ذوقِ کاوشِ دل ۔

---

(۷) تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ ٭ سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

مطلب :- کمالِ عاشقی یہ ہے کہ جان جائے مگر رازِ عشق فاش نہ ہو ۔ یعنی محبوب رسوا نہ ہو ۔ چنانچہ غالب خود کہتے ہیں :-

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ٭ ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

غالب کہتے ہیں کہ میرے سینہ میں رازِ محبوب مخفی تھا جیسے موتی دفینے میں مخفی ہوتے ہیں ۔ مگر افسوس کہ کاوشِ غمِ ہجراں (مفارقت کے غم) نے اس دفینہ کو برباد کر دیا یعنی شدتِ غمِ ہجراں نے رازِ عشق فاش کر دیا ۔

بنیادی تصور :- غمِ رسوائی محبوب۔

---

(۱۴)

(۱) بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا ٭ رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

اشعار کا دفتر کھلا یعنی مشاعرہ قائم ہُوا۔ گنجینۂ گوہر سے (۱) دربار شاہی اور (۲) دفترِ اشعار دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

مطلب :- بادشاہ کی سخن پروری کی بدولت دربار شاہی میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اے خدا اس دربار کو یا مشاعروں کے سلسلہ کو ہمیشہ قائم رکھیو۔

بنیادی تصور :- اظہارِ مسرت بر قیامِ مشاعرہ۔

---

(۲) شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا ٭ اس تکلف سے گویا بتکدے کا در کھلا

مطلب :- رات کے وقت چمکیلے ستارے ایسے دلکش انداز کے ساتھ آسمان پر نمودار ہوئے جیسے کسی بت خانے میں بہت سی حسینائیں اپنا جلوہ دکھا رہی ہوں۔

بنیادی تصور :- ستاروں کی دلکشی کا سماں دکھایا ہے۔

(۳) گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا!

دوست سے محبوب بھی مراد ہو سکتی ہے اور وہ لوگ بھی مراد ہو سکتے ہیں جو بظاہر بر دوستی کا دم بھرتے ہیں مگر باطن نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ اور اس دنیا کے بدلے ہوئے دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دشنہ یعنی خنجر یا چھرا۔

مطلب :۔ یہ سچ ہے کہ میں عاشق ہوں اور عاشق کی دیوانگی مشہور ہے مگر پھر بھی مجھ میں اتنی عقل ہے کہ دوست اور دشمن میں تمیز کر سکوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس زمانے کے دوست عموماً منافقانہ روش رکھتے ہیں۔ یعنی بظاہر ہمدردی کرتے ہیں مگر بباطن ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ نشتر سے فصد کھول کر دیوانگی کا علاج کرتے ہیں اس لیے نشتر کنایہ ہے اظہار ہمدردی سے اور دشنہ سے انسان کو قتل کر سکتے ہیں اس لیے دشنہ کنایہ ہے ایذا رسانی سے۔

بنیادی تصور :۔ دوستوں کی منافقانہ روش کا اظہار۔

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اس کا بھید
(۴) پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا!

کُھلا یعنی بے تکلف ہو گیا۔

مطلب :۔ اگرچہ نہ میں محبوب کی گفتگو سمجھ سکتا ہوں۔ نہ اس کے دلی ارادوں سے آگاہ ہو سکتا ہوں لیکن میرے لیے یہ بھی بہت خوشی کا مقام ہے کہ وہ مجھ سے بے تکلف تو ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور :۔ محبوب کی نظر التفات پر مسرت کا اظہار۔

---

(۵) ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال ÷ خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

خیالِ حسن یعنی حسن کا تصور کرنا۔ چونکہ عاشق ہمیشہ محوِ جمال رہتا ہے اس لیے خیالِ حسن کنایہ ہے عاشقانہ زندگی سے۔ خیال یعنی رنگ یا انداز۔ حُسنِ عمل یعنی نیکی کرنا۔ چونکہ زاہد ہمیشہ نیکی کرتا رہتا ہے اس لیے حسن عمل کنایہ ہے زاہدانہ زندگی سے دوسرا مصرع کنایہ ہے دخولِ جنت یا جنتی زندگی سے۔

مطلب :- یہ شعر غالب کے بلند پایہ حکیمانہ اشعار میں سے ہے اس میں انہوں نے یہ نظریہ بیان کیا ہے کہ محویت خیال یار میں بھی نکوکاری کا رنگ پایا جاتا ہے یعنی تصور حسن بھی بجائے خود ایک نیکی ہے۔ اس لیے ایک عاشق باعتبار نکوکاری کسی زاہد یا عابد سے کم نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد میری قبر میں جنت کی کھڑکی کھل گئی یعنی میں بھی نکوکاروں (بہشتیوں) کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مرنے کے بعد بھی تصور حسن جاناں میں مستغرق ہوں اس لیے قبر میں بھی جنت کا لطف حاصل کر رہا ہوں ۱۲

بنیادی تصور :- خیال حسن (تصور جاناں) میں بھی حسن عمل (نکوکاری) کا رنگ پایا جاتا ہے۔ بالفاظِ دگر، خیال حسن اور حسن عمل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

موُنہہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

(۶) زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا

مونہہ نہ کھلنے پر یعنی زیر نقاب ہونے کے باوجود + وہ عالم یعنی دلکشی کا وہ عالم ہے + دیکھا ہی نہیں۔ یہ جملہ غالب کے حسن انتخاب الفاظ پر شاہد ہے۔ اسی سے اندازِ بیان میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلکشی کا ایسا عالم کہیں نہیں دیکھا۔ یعنی ایسی دلکشی کسی معشوق میں نہیں دیکھی۔ کھلا بمعنی باعثِ زینت یا موجب دلکشی بن گیا۔

مطلب :- اس شعر کا اطلاق مجاز اور حقیقت دونوں پر ہو سکتا ہے :-

(۱) اگرچہ محبوب کے رخ روشن پر بکھری ہوئی زلفیں بھی بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں مگر میرے محبوب کے چہرے پر نقاب ان سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے حالانکہ اس کا چہرہ نقاب میں پوشیدہ ہے۔ اس کے باوجود اس کی

دلکشی کا یہ عالم ہے کہ اس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی یعنی اس کا چہرہ زیر نقاب ہونے کے باوجود اتنا دلکش ہے کہ کسی اور کا بے نقاب چہرہ بھی اس قدر جاذب نظر نہیں ہے۔

جس طرح پہلے مصرع میں "دیکھا ہی نہیں" قابل داد ہے اسی طرح دوسرے مصرع میں لفظ شوخ نہایت موزوں اور بر محل استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ اس قدر شوخ ہے کہ اس کی شوخی نقاب سے چھن چھن کر باہر آرہی ہے اور دیکھنے والوں کو محو حیرت بنا رہی ہے۔

(ب) اگر اس شعر کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو زلف سے صفات کی تجلی اور نقاب سے تعینات کا پردہ مراد لیں گے۔

مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ ذاتِ باری تعالےٰ تعینات کے پردوں میں مستور ہے اس کے باوجود اُس کے حسن کی دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ ساری کائنات میں اس کی نظیر نہیں ملتی یہ سچ ہے کہ اس کی صفات کی تجلی بھی دلکش ہے۔ مگر اس کی دلکشی کا کسی کو احساس نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے دیکھنے کی تاب کسے ہے؟ برعکس این اس کے حُسن کی جو شعاعیں تعینات کے پردوں سے پھوٹ کر نکل رہی ہیں چونکہ عشاق ان کی تاب لا سکتے ہیں اس لیے وہ ان کے دلوں کے پار ہوئی جاتی ہیں۔ اس بات کو غالب نے شاعرانہ انداز میں یوں ادا کیا ہے کہ

ع زُلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

بنیادی تصور:- (ا) نقاب زلفوں سے زیادہ دلکش ہے۔

(ب) مظاہر کائنات، جمال ذات پر شاہد ہیں۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا

(۷) جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

مطلب :۔ میری التجا پر اس نے مجھے اپنے دروازے پر پڑے رہنے کی اجازت دے دی مگر اس کی ستم ظریفی تو دیکھو! جب میں نے اپنا بستر جما لیا تو حکم دیا، کہ یہاں سے اُٹھ جاؤ۔

بنیادی تصور :۔ تصویر شوخیٔ محبوب۔

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
(۸) آج اُدھر ہی کو رہے گا، دیدۂ اختر کھلا

مطلب :۔ سوال کرتے ہیں کہ شبِ غم اس قدر تاریک کیوں ہے؟ خود ہی جواب دیتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالمِ بالا سے ایسی بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے جنہیں "چشمِ فلک" نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لیے تمام ستارے دنیا کی طرف دیکھنے کے بجائے عالمِ بالا کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

بنیادی تصور :۔ بیانِ تاریکیٔ شبِ غم۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
(۹) نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا!

غربت بمعنی پردیس + کھلا ہوا نامہ کنایہ ہے کسی کی موت کی خبر سے +

مطلب :۔ میں پردیس میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں جب کہ نزولِ مصائب کا یہ عالم ہے کہ نامہ بر اکثر کھلے ہوئے خطوط لے کر آتا ہے؟

بنیادی تصور :۔ شدتِ نزولِ مصائب۔

اُس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
(۱۰) واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

گنبدِ بے در کنایہ ہے آسمان سے۔ گنبدِ بے در کھلا یعنی آسمان میں شگاف ہو گیا۔ کنایہ ہے معراج نبوی سے + بند کا لفظ کھلا کی رعایت سے لائے ہیں۔

مطلب :۔ اے غالب! میں اس عظیم المرتبہ رسولؐ کی امت میں ہوں جس کے لیے گنبدِ بے در کھل گیا۔ جو ہمیشہ بند رہتا ہے کسی کے لیے نہیں کھلتا۔ تو بھلا میرا کام کیسے بند رہ سکتا ہے؟ یعنی میرے مقاصد بھی بر آئیں گے۔

بنیادی تصور :۔ وجۂ تسلئ قلبِ محزوں۔

---

(۱۵)

(ا) شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

زہرۂ ابر آب تھا۔ بادلوں کا پتہ بھی پانی ہو رہا تھا۔ پتہ پانی ہونا کنایہ ہے خوفزدہ ہونے سے + مطلب یہ ہے کہ بادل جو آگ کو بجھا سکتا ہے، میرے دل کی سوزش (گرمی) سے خوفزدہ تھا کہ کہیں یہ برقِ سوزِ دل مجھے جلا کر خاک نہ کر دے + شعلۂ جوالہ۔ گردش کرتے والا شعلہ +

مطلب :۔ شبِ ہجر میں میرے دل کی سوزش کو دیکھ کر بادل کا پتہ مارے خوف کے پانی ہو کر بہہ نکلا اور اس میں بھی اس قدر حرارت سرایت کر گئی کہ اس میں جو بھنور پڑتا تھا وہ بھی شعلۂ جوالہ معلوم ہوتا تھا۔ شعر کی خوبی صرف مبالغہ کو اغراق کی حد تک پہنچا دینے میں ہے۔ شاعرانہ خیال بندی کا کمال دکھایا ہے کہ پہلے بادل کو انسان فرض کیا پھر اس کے لیے پتہ ثابت کیا۔ پتہ کو پانی کر کے بہایا اور اس میں شعلۂ جوالہ کا تماشا دکھایا۔

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ سوزِ دل۔

وال کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
(۲)
گریہ سے یاں، پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

کرم کنایہ ہے تشریف آوری سے + عناں گیرِ خرام بمعنی مانع نقل و حرکت +
پنبۂ بالش بمعنی تکیہ کی روئی + کفِ سیلاب بمعنی سیلاب کے جھاگ۔
مطلب :۔ وہ تو بارش کی وجہ سے تشریف لانے سے معذور رہے اور یہاں
شدتِ گریہ کا یہ عالم تھا کہ تکیے کی روئی آنسوؤں میں کفِ سیلاب کی طرح تیر رہی تھی۔
بنیادی تصور :۔ کثرتِ گریہ در فراقِ یار۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
(۳)
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

مطلب :۔ غالب نے اس شعر میں صنعتِ تقابل سے خوبی پیدا کی ہے یعنی
محبوب اپنے بالوں میں موتی پرو رہا تھا اور میں تارِ نگاہ میں دُرِ اشک پرو رہا تھا
اور میں نے یہ موتی اس کثرت سے پروئے کہ تارِ نگاہ بالکل چھُپ گیا۔
بنیادی تصور :۔ شدتِ گریہ در انتظارِ محبوب ۱۲

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو
(۴)
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی :۔ واں جلوۂ گل نے آبِ جو کو چراغاں کر دیا تھا۔
مطلب :۔ باغ میں گلاب کے پھولوں کی وہ کثرت تھی کہ نہر کے پانی میں چراغاں
کا سماں نظر آ رہا تھا۔ ادھر میری پلکوں سے خون کے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی (گلاب
اور خون دونوں سرخ ہوتے ہیں)

بنیادی تصور :۔ داستانِ گریہ وزاری در فراقِ محبوب ۔

یاں سرِ پُر شور، بے خوابی سے تھا دیوار جو،
(۵)
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

"دیوار جو" کی ترکیب غیر مانوس اور غیر فصیح ہے ۔ سرِ عاشق دیوار جو تھا یعنی عاشق اپنا سر دیوار سے پھوڑنا چاہتا تھا۔ فرقِ ناز کنایہ ہے سرِ محبوب سے جس کی رگ رگ میں ناز و انداز بھرا ہوتا ہے ۔ بالش کمخواب کے دو معنی ہیں (۱) ایسا تکیہ جس پر کمخواب کا غلاف چڑھا ہو۔ (۲) ایسا تکیہ جس پر سر رکھنے سے نیند میں کمی ہو جائے۔ اس ایہام سے شاعرانہ خوبی پیدا ہو گئی ہے + محوِ بالش سے محبوب کا محوِ خواب ہونا مراد ہے۔ کمخواب کی رعایت سے پہلے مصرع میں خوابی، کا لفظ لائے ہیں ۔

مطلب :۔ ہم تو اس کے فراق میں زندگی سے عاجز آئے ہوئے تھے (دیوار سے سر پھوڑنا چاہتے تھے) اور وہ کمخواب کے تکئے پر اپنا سرِ پُر غرور رکھے ہوئے محوِ خواب تھا۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ بے قراری در فراقِ محبوب ۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
(۶)
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

مطلب :۔ یہاں آہ کے شعلے ہماری بزمِ بیخودی میں شمع روشن کر رہے تھے یعنی ہم مصروف آہ و نالہ تھے اور وہاں وہ (محبوب) دوستوں کے ساتھ پھولوں کے فرش پر بیٹھا ہُوا لطف شباب اٹھا رہا تھا۔

بنیادی تصور۔ نقشۂ شب فراق۔

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
(۷) یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

"سوختن کا باب" یہ ترکیب اردو میں غیر فصیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری نگاہ میں ساری کائنات جلا دینے کے لائق تھی + فرش سے تا عرش کا تقابل "زمیں سے آسماں تک" قابلِ دید ہے + موجِ رنگ کا طوفان کنایہ ہے، عیش و عشرت سے + سوختن کا باب کنایہ ہے شدتِ رنج والم سے۔

مطلب :۔ وہ میرے رقیبوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے تھے (دادِ عیش دے رہے تھے) اور میں آتشِ فراق میں سر سے پاؤں تک جل رہا تھا۔ یعنی ان کی جدائی میں میرا یہ حال تھا کہ ساری کائنات کو آگ لگا دینے کو جی چاہتا تھا۔ ع جی میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانہ کو ہم

بنیادی تصور :۔ تصویرِ شدتِ فراق۔

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
(۸) دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

اس رنگ سے یعنی اس انداز سے + واضح ہو کہ لفظ "رنگ" غالب کے محبوب الفاظ میں سے ہے۔ انہوں نے اس کو اکثر غزلوں میں، مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ یہاں خونابہ کی رعایت سے لائے ہیں۔ خونابہ بمعنی خونِ ناب یا خونِ خالص۔ یہاں کنایہ ہے اشعارِ دردناک سے + کاوشِ ناخن استعارہ ہے کاوشِ غم سے + لفظ ذوق، لذت یابی میں مبالغہ کے لیے لائے ہیں ورنہ اس کی

چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ذوق کا مفہوم خود لذت میں مخفی ہے۔

مطلب :۔ ناگہاں میرا دل، جو کاوشِ غم سے لذت اندوز ہو رہا تھا۔ اس طرح خون کے آنسو بہانے لگا۔ خونابہ چکانی سے آئندہ غزل کے اشعار مراد ہیں۔

بنیادی تصور :۔ تحریک غزل گوئی۔

(۱۶)

نالۂ دل میں شب، انداز اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا

سپند۔ کالا دانہ جسے دفع نظر بد کے لیے جلاتے ہیں۔ دل کو سپند سے تشبیہ دی ہے اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ دل بھی آتش فرقت میں جل رہا ہے۔

مطلب :۔ شب فرقت میں، میرے نالۂ دل میں کوئی اثر نہ تھا۔ اگرچہ میرا دل بہت بیتاب تھا۔ مگر نالوں میں اثر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیتابی خود اس کے مدعا کے خلاف تھی یعنی وہ محفل غیر کو درہم برہم کرنے کے بجائے، الٹا اسے نظر بد سے بچانے کے لیے سپند کا کام دے رہا تھا۔

بنیادی تصور :۔ نایابئ تاثیرِ آہ و فغاں۔

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا!

مقدم سیلاب بمعنی آمد سیلاب + نشاط آہنگ بمعنی شادماں یا مسرور + سازِ صدائے آب بمعنی جل ترنگ۔

مطلب :۔ گھر میں سیلاب کے آجانے سے یعنی گھر کی بربادی سے میرا دل بہت مسرور ہو رہا ہے۔ یوں سمجھو کہ میرا گھر، جلترنگ بن گیا ہے جس سے نغمے نکل رہے

ہیں اور میں ان کو سن کر خوش ہو رہا ہوں۔
بنیادی تصور:۔ عاشق کی نگاہ میں خانہ بربادی موجب مسرت ہوتی ہے۔

---

(۳) نازش ایام خاکستر نشینی، کیا کہوں ٭ پہلوئے اندیشہ وقف بستر سنجاب کا
نازش بمعنی فخر و تمکنت + خاکستر بمعنی خاک + پہلوئے اندیشہ یعنی اندیشہ،
اندیشہ بمعنی تصور یا خیال + سنجاب۔ ایک صحرائی جانور، گلہری سے بڑا،
لومڑی سے چھوٹا جس کی کھال کے پوستین بنائے جاتے ہیں۔
مطلب:۔ جب میں قناعت کی زندگی بسر کر رہا تھا کیا کہوں کس قدر اطمینان
قلب حاصل تھا! اگرچہ میں خاک نشین تھا مگر اس حالت میں بھی مجھے وہی راحت
محسوس ہوتی تھی جو کسی کو سنجاب کے بستر پر محسوس ہوتی ہے۔
بنیادی تصور:۔ لطف خاک نشینی۔

---

(۴) کچھ نہ کی اپنے جنوں نارسا نے، ورنہ یاں ٭ ذرہ ذرہ روکش خورشید عالمتاب تھا۔
کچھ نہ کی بمعنی امداد نہ کی۔ جنونِ نارسا بمعنی سودائے خام یا عشق ناقص۔ روکش
بمعنی مدِ مقابل +
مطلب:۔ میرے جذب ناقص نے مجھے اکتساب فیض سے محروم رکھا یعنی
میں اپنی خامی کی وجہ سے مشاہدہ تجلیات نہ کر سکا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ
کائنات کا ذرہ ذرہ، اس کے نور سے مستنیر ہو کر آفتاب کا مدِ مقابل بنا ہوا ہے۔
بنیادی تصور:۔ ع جمال یار ہر سو جلوہ گر ہے۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
(۵) کل تلک تیرا بھی دل، مہر و وفا کا باب تھا

(۶)
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ ترے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

مطلب :۔ اے محبوب! اجائے حیرت ہے کہ آج تجھے اپنے عاشقوں کی مطلق پروا نہیں ہے یا کل تک تو ان پر بڑا مہربان تھا! وہ دن یاد کر جب تیرے دام کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں دیدۂ بے خواب بنا ہوا تھا۔

حلقۂ دام کو دیدۂ بے خواب سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ حلقہ بھی دیدۂ بے خواب کی طرح ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب تو ہر وقت لوگوں کو اپنا عاشق بنانے کے لیے آمادہ رہتا تھا۔

بنیادی تصور :۔ شکوہ تغافل شعاریٔ محبوب۔

---

(۷)
میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

مطلب :۔ وہ تو یہ کہو کہ رات میں نے غالب کو سمجھا بجھا کر رونے سے باز رکھا ورنہ وہ اس قدر روتا کہ اس کے آنسوؤں کے سیلاب میں آسمان بھی بہ جاتا۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ گریہ در شبِ فراق۔

---

(۱۷)

(۱) اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑے حساب ؛ خونِ جگر، ودیعت مژگان یار تھا

حساب دینا پڑا یعنی آنکھوں سے بہانا پڑا۔ ودیعت بمعنی امانت۔ یہ شعر غالب کے اندازِ بیان کی بہت عمدہ مثال ہے۔

مطلب :۔ فراقِ یار میں تمام خون جگر آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر باہر آگیا۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ میرا خونِ جگر، میرا نہ تھا بلکہ مژگانِ یار نے امانتاً میرے جگر میں رکھ دیا تھا ورنہ کوئی قطرہ تو جگر میں باقی رہ جاتا![1]

بنیادی تصور:۔ تباہ کاری ناوکِ مژگاں۔

---

(۲) اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو ۔ توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا

ماتمِ یک شہرِ آرزو میں "یک شہر" مبالغہ کے لیے ہے جیسے یک بیاباں ماندگی میں یک بیاباں۔ مطلب ہے بہت سی آرزوؤں کا ماتم + آئینہ کنایہ ہے دل سے + تمثال بمعنی تصویر، کنایہ ہے آرزوؤں سے + تمثال دار بمعنی حامل تصاویر یعنی اس میں بہت سی آرزوئیں آباد تھیں +

مطلب:۔ محبوب سے خطاب کرتے ہیں کہ تو نے میرا دل توڑ دیا جس میں میری آرزوؤں کی ایک دنیا آباد تھی، اس لیے اب میں ساری عمر ان آرزوؤں کا ماتم کرتا رہوں گا۔

بنیادی تصور:۔ ماتمِ یک شہرِ آرزو۔

---

(۳) گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں ۔ جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

جاں دادہ بمعنی کشتہ + ہوا بمعنی آرزو + رہگذار سے رہگذارِ محبوب مراد ہے۔

مطلب:۔ میں اپنی زندگی میں اس بات کا آرزومند رہا کہ کسی طرح میری رسائی

---

[1] میری آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی اس لیے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا۔ جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔ (یادگارِ غالب ص ۲۹)

محبوب کی گلی تک ہو جائے لیکن افسوس کہ جیتے جی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اس لیے میرے مرنے کے بعد دوستوں کو لازم ہے کہ میری نعش کو دفن کرنے کے بجائے گلیوں میں گھسیٹتے پھریں۔ اس طرح کبھی نہ کبھی میری نعش اس کی گلی میں بھی پہنچ ہی جائے گی اور میری دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی۔

بنیادی تصور:۔ ہوا سے کوئے جاناں۔

(۴) موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ؛ ہر ذرہ، مثلِ جوہرِ تیغ، آبدار تھا

موجِ سراب۔ ذراتِ ریگ دھوپ میں دور سے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے پانی لہریں مار رہا ہو۔ اسی لیے سراب بمعنی دھوکہ یا فریبِ نظر مستعمل ہے + جوہر۔ گوہر کا معرب ہے اور کثیر المعانی لفظ ہے لیکن فارسی زبان میں بمعنی موجِ آہن مستعمل ہے۔ چنانچہ تیغ جوہر دار اس تلوار کو کہتے ہیں جس کا لوہا بہت عمدہ، درخشاں اور صیقل شدہ ہو یعنی اس میں نیلاہٹ جھلک مارتی ہو۔ اسی جھلک کو موجِ آہن کہتے ہیں اس موج کو آب و تاب یا چمک دمک سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لفظ غالب کے محبوب الفاظ میں سے ہے۔ انہوں نے اسے اکثر اشعار میں استعمال کیا ہے مثلاً جوہرِ تیغ، جوہرِ آئینہ، جوہرِ اندیشہ وغیرہ۔ مراد اس سے وہی صفائی، چمک دمک، آب و تاب یا صیقل ہے جو فولاد اور آئینہ کی سب سے بڑی خوبی ہے جب لوہے کو بار بار آگ میں تپاتے ہیں تو اس میں چمک (آب) پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کو جوہر کہتے ہیں۔ آبدار بمعنی چمکدار، والا یا درخشاں + موجِ سراب، جوہرِ تیغ اور آب دار تینوں لفظوں میں مناسبت ہے۔

مطلب:۔ دشتِ وفا میں قدم رکھنا (راہِ وفا میں گامزن ہونا) بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس راہ میں ہر قدم پہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یوں سمجھو کہ

اس دشت کا ہر ذرہ، رہرو کے حق میں تیغِ ابدار کا کام دیتا ہے۔
بنیادی تصور:۔ دشوارئ راہِ وفا۔

---

(۵) کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب ٭ دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

روزگار کے دو معنی ہیں (۱) روزی یا وجہ معاش (۲) زمانہ، جہان یا دنیا۔ اس لیے غمِ روزگار کے بھی دو معنی ہیں (۱) روزی یا وجہ معاش کا غم چنانچہ کہتے ہیں فلاں شخص آج کل بے روزگار ہے یعنی اسے روزی کا غم ہے۔ (۲) وہ غم جو دنیاوی زندگی سے اس طرح وابستہ ہے جس طرح تنفس، چنانچہ کہتے ہیں "جب تک دم ہے تب تک غم ہے"۔

ع غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا (میرؔ)
ع قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں (غالبؔ)

یعنی ہر شخص جب تک زندہ ہے ہر وقت کسی نہ کسی غم میں مبتلا رہتا ہے۔ اس غمِ روزگار یا غمِ جہان کو غالب نے غمِ ہستی سے بھی تعبیر کیا ہے۔

ع غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج

یہاں غالب نے غمِ روزگار کو دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی غموں کا وہ سلسلہ جو صرف موت سے منقطع ہوتا ہے۔

مطلب:۔ عشق کرنے سے پہلے ہم بھی، دوسرے ناتجربہ کار لوگوں کی طرح، غمِ عشق کو کم یعنی بہت معمولی بات سمجھتے تھے لیکن جب عاشقی کے کوچہ میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ غمِ عشق وہ بری بلا ہے کہ اگر کسی وجہ سے کم ہو جائے تو بھی غمِ روزگار سے کم نہیں ہے یعنی بہت زیادہ ہے۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ غمِ عشق۔

(۱۸)

(۱) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ٭ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

میسّر۔ یُسر (آسانی) سے اسم مفعول ہے بمعنی آسان کردہ شدہ۔ اگرچہ اردو میں میسّر اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا مگر یہاں غالب نے اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ انسان سے یہاں کمال انسانیت یا انسان کامل مراد ہے۔ دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے لیے انسان کامل کے مرتبہ پر فائز ہونا آسان نہیں ہے۔ اس شعر میں غالب نے لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں جمع کر دی ہیں۔

مطلب :۔ مولانا حالی فرماتے ہیں "بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا" یادگار غالب صفحہ ۱۹۱ مختصر لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہر آدمی، انسان ہے اس کے باوجود آدمی کے لیے انسان کامل بننا یعنی انسانیت کے مرتبۂ کمال تک پہنچنا آسان نہیں ہے

بنیادی تصور :۔ دشواریٔ حصولِ کمال انسانیت۔

---

(۲) گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی ٭ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا۔

"ٹپکے ہے" اس کے دو معنی ہیں (۱) ظاہر ہو رہا ہے (یہی معنی مراد ہیں)۔ (۲) آنسو کے لیے بھی ٹپکنے کا لفظ بولتے ہیں اور اسی ایہام سے اس لفظ میں شاعرانہ خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ غالب کے اندازِ بیان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ قصداً ایسے الفاظ لاتے ہیں جن میں ایہام ہوتا ہے۔ مقصد اس سے کلام میں دلکشی

پیدا کرنا ہے۔

مطلب :۔ یہ جو میں ہر وقت روتا رہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ گریہ میرے گھر کو برباد کرنا چاہتا ہے (ورنہ کسی وقت تو آنسو ختم جاتے) چنانچہ درودیوار سے بربادی کے آثار نظر آرہے ہیں اور وہ دن دور نہیں ہے جب میرا گھر واقعی بیاباں ہو جائے گا۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ گریہ وزاری۔

(۳) وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو ؛ آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

مطلب : اس شعر میں غالب نے جذبۂ جنوں کی شدت کا نقشہ کھینچا ہے کہ عاشق جذبۂ عشق سے بے اختیار ہو کر بار بار کوئے جاناں کی طرف جاتا ہے مگر جب وہاں پہنچ کر اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبوب تک رسائی ناممکن ہے تو حیران ہو کر اپنے دل سے یہ سوال کرتا ہے کہ آخر میں یہاں کیوں آیا؟

بنیادی تصور :۔ اظہار دیوانگیٔ شوق۔

(۴) جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

جلوہ ۔ لغوی معنی ہیں عرض کردن خود را بر کسے یعنی اپنے آپ کو کسی پر ظاہر کرنا اصطلاح میں جلوہ کہتے ہیں محبوب کے حسن یا اس کی اداؤں کے کامل اظہار کو، تقاضائے نگہ بمعنی تقاضائے دید + جوہر آئینہ ۔ لفظ جوہر کی تشریح قبل ازیں ہو چکی ہے یہاں آئینہ سے آئینہ فولادی مراد ہے کیونکہ جوہر، بربنائے صیقل فولاد ہی میں پیدا ہوتے ہیں آئینہ کو آنکھ سے اور جوہر آئینہ کو مژگان سے تشبیہ دی ہے۔ جو تشبیہہ یہ ہے کہ صیقل سے فولاد میں نیلگوں دھاریاں نمودار ہو جاتی ہیں۔ (یہی جوہر آئینہ ہے۔) اور دھاریاں پلکوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔

یہ شعر مضمون آفرینی کی بہت عمدہ مثال ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ندرتِ تخیّل نے شعریت کا خون کر دیا۔

مطلب :۔ چونکہ محبوب کے حسن کا جلوہ ہر ایک سے یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے دیکھو۔ (چونکہ اس کا جلوہ بے حد دلکش ہے) اس لیے جوہرِ آئینہ فولاد بھی (جو غیر ذی شعور ہے) یہ چاہتا ہے کہ اس کے جلوے سے لطف اندوز ہونے کے لیے مژگان بن جائے۔

بنیادی تصور :۔ جلوۂ محبوب کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ انسان تو انسان ہے، غیر ذی روح اشیاء بھی اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہیں۔

نوٹ :۔ شعر ۳ و ۴ کو حقیقت پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ لیکن میں نے اس شرح میں اس پہلو کی وضاحت کا التزام اس لیے نہیں کیا کہ پھر غالب کے دیوان اور "منطق الطیر" میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔

---

(۵) عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ ✽ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مطلب :۔ عاشقوں کو جو مسرت، قتل گاہ میں حاصل ہوتی ہے اس کا بیان لفظوں کے ذریعہ سے بہت دشوار ہے۔ بس یوں سمجھو کہ جب محبوب تلوار نیام سے باہر نکالتا ہے تو وہ شمشیرِ عریاں انہیں ہلال عید نظر آتی ہے یعنی اُسے دیکھ کر انہیں وہی خوشی حاصل ہوتی ہے جو روزہ داروں کو عید کا چاند دیکھ کر حاصل ہوتی ہے۔ شاعرانہ خوبی یہ ہے کہ شمشیر اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ہلال عید سے بہت مشابہ ہوتی ہے۔

بنیادی تصور :۔ شوقِ شہادتِ عشاق۔

---

(۶) لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط ✽ تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

مطلب :- اے محبوب! ہم تو اس دنیا سے عیش و نشاط کی تمنّا کا داغ لے کر رخصت ہوتے ہیں۔ تیرے لیے یہ دعا کرتے ہیں کہ تو ہر قسم (صد رنگ) کی راحتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ "گلستان ہونا" کنایہ ہے۔ وفور شادمانی سے محاورہ میں یوں کہیں گے کہ خدا کرے تو سدا باغ باغ رہے۔

بنیادی تصور :- انجام عاشقِ ناکام۔

---

(۷) عشرت پارۂ دل، زخم تمنا کھانا ✤ لذتِ ریش جگر، غرقِ نمکداں ہونا

پارۂ دل بمعنیٰ دل + زخم تمنا کھانا یعنی ناکامی کی اذیت برداشت کرنا + ریش بمعنیٰ زخم +

مطلب :- عاشقِ صادق کی نگاہ میں وصل سے محرومی بھی باعثِ عشرت و مسرت ہے اور اگر معشوق اس کے زخم جگر پر نمک چھڑکے یعنی ظلم و ستم کرے تو اس بات سے بھی اُسے بہت لذت محسوس ہوتی ہے۔

بنیادی تصور :- ایذا دوستئ عشاق۔

---

(۸) کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ✤ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

زود پشیماں بمعنی بہت جلد پشیماں ہونے والا۔ اس لفظ میں طنز کا پہلو پوشیدہ ہے اور شعر کا لطف اسی طنز میں پنہاں ہے۔ مفہوم میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

مطلب :- مجھ بے گناہ کو قتل کرنے کے بعد اسے اس قدر پشیمانی لاحق ہوئی کہ اس نے آئندہ کے لیے ظلم و ستم سے (بے گناہوں کو قتل کرنے سے) توبہ کر لی طنز کا پہلو یہ ہے کہ کاش اُس نے مجھے قتل کرنے سے پہلے ظلم سے توبہ کی ہوتی! اب توبہ کی تو کیا فائدہ، بلکہ میرے زاویۂ نگاہ سے تو اس کی توبہ میں بھی میرے لیے ظلم و ستم کا

پہلو مضمر ہے وہ اس طرح کہ میں تو اس کی جفا کا نشانہ بن کر اپنی نامرادی پر ماتم کرتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن میرے رقیب ساری عمر اس کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں گے اور اس کے دیدار سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

بنیادی تصور :۔ گلۂ جفائے وفا نما۔

---

(۹) حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مطلب :۔ عاشق کا گریباں کسی حال میں بھی سلامت نہیں رہ سکتا۔ حالتِ فراق میں عاشق کے ہاتھوں تار تار ہو جائے گا۔ اور عالمِ وصال میں معشوق، ازراہِ شوخی، اس کے پرزے اُڑا دے گا۔ مضمون کی خوبی اور نُدرت میں تو کلام نہیں ہے۔ مگر "قسمت" کی تکرار سے لطفِ بیان میں کمی واقع ہو گئی۔

بنیادی تصور :۔ بد نصیبئ گریبان عاشق۔

---

(۱۹)

(۱) شب، خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا ؛ تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا

خمارِ شوقِ ساقی۔ بمعنی ساقی کی آمد کا شدید انتظار۔ خمارِ شوق اسی لیے لائے ہیں۔ کہ حالتِ خمار کی طرح حالتِ انتظار میں بھی انگڑائیاں آنے لگتی ہیں۔ یوں بھی خمار، ساقی، رستخیز، بادہ اور خمیازہ ان سب لفظوں میں مناسبت پائی جاتی ہے۔ رستخیز۔ اندازہ یعنی قیامت کی مانند + تا بمعنی حتیٰ کہ، یہاں تک کہ + محیطِ بادہ یعنی بادہ بمعنی شراب، صورت خانۂ خمیازہ۔ انگڑائی کی صورت + واضح ہو کہ یہ شعر ابتدائی زمانہ کے کلام کا نمونہ ہے اسی لیے اس میں فارسیت، پیچیدگی، غیر مانوسیت اور گنجلک پائی جاتی ہے۔ خدا بھلا کرے مولانا فضلِ حق خیر آبادی مرحوم کا، جنہوں نے غالب

کو راہِ راست دکھائی ورنہ ان کا سارا کلام "درصورت خانۂ خمیازہ" ہو کر رہ جاتا جسے ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد تمام عمر، انگڑائیاں آتی رہتیں!

مطلب:- رات، ساقی کی آمد کے انتظار کی شدت نے قیامت برپا کر دی۔ میخانہ میں ہر شخص فرطِ انتظار سے بیچین اور مضطرب تھا۔ یہاں تک کہ شراب بھی شیشے میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔

بنیادی تصور:- وفورِ انتظارِ آمدِ ساقی۔

---

(۲) یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا ؏ جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

یک قدم وحشت۔ وحشت کنایہ ہے عشق سے۔ یک قدم بمعنی اندک یا قلیل یہاں کنایہ ہے ابتداء سے۔ مطلب اس کا ہے مسلک عشق میں قدم رکھتے ہیں۔ دفترِ امکاں۔ کنایہ ہے کائنات سے۔ درسِ دفترِ امکاں کا مطلب ہے۔ حقیقت کائنات + جادہ سے جادۂ وحشت (عشق) مراد ہے + دو عالم دشت اضافت مقلوب سے مراد ہے دشت دو عالم اور دشت دو عالم سے مراد ہے دو عالم لفظ دشت، وحشت کی رعایت سے لائے ہیں + اجزاء کنایہ ہے حوادث و واقعات سے + لفظ اجزاء، شیرازہ کی رعایت سے لائے ہیں + شیرازہ اس بندش کو کہتے ہیں جس کی بدولت کتاب کے اوراق منتشر ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ غالب نے اس لفظ کو پہلے بھی استعمال کیا ہے۔ شیرازہ اور جادہ میں مشابہت ظاہر ہے۔

مطلب:- مسلکِ عشق اختیار کرتے ہی یا کوچۂ عشق میں داخل ہوتے ہی مجھ پر ساری کائنات کی حقیقت منکشف ہو گئی۔ جادۂ وحشت گویا وہ شیرازہ ثابت ہوا جس کی بدولت دونوں عالم کے اجزائے پریشاں (واقعات و حوادث) ایک مسلک میں منسلک (مربوط) ہو گئے یعنی کائنات کے غیر مربوط حوادث میں ربط نظر

آنے لگا۔

بنیادی تصور :۔ عشق، کاشف الحقایق ہے۔

---

(۳) مانع وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے ٭ خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

مانع ۔ روکنے والا + وحشت خرامی، جوشِ جنون میں گھر سے نکل کھڑا ہونا + کون ہے یعنی کوئی نہیں + صحرا گرد، یہ لفظ اس لیے لائے ہیں کہ اس کے گھر کا "بے دروازہ" ہونا ثابت ہو سکے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ صحرا وہ گھر ہے جس کا دروازہ نہیں ہوتا۔

مطلب :۔ مطلب میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ مجنوں کے گھر کا تو کوئی دروازہ ہی نہ تھا جو کوئی دربان وہاں بیٹھا ہوتا اور اندر داخل ہونے سے روکتا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ لیلیٰ کو مجنوں کے پاس آنے سے کس بات نے روک دیا؟

بنیادی تصور :۔ بے اعتنائی معشوق۔

---

(۴) پوچھ مت رسوائیٔ اندازِ استغنائے حسن ٭ دست مرہونِ حنا، رخسار رہن غازہ تھا

استغنا، بمعنی بے نیازی + مرہون بمعنی ممنون یا احسان مند + رہن غازہ یعنی ممنون غازہ +

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ بظاہر معشوقوں کی بے نیازی کا سارے عالم میں شہرہ ہے مگر دراصل یہ لوگ بھی سامان آرائش (بناؤ سنگار) کے محتاج ہوتے ہیں (دیکھو!) اپنے ہاتھوں کو دلکش بنانے کے لیے مہندی لگاتے ہیں اور رخسار کو دلفریب بنانے کے لیے غازہ (پوڈر) کی تہ جماتے ہیں۔

بنیادی تصور :۔ رسوائی اندازِ استغنائے حسن۔

---

(۵) نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد ٭ یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

اوراقِ لختِ دل یعنی لخت ہائے دل + بباد دئے۔ غالب نے فارسی محاورہ کا اُردو ترجمہ کر دیا ہے۔ اسی لیے یہ ترکیب اہل زبان کی نگاہ میں محل اعتراض ہے یعنی غیر فصیح بھی ہے اور غیر مانوس بھی۔ یہ وہ زبان ہے جو نہ غالب کے زمانہ میں کہیں بولی جاتی تھی نہ آج کہیں سنی جاتی ہے۔ مطلب اس معجون مرکب کا یہ ہے کہ منتشر کر دئے اور یہ ترکیب محض "اوراق" کی رعایت سے لائے ہیں + دیوان بے شیرازہ کنایہ ہے اوراق دل سے۔ اور خود لفظِ اوراق کنایہ ہے لخت ہائے دل سے + اوراق کی رعایت سے شیرازہ اور دیوان کے الفاظ لائے ہیں + چونکہ غالب نے ابتدائے مشق سخن میں ناسخ کا تتبع کیا تھا اس لیے وہ ساری عمر "ناسخیت" کے طلسم سے رہا نہ ہو سکے۔

مطلب:۔ نالۂ دل نے دل کے سیکڑوں ٹکڑے کر کے برباد کر دیا۔ ان ٹکڑوں کو اوراق فرض کر کے کہتے ہیں کہ یادگار نالہ، یہی اوراق (لخت ہائے دل) تھے، مگر افسوس کہ نالوں نے ان اوراق (دیوان بے شیرازہ) کو برباد کر دیا۔

بنیادی تصور: تباہ کاری نالہ ہائے دل۔

نوٹ:۔ جیسا کہ شروع میں واضح کیا گیا ہے یہ پوری غزل ابتدائی زمانہ کی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ شعریت ہے نہ زبان کی صفائی نہ سوز و گداز ہے نہ دلربائی ہے۔ ہر شعر کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہے ۱۲

---

(۲۰)

(۱) دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

مطلب :- میرے ساتھ ہمدردی کرنے کے سلسلے میں، میرے دوستوں کی کوششیں سب بے کار ہیں۔ مثلاً اگر وہ میرے زخموں پر مرہم بھی لگا دیں اور میرے ناخنوں کو بھی تراش دیں تو کیا ہوا؟ جب تک زخم بھریں گے اس وقت تک ناخن دوبارہ نکل آئیں گے۔ میں پھر اپنے ناخنوں سے اُن زخموں کو ہرا کر لوں گا۔

بنیادی تصور :- ایذا دوستی۔

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
(۲) ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

مطلب :- محبوب سے کہتے ہیں کہ بندہ پرور! آپ کی بے نیازی اور تغافل شعاری حد سے گذر چکی ہے۔ آخر آپ ہمارا حال دل سن کر کب تک یہ کہتے رہیں گے کہ کیا کہا پھر تو کہو!

بنیادی تصور :- بے نیازئ محبوب۔

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
(۳) کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

دیدہ و دل فرش راہ۔ یعنی شوق سے تشریف لائیں + سمجھا دو بمعنی بتادو + سمجھائیں گے کیا، اس کے دو معنی ہیں (۱) کیا سمجھائیں گے۔ (۲) مجھ پر ان کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو گا + اس شعر کی روانی، صفائی، بندش اور اندازِ بیان کی خوبی قابلِ داد ہے۔

مطلب :- کہتے ہیں کہ اگر جنابِ ناصح میرے پاس آنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے تشریف لائیں، لیکن جس مقصد سے وہ میرے پاس آنا چاہتے ہیں، اس میں کامیابی نہیں ہوگی کیونکہ مجھ پر ان کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

بنیادی تصور :۔ عدم تاثیر نصیحت۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

(۴) عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

مطلب :۔ محبوب کو مجھے قتل کرنے میں دو ہی عذر ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ مجھ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ تو موت کا طالب نہیں ہے یا مرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے اس لیے تجھے کیا قتل کروں؟ اس کے جواب میں کفن سر سے باندھ لیا ہے۔ دوسرا یہ کہ میرے پاس تلوار نہیں ہے اس لیے کیسے قتل کروں؟ اس کے جواب میں تلوار ساتھ لیے جاتا ہوں۔ ظاہر ہے اب انہیں میرے قتل میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔

بنیادی تصور :۔ آرزوئے قتل۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی!!

(۵) یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

مطلب :۔ ہم کو عشق سے باز رکھنے کے لیے اگر ناصح نے قید کر دیا تو کیا ہوا؟ اس قید سے ہمارے جنونِ عشق کے انداز میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ قید کرنے کے ساتھ چھٹ جانے کے جملے نے شعر میں بڑا لطف پیدا کر دیا ہے۔

بنیادی تصور :۔ قید و بند سے عشق میں کمی نہیں ہو سکتی۔

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

(۶) ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

خانہ زاد بمعنی غلام + خانہ زادِ زلف یعنی اسیرِ خمِ گیسو + زلف اور زنجیر میں مناسبت ہے

گرفتار وفا یعنی وفادار یا عشق میں ثابت قدم + گرفتار اور زنداں میں مناسبت ہے۔ دونوں مصرعوں میں حسن تقابل قابل داد ہے۔

مطلب :۔ ہم تو پہلے ہی سے اس کی زلفوں میں اسیر ہیں اس لیے زنجیر ہمارے لیے موجب وحشت یا اذیت نہیں ہو سکتی اور چونکہ ہم نے شروع ہی سے قید وفا گوارا کر لی ہے اس لیے قید خانہ کی زندگی ہمارے لیے باعثِ اضطراب یا تکلیف نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور :۔ ذوقِ اسیری۔

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد

(۷) ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

معمورہ بمعنی بستی یا آبادی + قحط غم الفت بمعنی فقدان مراسم الفت و محبت۔

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ ہم تو محبت کے بندے ہیں اسی پر ہماری زندگی کا دار و مدار ہے لیکن دلی میں الفت کا قحط پڑ گیا ہے یعنی دلی والے رسم الفت سے بے گانہ ہو گئے ہیں اس لیے اب شہر میں زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ شعر کی خوبی قافیے کے برمحل صرف ہونے میں مضمر ہے۔ اور یہ قافیہ غالب کو لفظ قحط نے سمجھایا ۔[1]

بنیادی تصور :۔ ذوق غم الفت ۔

---

[1] جس دلی سے غالب بے زار ہیں ذوق اسی کے طلبگار ہیں چنانچہ کہتے ہیں ۔

ہم نے مانا، ہے دکن میں گوہر مضمون کی قدر

کون جائے ذوق پر، دلی کی گلیاں چھوڑ کر

دونوں استادوں نے اپنا اپنا زاویۂ نگاہ کیسے دلکش انداز میں واضح کیا ہے۔

(۲۱)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
(۱) اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

مطلب:۔ چونکہ وصالِ یار ہماری قسمت ہی میں نہیں تھا اس لئے اگر حالت فراق میں موت آگئی تو ہمیں مطلق افسوس نہیں ہے کیونکہ اگر اور جیتے رہتے تو بھی اسی حالتِ فراق میں ایڑیاں رگڑتے رہتے،

بنیادی تصور:۔ شکایت محرومی قسمت۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
(۲) کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

مطلب:۔ اگر ہم تیرے وعدۂ وصل کے بعد بھی زندہ رہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں تیرے وعدہ پر اعتبار نہیں ہے اگر اعتبار ہوتا تو فرطِ خوشی سے ہماری موت یقینی تھی۔

بنیادی تصور:۔ عدم اعتبار وعدہ۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
(۳) کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا!

مطلب:۔ اے محبوب، اگر تو نے ہم سے عہد باندھ کر توڑ دیا تو اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ عہد ہی بہت کمزور بندھا تھا اگر وہ مضبوط ہوتا تو تجھ سے کبھی نہ ٹوٹ سکتا۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کمزور کیوں بندھا اس کا جواب یہ ہے کہ کمزور (نازک) کا عہد بھی کمزور ہی ہوتا ہے، تجھ میں اتنی طاقت ہی کہاں تھی کہ اسے

مضبوط باندھا۔ حق یہ ہے کہ اس شعر میں غالب کی نزاکتِ خیال، معشوق کی نزاکت سے بھی زیادہ قابلِ تحسین ہے،
بنیادی تصور۔۔ عدمِ استواریٔ عہد۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
(۴) یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا!

تیرِ نیم کش اس تیر کو کہتے ہیں جسے چلاتے وقت کمان کو آدھی قوت سے کھینچا جائے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نشانے کے پار نہیں ہوتا، تیر سے تیرِ مژگاں مراد ہے، تیرِ نیم کش کنایہ ہے معشوق کی نیچی نظر سے جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے کہیں زیادہ دلکش ہوتی ہے،

مطلب:۔ اے محبوب! تیرے تیرِ نیم کش نے میرے جگر میں پیوست ہو کر دائمی خلش کا سامان مہیا کر دیا ہے اور اس خلش سے جو لذت مجھے محسوس ہو رہی ہے اسے میرا دل ہی جانتا ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تیرا تیر جگر کے پار نہ ہوا۔ اگر پار ہو جاتا تو یہ لذت کہاں سے حاصل ہوتی!

بنیادی تصور۔ لذتِ خلشِ تیرِ نیم کش۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا۔

مطلب:۔ افسوس ہے کہ میرے دوست چارہ سازی اور غم گساری کے بجائے مجھے ترکِ محبت کا مشورہ دے رہے ہیں یہ دوستی نہیں ہے بلکہ سراسر دشمنی ہے ان کا فرض تو یہ تھا وہ میرے ساتھ ہمدردی کرتے یعنی وصالِ یار کی تدبیریں

سمجھاتے۔

بنیادی تصور۔ شکوۂ نصیحت احباب۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا۔
(۶) جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا۔

مطلب:۔ غم عشق کی تباہ کاری کا بیان کرتے ہیں کہ اگر پتھر میں شرر کے بجائے غم عشق پنہاں ہوتا تو اس کی شدت سے پتھر جیسی چیز سے بھی اس قدر خون ٹپکتا کہ کبھی نہ تھمتا۔ بالفاظ دگر غم عشق وہ بری بلا ہے کہ انسان کی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ پتھر کا جگر بھی خون ہو کر بہہ جاتا۔

بنیادی تصور۔ تاثیر غم عشق۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے۔
(۷) غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا۔

مطلب:۔ یہ سچ ہے کہ غم انسان کی روح کو تحلیل کر دیتا ہے بلکہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے مگر اس سے کسی انسان کو نجات نہیں مل سکتی کیونکہ ہر انسان صاحب دل ہے اور غم دل کے ساتھ ہے یعنی دل کی فطرت یہ ہے کہ وہ جویائے غم ہے۔ لہذا جب تک ہمارے سینہ میں دل ہے، ہم غم سے بچ نہیں سکتے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم عشق ترک کر دیں اور اس طرح غم عشق سے نجات حاصل کر لیں تو ہمارا دل غم روزگار میں مبتلا ہو جائے گا، یعنی جو لوگ عاشق نہیں ہیں وہ آلام و افکار دنیوی میں گرفتار ہیں۔

بنیادی تصور۔ ہمہ گیری غم۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے۔
(۸) مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا۔

مطلب:۔ کس سے کہوں کہ شبِ غم کیا ہے، بس یہ سمجھو کہ بری بلا ہے اس کے کرب کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کے بجائے اگر مجھے موت آجاتی تو میں بخوشی گوارا کر لیتا ایک دفعہ مر کر رنج والم سے تو نجات مل جاتی! لیکن شب غم میں ہر لمحہ انسان پر موت کی سی اذیت طاری ہوتی ہے لیکن موت نہیں آتی۔
اس شعر میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں بقول نظم طباطبائی اس شعر کی خوبی حد تحسین سے باہر ہے۔
بنیادی تصور:۔ کیفیت شب غم۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
(۹) نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا!

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہمارا جنازہ بھی اٹھایا گیا اور مزار بھی بنایا گیا۔ اس طرح ہماری رسوائی کا پورا سامان مہیا ہو گیا۔ اگر ہم دریا میں غرق ہو جاتے تو کسی کو ہمارے مرنے کی کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی کیونکہ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار بنتا۔
بنیادی تصور:۔ آرزوئے گمنامی۔

ا۔ سے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا۔
(۱۰) جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا۔

یکتا سے ذاتِ احدیت مراد ہے یعنی حق تعٰ۔ یگانہ سے وجود مطلق یا موجود حقیقی مراد ہے۔ یگانہ ہے وہ یکتا سے مراد یہ ہے کہ حق تعٰ وجود مطلق ہے یعنی اس کے

علاوہ کائنات میں اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے بالفاظ دگر، وجود حق تعالیٰ میں منحصر ہے غیر اللہ کا وجود نہیں ہے + دوئی یعنی دوسرے کا وجود + "دوئی کی بو بھی ہوتی"۔ یعنی اگر کوئی اور موجود ہوتا یا غیر کا وجود ہوتا + دوچار ہوتا، یعنی دکھائی دیتا یا نظر آتا۔

مطلب۔۔ غالب نے اس شعر میں مسئلہ وحدت الوجود نظم کیا ہے اور الفاظ کے انتخاب کی بدولت شعر میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے یگانہ اور یکتا میں اور دوئی اور دوچار میں مناسبت معنوی پائی جاتی ہے۔

پہلے مصرعہ کے پہلے جملہ سے کون دیکھ سکتا میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ دوسرے جملہ میں اس پر دلیل دی ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ موجود حقیقی یکتا ہے اس کے سوا دوسری ہستی موجود ہی نہیں ہے۔

مطلب:۔ یہ ہے کہ دیکھنے کے لئے دوئی یعنی وجود غیر (کسی دوسرے کا وجود) شرط ہے۔ لیکن اس کے سوا کائنات میں اور کوئی تو موجود ہی نہیں ہے اس لئے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

بالفاظ دگر، دوچار ہونا متقاضی ہے دوئی یعنی وجود غیر کو۔ اگر کائنات میں کسی غیر کا وجود ہوتا تو وہ غیر اللہ سے کہیں نہ کہیں دوچار ہو جاتا یا اللہ اس غیر سے کہیں نہ کہیں دوچار ہو جاتا۔ مگر جب اس کے سوا کوئی موجود ہی نہیں تو اسے کون دیکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیکھنے کے لئے ناظر اور منظور دو ہستیوں کا ہونا شرط ہے لیکن اس کے سوا دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے لہذا ثابت ہوا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

بنیادی تصور۔ اثبات وحدت الوجود۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان، غالب۔
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

مطلب :- اے غالب! تصوف کے مسائل تو نے ایسے دلکش انداز میں بیان کئے ہیں کہ اگر تو بادہ خوار نہ ہوتا تو تیرے کلام کے پڑھنے والے یقیناً تجھے ولی سمجھ لیتے
بنیادی تصور :- غالب نے اس شعر میں اپنی شاعری کی دو خصوصیتیں واضح کی ہیں۔
(۱) مسائل تصوف (۲) انداز بیان
نوٹ :- حالی لکھتے ہیں "سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ (بہادر شاہ ثانی مرحوم) کو سنائی تو انہوں نے مقطع سُن کر کہا "بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔" مرزا نے کہا "حضور اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔
(یادگار غالب صفحہ ۱۲۶)

---

(۲۲)

(۱) ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ٭ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہوس - دنیا کی نعمتوں اور اچھی اچھی چیزوں کے حصول کی شدید آرزو (جو ہر انسان کے دل میں موجزن ہے)۔ نشاط - لفظی معنی شادمانی لیکن یہاں امنگ مراد ہے۔ نشاطِ کار یعنی دنیاوی امور کو سرانجام دینے کی امنگ۔ کیا کیا یعنی بہت زیادہ۔
مطلب :- حالی فرماتے ہیں "نشاط کے معنی امنگ کے ہیں اور نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی امنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے۔ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ (امر واقعی) ہے، کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ فرصت جس قدر قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام دیتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے، اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری

کرتا ہے۔" (یادگار غالب صنہ ۱۰۹)

حالی مرحوم کے مطلب پر اضافہ کرنا تو سوءِ ادب ہے۔ ہاں غالب کے اندازِ بیان کی ندرت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نفسِ مضمون جس قدر اچھوتا ہے انداز بیان بھی اسی قدر دلکش ہے۔ دوسرے مصرع میں غالب نے صنعت تضاد سے بیان میں بڑی دل آویزی پیدا کر دی ہے۔ بظاہر مرنا اور جینا دو متضاد چیزیں ہیں مگر غالب نے اپنے بیان کی طرفگی سے لطفِ زیست کو اندیشۂ مرگ میں منحصر کر دیا۔

بنیادی تصور:۔ موت کا کھٹکا نہ ہو تو جینے میں کوئی لطف نہیں آ سکتا۔

---

(۲) تجاہل پیشگی سے مدعا کیا ❊ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا"

تجاہل پیشگی یعنی تجاہل شعاری یا جان بوجھ کر انجان بننا۔ سراپا ناز کی ترکیب اس جگہ بہت مناسب ہے کیونکہ محبوب کو اس کے ناز ہی نے تجاہل پیشہ بنا دیا ہے۔ کیا کیا۔ حرفِ استفہام کی تکرار ہے یعنی محبوب، غالب کی ہر بات پر کہتا ہے "کیا"؟ یعنی تو نے کیا کہا؟

مطلب:۔ اے سراپا ناز! اس تجاہل شعاری سے تیرا کیا مدعا ہے؟ آخر تو میرا حال زار سن کر کب تک یہ کہتا رہے گا کہ "تو نے کیا کہا؟"

بنیادی تصور:۔ شکوۂ تجاہل پیشگی محبوب۔

---

(۳) نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں ❊ شکایتہائے رنگیں کا گلا کیا؟

مطلب:۔ محبوب سے خطاب ہے کہ میں رقیب پر تیری بیجا نوازشیں دیکھتا ہوں اس لیے تجھ سے محبت آمیز انداز میں شکایتیں کرتا ہوں۔ اندریں حالات تجھے اس کا گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ عذر شکایت ۔

---

(۴) نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں ٭ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

مطلب :۔ اے محبوب! میں یہ چاہتا ہوں کہ تو بے تکلف میری طرف دیکھے یعنی میں تیری نگاہِ التفات کا آرزومند ہوں لیکن تو میرا صبر و قرار آزمانے کے لیے مجھ سے تغافل کر رہا ہے۔ تیری یہ بے اعتنائی مجھے پسند نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ آرزوئے یک نگاہِ التفات ۔

---

(۵) فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ٭ ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

فروغِ شعلۂ خس کنایہ ہے بوالہوس کی محبت سے جو فروغِ شعلۂ خس کی طرح عارضی ہوتی ہے۔ ہوس کنایہ ہے اہلِ ہوس سے + پاس ناموس وفا یعنی وفا کے مقدس جذبے کا احترام۔

مطلب :۔ رقیب پر طعن کیا ہے کہ اس کی محبت کو ثبات نہیں ہے کیونکہ اہلِ ہوس وفا نہیں کر سکتے۔

بنیادی تصور :۔ تحقیر اربابِ ہوس۔

---

(۶) نفس، موجِ محیطِ بیخودی ہے ٭ تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

نفس کنایہ ہے عاشق کی ذات سے + موج محیط بے خودی یعنی بے خودی ۔

مطلب :۔ ہمارا ہر نفس بے خودی کے سمندر کی موج ہے یعنی ہم بے پئے بیخود ہیں اس لیے ہمیں ساقی کے تغافل کا کوئی گلہ نہیں ہے اگر وہ تغافل نہ کرتا یعنی ہمیں جام شراب عنایت کر دیتا تو اس کا نتیجہ بھی یہی ہوتا۔

بنیادی تصور :۔ کیفِ شرابِ عشق۔

(۷) دماغ عطرِ پیراہن نہیں ہے ٭ غمِ آوارگیہائے صبا کیا

دماغ کنایہ ہے آرزو یا برداشت یا تاب و تواں یا خواہش سے عطرِ پیراہن یعنی پیراہن محبوب کی خوشبو + آوارگیہائے صبا سے مراد ہے صبا کا عطرِ پیراہن کو منتشر کر دینا۔
مطلب :۔ اگر صبا نے محبوب کے پیراہن کی خوشبو کو منتشر کر دیا تو مجھے اس کا کوئی غم نہیں کیونکہ مجھ میں اس کے سونگھنے کی تاب و تواں ہی نہیں ہے۔
دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے بوئے یار مطلوب ہے نہ کہ بوئے پیراہنِ یار۔ اس لیے اگر صبا نے بوئے پیراہن کو منتشر کر دیا ہے تو مجھے اس کا چنداں افسوس نہیں ہے۔
بنیادی تصور :۔ شانِ بے نیازیٔ عشقِ حقیقی۔

(۸) دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ٭ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

دل کنایہ ہے حقیقت یا اصلیت سے۔ دلِ ہر قطرہ یعنی ہر قطرے کی حقیقت قطرہ کنایہ ہے انسان سے + سازِ انا البحر یعنی انا البحر + انا البحر کے لفظی معنی ہیں میں سمندر ہوں + شاعر نے انا البحر کو انا الحق کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ہم اس کے ہیں یعنی ہم وہی ہیں + ہمارا پوچھنا کیا، یہ بہت دلکش جملہ ہے۔ اس کے دو مطلب ہیں (۱) ہماری حقیقت کیا پوچھتے ہو؟ جو وہ ہے وہی ہم ہیں۔ (۲) ہمارا مرتبہ کیا پوچھتے ہو؟ جو مرتبہ اس کا ہے وہی ہمارا ہے۔
مطلب :۔ غالب نے اس شعر میں مسئلہ وحدت الوجود نظم کیا ہے۔ یعنی جس طرح ہر قطرہ از زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنی حقیقت کے اعتبار سے سمندر ہوں۔

اسی طرح ہر انسان زبانِ حال سے انا الحق کہہ رہا ہے۔ دوسرا مصرع پہلے مصرع کی تشریح ہے۔ یعنی ہماری حقیقت کیا پوچھتے ہو۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہم وہی ہیں یعنی ہماری ذات پر نظر کرو تو غیریت ہے لیکن وجود کا اعتبار کرو تو عینیت ہے۔ قطرہ کیا ہے در اصل بحر ہے جو متعین ہو گیا ہے اور اس تعین کی وجہ سے بحر اور قطرے میں مغائرت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر تعین کا پردہ ہٹا دیا جائے تو قطرہ غائب ہو جائے گا۔ بحر رہ جائے گا۔

بحر لیست متحد کہ باشکال مختلف

باران و قطرہ و صدف و گوہر آمدہ

اسی طرح تمام مخلوقات (ممکنات) وجود مطلق کے تعینات ہیں۔ تعینات سے قطع نظر کر لی جائے تو صرف وجود مطلق باقی رہ جائے گا۔

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے

کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا (سودا)

اقبال نے بھی آدم کو "طلسمِ بود و عدم" ہی سے تعبیر کیا ہے۔

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم

خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

بنیادی تصور:۔ اثباتِ وحدت الوجود۔

---

(۹) محابا کیا ہے؟ میں ضامن ادھر دیکھ ٭ شہیدانِ نگاہ کا خوں بہا کیا؟

محابا: تامل، پس و پیش + ادھر دیکھ۔ دو معنی ہیں (۱) میری طرف دیکھ (۲) میری بات سُن۔

مطلب:۔ اے محبوب! میری طرف بلا تامل دیکھ اگر میں شہید نگاہ ہو گیا تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ کوئی تجھ سے مواخذہ نہیں کرے گا (خوں بہا طلب نہیں کرے گا)

کیونکہ مواخذہ تو اس صورت میں ہوتا جب تو مجھے تلوار سے قتل کرتا۔ ع

شہیدانِ نگاہ کا خوں بہا کیا

حقیقت یہ ہے کہ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے خصوصاً دوسرے مصرع کی برجستگی حدِ تحسین سے بالاتر ہے۔

بنیادی تصور :- ذوقِ شہادت۔

---

(۱۰) سن اے غارتگرِ جنسِ وفا سن ٭ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

غارت گرِ جنسِ وفا۔ وفا کی بے قدری کرنے والا۔ شکستِ قیمت۔ قیمت کا گھٹانا قیمت کا لفظ، جنس کی رعایت سے لائے ہیں۔

مطلب :- محبوب سے کہتے ہیں کہ جنسِ وفا کی بے قدری کر کے تو نے دل کی قیمت گھٹا دی یعنی میرا دل توڑ دیا۔ لیکن تجھے خبر تک نہ ہوئی کہ تو نے مجھے کیا نقصان پہنچایا بالفاظِ دگر، میری جان پر کتنا بڑا ظلم کیا۔ تجھے اس وقت شاید اپنے ظلم کا احساس ہوتا جب تو دل کے ٹوٹنے کی آواز سنتا۔ مگر سن! دل کے ٹوٹنے کی تو آواز ہی نہیں ہوتی۔

اس شعر میں لفظ "سن" سے بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) آواز سن (۲) میری بات سن۔ اگرچہ شاعر نے دوسرے معنی مراد لئے ہیں لیکن لفظ صدا سے ہمارا ذہن بے ساختہ پہلے معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

بنیادی تصور :- شکوۂ بے قدریٔ جنسِ وفا۔

---

(۱۱) کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ ٭ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

جگرداری۔ ضبط و تحمل + شکیب۔ صبر و قرار + بھلا کیا یعنی ناممکن ہے۔

مطلب :۔ اے محبوب! میں نے ہرگز ضبط و تحمل کا دعویٰ نہیں کیا۔ بھلا کبھی عاشق کو بھی محبوب کے بغیر صبر و قرار آسکتا ہے؟

بنیادی تصور :۔ ع صبوری و دلِ عاشق ہزار فرسنگ است

---

(۱۲) یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ❊ یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

لفظِ قاتل، وعدۂ صبر آزما کی اور لفظ کافر، فتنۂ طاقت ربا کی صفت ہے۔ "قاتل وعدۂ صبر آزما" کا مطلب دوسرے مصرع میں خود بیان کر دیا ہے یعنی یہ وعدۂ صبر آزما گویا "فتنۂ طاقت ربا" ہے۔ شعر کی بندش قابلِ داد ہے۔ تقابل سے عجب دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

مطلب :۔ مطلب واضح ہے کہ اے محبوب! تو مجھ سے وعدۂ صبر آزما کیوں کرتا ہے یہ وعدہ تو میرے حق میں فتنۂ طاقت رُبا ہے یعنی مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ تیرے اس وعدے کے وفا ہونے تک زندہ رہ سکوں۔

بنیادی تصور :۔ بیتابیٔ دل عاشق۔

---

(۱۳) بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات ❊ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

عبارت بمعنی رمز یا کنایہ + اشارت بمعنی غمزہ

مطلب :۔ محبوب کی ہر بات، خواہ وہ عبارت (رمز) ہو یا اشارت (کنایہ) ہو یا ناز و ادا ہو، میری نگاہ میں بہت دلکش ہے بلکہ دیوانہ بنا دینے کے لیے کافی ہے

بنیادی تصور :۔ دلکشیٔ محبوب۔

---

(۲۳)

(۱) درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا ❊ پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

مطالب :- یہ شعر غالب کی جدت طرازی پر شاہد ہے جس کے ذریعہ سے اپنا عدیم المثال ہونا ثابت کیا ہے۔ دوسرے مصرع میں دعویٰ کیا ہے پہلے مصرع میں دلیل دی ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب نے ہمارے علاوہ کسی اور کو اپنے ظلم و ستم کے قابل نہیں سمجھا۔ یعنی دنیا کے تمام انسانوں میں سے صرف ہمیں اس مقصد کے لیے منتخب کیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم سا کوئی پیدا نہیں ہوا یعنی ہم عدیم المثال ہیں۔

بنیادی تصور :- اظہارِ یکتائی خویش۔

---

(۲) بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ؛ اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بندگی کے دو معنی ہیں (۱) پرستش (۲) غلامی۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ آزادہ بمعنی آزاد (جو کسی کا غلام نہ ہو) خودبیں بمعنی متکبر یا خودپسند۔ مگر غالب نے اس کو خوددار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

مطالب :- ہم خدا کی بندگی میں بھی اس قدر غیرت مند اور خوددار ہیں کہ اگر کعبہ کا دروازہ بند پائیں تو اُلٹے پاؤں واپس آجائیں۔ دروازے پر کھڑے ہو کر دستک دینا گوارا نہیں کر سکتے۔[۱]

بنیادی تصور :- اظہارِ خودداریٔ خویش۔

---

(۳) سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ؛ روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

بتِ آئینہ سیما یعنی ایسا حسین جس کی پیشانی آئینہ کی طرح روشن ہو۔ لفظ روبرو

---

[۱] اسی مضمون کو فارسی میں یوں بیان کیا ہے :-

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم

گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

کی رعایت سے آئینہ سیما کی ترکیب بہت برمحل ہے۔
مطلب :۔ اے محبوب ! دنیا کے تمام حسین افراد تیری شان یکتائی کے معترف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی حسین تیرے مقابلہ میں آنے کی جرائت نہیں کرتا۔
بنیادی تصور :۔ شان یکتائی محبوب۔

---

(۴) کم نہیں نازشِ ہم نامیٔ چشمِ خوباں ؛ تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، اگر اچھا نہ ہوا
نازش بمعنی فخر و ناز + ہمنامی چشم خوباں ۔ شعراء معشوق کی متوالی آنکھ کو "بیمار" باندھا کرتے ہیں مثلاً
تیری آنکھیں تو بہت اچھی ہیں۔ لوگ انہیں کہتے ہیں بیمار، یہ کیا تیرا بیمار یعنی تیرا عاشق + برا کیا ہے یعنی کوئی مضائقہ نہیں + اچھا کی رعایت سے "برا" لائے ہیں۔
مطلب :۔ اگر تیرا بیمار (عاشق) اچھا (صحت یاب)، نہ ہو سکا تو کوئی حرج نہیں ہے بیماری میں اس کے لیے تسکین کا یہ پہلو تو موجود ہے کہ اسے چشمِ خوباں کی ہمنامی کا فخر حاصل ہو گیا۔ یعنی دونوں بیمار ہیں۔
بنیادی تصور :۔ نازشِ ہمنامی چشمِ خوباں۔

---

(۵) سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا ؛ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہُوا
سینہ کا داغ ہے اس کے دو معنی ہیں (۱) عاشق کے لیے باعث ننگ ہے (۲) سینہ کے لیے موجب اذیت ہے + خاک کا رزق ہے اس کے بھی دو معنی ہیں (۱) بے سود ہے (۲) خاک میں جذب ہو گیا + قطرے سے آنسو مراد ہے۔
مطلب :۔ فراقِ یار میں عاشق نالہ و فریاد بھی کرتا ہے اور گریہ زاری بھی۔ غالب کہتے ہیں کہ لطف نالہ کشی اسی میں ہے کہ عاشق دل کھول کر نالہ و فریاد کرے، وہ نالہ ہی

کیا جو لب تک نہ آئے یعنی معشوق کے کان تک نہ پہنچے۔

اسی طرح لطفِ گریہ اس بات میں ہے کہ عاشق آنکھوں سے آنسوں کا دریا بہا دے اگر اس نے صرف ایک دو آنسوؤں پر اکتفا کیا تو ایسا گریہ یقیناً بے سود اور رائیگاں ہے۔

بنیادی تصور :۔ نالہ اور اشک اگر معشوق کو متاثر نہ کر سکیں تو بے کار ہیں۔ ایک سینہ کا داغ ہے، دوسرا انماک کا رزق ہے۔

---

(۶) نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا ٭ کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

مطلب :۔ اس شعر میں صنعتِ تقابل اور بندش کی چستی قابل داد ہے کہتے ہیں کہ کارکنان قضا و قدر نے ہر اس مصیبت کو جو کسی وجہ سے دوسروں کے حصے میں نہ آسکی میری تقدیر میں لکھ دیا۔ اور اسی طرح ہر فتنہ، جو کسی وجہ سے دنیا میں برپا نہ ہو سکا اور اس لیے دوسروں کو مبتلائے آلام نہ کر سکا، میری ایذا رسانی پہ مامور کر دیا۔ مختصر یہ کہ تمام دنیا کے آلام میرے حصے میں آگئے۔

بنیادی تصور :۔ ماتمِ شومیٔ تقدیر۔

---

(۷) ہر بنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب ٭ حمزہ کا قصّہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

بُنِ مو بمعنی بال کی جڑ + حمزہ کے قصے سے داستان امیر حمزہ مراد ہے جس میں ازاول تا آخر خلافِ واقعہ باتیں درج ہیں۔

مطلب :۔ کہتے ہیں عشق کی داستان بہت موثر ہوتی ہے۔ جب کسی عاشق صادق کا ذکر ہوتا ہے تو سننے والوں کے روئیں روئیں سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔ داستان عشق داستان امیر حمزہ نہیں ہے کہ لوگ سنیں اور اثر نہ ہو۔ مصرع اولیٰ میں استفہام

انکاری ہے۔

بنیادی تصور:۔ تاثیرِ داستانِ عشق۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
(۸) کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

دجلہ۔ ملکِ عراق میں ایک مشہور دریا ہے مگر یہاں عام دریا مراد ہے۔ دیدۂ بینا کنایہ ہے چشمِ عارف سے + لڑکوں کا کھیل کنایہ ہے امر عبث یا فعل بے مقصد سے۔
مطلب:۔ غالب نے اس شعر میں وحدت الشہود کا مسئلہ نظم کیا ہے کہتے ہیں کہ جو شخص عارف ہے اسے قطرے میں دریا اور جزو میں کل نظر آتا ہے۔ اگر مردِ عارف کو ہر شئی میں ذاتِ حق کا جلوہ نظر نہ آئے، اگر اس پر یہ صداقت منکشف نہ ہو سکے کہ ہر شئی، مظہرِ ذاتِ حق ہے تو پھر اس کا دیدۂ بینا بلا شک ایک بے معنی اور مہمل شئی ہے
بنیادی تصور:۔ ع ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست

---

(۹) تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں پرزے ÷ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

خبر گرم تھی یعنی یہ خبر بہت مشہور ہو چکی تھی + پرزے اڑیں گے یعنی بڑی بے رحمی سے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں گے + تماشا نہ ہوا۔ اس جملہ کا طنزیہ انداز بلا شبہ قابلِ داد ہے۔ تماشا کنایہ ہے نظارۂ قتل سے۔
مطلب:۔ کئی روز سے یہ خبر مشہور ہو رہی تھی کہ محبوب ستم پیشہ غالب کے پرزے اڑانے والا ہے یعنی اسے بڑی بے رحمی سے قتل کرے گا۔ چنانچہ ہم بھی یہ تماشا دیکھنے مقتل میں گئے تھے مگر افسوس کہ قاتل نے غالب کو درخورِ قتل ہی نہ سمجھا۔
بنیادی تصور:۔ عدمِ التفاتِ محبوب۔

(۲۴)

اسدؔ ! ہم وہ جنوں جولاں، گدائے بے سر و پا ہیں

(۱) کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو، پشت خار اپنا

جنون جولاں یعنی حالت دیوانگی میں دوڑنے والا + بے سر و پا یعنی بے سر و ساماں
پشتِ خار۔ وہ آلہ جس سے پیٹھ کھجاتے ہیں۔

اس شعر میں نہ دلکشی ہے نہ تاثیر، نہ شعریت ہے نہ معنویت، محض الفاظ کا طلسم باندھا ہے۔ جنونِ عشق میں چونکہ وحشت ہوتی ہے اور آہو بھی اپنی وحشت کے لیے مشہور ہے۔ اور وہ بھی صحرا میں اپنی جولانی دکھاتا ہے اس لیے "جنون جولاں" کے ساتھ آہو کا ذکر کیا ہے۔ پشتِ خار کے خار اور مژگاں میں مناسبت پائی جاتی ہے۔ اسی لیے شاعر کے تخیل نے مژگان آہو کو پشت خار بنا دیا یہ دوسری بات ہے کہ شعر کا مضمون "حمزہ کا قصہ" بن گیا۔

مطلب :۔ عشق نے ہمیں اس درجہ بے سر و سامان بنا دیا ہے کہ ہم پنجۂ مژگانِ آہو سے پشت خار کا کام لیتے ہیں اور چونکہ مژگانِ آہو کا حصول ناممکن ہے اس لیے مطلب یہ نکلا کہ ہمارے پاس پشتِ خار بھی نہیں ہے حالانکہ یہ وہ آلہ ہے جو فقیروں کے پاس عموماً ہوتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشق نے ہمیں اس قدر وحشی بنا دیا ہے کہ ہم مژگانِ آہو کو (جس کی وحشت مشہور ہے) بطور پشتِ خار استعمال کرتے ہیں۔ مگر میں پہلے مطلب کو ترجیح دیتا ہوں اگرچہ شعریت نہ اس میں ہے نہ اس میں۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ وحشت و بے سر و سامانی۔

(۲۵)

(۱) پیے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا ۔ بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

پیے نذر کرم یعنی خدائے کریم کی بارگاہ میں نذر کرنے کے لیے شرم نارسائی یعنی بارگاہِ ایزدی تک نہ پہنچ سکنے کی شرم + شرم نارسائی کا یعنی شرم نارسائی کی طرف سے بخوں غلطیدہ یعنی ناکام + صد رنگ یعنی گوناگوں + مصرع ثانی تحفہ کی تشریح ہے یعنی پارسائی کا دعویٰ جو بصد رنگ غلطیدۂ خون ہے ۔

یہ شعر غالب کی طبع دشوار پسند کی بہت عمدہ مثال ہے. بات بہت معمولی ہے مگر اسے بیان اس انداز سے کیا ہے کہ سننے والا حیران ہو کر رہ جائے یہی غالبیت ہے دوسرے مصرع کا مطلب ہے "پارسائی کے غلط دعوے" یا تقصیر خدمت ۔

مطلب بیان کرنے سے پہلے شعر کی نثر لکھتا ہوں :۔

بارگاہ کرم میں نہ پہنچ سکنے کی شرم، پارسائی کے گوناگوں مگر ناکام دعاوی کا تحفہ لے کر بارگاہ ایزدی میں عذر پیش کرنے حاضر ہوتی ہے ۔

مطلب :۔ مطلب یہ ہے کہ شرمسار حضوری کے لیے بجز اظہار عجز و ناکامی، استدعائے کرم کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں ہے ۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ میں بارگاہِ ایزدی میں طاعت و خدمت، (پارسائی) کے بجائے عذر تقصیر خدمت پارسائی کے غلط دعووں کا تحفہ لے کر آیا ہوں ۔ یعنی اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ سے طاعت نہ ہو سکی ۔ اور اسی اعتراف گناہ کو بطور تحفہ پیش کرتا ہوں ۔ سعدی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے :۔

عذر تقصیر خدمت آوردم

کہ ندارم بطاعت استظہار

بنیادی تصور :۔ عذر تقصیر خدمت یا اعتراف کوتاہی عمل ۔

نہ ہو حسن تماشا دوست، رسوا بے وفائی کا
(۲) بہ مہرِ صد نظر، ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

حسن بمعنی محبوب۔ تماشا دوست یعنی وہ حسین جو اپنے حسن کا جلوہ دوسروں کو دکھانا پسند کرے + "رسوا بے وفائی کا" یہ رسوائے بے وفائی "کا اُردو ترجمہ ہے اسی لیے غیر مانوس اور غیر فصیح ہے۔ ہم اُردو میں اس طرح نہ بولتے ہیں نہ لکھتے ہیں کہ "حسن تماشا دوست بے وفائی کا رسوا نہ ہو" اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر بیوفائی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

مطلب:۔ محبوب اگرچہ تماشا دوست ہے یعنی دوسروں کو اپنے حسن کا جلوہ دکھانا پسند کرتا ہے مگر اس کی تماشا دوستی کی وجہ سے اس پر بے وفائی کا الزام وارد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ بات اس کی پارسائی کا ثبوت ہے کیونکہ جہاں ہزاروں لاکھوں دیکھنے والے موجود ہوں، وہاں وہ کوئی ایسی بات کس طرح کر سکتا ہے جو اس کی رسوائی کا موجب بن جائے۔ چنانچہ تماشائیوں کی نظریں اس کے دعویٰ پارسائی پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہیں

بنیادی تصور:۔ اثبات پارسائی محبوب۔

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
(۳) چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

جلوۂ بینش (۱) عقل و دانش کو روشن کرنے والا۔ مراد ہے ذاتِ حق سے، یا محبوب حقیقی سے (۲) اے میری آنکھوں کی روشنی۔ اس صورت میں مراد ہے محبوب مجازی سے۔ مہر آسا بمعنی آفتاب کی طرح + زکوٰۃ، درویش، کاسہ اور گدائی میں رعایت لفظی پائی جاتی ہے۔ کاسہ گدائی کنایہ ہے دل عاشق سے +

مطلب:۔ اس شعر میں محبوب حقیقی کو مخاطب قرار دینا اولیٰ ہے کہتے ہیں کہ اے

خدا! تو اپنے حسن یعنی اپنی صفاتِ کمالیہ کا پرتو میرے دل پر ڈال دے تاکہ میری پوری شخصیت آفتاب کی طرح منور ہو جائے۔

بنیادی تصور:۔ آرزوئے فیضانِ الٰہی۔

---

(۴)
نہ مارا جان کر بے جرم، قاتل! تیری گردن پر
رہا مانند خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا

چونکہ شعر میں تعقید پائی جاتی ہے اس لیے پہلے اس کی نثر لکھتا ہوں:۔

اے قاتل! تو نے مجھے بے جرم جان کر نہ مارا، اس لیے مانند خونِ بے گناہ، حقِ آشنائی تیری گردن پر رہ گیا۔

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ ایک بے گناہ کا خون اپنی گردن پر نہ رہے۔ مگر اب خونِ بے گناہ کے بجائے حق آشنائی تیری گردن پر رہے گا۔"

یہ شعر مضمون آفرینی کی بہت عمدہ مثال ہے۔

بنیادی تصور:۔ آرزوئے قتل۔

---

(۵)
تمنائے زباں، محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا، شکوۂ بے دست و پائی کا

تمنائے زباں یعنی طاقت گویائی کی تمنا + محوِ سپاسِ بے زبانی ہے یعنی بے زبانی کا شکر ادا کرنے میں محو ہے + شکوۂ بے دست و پائی بمعنی بیچارگی یا عاجزی کا شکوہ +

مطلب:۔ میں چاہتا تھا کہ محبوب سے اپنی بیچارگی کی شکایت کروں لیکن زبان نے یاری نہ دی (ہمت نہ ہو سکی)، اس لیے خاموش ہو رہا۔ اس بے زبانی کا نتیجہ یہ نکلا

کہ شکوۂ بے دستی و پائی کا تقاضا ہی مٹ گیا۔ اس لیے میری تمنائے تابِ گویائی اب عدمِ تابِ گویائی (بے زبانی) کا شکریہ ادا کرنے میں محو ہے۔

شعر کا مطلب صرف اتنا ہے کہ رعبِ حسنِ محبوب کی وجہ سے طاقتِ گویائی سلب ہو گئی اور اس بے زبانی کی بدولت شکوۂ بیچارگی کا تقاضا مٹ گیا۔ اس لیے میں اب محوِ سپاسِ بے زبانی ہوں۔ مگر غالب نے اپنے اندازِ بیان سے اس میں شاعرانہ لطف پیدا کر دیا ہے۔ یعنی تمنائے زبان (تابِ گویائی کی تمنا) اپنی ضد (بے زبانی) کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

بنیادی تصور :- سپاسِ بے زبانی۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے

(۶) چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا!

وہی اک بات ہے یعنی دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ نفس کنایہ ہے رنگیں نوائی یا غزل سرائی سے۔ چمن کا جلوہ یعنی فصلِ بہار +

مطلب :- میری رنگیں نوائی اور پھول کی خوشبو ان دو مختلف النوع چیزوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی یہ دونوں ایک ہی شئے کے دو رُخ ہیں اور وہ شئے موسمِ بہار ہے جو پھولوں میں خوشبو اور مجھ میں تغزل کا رنگ پیدا کرتی ہے۔ اقبال نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے :-

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے

انساں میں وہ سخن ہے غنچہ میں وہ چٹک ہے

بنیادی تصور :- وحدتِ مظاہرِ فطرت

---

(۷) دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جُو، زنجیرِ رسوائی!
عدم تک بیوفا! چرچا ہے تیری بیوفائی کا

پیغارہ بمعنی شکوہ یا طعن۔ پیغارہ جُو بمعنی طعن و تشنیع کرنے والا۔ حلقۂ زنجیر اور دہن میں مناسبت ہے۔ چونکہ معشوقوں کے دہن کو معدوم باندھتے ہیں اس لیے بیوفائی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا۔ اس شعر میں شاعر نے لفظ عدم سے مضمون پیدا کیا ہے عدم تک بے وفائی کا چرچا ہونا کنایہ ہے دور دور تک بے وفائی کی شہرت پھیل جانے سے۔ لفظِ عدم کے دو معنی ہیں (۱) وجود کی ضد ہے۔ (۲) بہت دور تک۔ یہاں شاعر نے دوسرے معنی مراد لیے ہیں لیکن پہلے معنی کی طرف خود بخود ذہن منتقل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شاعرانہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔

مطلب:۔ اے بیوفا! تیری بے وفائی کا چرچا دنیا کے ہر بت پیغارہ جُو کے دہن پر ہے اور چونکہ ان کے حلقہ ہائے دہن سے رسوائی کی ایک زنجیر بن گئی ہے اس لیے تیری رسوائی کا سلسلہ عدم تک پہنچ گیا ہے۔ اگر یہ سوال ہو کہ بتانِ پیغارہ جُو اس کی بیوفائی کے کیوں شاکی ہیں؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے حسن کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ خود حسینانِ جہاں اُس کے شیفتہ ہیں ۱۲

بنیادی تصور:۔ بیانِ بے وفائی محبوب۔

---

(۸) نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

حسرت سنج ہوں یعنی مجھے حسرت ہے + عرضِ ستمہائے جدائی بمعنی فراق کی اذیتوں کا بیان +

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اے غالب! تو اپنے خط کو طول مت دے حرف اس قدر

لکھ دے کہ میرے دل میں ستمہائے جدائی کے بیان کی بہت حسرت ہے۔

بنیادی تصور: حسرتِ بیانِ ستمِ جدائی۔

---

(۲۶)

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
(۱) بے تکلف داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا

مطلب:۔ قاعدہ ہے کہ غمِ دل، بیان کر دینے سے اس کا نقش بہت ہلکا ہو جاتا ہے پس اگر غمِ فرقت بیان نہ ہوا یعنی میں خاموش رہا تو چاند کے داغ کی طرح نشانِ غم دائمی بھی ہو جائے گا اور عیاں بھی رہے گا۔ دوسرے مصرع میں خبر مقدم ہے اس کی نثر یوں ہوگی، بے تکلف مہرِ دہاں داغِ مہ ہو جائے گا یعنی خاموشی (مہرِ دہاں) داغِ مہ کی طرح دائمی اور عیاں ہو جائے گی۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ داغِ مہ اور مہرِ دہاں میں کوئی منطقی ربط نہیں ہے۔ محض تشبیہ کی ندرت مدنظر ہے ۱۲

بنیادی تصور: دوامِ کلفتِ ضبطِ غم۔

زُہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
(۲) پرتوِ مہتاب، سیلِ خانماں ہو جائے گا!

زہرہ بمعنی پتہ۔ زہرہ آب ہو گیا یعنی پتہ پانی ہو گیا۔ یہ محاورہ کنایہ ہے شدتِ خوف و ہراس سے + پرتوِ مہتاب بمعنی چاندنی + سیلِ خانماں یعنی وہ سیلاب جو گھر کو بہا کر لے جائے یا برباد کر دے۔

مطلب:۔ کیونکہ شبِ فرقت کی دہشت سے ہر شئے کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔ اس

لیے کوئی تعجب نہیں اگر چاندنی کا پتہ بھی مارے خوف کے پانی ہو جائے اور یہ پانی میرے گھر کو بہائے جائے۔

بنیادی تصور:۔ دہشتِ شامِ ہجر۔

---

(۳)
دے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

مطلب:۔ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت محبوب سو رہا ہو اس وقت اس کے پاؤں کا بوسہ دے تو سکتا ہوں مگر اندیشہ یہ ہے کہ میرے اس فعل سے کہیں وہ بدگماں نہ ہو جائے۔ لیکن بحالتِ خواب بدگمانی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ بدگمانی کے لیے بیداری شرط ہے۔

اس لیے یہ مطلب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اگر محبوب خواب میں میرے پاس آئے تو میں اس کے پاؤں چوم سکتا ہوں مگر اندیشہ یہ ہے کہ وہ بدگمان ہو جائے گا اور خواب میں آنا بھی چھوڑ دے گا۔

بنیادی تصور:۔ اندیشۂ بدگمانیٔ محبوب۔

---

(۴)
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھتے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

صرفِ وفا یعنی وہ شئے جو وفاداری کے سلسلہ میں ہمیشہ کام آ سکے۔

مطلب:۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا دل ساری عمر عشق کرنے کے لیے کافی ہوگا اور ہمیشہ ہمارا ساتھ دے گا۔ لیکن اس کا کام تو پہلے امتحان ہی تمام ہو گیا۔ لہذا ہم حیران ہیں کہ اب عاشقانہ زندگی کس کے بل بوتے پر بسر کریں گے؟

بنیادی تصور :۔ دشواریٔ راہِ عشق۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
(۵) مجھ پر گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

مطلب :۔ بہت عمدہ مضمون پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص تجھ سے محبت کرتا ہے اس لیے اگر تو مجھ پر مہربان ہو جائے تو سارا زمانہ مجھ پر مہرباں ہو جائے گا۔

بنیادی تصور :۔ ہر دلعزیزیٔ ذاتِ محبوب۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
(۶) شعلہ خس میں، جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

نگاہ گرم یعنی نگاہ عتاب + گرم کا لفظ شعلہ کی رعایت سے لائے ہیں تعلیم ضبط یعنی آتش الفت کو ضبط کرنے یا پنہاں رکھنے کی تعلیم۔ دوسرے مصرع کی نثر یوں ہوگی :۔
شعلہ خس میں اس طرح نہاں ہو جائے گا۔ جیسے خون رگوں میں نہاں ہوتا ہے

مطلب :۔ اگر تیری نظرِ عتاب اسی طرح محبت کی آگ کو پنہاں رکھنے کی تعلیم دیتی رہی تو اس کے خوف سے تنکا بھی آگ سے مشتعل نہ ہو سکے گا کیونکہ آگ، خوف کی وجہ سے تنکے میں اس طرح پوشیدہ ہو جائے گی جس طرح رگوں میں خون پوشیدہ ہے۔
یہ شعر مبالغہ کی بہت عمدہ مثال ہے۔ آگ کا کام یہ ہے کہ وہ خس کو جلا دیتی ہے۔ مگر محبوب کی نگاہ عتاب کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ آگ بھی اس کے خوف سے خس میں پوشیدہ ہو جائے گی!

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ نگاہِ ضبط آموز۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
(۷) ہر گلِ تر، ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

مطلب :۔ اے دوست! مجھے باغ میں مت لے جا کیونکہ میرا حال زار دیکھ کر پھولوں کو بھی رونا آجائے گا۔

بنیادی تصور :۔ بیانِ حالتِ زار۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
(۸) اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

مطلب :۔ میں نے آج تک تیرے ظلم و ستم اس امید پر برداشت کئے ہیں کہ مرنے کے بعد قیامت میں خدا میرے ساتھ انصاف کرے گا لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر، میرا ٹھکانا کہاں ہو گا۔

بنیادی تصور :۔ توقعِ انصاف در محشر۔

فائدہ کیا؟ سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
(۹) دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

مطلب :۔ اے اسدؔ! تو کافی سمجھ رکھتا ہے اس لیے غور کر کہ ایک ناداں سے محبت کر کے تجھے کبھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک نہ ایک دن تجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

بنیادی تصور :۔ مضرتِ دوستیٔ ناداں۔

(۲۷)

(۱) دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا ٭ میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

درد بمعنی مرضِ عشق + منت کش بمعنی ممنون یا احسان مند۔ اچھا بمعنی صحت یاب

اچھا کے دو معنی ہیں (۱) برے کی ضد ہے (۲) صحت یاب۔ برا نہ ہوا یعنی میرا صحت یاب نہ ہونا میرے حق میں کسی نقصان یا مضرت کا موجب نہیں ہوا +

مطلب :۔ اگر میں مرضِ عشق سے صحت یاب نہ ہو سکا تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے یا مقامِ افسوس نہیں ہے بلکہ میں خوش ہوں کہ میں کسی معالج (معشوق) کا ممنونِ احسان تو نہیں ہوا۔

بنیادی تصور :۔ شانِ بے نیازیٔ عشق۔

---

(۲) جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ٭ اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

مطلب :۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ اگر تم کو مجھ سے کچھ شکایات ہیں تو انہیں تنہائی میں بھی بیان کر سکتے ہو۔ رقیبوں کو جمع کر کے میری تذلیل اور توہین کا سامان کیوں کرتے ہو؟ آخر گلہ کوئی تماشا تو نہیں ہے جس کے لیے چار آدمیوں کا جمع ہونا ضروری ہو!

بنیادی تصور :۔ شانِ خودداریٔ عشق۔

---

(۳) ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ٭ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مطلب :۔ اے محبوب! عاشقوں کو قتل کرنا تیرا دل پسند مشغلہ ہے۔ تو ہر وقت انہیں قتل کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ جب تجھ جیسا سفاک میرے قتل پر آمادہ نہ ہوا تو پھر دنیا میں شاید کوئی بھی مجھے قتل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا۔

بنیادی تصور :۔ شکوۂ شومیٔ تقدیر۔

(۴) کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ؛ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

مطلب :۔ محبوب کی شیریں لبی کو نئے انداز سے ثابت کیا ہے اور اسی میں شعر کا لطف مضمر ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرے لبوں کی شیرینی کا یہ عالم ہے کہ تو نے جو گالیاں رقیب کو دیں وہ بھی ان لبوں کی تاثیر سے شیریں ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گالیاں کھا کے رنجیدہ نہیں ہوا۔

بنیادی تصور :۔ ذکرِ شیرینیٔ لبِ محبوب +

---

(۵) ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ؛ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مطلب :۔ شوخی کے رنگ میں بہت خوب شعر کہا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ آج ان کے آنے کی توقع ہے مگر کیا سوء اتفاق یا شومیٔ قسمت ہے کہ آج ہمارے گھر میں بوریا نہیں ہے۔

لفظ بوریا میں ایک خوبی یہ مضمر ہے کہ افلاس کی وجہ سے چارپائی تو کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ ہاں کل کائنات ایک بوریا تھی مگر افسوس کہ آج وہ بھی نہیں ہے

بنیادی تصور :۔ اظہارِ بے سروسامانی۔

---

(۶) کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؛ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

نمرود۔ ملک عراق کا مشہور بادشاہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہمعصر (حضرتؑ کی ولادت طوفان نوحؑ کے بارہ سو سال بعد ہوئی تھی) اس بادشاہ نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔

مطلب :۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت (پرستش) نہیں ہے۔ بلکہ عبودیت (بندہ ہونا) ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا

بالکل نئی بات ہے۔"

نوٹ:۔ بطورِ وضاحت اس قدر لکھنا شاید خلاف محل نہ ہو کہ غالب کہتے ہیں:۔

(ا) میں نے بارگاہ ایزدی میں اپنی عبودیت کا اعتراف کیا۔

(ب) مگر افسوس کہ اقرار عبودیت سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ مثلاً مرتے دم تک قرض خواہوں سے نجات نہ مل سکی۔

(ج) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دعویٔ عبودیت اس کی نظر میں نمرود کا دعویٔ خدائی قرار پایا (جبھی تو مجھے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔)

بنیادی تصور:۔ شکوۂ تلخیٔ حیات۔

---

(۷) جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ؎ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان دی یعنی مرکر جان واپس دے دی۔ حق تو یہ ہے بمعنی سچی بات تو یہ ہے۔ حق ادا نہ ہوا یعنی فرض ادا نہ ہوا۔

مطلب:۔ اگر مرنے کے بعد ہم نے اس کی عطا کردہ جان (زندگی) اُسے واپس کر دی تو ہم نے کوئی قابل تحسین فعل نہیں کیا۔ کیونکہ امانت واپس کرنے میں کوئی خوبی نہیں ہے ہمارا فرض یہ تھا کہ خدا کے اس احسان عظیم کا حق ادا کرتے یعنی حسن عمل سے اس کی عطا کردہ زندگی کو چار چاند لگاتے۔ اور اس طرح زندگی میں کچھ اضافہ کرکے واپس کرتے۱۲

بنیادی تصور:۔ ماتم تضییعِ اوقات۔

---

(۸) زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما ؎ کام گر رک گیا، روانہ ہوا

مطلب:۔ بدقسمتی دیکھو کہ اگر میرا کوئی کام رک گیا تو پھر کسی طرح جاری نہ ہو سکا۔

لیکن اگر میرا زخم رجراح کی توجہ سے اب بھی گیا تو خون نہ رکا۔ حالانکہ کام کی طرح اسے بھی رک جانا چاہیئے تھا۔

بنیادی تصور :۔ شکوۂ ستم ظریفیٔ روزگار۔

---

(۹) رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے ٭ لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا

غالب نے جزوِ ردیف (نہ) کو جزو قافیہ بنا دیا ہے۔ یہ بات اس زمانہ میں معیوب تھی مگر اب قابل تحسین ہے۔

مطلب :۔ معشوق کے طرز عمل پر طنز کی ہے کہ اس کو لازم تھا کہ میرا دل لینے کے بعد تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھتا تاکہ مجھے اپنی عظیم الشان قربانی کا کچھ تو معاوضہ مل جاتا۔ مگر افسوس کہ وہ تو دل ستاں کے بجائے راہزن ثابت ہوا یعنی دل لے کر ایسا بھاگا جیسے کوئی ڈاکو لوٹ مار کر کے بعجلت تمام فرار ہو جائے۔

بنیادی تصور :۔ خود غرضی محبوب۔

---

(۱۰) کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں ٭ آج غالب غزل سرا نہ ہوا

مطلب :۔ بیخود دہلوی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ قلعہ معلیٰ میں کسی شہزادے کے یہاں مشاعرہ ہوا تھا۔ غالب بھی شریک ہوئے تھے مگر طرحی غزل نہیں کہی تھی اس لیے یہ غزل وہاں پڑھ دی تھی۔ مقطع کا انداز بتا رہا ہے کہ غالب سے لوگوں نے یہ کہا کہ اگر طرحی غزل نہیں لکھی تو غیر طرحی کلام ہی سنا دیجئے (کچھ تو پڑھیئے)

بنیادی تصور :۔ اصرارِ احباب۔

(۴۸)

(۱) گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا ؛ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

گہر کی آب و تاب کو اضطراب دریا سے تعبیر کیا ہے + شوق بمعنی تمنا +

مطلب :- دریا کا اضطراب (اپنی عظمت کے باوجود) گوہر (موتی) میں آ کر سکون پذیر ہو جاتا ہے لیکن شوق (تمنا) کا اضطراب اس قدر شدید ہوتا ہے کہ عاشق کے دل میں بھی (اس کی وسعت کے باوجود) نہیں سما سکتا۔ عشق کی بے تابی کو کیسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے !

بنیادی تصور :- شدتِ اضطرابِ شوق۔

---

(۲) یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب ؛ مگر ستم زدہ ہوں شوقِ خامہ فرسا کا

مطلب :- میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو کبھی میرے خط کا جواب نہیں لکھے گا مگر شوقِ خط نویسی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اس لیے تجھے مسلسل خطوط لکھتا رہتا ہوں۔

بنیادی تصور :- شوقِ خامہ فرسائی۔

---

(۳) حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی ؛ دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

عیشِ دنیا کو بہار سے اور دوامِ کلفتِ خاطر کو خزاں سے تعبیر کیا ہے۔

مطلب :- از بسکہ بہار خود خزاں کے اسباب میں سے ہے کہ خزاں نام ہی ہے سامانِ بہار کے اتلاف کا پس گویا یہ بہار پائے خزاں کی زینت کا سبب یا اس کے پاؤں کی مہندی ہے اسی طرح دنیا کا سامانِ عیش و راحت بدیں جہت کہ فنا پیوستہ ہے مستوجب دوامِ کلفت ہے۔ کہ اس کے تلف ہوتے ہی کا نام دوامِ کلفت ہے۔ جس طرح بہار نہ ہو تو خزاں کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عیشِ دنیا نہ ہو تو دوامِ کلفتِ خاطر بھی نہ ہو۔

بقول پروفیسر منظور حسن صاحب عباسی۔

بہار سرخوشِ صد آب و رنگ، کیا جانے
کہ یہ متاعِ گل و لالہ ہے خزاں کے لیے

یعنی عیشِ دنیا دوام کلفت کے لیے بمنزلۂ متاع ہے۔ ۱۲

بنیادی تصور:۔ دوام کلفتِ خاطر۔

---

(۴) غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ❊ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ خندۂ گل کو خندۂ بیجا اس لیے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھ کر یا از راہِ تعجب نہیں ہنستا۔ پس گویا اس کا خندہ بے محل ہے۔

مطلب:۔ اپنے دوست سے کہتے ہیں غمِ فراق کی حالت میں مجھے سیرِ باغ کے لیے مت لے چلو کیونکہ اس حالت میں مجھے پھولوں کی شگفتگی، خندہ ہائے بیجا معلوم ہو گی یعنی اس سے مجھے مسرت کے بجائے کلفت محسوس ہو گی۔ (شگفتگیٔ گل کو خندہ ہائے بیجا سے تعبیر کیا ہے)

بنیادی تصور:۔ ع رنج میں خندۂ گل رنج فزا ہوتا ہے۔

---

(۵) ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں ❊ کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

مطلب:۔ اگرچہ اس کے حسن کا جلوہ دیکھنے کے لیے میرے ہر بال کی جڑ چشمِ بینا بن گئی ہے۔ یعنی میں از سر تا پا نگاہ بن گیا ہوں۔ لیکن ابھی تک اس کے حسن کی حقیقت مجھ پر آشکار نہیں ہو سکی۔

بنیادی تصور:۔ اعترافِ عجزِ معرفت

نوٹ:۔ اگر "ہر بنِ مو" سے اشیائے کائنات مراد لی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ اگرچہ ہر شئی مظہرِ جلوہ ذات و صفات ہے اس کے باوجود کوئی انسان محرمِ راز نہیں ہو سکتا۔

یعنی کنہِ ذات تک رسائی ناممکن ہے۔

---

(۶) دل اسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ٭ ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

"پہلے ہی ناز و ادا سے" یعنی ناز و ادا دکھانے سے پہلے ہی + "دماغ کہاں یعنی تقاضا گوارا نہیں۔ لفظ تقاضا محض قافیے کی مجبوری سے باندھا ہے۔ محاورے کی رُو سے "تقاضے" ہونا چاہیئے۔

مطلب:۔ ناز و ادا سے محبوب کا تقاضا یقیناً یہ ہونا کہ ہم اپنا دل اس کی نذر کر دیں۔ لیکن یہ ہمیں گوارا نہیں ہے کہ کوئی ہم سے تقاضا کرے۔ اس لیے ہم نے ناز و ادا سے پہلے ہی اپنا دل محبوب کو دے دیا۔

بنیادی تصور:۔ قدر دانیٔ ناز و ادا۔ یا ناگواریٔ تقاضا۔

---

(۷) نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے ٭ مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

دریا کنایہ ہے چشمِ اشک فشاں سے۔ میری نگاہ میں ہے یعنی مجھے اچھی طرح معلوم ہے "میری نگاہ میں ہے" غالب کو ایسی تراکیب استعمال کرنے میں کمال حاصل ہے جن کے دو معنی ہو سکیں۔ یہاں یہ ترکیب نہایت دلکش ہے کیونکہ اس کے دو معنی ہیں (۱) مجھے جمع و خرچ دریا کا علم ہے۔ (۲) آنسوؤں کا ذخیرہ میری نگاہ میں ہے۔ اور یہ بات کون نہیں جانتا کہ آنسو نگاہ ہی میں ہوتے ہیں۔

مطلب:۔ اے ہمدم! یہ مت سمجھ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے یعنی یہ مت سمجھ کہ میں اسی قدر رویا ہوں جس قدر رونا چاہتا ہوں میرے پیشِ نظر تو جمع و خرچ دریا ہے۔ یعنی میں تو دریا کے حساب سے رونا چاہتا ہوں۔ بالفاظِ دگر روتے روتے دریا بہانا چاہتا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ گریہ۔

(۸) فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

کارفرما کنایہ ہے محبوب جفا شعار سے۔

مطلب:۔ چونکہ فلک کی جفاؤں میں محبوب کی جفاؤں کا انداز پایا جاتا ہے۔ اس لیے فلک کو دیکھ کر میرے دل میں محبوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ یادِ محبوب۔

---

(۲۹)

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا ٭ خطِ جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

مطلب:۔ غالب نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "اس مطلع میں خیال ہے دقیق کوہ کندن وکاہ برآوردن" والا معاملہ ہے یعنی لطف زیادہ نہیں ہے: قطرہ ٹپکنے میں اختیار ہے۔ بقدر یک مژہ برہم زدن ثبات وقرار ہے حیرت ازالۂ حرکت کرتی ہے قطرۂ مے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط صورت اس تاگے کے بن گیا جس میں موتی پرد ئے ہوئے ہوں۔"

چونکہ غالب نے جو مطلب بیان کیا ہے وہ بجائے خود تشریح طلب ہے۔ اس لیے حسرت موہانی نے اس مطلب کا خلاصہ بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ جب ساغر مے لب یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے، فرطِ حیرت سے منجمد ہو کر گویا گوہر بن گئے اس لیے خطِ جام مے، رشتۂ گوہر کی مانند ہو گیا۔

نظم طباطبائی نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ "یہ حیرت حسن ساقی کو دیکھ کر پیدا ہوئی مگر یہ مضمون مصنف کے ذہن میں رہ گیا۔"

بنیادی تصور:۔ تاثیرِ حسنِ محبوب

(۲) اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ۔ غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

مطلب :- یہ بات تو میرے لیے باعث فخر ہے کہ محبوب کو میرے عشق کا یقین ہو گیا ہے لیکن اس یقین کا نتیجہ میرے حق میں بہت برا نکلا یعنی اگر کبھی رقیب بھی آہ کرتا ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ آہ میں نے ہی کی ہے اس لیے وہ مجھی پر خفا ہوتا ہے۔

بنیادی تصور :- خانہ خرابیٔ اعتبار عشق۔

---

(۳۰)

(۱) جب بتقریب سفر، یار نے محمل باندھا!
تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

بتقریب سفر محمل باندھنا کنایہ ہے عزم سفر سے۔

مطلب :- جب محبوب نے عزم سفر کیا تو ہر ذرہ شوق نظارہ جمال میں اک دل بیتاب بن گیا یعنی ذرہ ذرہ مشتاق دید ہو گیا۔

بنیادی تصور :- کشش حسن۔

---

(۲) اہل بینش نے بحیرت کدۂ شوخیٔ ناز ۔ جوہر آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

مطلب :- دیکھنے والوں پر محبوب کی شوخیٔ ناز سے ایسا عالم حیرت طاری ہوا کہ انھوں نے آئینہ کے جوہر کو یہ سمجھا کر یہ ایک طوطیٔ بسمل ہے یعنی دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ محبوب کے ناز کی شوخی، عشاق بر طرف، جوہر آئینہ کو بھی تڑپا رہی ہے۔

بنیادی تصور :- تاثیر حسن محبوب۔

---

(۳) یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا ۔ عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

عربدہ میداں یعنی میدان جد وجہد + عربدہ بمعنی جنگ + عجز ہمت یعنی پستی ہمت۔
مطلب :۔ یاس اور امید ایک وسیع میدان جد وجہد کے متقاضی ہیں اور یہ میدانِ جد وجہد وہ طلسم ہے جو سائل کا دل اپنی کم ہمتی کی وجہ سے باندھتا رہتا ہے۔ اس میدانِ جد وجہد کو طلسم اس لیے کہا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر انسان شانِ بے نیازی اختیار کرے تو چشم زدن میں یہ طلسم پاش پاش ہو جائے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس شعر میں غالبؔ نے بے نیازی کی تعلیم دی ہے۔
بنیادی تصور :۔ بے حقیقتیٔ بیم در جا۔

---

(۴۲) نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

غالبؔ نے یہ شعر پہلے یوں کہا تھا :۔

یار نے تشنگیٔ شوق کے مضمون چاہے ❖ ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

تشنگیٔ شوق سے شوق کی فراوانی مراد ہے۔ دل کھول کے یعنی بے تامل ساحل باندھا یعنی خشک قرار دیا۔
مطلب :۔ تشنگیٔ شوق کو بجھانے کے لیے اگر دریا کو بھی ساحل کی طرح خشک و ناکافی سمجھا جائے تو بھی تشنگیٔ شوق کی فراوانی کا صحیح اور کامل نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ یعنی شوق کی پیاس ایسی شدید ہوتی ہے کہ اسے دریا بھی نہیں بجھا سکتا۔
بنیادی تصور :۔ بے پایانی تشنگیٔ شوق۔

---

(۱۳)

(۱) میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں ❖ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

مطلب :- کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مجھ جیسا شراب کا رسیا، بزم مے سے یوں بے پیئے چلا آئے ۔ مان لیا کہ میں نے توبہ کر لی تھی مگر ساقی اپنے فرض سے کیوں غافل ہو گیا یعنی اس نے زبردستی کیوں نہ پلا دی !

مشرقی شاعری میں ساقی زہد شکن ہوتا ہے ۔ یعنی اس کا کام ہی یہ ہے کہ لوگوں کی توبہ توڑے اور جو انکار کرے زبردستی پلا دے ۔ چنانچہ داغ کہتے ہیں :-

انکار مے کشی نے مجھے کیا مزا دیا
سینے پہ چڑھ کے اس نے خم مے پلا دیا

بنیادی تصور :- شکوۂ محرومی ۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
(۲) وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

دوسرے مصرع کی نثر یوں ہوگی :-

"وہ دن گئے جب اپنا جگر دل سے جدا تھا"

مطلب :- اس کے ایک تیر نظر نے میرے دل اور جگر دونوں کو زخمی کر دیا ۔ اس لیے اب دونوں کی حالت یکساں ہے ۔ یہ بھی تڑپ رہا ہے وہ بھی تڑپ رہا ہے

غالب نے لفظ جدا کو الگ کے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے یعنی وہ یہ نہیں کہتے کہ دونوں متحد الوجود ہو گئے ہیں بلکہ زخمی ہونے کے اعتبار سے دونوں یکساں ہو گئے ہیں یعنی دونوں کی حالت ایک سی ہو گئی ہے ۔

بنیادی تصور :- بربادئ دل و جگر ۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
(۳) جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

درماندگی بمعنی بیچارگی۔ کچھ بن پڑے یعنی کوئی تدبیر ہو سکے"۔ دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے ہمیں گھیر اتھا اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی"۔ (حالیؔ)

مطلب:۔ جب مشکلات نے ہمیں گھیرا تھا اس وقت مجھ میں ان کے دفع کرنے کی طاقت موجود تھی۔ یعنی مختلف تدابیر میرے ذہن میں آتی تھیں مگر اب جب کہ چاروں طرف سے مشکلات کا ہجوم ہے ان کے دفعیہ کی کوئی تدبیر کر سکوں تو جانوں کہ میری عقل بہت تیز ہے۔

بنیادی تصور:۔ شدت عالم پریشانی۔

---

(۳۲)

(۱) گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا ∴ بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔

مطلب:۔ ناصح کہتا ہے کہ اگر تم اس کثرت سے گریہ وزاری نہ کرتے تو تمہارا گھر ویران نہ ہوتا۔ اس کے جواب میں غالبؔ کہتے ہیں کہ ہم چونکہ عاشق ہیں اس لئے ہمارے گھر کی ویرانی بہر حال لازمی ہے۔ اب شدت گریہ سے گھر ویران ہو گیا نہ روتے تو دشت نوردی اختیار کر لیتے اور ہماری عدم موجودگی میں ہمارا گھر ویران ہو جاتا۔

دوسرے مصرع میں اپنے دعوے کو بحر کی مثال سے ثابت کیا ہے کہ سمندر اگر سمندر نہ ہوتا تو اس کی جگہ بیاباں ہوتا۔ اسی طرح ہمارا گھر اس وقت وفور اشک فشانی سے سمندر بنا ہوا ہے۔ اگر سمندر نہ ہوتا تو ہماری صحرانوردی کی وجہ سے ویران ہو جاتا

بنیادی تصور:۔ خانہ خرابیٔ عاشق۔

---

(۲) تنگیٔ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے ∴ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

تنگی کے دو معنی ہیں (۱) غمگینی (۲) پریشانی کی ضد ہے یعنی سکڑا ہوا ہونے کی حالت، پریشانی کے دو معنی ہیں۔(۱) غمگینی (۲) تنگی کی ضد ہے۔ یعنی پھیلا ہوا ہونے کی حالت۔ دو لفظوں میں جو ایہام ہے اسی میں شعر کا لطف مضمر ہے۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ مجھے دل تنگی (غمگینی) کا کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ یہ وہ کافر دل ہے کہ اسے راحت سے نفرت ہے یہ تو دشمنِ عافیت ہے اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا۔ یعنی بہر صورت کسی رنج میں مبتلا ہوتا۔

تنگی اور پریشانی اگرچہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر دل کے معاملہ میں مترادف ہیں۔ یعنی دل کے لئے دونوں باعث اذیت ہیں اور اسی میں شعر کا لطف پوشیدہ ہے۔

بنیادی تصور:۔ حرمان نصیبیٔ عشاق۔

---

(۳) بعد یک عمر ورع، بار تو دیتا بارے ❊ کاش رضواں ہی دربار کا درباں ہوتا

ورع بمعنی زہد و تقوی + یک عمر سے درازی مدت مراد ہے + بار بمعنی اجازت + رضواں + داروغۂ جنت کا نام ہے۔

مطلب:۔ اس عالم کے درباں کے بجائے اگر رضوان، دربار کا درباں ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا مدت دراز تک یار کی پرستش کرنے کے صلہ میں وہ ہمیں ضرور گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دیتا۔

بنیادی تصور:۔ سخت گیری درباں۔

---

(۲۳۳)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

(۱) ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

ڈبویا مجھ کو ہونے نے" یہ محاورہ ہے اور اس کا مطلب ہے کہ ہونے نے مجھے حصولِ مقصد سے باز رکھا۔ خوبی اس میں یہ پیدا ہو گئی کہ اپنی ہستی کو اپنے ڈوبنے یعنی ناکام ہو جانے کا سبب قرار دیا ہے اور ڈوب جانے کے ظاہری معنی ہیں فنا ہو جانا یا نیست ہو جانا، اگر محاورہ سے قطع نظر کر لی جائے تو دوسرا مطلب یہ ہے کہ میری ہستی میری مصیبتوں کا باعث ہے "نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" اس کے بھی دو معنی ہیں (۱) اگر میں نہ ہوتا تو کوئی حرج واقع نہ ہوتا، کوئی مضائقہ نہ تھا۔ (۲) اگر میں نہ ہوتا تو خدا ہوتا (کیونکہ پہلے مصرع میں واضح کر چکے ہیں کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا)

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے پہلے مصرع کے معنی تو ظاہر ہیں دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی مگر در اصل قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیئے کہ میں کیا چیز ہوتا؟ مطلب یہ ہے کہ میں خدا ہوتا کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

بنیادی تصور:۔ مذمت ہستی خویش۔

---

(۲)
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جُدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

سر زانو پر دھرا ہوتا کنایہ ہے عالم محویت سے۔

مطلب:۔ جب فرطِ غم سے میرا سر بے حس (مردہ) ہو گیا تو اس کے کٹ جانے کا چنداں ملال نہیں ہے (اگر معشوق نے میرا سر قلم کر دیا تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا، کیونکہ وہ تو پہلے ہی بے کار ہو چکا تھا اگر تن سے جدا نہ ہوتا تو زانو پر دھرا ہوتا۔ (مجھ پر عالم محویت طاری ہوتا اور اس عالم میں انسان از خود رفتہ ہو کر دنیا و ما فیہا دونوں سے بے گانہ ہو جاتا ہے

یعنی اس صورت میں بھی میرے کام نہ آتا۔ خلاصۂ کلام ایں کہ میرے حق میں اس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ خوب شعر کہا ہے!

بنیادی تصور:۔ عالم محویت۔

(۳) ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے ٭ وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' اس کے دو معنی ہیں (۱) یوں ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا یا کیسا لطف ہوتا (اظہار تمنا) مثلاً وہ میرے گھر آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ (۲) یوں ہوتا بھی تو کیا ہوں ۔۔ کیا فائدہ ہوتا۔ مثلاً اگر زید کو پچاس لاکھ کے بجائے ساٹھ لاکھ مل جاتے تو کیا کمال ہوتا جب کہ مرتے وقت نہ پچاس لاکھ اس کے ساتھ جاتے نہ ساٹھ لاکھ۔

مطلب:۔ اگرچہ غالبؔ کو مرے ہوئے ایک مدت ہو گئی مگر ہر موقعہ پر یہ کلمہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا (کیسا اچھا ہوتا یا کیا فائدہ ہوتا)، مجھے اب تک یاد آتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ فراوانیٔ آرزو یا بے ثباتیٔ آرزو۔

(م ۳)

(۱) یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا ٭ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

جادہ بمعنی لیکھ یا بٹیا + فتیلہ بمعنی بتی + باغ کنایہ ہے کائنات سے۔

مطلب:۔ کائنات کی ہر چیز تخلیق حسن میں باہم دگر تعاون کرتی ہے۔ بظاہر لالہ کے خوبصورت داغ کو نشان راہ (جادہ) سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن غالبؔ یہ کہہ کر اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے باغ (کائنات) کا ہر ذرہ تخلیق حسن میں مصروف ہے یہاں تک کہ جادہ بھی لالہ میں داغ پیدا کرنے کے لئے فتیلہ کا سا کام کرتا ہے یہ شعر غالبؔ کی جدت فکر کی بہت عمدہ مثال ہے۔

بنیادی تصور:۔ وحدتِ موجوداتِ عالم۔

(۲) ہے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی ٭ کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

آگہی بمعنی عقل و ہوش + آشوبِ آگہی بمعنی شورش یا فتنۂ آگہی۔ چونکہ آگاہی (شعور یا ہوش) ہماری تمام پریشانیوں کا سبب ہے اس لئے آشوبِ آگہی کنایہ ہے افکار و آلام دنیوی سے + طاقتِ آشوبِ آگہی یعنی افکار و آلام دنیوی کا مقابلہ کرنے کی طاقت عجزِ حوصلہ یعنی عجزِ ہمت یا پستی حوصلہ + ایاغ بمعنی جام شراب۔ خطِ ایاغ بمعنی وہ نشان (خطوط) جو شراب کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لئے جام شراب پر کھنچے ہوتے ہیں۔

مطلب:- شراب نوشی کے بغیر افکار و آلام دنیوی سے نجات نہیں مل سکتی۔ لیکن ہم اپنی کم حوصلگی کی وجہ سے ناپ ناپ کر (تھوڑی مقدار میں) شراب پیتے ہیں ورنہ اگر بے اندازہ پیکر مست و بیخود یعنی عقل و ہوش سے بیگانہ ہو جائیں تو آشوبِ آگہی (آلام دنیوی) کا بآسانی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ (کیونکہ کسی بات کا احساس ہی باقی نہیں رہے گا)

بنیادی تصور:- لذتِ عالمِ بیخودی۔

---

(۳) بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ٭ کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

کاروبار بمعنی طرزِ حیات یا حرکات و سکنات + غالب نے اس شعر میں عشق کو خلل دماغ سے تعبیر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں عشق کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) اعلیٰ قسم کا عشق جو زندگی کو بامعنی بنا دیتا ہے اور ہر درد کی دوا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا؟

(ب) ادنیٰ قسم کا عشق جو زندگی کو بے معنی بنا دیتا ہے اور تمام مصیبتوں کی جڑ ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مطلب :- بلبل تو گلوں کے عشق میں نالہ و فریاد کر رہی ہے مگر گل متاثر ہونے کے بجائے شگفتہ ہو رہے ہیں (پھولوں کی شگفتگی کو خندۂ گل سے تعبیر کیا کرتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ بلبل کے دماغ میں خلل ہے جو وہ اس فعل عبث (نالہ و فریاد) کی مرتکب ہو رہی ہے پھولوں پر تو اس کے نالہ و فریاد کا اُلٹا اثر مرتب ہو رہا ہے۔ اگر وہ صحیح الدماغ ہوتی تو اس فعل سے باز آجاتی۔ اس کا یہ طرز عمل ثبوت ہے اس بات کا کہ اس کے دماغ میں خلل ہے۔

اس میں ایک لطیف نکتہ یہ مضمر ہے کہ بلبل نالہ کر رہی ہے۔ پھول اس کی حماقت پر ہنس رہے ہیں کہ یہ کتنی بیوقوف ہے کہ اس شے سے محبت کر رہی ہے جو صرف ایک دن کی مہمان ہے۔ اگر اس کے دماغ میں خلل نہ ہوتا تو کبھی ہم سے دل نہ لگاتی۔

بنیادی تصور :- بے ثباتیٔ گل۔

(۴) تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے ؎ تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا۔

تریاکیٔ قدیم یعنی پرانا افیونی یا چنڈو باز + دودِ چراغ کے دو معنی ہیں (۱) چراغ کا دھواں (۲) چنڈو باز چراغ کی لو پر افیون رکھ کر اس کا دھواں نے کے ذریعہ سے کھینچ کر پیتے ہیں + نشہ، تریاکی اور دودِ چراغ میں رعایت لفظی ہے۔

مطلب :- فن شاعری میں نو آموز نہیں ہوں۔ اس کا چسکا مجھے بچپن سے پڑا ہوا ہے۔ میں عرصۂ دراز سے راتوں کو چراغ کے سامنے بیٹھ کر فکر سخن کر رہا ہوں۔

بنیادی تصور :- فن شعر سے فطری مناسبت ہے۔

(۵) سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے ؎ پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

مطلب :- ہم نے بارہا عشق سے توبہ کی مگر کیا کریں اپنی اُفتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ہمارا دل خود غم عشق سے فارغ ہونا نہیں چاہتا۔ اس شعر ... کا۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی فطرت اِس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ نچلا بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ کسی نہ کسی شئے سے وابستگی چاہتا ہے اور وابستگی کا نتیجہ پریشانی ہوتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تصویر فطرت انسانی۔

(۶) اے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار ٭ یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

میکدہ کنایہ ہے چشم سے + خراب ہے یعنی برباد یا ویران ہو گیا + مے کنایہ ہے + خونِ دل سے + سراغ کا۔ یہ فارسی ترکیب کا اردو ترجمہ ہے اس لئے غیر فصیح ہے + مے کے سراغ کا خراب ہے یعنی خونِ دل کی تلاش میں ویران ہو گیا۔

مطلب:۔ میری آنکھوں کی ساری رونق خونا یہ نشانی کی وجہ سے ہے اگر میں خون کے آنسو بہانا چھوڑ دوں تو میری آنکھوں میں خاک اُڑنے لگے یعنی بے رونق ہو جائیں۔

جس طرح میکدہ کی رونق شراب سے ہے اگر شراب نہ ہو تو میکدہ میں خاک اُڑنے لگے۔ اسی طرح میری آنکھوں کی رونق، خونِ دل (خونابہ فشانی) کی بدولت ہے چونکہ خونِ دل ختم ہو چکا ہے اس لئے موجِ نگہ، غبار بن گئی۔ یعنی آنکھیں بے رونق ہو گئیں۔ بالفاظ دگر یہ میکدہ (آنکھ) مے (خونِ دل) کے فقدان کی وجہ سے ویران ہو گیا۔

بنیادی تصور:۔ خونِ دل باعثِ رونقِ چشم ہے۔

(۷) باغِ شگفتہ تیرا، بساطِ نشاطِ دل ٭ ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا۔

باغ شگفتہ کنایہ ہے محبوب کے حسن و جمال سے جو بغایت دلکش ہے + بساطِ نشاطِ دل یعنی میرے دل کی مسرت کا سبب ہے + خمکدہ کس کے دماغ کا یعنی ہمارے لئے موجب سرور نہیں ہو سکتا۔

مطلب :۔ ابرِ بہار ہماری مسرت کا موجب نہیں ہو سکتا۔ ہماری نشاطِ خاطر تو تیرے حسن و جمال کے نظارہ پر موقوف ہے۔

بنیادی تصور :۔ حسنِ محبوب باعثِ نشاطِ دل ہے۔

(۳۵)

(۱) وُہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا ؛ رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

چینِ جبیں ماتھے کی شکن جو اضطراب یا پریشانی کی علامت ہے + رازِ مکتوب کنایہ ہے غمِ پنہاں سے + بے ربطیٔ عنوان کنایہ ہے چینِ جبیں سے +

مطلب :۔ جس طرح مضمونِ خط کی بے ربطی سے لکھنے والے کے اضطرابِ باطنی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میری چینِ جبیں سے میرے غمِ پنہاں کا رازِ محبوب پر ظاہر ہو گیا۔

بنیادی تصور :۔ چینِ جبیں مظہرِ غمِ پنہاں ہے۔

(۲) یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ؛ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

مطلب :۔ غالب نے اس شعر کا مطلب خود بیان کیا ہے لکھتے ہیں کہ :۔

پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ "آئینہ" عبارت ہے فولاد کے آئینہ سے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں ؟ اور ان کو صیقل کون کرتا ہے ؟ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اس کو "الف صیقل" کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہو گیا تو اب اس مفہوم کو سمجھیئے۔

ع چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا۔

یعنی ابتدائے سن صغیر سے مشقِ جنوں کر رہا مگر اب تک کمالِ فن حاصل نہیں ہُوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا۔ بس وہی ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب "آثار جنوں" اسی

سے ہے۔" (خطوطِ غالب جلد دوم ص۳۶۶)

بنیادی تصور:۔ معرفت باری محال ہے۔

(نوٹ) اردو کے نامور شاعر اور نقاد مرزا جعفر علی خانصاحب اثرؔ لکھنوی نے غالب کی اس شرح پر حسب ذیل حاشیہ آرائی کی ہے جو بلا شبہ لائق مطالعہ ہے۔

"یک الف، صیقل گروں کی اصطلاح ہے۔ الف معیار صیقل ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ایک الف صیقل ہوئی یا دو الف صیقل ہوئی + آئینہ کنایہ ہے دل سے + گریباں چاک کرنا علامت جنوں ہے۔

جنوں، شاعری میں، خلل دماغ کا مترادف نہیں ہے بلکہ عشق کی وہ منزل ہے جب عاشق، تصورِ محبوب میں دنیا وفیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ گریباں کا چاک بھی الف سے مشابہ ہوتا ہے۔ گویا چاک گریباں۔ وہ آلہ ہے جس سے آئینۂ دل کی جلاء ہوتی ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے عقل نہیں بلکہ وجدان کے ذریعہ سے آئینہ دل کو مجلی کرنا شروع کیا تاکہ انوار سرمدی اس میں منعکس ہوں۔ یہ مشق ایک عرصہ سے جاری ہے لیکن افسوس کہ ابھی تک آئینہ پورے طور سے مجلی نہیں ہوا یعنی میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ معرفت ذاتِ باری تعالیٰ دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔"

(مطالعۂ غالب صفحہ ۴۹ و ۵۰)

(۳) شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ ٭ اسقدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا۔

گرفتاری خاطر اور تنگیٔ دل، ہم معنی ہیں اور انہی پر شعر کی عمارت قائم ہے۔ زنداں کی مناسبت سے گرفتاری اور تنگ کی مناسبت سے شرح کا لفظ لائے ہیں۔ "شرح اسباب" میں ایہام ہے (۱) افسردگی خاطر کے اسباب کی وضاحت بھی مراد لئے ہیں (۲) فن طب کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے +

مطلب :۔ اے ہمدم! میں تجھ سے اپنی افسردگی خاطر کے اسباب کی تشریح کیا کروں! تنگئ دل وافسردگی خاطر، کا یہ عالم ہے کہ میں اپنے آپ کو زنداں کی تنگ وتار کوٹھری میں محبوس سمجھتا ہوں۔

نوٹ :۔ غالب نے دوسرے مصرع میں زنداں کے پردے میں گرفتارئ خاطر کے اسباب کی شرح کردی ہے۔

بنیادی تصور:۔ کیفیت گرفتارئ خاطر۔

(۴) بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام ✽ رُخ پہ ہر قطرہ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا

قطرہ عرق بمعنی قطرۂ عرق + عرق بمعنی پسینہ + دیدۂ حیراں یعنی رقیب کی چشم حیراں + قطرۂ عرق کو دیدۂ حیراں سے تشبیہہ دی ہے۔

مطلب :۔ میری بدگمان طبیعت نے اس کا سرگرم خرام ہونا گوارا نہ کیا کیونکہ چلنے سے اسے پسینہ آیا۔ اور اس کے قطرے اس کے چہرے پر جم گئے۔ تو میں نے ہر قطرے کو رقیب کی چشم حیران سمجھا کہ اُس کے چہرے پر جم کر رہ گئی ہے۔

بنیادی تصور:۔ عشق است وہزار بدگمانی۔

(۵) عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ✽ نبضِ خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

یہ شعر غالب کے مشکل ترین مگر بغایت معنی آفریں اشعار میں سے ہے۔ لفظ عجز اس شعر کی کنجی ہے اس سے مراد ہے محبوب کو خوش کرنے سے عاجز ہونا۔

مطلب :۔ پہلے مصرع میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ دراصل محبوب بدخو نہیں ہے مگر ہم اس کو اس لئے بدخو سمجھتے ہیں کہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے سے عاجز ہیں۔ یعنی ہمارے اندر اسے خوش کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

دوسرا مصرع بطور تمثیل موزوں کیا ہے کہ دیکھو! نبضِ خس بہت کمزور (عاجز) ہوتی ہے یعنی اس میں شعلہ کو ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہوتی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ شعلہ بہت تیزی اور شدّت سے بھڑکتا ہے۔ اگر خس۔ (تنکے) میں شعلہ کی حدت و حرارت کو کم کرنے کی صلاحیت ہوتی۔ اگر اس میں شعلہ کو منتہب ہونے سے روکنے کی طاقت ہوتی، تو شعلہ میں تپش بھی پیدا نہ ہوتی۔ کس قدر بلند پایہ اور ندرت آمیز مضمون نظم کیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اعتراف تقصیر خدمت۔

(۶) سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ❊ ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

مطلب:۔ یہ بھی بہت بلند پایہ شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ در حقیقت سفرِ عشق کبھی طے نہیں ہوتا۔ بقول اقبال:۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی ❊ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

مگر انسان اپنی پستیٔ ہمت کی وجہ سے مراحل سفر میں سے کسی مرحلہ (سایہ) کو منزل مقصود (شبستان) سمجھ لیتا ہے اور جدوجہد ختم کر دیتا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ راحت طلبی (جمود) نتیجۂ ضعف (پستی ہمّت) ہے۔

(۷) تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ❊ دفعِ پیکانِ قضا اسقدر آساں سمجھا۔

پیکانِ قضا کنایہ ہے مژۂ یار سے۔ پیکاں اور مژہ میں مناسبت ظاہر ہے۔

مطلب:۔ میں تا دمِ آخر، مژگانِ یار سے بچنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ مژۂ یار تو پیکانِ قضا ہے اور تیرِ قضا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ میرا دل بھی کس قدر ناداں تھا کہ حصولِ جمال کے لئے جدوجہد میں مشغول رہا!

بنیادی تصوّر:۔ تاثیر مژۂ یار۔

(۸) دل دیا جان کے اسکو وفادار اسدؔ ❊ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

مطلب:۔ معشوق کو وفادار سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی کافر کو مسلمان سمجھ لینا! کافر تو خدا سے بھی وفا نہیں کرتا تو میں کس شمار و قطار میں ہوں!۔

بنیادی تصورہ۔ ماتم بے وفائی معشوق۔۱۲

(۳۶۶)

(۱) پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ⁂ دِل، جگر تشنۂ فریاد، آیا

جگر تشنہ کلمۂ مبالغہ ہے یعنی بغایت تشنہ مراد ہے متمنیٔ فریاد + جگر تشنۂ فریاد، دل کی خبر ہے + آیا فعل ناقص ہے بمعنی ہوا + دیدۂ تر یاد آنا کنایہ ہے ناگزیریٔ گریہ سے +

مطلب :۔ میرا دل فریاد کرنے کے لئے اُمنڈا چلا آرہا ہے پھر رونا ناگزیر ہو گیا یعنی پھر وہی مصیبت کی گھڑی آتی معلوم ہوتی ہے۔

بنیادی تصورہ۔ ہجوم غم۔

(۲) دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ⁂ پھر ترا وقت سفر یاد آیا۔

دم لیا یعنی سکون ہُوا + دم لینا بمعنی توقف کرنا یا ٹھہرنا + قیامت کنایہ ہے اضطراب جدائی سے + جب محبوب جُدا ہُوا تو غالب پر قیامت گذر گئی۔ اس جدائی کی تکلیف کو قیامت سے تعبیر کیا ہے +

مطلب :۔ حالی مرحوم کہتے ہیں۔ دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعراء اردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ جس سے بہتر کسی اسلوبِ بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔ (یادگار غالب صـ۱۱۶)

خلاصۂ کلام اینکہ غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابھی جُدائی کے اضطراب میں کمی ہونے نہیں پائی تھی کہ پھر تیرا وقت سفر یاد آگیا۔ اور پھر مجھ پر وہی قیامت

گذر گئی جو تجھے رخصت کرتے وقت گذری تھی۔

بنیادی تصور:۔ شدت درد وجدائی۔

(۳) سادگی ہائے تمنا، یعنی ؛ پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا۔

نیرنگِ نظر کنایہ ہے محبوب سے۔

مطلب:۔ تمنا کی خاصیت یہ ہے کہ ناکامیوں کے باوجود انسان تمنا کرنے سے باز نہیں آتا۔ اس حقیقت کو غالب نے اِس طرح واضح کیا ہے کہ مجھ کو دیکھو! ہر چند کہ وصالِ محبوب ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی اس کو یاد کئے جا رہا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ خام خیالئ بشر۔

(۴) عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل ؛ نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا۔

پہلے مصرعہ کی نثر یوں ہوگی:۔ اے حسرتِ دل! میرا عذرِ واماندگی قبول کر +

مطلب:۔ چونکہ دلِ نالہ کشی کا آرزومند تھا۔ اس لئے غالب اس سے خطاب کرتے ہیں کہ اے دل! میں تیرے سامنے اپنی عاجزی کا عذر پیش کرتا ہوں۔ یعنی نالہ کرنے سے معذور ہوں۔ کیونکہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں نالہ کروں گا تو میرا جگر شق ہو جائے گا۔

بنیادی تصور:۔ بیان شدت نالہ و فریاد۔

(۵) زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی ؛ کیوں ترا راہگذر یاد آیا

مطلب:۔ ہم ناحق تیری رہ گذر میں (تیرے کوچہ میں) ٹھوکریں کھانے کے لئے آپڑے۔ یہاں اگر بھی تیرے در تک رسائی نہ ہو سکی۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ یہاں نہ آتے۔ زندگی اپنے گھر رہ کر بھی گذر ہی جاتی۔ یہاں آکر کیا فائدہ ہوا جب تجھ تک رسائی نہ ہو سکی تو تیرا کوچہ اور اپنا گھر دونوں برابر ہو گئے۔

بنیادی تصوّر:۔ تصویرِ ناکامی۔

(۶) کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ٭ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا۔

مطلب:۔ رضواں بہشت کی تعریف کرے گا۔ میں تیرے گھر کو بہشت پر ترجیح دوں گا۔ لڑائی یقینی ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ محبوب کا گھر جنّت سے بہتر ہے۔

(۷) آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں! ٭ دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی:۔ آہ! دل میں جگر کی سی جرأتِ فریاد کہاں!

مطلب:۔ افسوس ہے کہ میرے دل میں جگر کی سی طاقت فریاد نہیں ہے اسلئے جب میں نے دیکھا کہ دل سے کام نہیں چلتا۔ تو مجھے اپنا جگر یاد آیا (مگر افسوس کہ وہ تو پہلے ہی خون ہو چکا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ ماتم دل و جگر۔

(۸) پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال ٭ دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

مطلب:۔ چونکہ ہم اپنا دل تیرے کوچہ میں کھو بیٹھے ہیں۔ اس لئے بار بار تیرے کوچہ کا خیال آتا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ یادِ دلِ گم گشتہ۔

(۹) کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ٭ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے" (یادگار غالب ص ۱۷۱)

جناب اثرؔ لکھنوی نے تیسرا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ "مجھے وحشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی جو گھر سے زیادہ ویران ہو۔ لہذا دشت کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ تو میرا گھر ہی ویران تھا۔" (مطالعۂ غالب ص ۵۷)

بنیادی تصور:۔ میرا گھر صحرا سے بھی زیادہ ویران ہے۔

(۱۰) میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ ✽ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مطلب:۔ میں نے لڑکپن میں مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اُٹھایا تھا کہ مجھے اپنا سر یاد آگیا۔ یعنی میں نے یہ سوچا کہ آگے چل کر میرا بھی یہی حال ہونا ہے میں بھی جوانی میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ اور لڑکے اسی طرح میرے بھی پتھر ماریں گے۔ یہ سوچ کر میں اس فعل سے باز رہا۔

بنیادی تصور:۔ عاشقی میری سرشت میں داخل ہے۔

---

(۳۷)

(۱) ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ✽ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

مطلب:۔ آپ وقت مقررہ سے کچھ دیر کے بعد میرے پاس آئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں رقیب آپ کو مل گیا اور اُس نے آپ کو روکنے کی کوشش کی۔

بنیادی تصور:۔ عشق است و ہزار بدگمانی۔

(۲) تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ✽ اِس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

شائبہ بمعنی آمیزش یا ملاوٹ + خوبیٔ تقدیر۔ شومیٔ تقدیر (بد بختی) کو ازراہِ طنز خوبیٔ تقدیر سے تعبیر کیا ہے +

مطلب:۔ میں تم کو اپنی بربادی کا ملاّ ذمہ دار قرار نہیں دیتا کیونکہ اس میں بڑی حد تک میری بد قسمتی کو بھی دخل ہے۔

بنیادی تصوّر :۔ شوئ تقدیر۔

(۳) تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلادوں ٭ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

فتراک بمعنی شکاربند + نخچیر بمعنی صید یا شکار۔

مطلب :۔ اگر تو مجھے بھول چکا ہے تو میں تجھے یاد دلاتا ہوں کہ مدّت ہوئی تُو نے کسی کو شکار کر کے اپنے فتراک سے باندھ لیا تھا۔ میں وُہی تو ہوں۔

بنیادی تصور :۔ ایک مُدّت سے اسیر زلف ہوں۔

(۴)
قید میں ہے ترے وحشی کو وُہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

زلف کا لفظ دانستہ لائے ہیں۔ کیونکہ عاشق ہمیشہ اسیر زلف ہوا کرتا ہے۔

رنج بمعنی اذیت + رنج گرانباریٔ زنجیروں کے بوجھ سے جسمانی اذیت کا احساس ٭

مطلب :۔ یہ سچ ہے کہ زنجیروں کے بوجھ سے مجھے کسی قدر جسمانی اذیت بھی محسوس ہوتی ہے مگر وہ قلبی اذیت اس سے بہت بڑھ کر ہے جو تیری زلفوں کی یاد میں ہو رہی ہے۔

بنیادی تصوّر :۔ شدّتِ اذیت فراق۔

(۵)
بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

بجلی کوند گئی۔ کنایہ ہے محبوب کی ایک جھلک سے + لب تشنۂ تقریر یعنی گفتگو کا آرزومند +

مطلب :۔ انہوں نے صرف اپنی ایک جھلک مجھے دکھادی تو اس سے مجھے کچھ تسلی نہیں ہوئی۔ مزہ تو جب تھا کہ وُہ دو گھڑی میرے پاس بیٹھتے۔ تاکہ میں

اُنہیں دل بھر کے دیکھتا۔ اور اُن کی گفتگو سے لُطف اندوز ہوتا۔

اگر مزید غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں غالب نے اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کا قائم مقام فرض کر کے خُدا سے (ازراہِ شوخی) یہ کہا ہے کہ محض تیری ایک جھلک دیکھ لینے سے تو مجھے تسلّی نہیں ہو سکتی۔ مَیں تو تجھ سے ہمکلامی کا آرزومند تھا۔ قرینہ اس تعبیر پر یہ ہے کہ فی الحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظروں کے سامنے ایک بجلی ہی تو کوند گئی اور وہ بیہوش ہو گئے تھے۔

بنیادی تصور:۔ آرزوئے ہمکلامیٔ محبوب۔

یُوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی
(۶) گر بگڑ بیٹھے تو مَیں لائقِ تعزیر بھی تھا

مطلب:۔ مَیں نے کہنے کو تو اسے یُوسف کہہ دیا مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ بات سُن کر وہ ناراض نہیں ہُوا۔ اگر وہ اپنی نسبت یہ کلمہ سُن کر مجھ سے بگڑ بیٹھتا کہ تم نے مجھے یُوسف کہہ کر میری توہین کی ہے۔ کہاں مَیں، کہاں یوسف! (یعنی میں تو یُوسف سے بدرجہا زیادہ حسین ہوں) تو مَیں یقیناً لائقِ تعزیر (مستوجب سزا) تھا۔

یہ شعر اسلوب بیان اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہے ایسے دلکش انداز سے محبوب کو حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی زیادہ حسین ثابت کیا ہے!

بنیادی تصور:۔ فوقیتِ محبوب بر حسینانِ عالم۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
(۷) نالہ کرتا تھا وے طالبِ تاثیر بھی تھا

"نالہ کرتا تھا" اِس جملہ میں "غیر" محذوف ہے۔

مطلب:۔ مَیں نے فراق یار میں بہت دِنوں تک نالے کئے مگر تاثیر نہ ہونے

کی وجہ سے بہت رنجیدہ رہا کرتا تھا۔ لیکن جب غیر کو اس حال میں دیکھنے کا اتفاق ہُوا کہ وہ بھی نالے کر رہا تھا مگر اس کے نالوں میں بھی اثر نہ تھا تو میرا کلیجا ٹھنڈا ہُوا۔

بنیادی تصور:۔ ناکامیٔ رقیب پر اظہارِ مسرت۔

پیشے میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام
(۸)
ہم ہی آشفتہ سروں میں وُہ جواں میر بھی تھا

نام رکھنا یعنی عیب لگانا یا اعتراض کرنا + جواں میر بمعنی جسے جوانی میں موت آجائے۔

مطلب:۔ کسی قسم کا پیشہ اختیار کرنے سے ذات میں بٹہ نہیں لگ سکتا۔ یہ مانا کہ فرہاد پیشہ کے اعتبار سے سنگ تراش تھا۔ لیکن محض اس بناء پر اُس کو زمرۂ عشاق سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ عاشقِ صادق، خواہ وہ پیشہ کے لحاظ سے کچھ ہی کیوں نہ ہو، بہر حال لائقِ احترام ہے۔

بنیادی تصور:۔ عشق نہ جانے ذات کُذات۔

ہم مٹنے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا نہ سہی
(۹)
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

مطلب:۔ اگر قاتل کو ہمارے قریب آکر (تلوار سے) قتل کرنے میں اپنی ذلت یا توہین محسوس ہوتی تھی۔ اگر اُسے یہ خیال تھا کہ میں غالب کے پاس کیوں جاؤں؟ تو کیا اُس کے ترکش میں کوئی تیر بھی نہیں تھا؟ مطلب یہ کہ وہ مجھے دور سے بھی قتل کر سکتا تھا۔ لہذا معلوم ہُوا کہ دراصل وہ میری آرزو پُوری کرنی ہی نہیں چاہتا تھا۔

بنیادی تصور:۔ شکوۂ بے اعتنائی قاتل۔

(۱۰) پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ٭ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

مطلب :۔ شوخی اور ظرافت کے اعتبار سے بے مثل شعر کہا ہے۔ یہ اُن اشعار میں سے ہے جن کا مطلب بیان کرنے سے شعر کی معنویّت کا خون ہو جاتا ہے۔

کیا ٹھکانا ہے اس شوخی کا کہ غالب خدا سے کہہ رہے ہیں کہ دمِ تحریر ہمارا بھی کوئی آدمی موجود تھا؟ یہ تو محض یکطرفہ کارروائی ہوئی۔ اور سب جانتے ہیں کہ فریقِ ثانی کا بیان سُنے بغیر سزا دے دینا، قرینِ انصاف نہیں ہے۔

بنیادی تصوّر :۔ کارکنانِ قضاء و قدر (خدا) سے چھیڑ چھاڑ مقصود ہے۔

(۱۱) ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب ❊ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

مطلب :۔ دراصل اس شعر میں غالبؔ نے اپنی قادر الکلامی (اُستادی) کا دعویٰ کر کے خودستائی کی ہے۔ مگر طرزِ ادا ایسی دلکش اختیار کی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن میرؔ کی عظمت کے اعتراف کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور غالب کا دامن خودستائی کے عیب سے پاک رہتا ہے۔

بنیادی تصوّر :۔ ادعائے اُستادئ خویش۔

---

(۳۸)

(۱) لبِ خشک، در تشنگی مُردگان کا ❊ زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

پہلے مصرع کی نثر یوں ہو گی :۔ مَیں، در تشنگی مُردگاں کا لبِ خشک ہوں لبِ خشک کنایہ ہے افسردگی اور پژمُردگی سے۔ اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ہونٹوں سے تشبیہ دی ہے جو پیاس کی شدّت سے مر گئے۔ یہ تشبیہ اپنی صراحت کی وجہ سے بہت دلکش ہو گئی ہے + دل آزردگاں کنایہ ہے عشّاق سے + زیارت کدہ ہوں یعنی تمام عشاق مجھے بنظرِ احترام دیکھتے ہیں۔ اس لفظ کے ذریعہ سے عشاق پر درپردہ اپنی فضیلت ثابت کر دی +

مطلب :۔ تصریحاتِ مذکورہ بالا کے بعد اب مضمون میں کوئی خفاء باقی نہیں رہا

یعنی مَیں اتنا افسردہ اور ملول ہوں کہ دنیا میں جس قدر آزردہ دل اور افسردہ خاطر لوگ ہیں وُہ سب میری زیارت کو آتے ہیں !

بنیادی تصور :- غایتِ افسردگیٔ خاطر-

(۲) ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی ٭ میں دل ہوں فریبِ وفاخوردگاں کا

فریبِ وفاخوردگان - وہ لوگ جنہوں نے محبوب سے وفا کی مگر اس کا کچھ صلہ نہ پایا۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو اس کی وفا کا کوئی صلہ نہ ملے وہ مجسّم مایُوسی اور بدگمانی بن جاتا ہے -

مطلب :- میں سراپا ناامیدی اور بدگمانی ہوں - دُوسرے لفظوں میں یُوں سمجھو کہ مَیں فریب وفا کھائے ہوئے لوگوں کا دل ہوں - جو مایُوسی اور بدگمانی سے معمور ہے -

جس طرح پہلے شعر میں اظہارِ افسردگی کے لیے اپنے آپ کو "لبِ خشک" سے تشبیہہ دی ہے - اسی طرح اس شعر میں اظہارِ مایوسی کے لیے اپنے آپ کو فریبِ وفا خوردگاں کا "دل" قرار دیا ہے -

بنیادی تصور :- انتہائے مایوسی و بدگمانی -

---

(۳۹)

(۱) تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہُوا تھا ٭ اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہُوا تھا

دوسرے مصرع کو یوں پڑھنا چاہیئے :- اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اس کی نثر یُوں ہوگی"- وہ ظلم جو مجھ پر ہے، اوروں پر نہ ہُوا تھا - یہی نثر اس شعر کا مطلب ہے یعنی تُو نے یُوں تو کسی کو نہیں چھوڑا - مگر مجھ پر سب سے زیادہ ظلم کئے ہیں -

بنیادی تصوّر :- گلہ جفائے محبوب -

(۲) چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ٭ خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

ماہِ نخشب میں تلمیح ہے اس چاند کی طرف جسے حکیم ابن عطا المعروف با بن مقنع نے بنایا تھا۔ یہ چاند شام کے وقت ایک کنویں سے نکلا کرتا تھا لیکن اس کی روشنی بارہ میل سے آگے نہیں جاتی تھی اور قدرتی چاند کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ دو تین ماہ کے بعد ناکارہ ہو گیا۔ نخشب ترکستان میں ایک قصبہ ہے۔ اس قصبہ سے چند میل کے فاصلہ پر کوہ سیام واقع ہے جس کے دامن میں وہ کنواں ہے جہاں سے وہ چاند نکلا کرتا تھا۔ چھوڑا یعنی ناتمام چھوڑ دیا۔ برابر نہ ہوا یعنی حسن و جمال کے اعتبار سے اُس کا مدِ مقابل نہ ہوا۔

مطلب :- مولانا حالی فرماتے ہیں کہ "اس شعر میں آفتاب کو اِس لحاظ سے کہ وہ حسنِ محبوب کے مقابلہ میں ناقص ہے، ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔" یعنی جب کارکنانِ قضا و قدر نے یہ دیکھا کہ ہماری انتہائی کوشش کے باوجود "خورشید" حسن و جمال کے اعتبار سے، غالبؔ کے محبوب کا مدِ مقابلہ نہیں بن سکے گا تو اُنھوں نے اسے یونہی ناتمام (ناقص الخلقت) چھوڑ دیا۔

بنیادی تصور :- تنقیصِ خورشید بمقابلۂ حسنِ محبوب۔

(۳) توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ٭ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

مطلب :- حالی مرحوم فرماتے ہیں "بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہمت جس قدر عالی ہوتی ہے، اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے، اگر اُس کی ہمت، جبکہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو، جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کی عزت حاصل

نہ ہوتی۔" (یادگارِ غالب ص۱۰۹)

بنیادی تصور :۔ برتریٔ اشک بر گوہر۔

(۴) جبتک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ؛ مَیں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہُوا تھا

قامتِ یار (قدِ یار) کو قیامت (فتنۂ محشر) سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب :۔ پہلے میں یہ خیال کرتا تھا کہ مُردے زندہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے میں وقوعِ قیامت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جب مَیں نے یہ دیکھا کہ محبوب کی چال سے مُردے زندہ ہو گئے تو مجھے یقین آگیا کہ قیامت برحق ہے۔ یعنی مُردے زندہ ہو سکتے ہیں۔

یا بالفاظِ دگر، جب اس کی چال سے ایک حشر برپا ہو گیا۔ تو مجھے یقین آگیا کہ فتنۂ محشر کا برپا ہونا بھی ممکن ہے۔

بنیادی تصور :۔ محشر خرامیٔ محبوب۔

(۵) میں سادہ دل، آزردگیٔ یار سے خوش ہوں ؛ یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا!

سادہ بمعنی سادہ لوح + سبق کی رعایت سے مکرّر کا لفظ لاتے ہیں۔ کیونکہ عربی مدارس کے طلبہ اب بھی پچھلا سبق آپس میں دُہرانے کو اپنی اصطلاح میں تکرارِ سبق کہتے ہیں۔

مطلب :۔ میری سادگی (نادانی) قابلِ دید ہے کہ میں محبوب کی ناراضگی سے خوش ہوں۔ کیونکہ یہ سمجھتا ہوں یعنی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ جب چند روز کے بعد صلح صفائی ہو جائے گی۔ تو دوبارہ اظہارِ عشق اور تجدیدِ محبّت کا موقع ملے گا۔ (سبقِ شوق کی تکرار کروں گا) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا موقع کبھی نہیں آئے گا۔

بنیادی تصور :۔ بیانِ سنگدلیٔ محبوب۔

(۶) دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک ٭ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی۔ گناہوں کا دریا + تنک آبی سے یعنی پانی کی کمی سے + لفظی خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ محاورے میں گنہ گار کو" تر دامن کہتے ہیں۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو ٭ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

مطلب :۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ" کہتا ہے کہ گناہ کرتے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا۔ یعنی جتنے گناہ ممکن ہو سکتے تھے سب کئے مگر ابھی تک دل نہیں بھرا۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ ذوقِ معصیت ۔

(۷) جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل ٭ آتشکدہ، جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

جاگیر کی رعایت سے تحصیل کا لفظ لائے ہیں۔ کیونکہ جاگیر کی آمدنی کو تحصیل کہتے ہیں + تحصیل از داغِ جگر کنایہ ہے سوز و تپ عشق سے + سمندر، آگ کے کیڑے کو کہتے ہیں +

مطلب :۔ واضح ہو کہ اس شعر میں شاعر نے نہایت مبالغہ آمیز تشبیہ سے کام لیا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ یہ سانپ، سانپ نہیں ہے بلکہ زُلفِ محبوب ہے۔ اسی طرح شاعر یہ کہتا ہے کہ آتشکدہ، جاگیر سمندر نہیں ہے بلکہ داغِ جگر سے مری تحصیل جاری ہے۔ یعنی خود میری کیفیت اس سمندر کی مانند ہے جو آتشکدہ سے تب و تاب حاصل کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر شاعر نے کمال تشبیہ کی بناء پر مشبہ کو عین مشبہ بہ قرار دے دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ آتشکدہ، سمندر کی جاگیر ہے، غلط ہے۔ بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ میں داغ جگر سے تحصیلِ سوزِ عشق کر رہا ہوں۔

بعض نسخوں میں پہلا مصرع یُوں ہے :۔

جاری تھی اسد داغِ جگر سے مرے تحصیل

اس صُورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ابھی آتشکدہ، جاگیر سمندر نہیں ہُوا تھا کہ لوگ مرے داغِ جگر سے تحصیل تب وتاب کر رہے تھے۔ بالفاظِ دگر جس طرح سمندر آتشکدہ سے اب استفادۂ سوزش کر رہا ہے۔ اسی طرح لوگ میرے داغِ جگر سے قبل ازاں مستفید ہو رہے تھے۔

بنیادی تصور :۔ اذیتِ عشق۔

---

(۴۰)

(۱) شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا ٭ رشتۂ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا

خلوتِ ناموس یعنی شبستانِ شرم وحیا + رشتہ بمعنی تاگا جو موم بتی میں ہوتا ہے + کسوت بمعنی لباس + خار در پیراہن۔ فارسی محاورہ ہے۔ یعنی وہ چیز جو باعثِ خلش ہو + خارِ کسوت کنایہ ہے خلشِ پنہاں سے۔

مطلب :۔ رات جبکہ محبوب اپنی خلوت گاہِ ناز میں جلوہ افروز تھا۔ تو وہ کیفیت اس قدر دلکش اور جاذبِ نظر تھی کہ شمع کو اُس پر رشک آ رہا تھا، اور اُس کا تاگا اُس کے حق میں خارِ پیراہن بنا ہوا تھا۔

بنیادی تصور :۔ بیانِ دل افروزیٔ محبوب۔

(۲) مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا

کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پا بوس تھا

مشہد بمعنی جائے شہادت یا جائے قتل + ہلاکِ حسرتِ پا بوس یعنی محبوب کی قدمبوسی کا آرزومند۔

مطلب :۔ عاشق کے مزار سے کوسوں تک حنا اُگ رہی ہے۔ یہ اِس کا

ثبوت ہے کہ وہ قدمبوسی کی حسرت لیے ہوئے اس جہان سے رُخصت ہُوا ہے اور اب اُسکی حسرتِ دل بشکلِ حنا، ظاہر ہوئی ہے۔ یعنی اس کی خاک سے مہندی اُگ رہی ہے شاید محبوب اسے اپنے پاؤں میں لگالے تو عاشق کی حسرتِ پابوس پُوری ہو جائے!

بنیادی تصور :۔ بقائے حسرتِ عاشق۔

(۳) حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو ؛ دل بدل پیوستہ گویا اِک لبِ افسوس تھا

حاصل بمعنی نتیجہ + شکستِ آرزو بمعنی ناکامی یا خونِ تمنا + دل بہ دل پیوستہ یعنی ایک دل دوسرے دل سے ملا ہوُا۔ مراد ہے عاشق و معشوق کا دل + پیوستگی کنایہ ہے الفت باہمی سے +

مطلب :۔ ہم نے اِس دنیا میں محبت کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی ہی دیکھا۔ اگر عاشق و معشوق کا دِل پیوستہ بھی ہو جائے (مل بھی جائے)، تو انجام کار وہ دونوں دل لبِ افسوس ہی بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ افسوس کی صورت میں دونوں ہونٹ پیوستہ ہو جاتے ہیں۔

بنیادی تصور :۔ بے حاصلی جذبہ الفت۔

(۴) کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں ؛ جو کہ کھایا خونِ دل، بے منتِ کیموس تھا

بیماریٔ غم یعنی مرضِ عشق + فراغت بمعنی آسانی + کیموس۔ غذا کی وہ صورت جبکہ وہ ہضم ثانی کے بعد خون بن جاتی ہے +

اِس شعر میں غالب نے خونِ دل کھانے سے مضمون پیدا کیا ہے۔ یعنی یہ شعر ان کی مضمون آفرینی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ خونِ دل کھانا یا خونِ دل پینا کنایہ ہے غم کھانے سے۔ عاشق ہمیشہ خونِ دل پیتا رہتا ہے۔ ؎

خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو ؛ یہ غذا ملتی ہے جاناں! ترے دیوانے کو

اگر کوئی شخص غذا کھائے تو قانونِ فعلِ ہضم کے مطابق پہلے وہ غذا "کیلوس"

پھر "کیموس" کی شکل اختیار کر کے خون میں تبدیل ہو گی۔ لیکن اگر ایک شخص غذا کے بجائے خونِ دل ہی کو اپنی غذا بنائے تو پھر اسے کیموس کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت؛ غالب نے شعر کی بنیاد اسی نکتہ پر رکھی ہے۔ اور غالب اس کیفیت کو فراغت سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ ہماری غم کو عینِ فراغت قرار دیا گیا ہے۔ اور شعر کی خوبی اسی جدّت طرازی میں مضمر ہے۔ ۱۲۰

مطلب: مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ طرزِ اسلوب بیان بھی قابلِ تحسین ہے کہتے ہیں کہ جب سے مرضِ عشق لاحق ہوا ہے، کیا کہوں کیسی فراغت حاصل ہو گئی ہے یعنی اب غذا کھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صرف خونِ دل پر زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس لیے کیموس کا احسان اٹھانے سے بھی نجات مل گئی۔ کیموس کا احسان تو وہ اٹھائے جو روٹی سالن یا کسی اور قسم کی غذا کھائے! اور اس پر یہ عمل وارد ہو۔ اس شعر میں فلسفیانہ نکتہ یہ ہے کہ عشق بذاتِ خود موجبِ فراغتِ خاطر ہے۔ ۱۲۰

بنیادی تصور:۔ فراغِ خاطرِ عاشق۔

---

(۴۱)

(۱) آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے ۞ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

آئینہ دیکھ یعنی آئینہ دیکھ کر + اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے یعنی شرمندہ ہو گئے۔

مطلب:۔ محبوب دعویٰ کیا کرتا تھا کہ ہم کسی پر عاشق نہیں ہو سکتے۔ لیکن جب آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو بے اختیار اُس پر دل آ گیا۔ چونکہ دعویٰ باطل ہو گیا، اس لیے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

بنیادی تصور:۔ دلفریبیِ عکسِ رُخِ یار۔

(۲) قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے ۞ اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

قاصد کو گردن نہ ماریئے۔ یہ فارسی محاورہ "قاصد را گردن مزنند" کا اُردو ترجمہ ہے ورنہ اُردو محاورہ میں 'کو' کے بجائے 'کی' ہونا چاہیئے + "اپنے ہاتھ سے" اس ترکیب کا مطلب یہ ہے کہ عاشق اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ قاصد محبوب کے ہاتھ سے قتل ہونے کی عزت حاصل کرے۔

مطلب:۔ شعر کا مطلب بالکل واضح ہے کہ دراصل قصور میرا ہے کہ میں نے اسے آپ کے پاس بھیجا۔ اس لیے سزا بھی مجھی کو ملنی چاہیئے۔ قاصد بے گناہ ہے۔

بنیادی تصور:۔ بے گناہی قاصد +

---

(۴۲)

(۱) عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ÷ جس دل پہ ناز تھا مجھے وُہ دِل نہیں رہا

عرض بمعنی اظہار + نیاز بمعنی نیازمندی + نیاز اور ناز میں مناسبت ہے۔

مطلب:۔ بیوفائی کے صدمے اس قدر اُٹھائے کہ دل شکستہ ہو گیا۔ اس لیے اب اتنی ہمت ہی باقی نہیں کہ عاشقی کا دعویٰ کر سکوں۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ عالمِ مایوسی۔

(۲) جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے ÷ ہُوں شمعِ کُشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

داغِ حسرت یعنی حسرت + حسرتِ ہستی یعنی زندگی یا دُنیا میں زندہ رہنے اور کامیابی حاصل کرنے کی آرزو + شمع کشتہ۔ بجھی ہوئی شمع + درخورِ محفل یعنی محفل کے لائق +

مطلب:۔ دل میں بڑی بڑی آرزوئیں تھیں کہ عشق میں کامیابی ہو گی، محبوب کا وصل ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ مگر افسوس کوئی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اب داغِ حسرت لے کر دُنیا سے جا رہا ہوں۔ میری مثال شمع کشتہ کی سی ہے۔ جب شمع بجھ جاتی ہے تو لوگ اسے محفل سے خارج کر دیتے ہیں۔

بنیادی تصوّر:۔ داغِ حسرتِ ہستی۔

(۳) مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ٭ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

مطلب:۔ میں ہجر کے صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اس قدر نحیف و ناتواں ہو گیا ہوں کہ قاتل مجھ جیسے نیم جاں کو قتل کرنا اپنی توہین سمجھے گا۔ اور اس کے عشق میں جان دینی بہر حال ضروری ہے، اس لیے اے دِل اب تو مرنے کی کوئی اور تدبیر کر۔

بنیادی تصوّر:۔ شدّتِ ناتوانی۔

(۴) بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے ٭ یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

بر رُوئے شش جہت یعنی کائنات کی ہر شئے کے لیے + آئینہ سے قلبِ غالب مراد ہے + یاں یعنی میرے نزدیک +

مطلب:۔ غالب اپنی باطنی کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں کہ عشقِ حقیقی نے میرے زاویۂ نگاہ میں اس قدر وسعت پیدا کر دی ہے کہ میرے نزدیک ناقص اور کامل میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ یعنی میرے دل میں ہر شخص کے لیے جگہ ہے خواہ وہ ناقص ہو یا کامل (کافر ہو یا مومن) گویا میرا دِل ایسا آئینہ ہے جس کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہُوا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ ع آزادہ رو ہوں اور مرا مشرب ہے صلحِ کل

اگر آئینہ سے آئینہ فطرت یا نظامِ قدرت مُراد لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ فطرت ناقص اور کامل میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ہر شخص کو اپنی تصویر جیسی ہے ویسی ہی نظر آ سکتی ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق مستفید ہو سکتا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ عمومیتِ فیضانِ فطرت۔

(۵) وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن ٭ غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

نگاہ کنایہ ہے خودی یا ذاتِ عاشق سے۔
مطلب:۔ عشق نے حسن کے چہرے (ذاتِ محبوب) سے نقاب کے سارے بند کھول دئے ہیں۔ یعنی تمام حجاب دُور کر دئے ہیں۔ صرف نگاہ کا پردہ باقی رہ گیا ہے۔ پردۂ نگاہ کنایہ ہے ذاتِ عاشق سے یعنی اب عاشق اور معشوق میں صرف عاشق کی ذات حائل ہے۔ خواجہ حافظ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست ٭ تو خود حجاب خودی حافظؔ از میاں برخیز

بنیادی تصور:۔ مجھ میں اور یار میں بس میری خودی حائل ہے

میں جو اٹھ جاؤں تو پردہ کوئی باقی نہ رہے (تسلیم)

(۶) گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار ٭ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مطلب:۔ اگرچہ میں دُنیا جہان کی مصیبتوں میں گرفتار رہا۔ اس کے باوجود تجھے کبھی نہیں بھُولا۔ یعنی تیری یاد میرے دل سے کسی حال میں بھی نہیں گئی۔

رہین بمعنی گروی رکھی ہوئی چیز۔ ۱۲

بندش اور مضمون دونوں کے اعتبار سے بہت بلند پایہ شعر ہے۔ اِسی لیے ضرب المثل ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ استوارئ یادِ جاناں۔

(۷) دِل سے ہوائے کشتِ وفا مِٹ گئی کہ واں ٭ حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

ہوا بمعنی آرزو ٭ واں بمعنی کشتِ وفا میں ٭ حاصل کی رعایت سے کشت کا لفظ لائے ہیں ٭ کشت بمعنی کھیتی۔ اور حاصل وُہ شئے جو کھیتی سے حاصل ہو مثلاً غلّہ ٭ پہلے حاصل کا معنی ہے نتیجہ۔ اور دوسرے حاصل کا معنی ہے محاصل یا خرمن یا پیداوار ٭

مطلب:۔ چونکہ وفا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہُوا۔ اِس لیے اب دِل سے

وفا کی آرزو ہی نکل گئی۔

بنیادی تصور :- ع یہ ہے وُہ لفظ کہ شرمندۂ معنیٰ نہ ہُوا

(۸) بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ ؎ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دِل نہیں رہا

مطلب :- مَیں اُن مصائب سے تو نہیں ڈرتا جو راہِ عشق میں لازمی طور سے پیش آیا کرتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ میرے دل میں اُن مصائب کے برداشت کرنے کی طاقت اور ہمت نہیں رہی۔

بنیادی تصور :- بیانِ افسردگیٔ خاطر۔

---

(۱۴۲)

(۱) رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف ؎ عقل کہتی ہے کہ وُہ بے مہر کس کا آشنا

مطلب :- جب مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ غیروں سے محبت کا برتاؤ کرتا ہے تو جذبۂ رشک کی بناء پر مجھے بہت رنج ہوتا ہے یعنی اس کے اِس طرزِ عمل پر بہت افسوس کرتا ہوں۔ لیکن عقل مجھے تسلّی دیتی ہے کہ افسوس مت کر۔ وہ بے مہر کسی کا بھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ غیر سے اس کا یہ طرزِ عمل محض چند روزہ ہے۔

بنیادی تصور :- بے مہریٔ محبوب۔

(۲) ذرّہ ذرّہ، ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے ؎ گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

نیرنگ کنایہ ہے کائنات (عالم) سے۔ عالم کو نیرنگ اِس لیے کہا کہ نیرنگ کہتے ہیں فریب یا طلسم کو جس کی محض نمود ہوتی ہے، کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور اس عالم کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ محض ایک نمودِ بے بود ہے + نیرنگ کو میخانہ قرار دیا تاکہ ساغر کا تلازمہ قائم ہو سکے۔ اور ساغر کا لفظ اس لیے لائے کہ ذرات کی گردش کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ کیونکہ ساغر ہر وقت گردش میں رہتا ہے۔

مطلب یہ نکلا کہ کائنات کا ہر ذرّہ، معشوقِ حقیقی کے اشاروں پر گردش کر رہا

ہے + دُوسرے مصرع میں پہلے مصرع کے مضمون کو مثال سے واضح کیا ہے +
مطلب:- جس طرح مجنوں کی ہر حرکت (پوری زندگی) لیلیٰ کی مرضی کے تابع تھی.
اسی طرح یہ کائنات یا اس کا ہر ذرہ، محبوب حقیقی کی مشیئت (مرضی) کے تابع
ہے۔

اگر اس شعر کی سائنٹفک توجیہہ مطلوب ہو تو یوں سمجھو کہ ہر ذرہ مرکب ہے
الیکٹران اور پروٹان سے اور یہ الیکٹران (برق پارے) نہایت سرعت کے
ساتھ پروٹان (PROTON) کے گرد گھوم رہے ہیں۔ سائنس ان کی گردش کی وجہ
نہیں بتا سکتا۔ صوفیائے کرام نے اپنے وجدان سے اس کی وجہ معلوم کی ہے کہ
یہ گردشِ پیہم (رقصِ مسلسل) عشق کا کرشمہ ہے ؎

دور گردوں راز فیضِ عشق داں
گر نبودے عشق، بفسردے جہاں (رومی)

بنیادی تصور:- گیرائی مشیت ایزدی۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ، صحرا دستگاہ و قطرہ، دریا آشنا

شوق بمعنی عشق + ساماں طراز بمعنی باعث + اربابِ عجز بمعنی عشاق +
مطلب:- عشاق اپنی حقیقت کے اعتبار سے سراپا عجز ہیں۔ ان میں بذاتِ
خویش کوئی طاقت نہیں ہے لیکن عشق ان کے لیے باعثِ فخر و ناز بن جاتا ہے
یعنی اسی کی بدولت ان میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اندر
معشوق کی صفات پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً عشق کی بدولت ذرہ میں صحرا کی اور
قطرے میں دریا کی وسعت پیدا ہو جاتی ہے یا ذرہ، صحرا کو اور قطرہ دریا کو اپنی
آغوش میں لے لیتا ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ انسان، بذاتِ خود بہت حقیر اور عاجز ہستی ہے بلکہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ لیکن عشق کی بدولت وہ خدا سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

بنیادی تصور :- یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرے میں سمندر ہے، ذرّے میں بیاباں ہے (اصغر مرحوم)

(۴) مَیں اور اِک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا!

"مَیں" کے بعد لفظ "ہوں" محذوف ہے + آفت کا ٹکڑا کنایہ ہے دلِ وحشی سے،
مطلب :- مجھے عشق میں اُس دلِ وحشت طلب سے پالا پڑا ہے جو راحت اور سکون کا دشمن ہے اور ہر وقت صحرا نوردی کا طالب ہے۔ اندریں حالات مجھ پر جو مصیبت بھی آئے، کم ہے۔

بنیادی تصور :- بیانِ عافیت دشمنیٔ دِل۔

(۵) شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

مطلب :- غالب محبوب سے کہتے ہیں کہ نہ تجھ کو میرے محوِ رنج والم رہنے پر شکوہ کرنا چاہیئے اور نہ مجھے تیرے محوِ زیب وزینت رہنے کی شکایت کرنی چاہیئے کیونکہ یہ دونوں باتیں عشق اور حُسن کے لوازمات میں سے ہیں۔

بنیادی تصور :- محبوب کی بے التفاتی پر لطیف طنز ہے۔

(۶) ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں یعنی شیرازۂ وحشت ہیں مربوط یا ایک سلکِ وحشت

میں مسلک ہیں + اجزا کی رعایت سے شیرازہ کا لفظ لائے ہیں۔ اجزائے کتاب کی شیرازہ بندی سے کوئی ورق جلد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ تمام اوراق آپس میں مربوط ہو جاتے ہیں۔ شعراء کا قاعدہ ہے کہ وہ سبزہ کو بیگانہ، صبا کو آوارہ اور گل کو نا آشنا باندھا کرتے ہیں۔ غالبؔ نے شعراؔ کی ان وضع کردہ مصطلحات سے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی اجودتِ طبع سے کام لے کر ایک نکتۂ عجیبہ پیدا کیا ہے۔ غالبؔ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ان کے اِس قول کی تصدیق کرنی پڑتی ہے کہ شاعری مضمون آفرینی کا دوسرا نام ہے۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اجزائے بہار میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اگر ہے تو ربط آشفتگی کہ اس میں سب شریک ہیں۔ دیکھ لو! سبزہ بیگانہ ہے، صبا آوارہ ہے گل نا آشنا ہے واضح ہو کہ بیگانگی، آوارگی اور نا آشنائی یہ سب آشفتگی کے کرشمے یا اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ خلاصۂ کلام اینکہ ساری دنیا پریشان ہے

ع جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

بنیادی تصور:۔ ہمہ گیری آشفتگی۔

(۷)
کوہکن، نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

کوہکن یعنی فرہاد کو ہکنی اس کا پیشہ تھا، نقاش بمعنی مصوّر + تمثال بمعنی تصویر آشنا بمعنی محبوب۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ فرہاد محض ایک مصوّر تھا۔ اگر وہ عاشقِ کامل ہوتا تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی کہ پتھروں سے سر پھوڑنے سے محبوب نہیں ملا کرتا۔ اس کے لئے جذبِ کامل درکار ہے۔ بالفاظِ دگر، اگر وہ عاشقِ صادق ہوتا تو ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

بنیادی تصور :- جذب کامل، شرطِ حصولِ مقصد ہے۔

(۴۴)

(۱) ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ؛ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مطلب :- حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشین تھا۔ وہی شخص تعریف سن کر میرا رقیب بن گیا۔ کیونکہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ سے جادو بیان کی زبان سے۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی "اور پھر بیان اپنا"، سارے شعر کی جان ہے جس کی خوبی ذوق سلیم کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور :- دلکشیٔ حُسنِ محبوب۔

(۲) مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب ؛ آج ہی ہُوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

مطلب :- اگر وہ بزم غیر میں شریک ہوتے تو اس کثرت سے شراب نہ پیتے۔ لیکن میری بد قسمتی دیکھو کہ میرے گھر آئے تو انہیں اپنے ظرف کا امتحان لینے کی سوجھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کثرت سے شراب پی کہ بیہوش ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ لطفِ صحبت ہی ختم ہو گیا۔ کس خوبی سے محبوب کی عنایت میں ستم کا پہلو دکھایا ہے۔

بنیادی تصور :- شوخیٔ تقدیر۔

(۳) منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ؛ عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

منظر بمعنی مطمح نظر یا وہ جگہ جس پر نظر ڈالی جائے + عرش سے اُدھر یعنی عرش سے پرے یا عرش سے بالاتر + اپنا مکان عرش سے اوپر ہوتا یعنی کاش ہمارا تصور عرش تک محدود نہ ہوتا + مکان بمعنی رسائی تخیل +

مطلب :- ہم ابھی تک عرش تک پہنچے ہیں یعنی خدا کے متعلق ہمارے تصور

کی پرواز ابتک یہ ہے کہ وہ عرش پر متمکن ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ ہمارا تصور ذاتِ باری کے متعلق، عرش کی حدود سے بالاتر فضا میں پرواز کر سکتا۔ تاکہ ہمارا مطمحِ نظر اس کے متعلق زیادہ صحیح ہوتا۔ اس کو عرش پر متمکن سمجھ لینا تو ہمارے تصور کی کوتاہی ہے یہ مضمون نظیری کے اس شعر سے مطابقت رکھتا ہے۔

ع توحیدِ حق، بیانِ نظیری بلند ساخت
برتر نہید پایۂ عرشِ عظیم را

بنیادی تصور:۔ ع تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر۔

(۴) دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے ؛ بارے، آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع ہے کہ وہ جس قدر چاہے ذلت دے۔ ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے۔ اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیمی آشنا ہے، اِس لئے ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

بنیادی تصور:۔ خود فریبی۔

(۵) دردِ دل لکھوں کبتک، جاؤں انکو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا!

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اظہارِ دردِ دل کے سلسلہ میں انہیں اس قدر خطوط لکھے کہ انگلیاں کثرتِ تحریر سے زخمی ہوگئیں اور قلم سے بھی خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطوط لکھنے کے بجائے، اپنی زخمی انگلیاں اور خونچکاں قلم جا کر دکھادوں۔ وہ عقلمند ہیں خود سمجھ جائیں گے کہ ان کی جُدائی میں میرا کیا حال ہے۔

بنیادی تصور:۔ کیفیتِ عالمِ فراق۔

(۶) گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا، ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا

مطلب :۔ میں نے محبوب کے سنگ آستاں پر سجدہ کیا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ پتھر ناپاک ہو گیا۔ اس لئے اسے تبدیل کر دیا۔ غالب کہتے ہیں کہ حضور! آپ نے ناحق یہ زحمت گوارا فرمائی۔ اگر چند روز اور توقف فرما لیتے تو پتھر تبدیل کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں خود اپنے سجدوں کی کثرت سے، اسے مٹا دیتا۔

سبحان اللہ! کیا جدت طرازی اور ندرت آفرینی ہے۔

بنیادی تصور :۔ قدرِ جبہہ سائی۔

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
(۷) دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

مطلب :۔ تاکہ رقیب (دشمن) محبوب (دوست) سے ہماری چغلی نہ کھا سکے ہم نے اسے بھی دوست کی بیوفائی کی شکایت میں اپنا ہم زبان اور ہم خیال بنا لیا ہے)

بنیادی تصور :۔ بیان ستم کوشی محبوب۔

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
(۸) بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

مطلب :۔ عام طور پر خیال یہ ہے کہ آسمان، اصحاب ہنر اور ارباب دانش کا دشمن ہوا کرتا ہے اس خیال کے پیش نظر غالب نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے۔ کہ ہم نہ تو دانا تھے اور نہ کسی ہنر میں یکتا تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ آسمان ہمارا دشمن ہو گیا۔

بنیادی تصور :۔ "آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے۔" (حالی)

---

(۵۴)

(۱) سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے، کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

سرمۂ مفت نظر،، اس میں لذتِ نظر کو سرمۂ مفت سے تشبیہ دی ہے۔ اور سرمۂ مفت کی اضافت، نظر کی طرف، تشبیہی ہے،، (نظم طباطبائی) مطلب یہ ہے کہ مانندِ نظر، سرمۂ مفت ہوں جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

مطلب:۔ جس طرح لذتِ نظر مفت ہے کسی کو کوئی قیمت ادا کرنی نہیں پڑتی۔ اس طرح میرے کلام سے لذت اندوزی (استفادہ) مفت ہے اگر قیمت ہے تو بس اتنی کہ مستفید ہونے والا میرے کمالِ فن کا اعتراف کرے یعنی میرا احسان مانے سرمۂ، نظر اور چشم میں رعایت لفظی ہے اور دوسرے مصرع میں غضب کی روانی، بیساختگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ اسی لئے یہ شعر ضرب المثل ہو گیا ہے،

بنیادی تصور:۔ اظہار کمالِ سخنوری۔

(۲)
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم!
تیرے چہرے سے ہو ظاہر، غمِ پنہاں میرا

مطلب:۔ اے ظالم! مجھے نالہ (فریاد) کی اجازت دیدے۔ کیونکہ اگر نالہ فریاد کی اجازت نہ ہو گی تو ہم اس کو ضبط کریں گے۔ اور اس کا اثر تجھ تک پہنچیگا،، یعنی میرا غم پنہاں تیرے چہرے سے ظاہر ہو جائے گا۔ اور تیری پریشانی مجھے کسی صورت میں گوارا نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ حسنِ طلب۔

---

(۴۶)

(۱)
غافل بوہم ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں، طرۂ گیاہ کا

غافل بمعنی ناداں یا کوتاہ بیں + بوہم ناز بمعنی بخیال مفاخرت + شانہ صبا کنایہ ہے مشاطگی فطرت سے + طرہ بمعنی زلف +

مطلب :- کوتاہ بیں انسان جذبۂ مفاخرت کے ماتحت خود آرائی کرتا ہے ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ فطرت خود ہر شئی کو آراستہ کرتی رہتی ہے۔ دوسرا مصرع بطور تمثیل لائے ہیں کہ دیکھو! صبا خود گھانس کی زلفیں سنوارتی رہتی ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ دنیا میں ہر شے فطری طور سے حسین ہے انسان اپنی کوتاہی فکر و نظر کی بنا پر اشیائے کائنات کو اپنے خیال کے مطابق آراستہ کرتا ہے تاکہ اپنے کمال (آرٹ) پر فخر کر سکے۔ اور ہمچشموں سے بصد ناز (فخر و مباہات) یہ کہہ سکے کہ دیکھو! فلاں شئے کو میں نے حسین بنا دیا۔ وغیر ذالک۔

بنیادی تصور :- حسنِ فطرت۔

(نوٹ) اقبال نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :-

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو ؛ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

بزمِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
(۲) صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا!

بزمِ قدح کنایہ ہے بزمِ طرب سے + رنگ کنایہ ہے عیش و عشرت سے + دام گاہ کنایہ ہے دنیا سے + صید ز دام جستہ یعنی وہ شکار جو دام سے نکل بھاگا ہو +

مطلب :- دنیا میں عیش و عشرت کی محفلوں سے راحت یا خوشی کی امید مت رکھ کیونکہ عیش دنیوی اس شکار کی مانند ہے جو صیاد کے جال سے نکل بھاگا ہو یعنی عیش دنیوی ہمیشہ کے لئے کسی کے قبضہ میں نہیں رہ سکتا۔ آج اس کے پاس ہے تو کل اس کے پاس۔

بنیادی تصور :- بے ثباتی عیش دنیوی۔

(۳) رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے ؛ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مطلب :- میرے عذر گناہ نہ کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں معترف گناہ

نہیں بھی۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے گناہوں پر اس درجہ نادم ہوں کہ معذرت کرتے ہوئے بھی ندامت محسوس ہوتی ہے۔

عجب نہیں کہ میرا یہ شدید احساسِ ندامت، بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبول حاصل کرے۔

خوبی اِس شعر میں یہ ہے کہ جس چیز (عذرِ گناہ نہ کرنے) کو عیب سمجھا جاتا ہے غالبؔ نے اُس کو ہنر قرار دیا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ احساس ندامت۔

(۴) مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے ☆ پُرگل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

پُرگل یعنی پُر از گل یا پھولوں سے بھرا ہوا + زخم کو گل سے تشبیہہ دی ہے۔ میری نگاہ میں ہر زخم ایک پھول ہے یا پھول کی طرح دلکش ہے کیونکہ وہ زخم معشوق کے ہاتھ سے لگے گا +

مطلب:۔ چونکہ زخموں کے تصوّر سے میری نگاہ کا دامن پُرگل ہے۔ اسلئے میں مقتل کی طرف بہت خوش خوش جا رہا ہوں۔

بنیادی تصوّر:۔ لذّتِ قتل یا شوقِ شہادت۔

(۵) جاں درہوائے یک نگۂ گرم ہے اسدؔ ☆ پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

ہوا یعنی خواہش، آرزو، تمنّا + نگۂ گرم کنایہ ہے نگاہ محبت سے + جاں در ہوائے یک نگۂ گرم ہے یعنی میری جان تیری نگاہِ محبت کی آرزومند ہے + پروانے کو وکیل اس لئے بنایا کہ وہ شمع کی نگاہِ کرم کی آرزو میں جان دے کر غالبؔ کی آرزو کی نمائیندگی یا ترجمانی کرتا ہے۔

مطلب:۔ اے محبوب! جس طرح پروانے کو یہ خواہش ہے کہ وہ شمع کی نگاہِ کرم سے ہلاک ہو جائے۔ اِسی طرح میری آرزو یہ ہے کہ میں تیری نگاہ

برق پاش پر اپنی جان قربان کر دوں۔
بنیادی تصور:۔ شوقِ فدا کاری۔

(۷۷)

(۱) جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا ؛ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

مطلب:۔ پہلے تو از راہ ستم (جور) اپنا منہ مجھ سے چھپاتے تھے۔ بارے میری آہ وزاری نے اثر دکھایا۔ انہوں نے جور سے توبہ کی۔ مگر شوئی قسمت ملاحظہ ہو کہ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ اے غالب ہم نے تجھ پر اتنے ظلم کئے ہیں کہ سامنے آنے یا منہ دکھانے کی ہمت نہیں ہے! پہلے از راہِ ستم منہ نہیں دکھاتے تھے، اب از راہِ شرم سامنے نہیں آتے۔ یعنی جور سے باز آنے کے باوجود جور سے باز نہیں آئے۔

بنیادی تصور:۔ ستم ظریفی محبوب۔

(۲) رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ؛ ہو رہیگا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

مطلب:۔ جب یہ مسلّم ہے کہ گردشِ فلک سے زندگی میں انقلاب رونما ہوتا ہے تو چونکہ ساتوں آسمان ہر وقت گردش میں ہیں۔ اس لئے ہماری زندگی میں بھی کوئی نہ کوئی انقلاب ضرور برپا ہو جائے گا۔ گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ ترغیبِ توکل۔

(۳) لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ ؛ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں:۔ معشوق کو ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اس میں ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اُسی کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو، نہ دشمنی۔ تو پھر کس بات پر دھوکہ کھائیں قطع! نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے، لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے۔

ہیں جن کا ماخذ متحد ہے اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس سے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے۔،، (یادگار غالب صفحہ ۱۱۱)

بنیادی تصور :۔ بے اعتنائی معشوق۔

(۴) ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ ٭ یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

مطلب :۔ غالب نے اس شعر کا مضمون، قیس کے طرز عمل سے اخذ کیا ہے کہ ایک دن اُسے ایک ناقہ سوار ملا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لیلیٰ کے گاؤں کو جا رہا ہے قیس اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ لیلیٰ سے یہ کہنا اور یہ کہنا، یہاں تک کہ گاؤں آ گیا۔ اسی طرح غالب کہتے ہیں کہ ہم جو فرطِ اشتیاق میں نامہ بر کے ساتھ ہو لئے ہیں تو کیا اپنے خط کو خود ہی محبوب تک پہنچائیں گے؟ مضمون شعر میں بڑی جدت طرازی ہے۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ محویت۔

(۵) موجِ خون سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے ٭ آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

مطلب :۔ خواہ کیسی ہی مصیبت ہم پر کیوں نہ آئے، ہم اسکے آستاں سے نہیں اُٹھ سکتے۔

بنیادی تصور :۔ وفاداری بشرطِ استواری یا وفا کیشی۔

(۶) عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ ٭ مر گئے پر دیکھیئے دکھلائیں کیا

مطلب :۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں: ،، دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت، زندگی سے ضرور بہتر ہو گی اب دیکھیں مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔،،

(یادگار غالب صفحہ ۱۲۶)

بنیادی تصور :۔ بے اطمینانیٔ قلبِ عاشق۔

(۷) پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ٭ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

مطلب :۔ ہم نے تو ساری عمر ان کی محبت میں بسر کر دی۔ ایک دنیا جانتی ہے کہ غالبؔ اُن کے عاشقوں میں سے ہے، لیکن وہ تجاہل عارفانہ سے کام لے کر یہ پوچھ رہے ہیں کہ "غالبؔ کون شخص ہے؟ ہم نے تو اُس کا نام بھی نہیں سُنا" کوئی بتائے کہ اُن کے اس سوال کا ہم کیا جواب دے سکتے ہیں۔
بنیادی تصور:۔ تجاہل عارفانہ۔

---

(۴۸)

(۱) لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ٭ چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

لطافت کنایہ ہے لطیف اشیاء سے جو کثافت سے پاک ہیں، مثلاً خدا، روح نور اور حسن + کثافت کنایہ ہے مادی اشیاء سے + لطافت ضد ہے کثافت کی + جلوہ بمعنی ظہور یا نمود + زنگار بمعنی زنگ + چونکہ بادِ بہاری کو آئینہ فرض کیا ہے۔ اِس لئے چمن کو اس کے لئے بمنزلۂ زنگ قرار دیا ہے خوبی اس میں یہ ہے کہ چمن کی طرح زنگ بھی سبزی مائل ہوتا ہے۔

مطلب :۔ یہ ایک نہایت بلند پایہ فلسفیانہ شعر ہے بقول ڈاکٹر بجنوری مرحوم غالبؔ نے اس شعر میں اِس سوال کا جواب دیا ہے کہ حُسنِ مطلق (خدا) اگر بتقاضائے ذاتِ خویش، ظہور چاہتا ہے تو کسوتِ مادی (کثافت) کیوں اختیار کرتا ہے؟ غالبؔ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے۔

ع لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی [1]

---

[1] ڈاکٹر مرحوم کا یہ خیال کہ اس سوال کا جواب مرزا غالبؔ کے سوا دُنیا کے کسی فلسفی نے نہیں دیا، صوفیائے کرام کی تصانیف سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ اگر وہ صرف لوائحِ جامی پڑھ لیتے تو ایسی جسارت بیجا ہرگز نہ کرتے۔
عارف جامی "لائحہ بست و یکم میں یوں گوہر افشاں ہیں :۔
"مطلق بے مقید نباشد" یعنی مطلق، مقید ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چونکہ حسن بذاتِ خود طالبِ نمائش ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ تعینات کے پردوں میں جلوہ گر ہو۔ ۱۲۰

یعنی مجرد، بلا وساطت مادہ (کثافت) جلوہ گر نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں: "کائنات کی کثیف اشیاء آئینہ فطرت کے لئے قلعی کا کام دے رہی ہیں۔ آئینہ پر جبتک قلعی نہ کی جائے، اس وقت تک اُس میں پوری طرح انعکاس نہیں ہوتا، ہر انعکاس کے لئے ایک کثافت کا بطور پس منظر ہونا ضروری ہے آفتاب کی شعاعیں فضائے آسمانی میں نیرنگی ہوئی نظر نہیں آتیں جبتک زمین یا اور کسی کثیف جسم پر پڑ کر منتشر نہ ہوں لطافت اور کثافت کا یہی امتزاج، وجود مطلق (ذاتِ حق) کی جلوہ فروزی کے لئے ضروری ہے"۔

(فلسفۂ کلام غالب ص۲۷۴)

اس حکیمانہ نکتہ کو غالب نے دوسرے مصرع میں ایک مثال سے واضح کیا ہے کہتے ہیں کہ بادِ بہاری چونکہ ایک لطیف شئی ہے اسلئے وہ چمن کے واسطہ سے اپنا جلوہ دکھاتی ہے یعنی چمن آئینۂ بادِ بہاری کے لئے زنگار (کثافت) کا کام دیتا ہے چمن نہ ہو تو بادِ بہاری کا جلوہ بھی ظاہر (پیدا) نہ ہو۔

غالب نے اس شعر میں ایسا کلیہ بیان کیا ہے جو اس کائنات کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔ مثلاً بوئے گل ایک لطیف شئے ہے اس لئے وہ اوراقِ گل کے واسطہ سے اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ رُوح بھی بواسطہ جسم انسانی کارفرما ہے؛ اسی طرح مطلق بھی مقید کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے خلاصہ کلام اینکہ تعرف الاشیاء باضدادھا۔

بنیادی تصور:۔ اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔

(۲)
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداری ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

حریف بمعنی مدِ مقابل + جوششِ دریا بمعنی طغیانی + خودداریٔ ساحل بمعنی

استقامتِ ساحل +
مطلب :- حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے" (یادگار غالب ص ۱۲۸)

بنیادی تصور :- فراوانی جلوہ ایزدی۔

---

(۴۹)

(۱) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ✤ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

مطلب :- حالی مرحوم لکھتے ہیں "جب درد حد سے گذر جائے گا تو مر جائیں گے یعنی فنا ہو جائیں گے (یعنی واصل باللہ ہو جائیں گے، گویا قطرہ، دریا میں کھپ جائیگا اور یہی اس کا مقصود ہے پس درد کا حد سے گذر جانا، یہی اس کا دوا ہو جانا ہے" (یادگار غالب ص ۱۲۸)

بنیادی تصور :- مقام فنا

نوٹ :- پہلا مصرع دوسرے مصرع کی تمثیل ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
(۲) تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا!

صورتِ قفلِ ابجد- قفلِ ابجد کی طرح۔ قفلِ ابجد، وہ قفل ہے جس پر حروف کندہ ہوتے ہیں۔ جب حروف کو گھمانے سے لفظِ معین بن جاتا ہے تو قفل کھل جاتا ہے + بات کے بنتے ہی۔ اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) لفظ معین کے بنتے ہی (۲) ملاقات کی تدبیر ہوتے ہی۔ اس ایہام ہی پر شعر کا مضمون مبنی ہے۔ جدا ہو جانا۔ اس کے بھی دو معنی ہیں (۱) قفل کا کھل جانا

(۲) محبوب سے جدائی +

مطلب :- جس طرح لفظِ معین کے بنتے ہی قفل کھل جاتا ہے (حلقۂ قفل، قفل سے جدا ہو جاتا ہے) اسی طرح میری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ جب تجھ سے ملاقات کی صورت پیدا ہو جائے (بات بن جائے) تو فوراً جدائی ہو جائے۔

بنیادی تصور :- شومیٔ قسمت۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
(۳) مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

کشمکش بمعنی کاوش + چارۂ زحمت بمعنی علاجِ کلفت + عقدہ کنایہ ہے، دل سے۔ کیونکہ شعراء دلِ عاشق کو گرہ سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں۔

مطلب :- کلفتِ دل کا علاج کرنے میں مجھے ایسی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا کہ خود دل کا کام تمام ہو گیا۔ گویا دل کیا تھا ایک گرہ تھی جو کھولنے کی کوشش میں گھس کر رہ گئی یعنی ختم ہو گئی۔

بنیادی تصور :- کاوشِ چارۂ زحمتِ دل۔

(۴) اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ؎ اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

مطلب :- یہ ان شعروں میں سے ہے جن کا مطلب بیان کرنے سے شعر کی دلکشی معنویت اور تاثیر کا خون ہو جاتا ہے۔ بقولِ نظم طباطبائی "مطلب ظاہر ہے اور تعریف اس کی امکان سے باہر ہے"۔ غالب نے اپنے مخصوص اندازِ بیان میں خفگیٔ محبوب کا نقشہ کھینچا ہے۔

بنیادی تصور :- گلۂ بے اعتنائیٔ محبوب۔

(۵) ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا ؎ باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

مطلب :- غالب نے اس شعر میں استحالۂ عناصر کو شاعرانہ رنگ میں ثابت کیا ہے (استحالۂ عناصر سے مراد ہے ایک عنصر مثلاً پانی کا دوسرے عنصر مثلاً ہوا میں تبدیل ہو جانا) کہتے ہیں کہ جب تک ہم میں طاقت تھی، رات دن روتے رہتے تھے مگر جب ضعف لاحق ہوا تو آنسو بہانے کے بجائے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے یہ دیکھ کر ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ واقعی پانی (گریہ) ہوا (دم سرد) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بنیادی تصور :- اثباتِ استحالۂ عناصر۔

(۲) دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہو گیا، گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مطلب :- مثل مشہور ہے "کہیں ناخن بھی گوشت سے جدا ہو سکتا ہے" لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح ناخن گوشت سے جدا نہیں ہو سکتا، اسی طرح میرے دل سے تیری انگشتِ حنائی کی یاد نہیں نکل سکتی۔ خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ دل مضغۂ گوشت ہوتا ہے اور انگلی کے ساتھ ناخن بھی ہوتا ہے۔

بنیادی تصور :- استواریٔ خیالِ جاناں۔

(۷) ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا ؛ روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

ابرِ بہاری کا برس کر کھل جانا ہر شخص کے لئے باعثِ مسرت ہوتا ہے کھلنا بمعنی بارش کا ختم ہو جانا، یعنی ابر کا فنا ہو جانا + ابرِ بہاری یعنی ساون کی گھٹا + حالی مرحوم نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ وہ غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابرِ بہاری کا برس کر کھل جانا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔ (یادگارِ غالب ص ۱۲۹)

مطلب :- کہتے ہیں کہ جس طرح ابرِ بہاری کا برس کر کھل جانا باعثِ مسرت ہوتا ہے۔ اسی طرح تیرے فراق میں روتے روتے فنا ہو جانا میرے لئے باعثِ مسرت

ہے۔ کیونکہ عاشق کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ وہ فراقِ محبوب میں فنا ہو جائے،
اس کی یہی فنا اس کے حق میں سامانِ بقا بن جاتی ہے۔
بنیادی تصور ہ۔ فنا فی العشق ہو جانے کی آرزو۔

گر نہیں نکہتِ گُل کو ترے کوچے کی ہوس
(۸) کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا!

جولانِ صبا یعنی جولانیٔ صبا۔ مراد ہے صبا کی تیز رفتاری + گردِ رہ کہنے سے
یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ نکہتِ گل، جولانیٔ صبا کا ساتھ نہیں دے سکتی اِس
لئے گردِ راہِ صبا ہو کر رہ جاتی ہے لفظِ ہوس میں یہ اشارہ ہے کہ محبوب کا جسم
اس قدر خوشبودار ہے کہ اس کا کوچہ بھی خوشبو سے بس کر رہ گیا ہے۔ اور
کوچہ کی خوشبو کی دلآویزی کا یہ عالم ہے کہ نکہتِ گل کو بھی اس خوشبو سے لذت
اندوز ہونے کی ہوس ہے لیکن صبا، نکہتِ گل سے بھی زیادہ مشتاق ہے اسلئے
وہ اس تیزی سے چلتی ہے کہ بیچاری نکہتِ گل پیچھے رہ جاتی ہے! غور سے دیکھو تو
ہر لفظ میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے۔ غالب نے غلط تو نہیں کہا۔
گنجینۂ معنی کا طلسم اسکو سمجھیے ٭ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے
مطلب ہ۔ اگر نکہتِ گل کو تیرے کوچہ میں جانے کی آرزو نہیں ہے تو وہ گردِ رہِ
جولانِ صبا کیوں ہے یعنی صبا کی گردِ راہ کیوں بن گئی ہے؟
غالب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں گردِ راہِ جولانِ صبا ہوئے بغیر کوئی شخص
اس کے کوچہ تک نہیں پہونچ سکتا۔
بنیادی تصور ہ۔ دلکشیٔ کوچۂ محبوب۔
(۹) تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل ٭ دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا
مطلب ہ۔ برسات کے موسم میں یوں تو ہر جگہ سبزہ نمودار ہو جاتا ہے دیہ سے

معجزہ برشگال، لیکن آئینہ کا سبز ہو جانا۔ یہ برسات کا معجزہ نہیں ہے۔ اعجازِ ہوائے صیقل ہے یعنی صیقل کی تمنا، آئینہ کو سبز (زنگ آلود) کر دیتی ہے بالفاظ دگر جب صیقل کی آرزو، مرتبہ کمال کو پہنچ گئی۔ تو قدرت نے آئینہ کی صیقل کا سبب پیدا کر دیا۔

بنیادی تصور۔ اعجازِ ہوائے صیقل۔

(۱۰) بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا، غالبؔ ٭ چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

جلوۂ گل بمعنی پھولوں کی بہار۔ یا ان کی دلکشی کا عالم + ذوقِ تماشا بمعنی ذوق مشاہدہ فطرت + ہر رنگ میں یعنی ہر حال میں + رنگ کا لفظ گل کی رعایت سے لائے ہیں۔

مطلب:۔ جلوۂ گل انسان میں ذوقِ مشاہدہ پیدا کرتا ہے اس لئے اس کو لازم ہے کہ اپنے اندر فطرت کے تمام مناظر سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اگر انسان بامعانِ نظر، مشاہدۂ فطرت کرے۔ تو اسے ہر شے میں حسن نظر آئے گا۔

بنیادی تصور:۔ آنکھ والا تو ہے جو بن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر، کیا دیکھے!

ردیف (ب)

(۵۰)

(۱) پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب ÷ دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پھر ہُوا وقت یعنی پھر فصلِ بہار آئی + بال کشا بمعنی پَر کھولنے والا + بال کشودا، استعارہ ہے جوشِ شراب سے + بطِ مے یعنی شراب کی صراحی + دل و دستِ شنا بمعنی تیرنے کی ہمت اور طاقت + لفظِ شنا، بط کی رعایت سے لائے ہیں + شناوریٔ بطِ مے کنایہ ہے دورِ جامِ شراب سے +

مطلب :- پھر فصلِ بہار آگئی۔ جس کے اثر سے شراب میں جوش پیدا ہوگیا۔ اور موجِ شراب نے، صراحی کو تیرنے کی طاقت عطا کر دی یعنی میخانہ میں دورِ شراب شروع ہوگیا۔

بنیادی تصور :- تاثیرِ فصلِ بہار۔

(۲) پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن ÷ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

سیہ مستی بمعنی بدمستی + اربابِ چمن یعنی اشجارِ چمن + سایۂ تاک بمعنی انگوروں کی بیل کا سایہ۔ باغ میں درخت اور پودے اس لیے مست ہیں کہ آج کل ہوا جب انگوروں کی بیل کے پاس سے گذرتی ہے تو اس میں شراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے اثر سے تمام درخت نشہ میں جھومنے لگتے ہیں۔ اس شعر میں حسنِ تعلیل کی خوبی پائی جاتی ہے۔

بنیادی تصور :- ع ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

(۳) جو ہُوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے ÷ سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہُما، موجِ شراب

غرقۂ مے۔ وُہ شخص جو شراب میں ڈوب جائے یعنی مدہوش ہو جائے + بختِ رسا بمعنی طالع بلند۔ بختِ رسا، بالِ ہُما کی رعایت سے لائے ہیں۔ کیونکہ مشہور ہے کہ جس کے سر پر ہُما کا سایہ پڑ جائے۔ وہ بہت خوش قسمت ہوتا

ہے۔ سر سے گذرنا۔ اس میں ایہام ہے (ا) موجِ شراب سر سے گذر جائے یعنی خواہ ہم غرق یا تباہ ہی کیوں نہ ہو جائیں یا فنا ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے ؛ آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

(ب) مدہوش کر دے یا اس کا نشہ حد سے گذر جائے۔

مطلب:۔ بڑا خوش نصیب ہے وہ شخص جو غرقِ مئے ہو جائے۔ کیونکہ موجِ شراب سر سے گذر جانے (غرق کر دینے) کے باوجود، بلحاظِ تاثیر بالِ ہُما سے کم نہیں ہے۔ (اور سب جانتے ہیں کہ ہُما جس کے سر سے گذر جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے)۔ "سر سے گذر جانے" میں جو ایہام پایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے اندازِ بیان میں بڑا لُطف پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ اندازِ بیان ہی غالبؔ کی خصوصیت ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ، اگر میخوار پیتے پیتے فنا ہو جائے یا اس قدر پی لے کہ مدہوش ہو جائے، دونوں صورتوں میں اس کی خوش نصیبی میں کوئی شک نہیں ہے۔ موجِ شراب سر سے نہ گذرے (مدہوش نہ کرے) تب تو کیا کہنا! اگر سر سے گذر جائے (مدہوش کر دے) تو بھی بالِ ہُما سے کم نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ توصیفِ شراب۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
(۴) موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا، موجِ شراب

مطلب:۔ برسات میں ہَوا کے اندر اس قدر مستی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اس کی تاثیر سے ہستی یعنی ساری کائنات، شراب میں تبدیل ہو جائے، یعنی ساری کائنات مست ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ فیضِ ہوائے برشگال۔

(۵) چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو ☆ موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

چار موج بمعنی گرداب یا بھنور۔ خوبی اس لفظ میں یہ ہے کہ شاعر نے اگلے مصرع میں چار قسم کی موجیں جمع کر دی ہیں +

مطلب :۔ موسمِ برشگال میں ہر طرف مسرت رونما ہے۔ باغوں میں پھولوں کی کثرت ہے، آسمان پر شفق پھولی ہوئی ہے۔ ہر طرف ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں۔ اور میخانوں میں شراب کا دور چل رہا ہے۔

بنیادی تصور :۔ تصویرِ طوفانِ طرب۔

(۶) جسقدر رُوحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز ☆ دے ہے تسکین بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

رُوحِ نباتی یعنی قوتِ نامیہ + جگر تشنہ بمعنی آرزومند + ناز کنایہ ہے نشو و نما سے + دمِ آبِ بقا یعنی آبِ حیات کا گھونٹ +

مطلب :۔ روحِ نباتی اشیائے کائنات کو جس قدر نشو و نما دینے کی آرزومند ہے، موجِ شراب اُسی قدر اُس کو (قوتِ نامیہ کو) آبِ حیات کے گھونٹ پلا کر تسکین (طاقت) بخشتی ہے۔

بنیادی تصور :۔ شراب، رُوحِ نباتی کے حق میں موجبِ تسکین ہے۔

(۷) بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

رگِ تاک یعنی انگور کی بیل کی رگ + رگ بمعنی ریشہ + رنگ کنایہ ہے شادابی اور سرسبزی سے +

مطلب :۔ چونکہ موجِ شراب، انگور کی بیل میں خون بن کر دوڑ رہی ہے اسلیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شادابی کے پر لگا کر مائل پرواز ہے یعنی شراب، انگوری بیل میں رنگ بن کر نمودار ہے۔

بنیادی تصور :۔ شراب، باعثِ شادابیٔ تاک ہے۔

(۸) موجۂ گل سے چراغاں ہے گذر گاہِ خیال ❊ ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

اِس شعر میں شاعر نے موجِ شراب کو پہلے موجِ گل سے تشبیہہ دی ہے، پھر چراغاں سے +

مطلب :- چونکہ میرے تصوّر میں موجِ شراب جلوہ نما ہے اور موجِ شراب گویا موجِ گل ہے اور موجِ گل مشابہ چراغاں ہے - اِس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خیال (تصوّر) کی گذر گاہ چراغاں بن گئی ہے یعنی خیال میں چراغاں کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے -

بنیادی تصوّر :- شراب باعثِ رنگینیٔ تصوّر ہے -

(۹) نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ ❊ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما، موجِ شراب

سرِ نشو و نما یعنی دماغ کو نشو و نما دینے کی آرزو +

مطلب :- چونکہ شراب ہمارے دماغ کو نشو و نما دینے کی آرزو مند ہے اس لیے وُہ بشکل نشہ (نشہ کے پردے میں)، ہمارے دماغ میں پہنچ کر محوِ تماشا ہے - یعنی دماغی قوتوں کو ترقی دے رہی ہے -

خوبی اس مضمون میں یہ ہے کہ شراب کا نشہ ہمیشہ دماغ ہی کو چڑھا کرتا ہے غالب نے نشہ چڑھنے کی شاعرانہ توجیہہ کی ہے کہ شراب، دماغ میں بشکلِ نشہ اس لیے گئی ہے کہ وہاں جا کر دماغی قوتوں کو ترقی عطا کرے -

بنیادی تصوّر :- نشہ، شراب موجبِ ترقیٔ دماغی ہے -

(۱۰) ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل ❊ موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

طوفانیٔ کیفیتِ فصل یعنی فصلِ بہار کی کیفیت کا طوفان برپا کرنے والے -

مطلب :- موجِ سبزۂ نوخیز ہو، یا موجِ شراب، یہ دونوں فصلِ بہار میں، ساری کائنات میں ایک طوفان برپا کر دیتی ہیں - یعنی برسات میں ساری دُنیا پر مستی

کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ کرشمہ سازیٔ سبزہ و شراب۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
(۱۱) رہبرِ قطرہ بدریا ہے، خوشا موجِ شراب

اِس شعر میں صنعتِ تقابل پائی جاتی ہے نیز بندش کی چستی قابلِ داد ہے۔

مطلب:۔ موسمِ گل، ہنگامۂ ہستی کی شرح ہے یعنی ہستی کی رونق، موسمِ بہار ہی کے دم سے قائم ہے۔ موسمِ بہار نہ آئے۔ تو ساری دُنیا اُجاڑ ہو کر رہ جائے۔ دُوسرے مصرع میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ موجِ شراب، قطرے کو دریا سے ملا دیتی ہے یعنی شراب انسان پر عالم بیخودی طاری کر دیتی ہے اور بیخودی، فنا سے مشابہ ہے اور فنا ہو کر، قطرہ، دریا سے مل جاتا ہے۔ اس لیے شراب، قطرے (انسان) کو دریا (ذاتِ حق) سے ملا دیتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ وصفِ موسم گل و موجِ شراب۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
(۱۲) پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کشا، موجِ شراب

دیکھ یعنی دیکھ کر۔

مطلب:۔ اے اسدؔ! موسم بہار میں پھُولوں کا حسن و جمال دیکھ کر مجھ پر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ یعنی پھر وُہ وقت آ گیا کہ شراب کا دورِ چلے۔

بنیادی تصوّر:۔ جلوۂ گُل، محرکِ دَورِ ساغر ہے۔

٭

ردیف (ت)

(۵۱)

(۱) افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے ٭ جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر، انگشت

دیداں۔ جمع ہے دود کی، یعنی کیڑے مکوڑے + درخور بمعنی لائق یا قابل + عقدِ گہر

بمعنی موتیوں کی لڑی +

مطلب :۔ افسوس کہ جن لوگوں کی انگلیاں، زندگی میں اس قدر حسین تھیں کہ انہیں موتیوں کی لڑی سے مزین کیا جاتا، مرنے کے بعد کیڑوں کا رزق بن گئیں۔

بنیادی تصور :۔ بے ثباتیٔ حسنِ جسمانی۔

بعض نسخوں میں دیداں کے بجائے دنداں لکھا ہوا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں کی انگلیاں سلکِ گہر کے لائق تھیں، فلک نے انہیں دانتوں کا رزق بنا دیا۔ یعنی اہلِ کمال اپنی بدنصیبی اور بے قدری کی وجہ سے فرطِ غم میں اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹ رہے ہیں۔

اُستاد ذوق نے اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے :۔

یُوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال، افسوس ہے

اے کمال! افسوس ہے تجھ پر، کمال افسوس ہے

بنیادی تصور :۔ بے قدریٔ اربابِ ہنر۔

(نوٹ) راقم الحروف کی رائے میں "دیداں" بہتر ہے ۱۲۰

(۲) کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا ٭ خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر، انگشت

مطلب :۔ پہلے زمانہ میں دستور تھا کہ بوقتِ رخصت، چھلا بطور یادگار دیا کرتے تھے۔ غالب محبوب سے کہتے ہیں کہ تو نے بوقتِ رخصت اپنی خالی اُنگلی مجھے دکھا دی۔ جس سے تیرا مطلب یہ تھا کہ میرے پاس کوئی چھلا نہیں ہے۔ میں اسی بات کو تیری نشانی سمجھوں گا۔

بنیادی تصوّر:۔ وجہ تسکین خاطر۔

(۳) لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم ✤ تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

سخنِ گرم میں ایہام ہے (۱) سوزشِ دل کی وجہ سے کلام میں بھی گرمی آگئی (۲) کلامِ مؤثر + حرف پر انگشت رکھنا (۱) انگلی رکھنا محاورہ ہے یعنی اعتراض کرنا۔ ردیف کی مجبوری سے انگلی کے بجائے 'انگشت' لائے ہیں + (۲) لفظی معنیٰ یہ ہیں کہ جل جانے کے خوف سے کوئی شخص انگلی نہیں رکھ سکتا +

مطلب:۔ یہ شعر محض رعایت لفظی کی خاطر لکھا ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ سوزِ عشق کی بدولت میرے کلام میں وہ تاثیر پیدا ہوگئی ہے کہ کوئی شخص میرے اشعار پر اعتراض نہیں کر سکتا۔

بنیادی تصوّر:۔ رنگ تعلّی۔

---

(۵۳)

(۱) رہا گر کوئی تا قیامت سلامت ✤ پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

مطلب:۔ تو واضح ہے کہ موت سے کسی کو مفر نہیں ہے لیکن بندش لطف سے خالی نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص قیامت تک زندہ رہے تو بھی موت سے رستگار رہنا ممکن نہیں ہے۔ وہ شخص عین قیامت کے دن مرجائے گا۔ حالانکہ قیامت کے دن سب مُردے زندہ ہو جائیں گے!

دوسری خوبی یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں مرنے اور سلامت دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ حضرت سلامت محاورہ ہے اور جنابِ والا کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ ع موت سے کس کو رستگاری ہے

(۲) جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب ✤ لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

عشق خونبار یہ مشرب سے مراد یہ ہے کہ عشق کا مشرب (طریقِ زندگی) خون آشامی ہے یعنی اس کی زندگی عاشق کا خون پینے پر موقوف ہے۔ لفظ مشرب میں ایہام ہے (۱) مشرب بمعنی جائے نوشیدن (۲) مشرب بمعنی طریقِ کار یا مذہب، خداوندِ نعمت بمعنی مُربّی۔ چونکہ جگر مربّیٔ عشق ہے (عاشق خونِ جگر پیا کرتا ہے) اس لیے اسے خداوندِ نعمت سے تعبیر کرنے میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔

مطلب :- مطلب واضح ہے کہ عشقِ خون آشام، میرے جگر کو خداوندِ نعمت ! سلامت باشند کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ شوخی یہ پیدا ہو گئی کہ عشق جس کا خون پی رہا ہے، اسی کی سلامتی کی دعا مانگ رہا ہے۔ کیونکہ اگر وہ سلامت نہ رہا تو عشق کس کے سہارے زندہ رہے گا ؟

بنیادی تصور :- خون آشامیٔ عشق۔

(۳) علی الرغم دشمن، شہیدِ وفا ہوں ؛ مبارک مبارک! سلامت سلامت

علی الرغمِ دشمن یعنی رقیب کی آرزو یا کوشش کے برعکس + پہلے مصرع میں ثقالت ہے، دوسرے مصرع میں اسی قدر سلاست (روانی) ہے۔

مطلب :- دشمن نے بڑی کوشش کی کہ مجھے درجۂ شہادت نصیب نہ ہو، مگر الحمد للہ کہ اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا کامیابی پر مبارک باد دیتے وقت 'مبارک سلامت' کہا کرتے ہیں۔ یہاں ان دونوں لفظوں سے دو مطلب برآمد ہوتے ہیں (و) کامیابی کی رعایت سے مبارک کا لفظ اور شہادت کے بعد حیاتِ جاوید یعنی سلامتی حاصل ہوتی ہے اس لیے سلامت کا لفظ بہت موزون ہے۔

بنیادی تصور :- "ذٰلک الفوز العظیم"

(۴۴) نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی ٭ تماشائے نیرنگِ صورت، سلامت

سر و برگ بمعنی ساز و سامان۔ یہاں مراد ہے اہلِ بیت یا لیاقت + ادراکِ معنی الیعنی حقیقت کو پالینا یا کنہ کو دریافت کر لینا + تماشا کے لفظی معنی تو ہیں چلنا۔ چونکہ چلنے میں انسان چیزوں کو دیکھتا ہے اس لیے تماشا بمعنی دیکھنا مستعمل ہو گیا + صورت، معنیٰ کی ضد ہے۔ معنی ہمیشہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ صورت ہمیشہ عیاں ہوتی ہے۔ بالفاظِ دگر، معنی 'باطن' ہے۔ صورت 'ظاہر' ہے + معنیٰ عقل سے اور صورت آنکھ سے متعلق ہے + نیرنگِ صورت یعنی صورت کی نیرنگی۔ نیرنگی کا لفظ اس لیے لائے کہ صورت ہر دم متغیر ہوتی رہتی ہے۔ بمعنیٰ کو ثبات حاصل ہے۔

مطلب:۔ اگر انسان میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ حقیقت تک پہنچ سکے یا حقائق اشیاء کا علم حاصل کر سکے تو کم از کم اسے کائنات کے مظاہر ہی کا مشاہدہ کرنا چاہیے کیونکہ مشاہدۂ فطرت بھی خالقِ فطرت تک رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

بنیادی تصور:۔ المجازُ قنطرۃُ الحقیقۃ۔

---

(۵۳)

(۱) مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اسے، پر کس وقت

مطلب:۔ افسوس! میرے احباب میرے محبوب کو اس وقت میری بالیں پر لائے جب میرا وقت آخر ہو چکا تھا۔ چاہتا تھا کہ اسے ایک نظر دیکھ لوں مگر آنکھیں بند ہو گئیں۔ یعنی موت آگئی۔

بنیادی تصور:۔ حسرتِ دیدار۔

---

(۵۴)

(۱) آمدِ خط سے ہُوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

خط بمعنی وہ سبزہ یا رواں جو داڑھی نکلنے سے پہلے رخسار پر نمایاں ہوتا ہے + بازار سرد ہو گیا کنایہ خریداروں کے کم ہو جانے سے + بازارِ دوست بمعنی بازارِ حسنِ دوست + بازارِ دوست سرد ہو گیا یعنی چاہنے والے کم ہو گئے

دوسرے مصرع میں خط کو دودِ شمع سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح شمع کے بجھ جانے کے بعد پروانے رخصت ہو جاتے ہیں اسی طرح خط آجانے سے عشاق غائب ہو جاتے ہیں۔

مطلب:۔ چہرے پر سبزہ آغاز ہو جانے کی وجہ سے عاشقوں کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو گئی۔ گویا خطِ رخسار، دودِ شمع تھا جس کے نکلتے ہی پروانے (عشاق) غائب ہو گئے۔

خطِ رخسار کے مضمون کو لکھنؤ کے ایک شاعر نے یوں باندھا ہے:۔

جب تلک خط صاف تھا تب تک جواب صاف تھا
اب تو خط آنے لگا، شاید کہ خط آنے لگے !

بنیادی تصور:۔ تصویرِ عشقِ مجازی۔

(۲) اے دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر ؛ کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

مطلب:۔ دل کو 'ناعاقبت اندیش' کہنے سے معلوم ہوا کہ شاعر نے حضرت موسیٰؑ کے واقعہ طور کو مدِ نظر رکھ کر شعر کہا ہے۔ غالب اپنے دل سے کہتے ہیں کہ جب موسیٰؑ جلوۂ یار کی تاب نہ لا سکے تو تیری یا کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔

بنیادی تصور:۔ کوئی شخص دیدارِ دوست کی تاب نہیں لا سکتا۔

(۳) خانۂ ویراں سازئ حیرت تماشا کیجیے ؎ صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

خانہ ویراں سازی بمعنی بربادی یا تباہی + تماشا کرنا بمعنی دیکھنا۔ یہاں غور کرنا مراد ہے + صورتِ نقشِ قدم۔ شعرا نقشِ قدم کو حیراں باندھا کرتے ہیں + رفتہ بمعنی وارفتہ یا فریفتہ +

مطلب:- جس طرح نقشِ قدم حیراں ہوتا ہے اسی طرح مَیں بھی وارفتۂ خرام یار ہوں یعنی اس کی چال میں ایسی دلکشی ہے کہ مجھ پر نقشِ قدم کی طرح عالمِ حیرت طاری ہو گیا ہے اور نقشِ قدم ہی کی طرح جہاں کھڑا تھا وہیں رہ گیا! اندریں حالات میرے گھر واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے گھر کی بربادی یقینی ہے اور باعث اس بربادی کا میری حیرت ہے!

بنیادی تصوّر:- دلکشئ رفتارِ دوست، علّتِ خانہ بربادئ عاشق۔

(۴) عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

مطلب:- چونکہ میں بیمارِ دوست (محبوب پر عاشق) تھا اس لیے حسبِ معمول مجھے اسی کے عشق میں مرنا چاہیے تھا۔ مگر ہوا یہ کہ مجھے جلانے کے لیے محبوب نے غیر پر لطف وکرم شروع کر دیا۔ میں رشک کی تاب نہ لا سکا اور جاں بحق ہو گیا اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ کشتۂ دوست نہیں ہوں بلکہ کشتۂ دشمن ہوں۔

بنیادی تصوّر:- بیدادِ رشکِ غیر کی ہلاکت آفرینی۔

(۵) چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

"چشمِ ما روشن۔ دلِ ما شاد" فارسی کی مشہور ضرب المثل ہے۔ خوشی کے موقع پر کہی جاتی ہے + غالب نے اسے بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے، بلکہ اس

سے فائدہ اُٹھایا ہے + دیدۂ پُر خوں، کنایہ ہے عاشق کی خونناب فشانی سے۔ اور ساغرِ سرشارِ دوست کنایہ ہے معشوق کی شادمانی سے + دوسرے مصرع میں لفظ "ہے" محذوف ہے + دوسرے مصرع کو پہلے پڑھا جائے تو مطلب فوراً واضح ہوجائے گا۔

مطلب:۔ اگر دیدۂ پُر خوں، اُس بیدرد کو ساغرِ سرشار نظر آتا ہے یعنی اگر وہ ہماری اشک فشانی سے خوش ہوتا ہے تو ہم اس میں خوش ہیں۔ (چشمِ ماروشن) کہ ہم برباد سہی مگر اس کا دل تو شاد ہے!

"دیدۂ پر خوں کی رعایت سے چشمِ ماروشن اور چشمِ ماروشن کی رعایت سے "دلِ ما" شاد نظم کیا ہے۔" (حسرت)

بنیادی تصور:۔ پاسِ خاطرِ محبوب۔

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
(۶)
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

مطلب:۔ اس کے ہجر میں، غیر (رقیب) میری مزاج پرسی اس طرح کرتا ہے جیسے وہ میرا بڑا غمخوار ہے۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ وہ مجھے رُوحانی اذیت پہنچانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ایذا رسانیٔ رقیب۔

تاکہ مَیں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
(۷)
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست!

مطلب:۔ جب وہ مزاج پرسی کے لیے آتا ہے۔ تو مجھ سے کہتا ہے کہ تم رنجیدہ مت ہو! میری رسائی تمہارے دوست تک ہے اس لیے میں تمہیں اُس کا دیدار کرادوں گا۔ وہ مجھے بیوقوف بنانا چاہتا ہے۔ مگر میں خوب جانتا

ہوں کہ وہ محض میرے جلانے کو ایسی باتیں کرتا ہے۔
بنیادی تصور:۔ نیش زنیٔ رقیب۔

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعفِ دماغ
(۸) سر کرے ہے وُہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

سر کردن بمعنی شروع کرنا + حدیث سر کردن یعنی بات کہنا یا قصہ سنانا۔
مطلب:۔ جب میں ضعفِ دماغ کی شکایت کرتا ہوں تو وہ بظاہر ازالۂ مرض (ضعفِ دماغ) کے لیے مجھے محبوب کی زلفِ عنبریں کی داستاں سناتا ہے۔ یعنی بظاہر ہمدردی کرتا ہے مگر دراصل مجھے اس کی زلف کی یاد دلا کر تڑپاتا ہے۔
بنیادی تصور:۔ جفا کیشیٔ رقیب۔

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
(۹) ہنسکے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مطلب:۔ اگر مجھے روتے دیکھتا ہے تو طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ محبوب کی شوخیٔ گفتار کا بیان کرنے لگتا ہے۔ بظاہر میرا دل بہلاتا ہے مگر دراصل اس کی دلکش گفتگو کی یاد دلا کر بے چین کرتا ہے۔

(۱۰) مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے ؛ یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

مطلب:۔ مہربانی سے یہاں ستم کوشی مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ اندریں حالات میں حیران ہوں کہ رقیب کی دشمنی کی شکایت کروں یا محبوب کی آزار دوستی کا شکریہ ادا کروں! کیونکہ رقیب نے یہ منافقانہ طرزِ عمل اسی کے ایماء پر اختیار کیا ہے۔ ورنہ کجا رقیب کجا پرسشِ احوال؟
بنیادی تصور:۔ ستم کیشیٔ محبوب۔

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
(۱۱) ہے ردیفِ شعر میں غالب زبس تکرارِ دوست

مطلب :- چونکہ اس غزل کے ہر شعر کے آخر میں دوست (محبوب) کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے مجھے یہ غزل بہت پسند ہے۔

بنیادی تصور :- لذتِ ذکرِ دوست۔

ردیف (ج)

(۵۵)

(۱) گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج ٭ قمری کا طوق، حلقۂ بیرونِ در ہے آج

دوسرے مصرع کی نثر یوں ہو گی :-

آج حلقۂ بیرونِ در، قمری کا طوق ہے یعنی حلقۂ بیرونِ در بھی اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے قمری کا طوق نظر آتا ہے +

مطلب :- موسم بہار کے فیضان کی بدولت باغ کا کچھ اور ہی عالم ہے۔ ہر طرف دل آویزی کے سامان ہویدا ہیں۔ یہاں تک کہ حلقۂ بیرونِ در پر باعتبارِ دلفریبی، قمری کے طوق کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یعنی اس میں بھی وہی دلکشی پیدا ہو گئی ہے جو قمری کے طوق میں قدرتی طور پر پائی جاتی ہے۔

حلقہ اور طوق میں صوری مشابہت کی وجہ سے شعر میں بھی بہت دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ دلفریبیٔ بہار۔

(۲) آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ٭ تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج!

تارِ نفس یعنی نفس + نفس بمعنی آہِ سرد + نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے یعنی میری آہِ سرد میں اثر پیدا ہو گیا ہے۔

یہ شعر غالب ازم کی جہت عمدہ مثال ہے۔ مقصود تو اظہارِ بدبختی ہے یعنی

دراصل کہنا تو یہ چاہتے ہیں کہ شدّتِ آہ و فریاد سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے مگر کہتے یہ ہیں کہ آج ہماری آہ میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

اس اندازِ بیان میں ایک خوبی اور بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ غالبؔ نے اپنی طبعی شوخی اور ظرافت سے کام لے کر اپنی آہ کی تاثیر، اُلٹی دکھائی ہے۔ یعنی وہ تاثیر عاشق کے حق میں پیامِ موت بن گئی ہے۔

مطلب:۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہماری آہ میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ہر آہ کے ساتھ ایک پارۂ دل بھی باہر آ رہا ہے!

بنیادی تصور:۔ ماتمِ بدبختیِ خویش۔

(۳) اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

مطلب:۔ چونکہ سیلابِ گریہ آنے والا ہے اور اس کی شدت سے میرا مکان منہدم ہو جائے گا۔ اس لیے عافیت اور انتظام دونوں میرے گھر سے مفقود ہو جائیں گے۔ سچ ہے جب گھر ہی نہ رہا تو عافیت اور انتظام کہاں!

بنیادی تصور:۔ تذکرۂ خانہ بربادیٔ عاشق۔

---

(۵۶)

(۱) لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں ❊ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

"مسیحا کا کیا علاج" یہ محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ اگر مریضِ عشق اچھا نہ ہوا تو پھر مسیحا کو کیا سزا ملنی چاہیئے! چونکہ لفظ علاج میں ایہام ہے اس لیے شعر میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

مطلب:۔ مسیحا نے اپنی خفت مٹانے کے لیے مریضِ عشق کے اقرباء سے یہ کہا کہ اس کی تیمارداری ٹھیک طور سے نہ ہو سکی اس لیے صحت یاب نہ ہو سکا۔

غالب کہتے ہیں کہ مسیحا نے یہ بات اپنی خفت مٹانے کے لیے کہی ہے۔ اگر تم لوگوں کو میری بات میں شک ہے تو میں مریضِ عشق کی تیمارداری کا ذمہ لیتا ہوں مگر یہ طے کر لو کہ اگر مریض اچھا نہ ہوا تو مسیحا کو کیا سزا دی جائے گی؟ اس کا کیا علاج کرو گے؟

بنیادی تصور:۔ مریضِ عشق مسیحا سے بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔

ردیف (چ)

(۵۷)

(۱) نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ ❊ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

انجمنِ آرزو یعنی آرزو۔ نفس باہر کھینچنا یہ فارسی محاورہ کا اردو ترجمہ ہے۔ یعنی قطع تعلق کرنا۔ پہلے مصرع کا مطلب ہے ترک آرزو مت کر۔

مطلب:۔ اے مخاطب! آرزو کے بغیر زندگی بے کیف ہو جاتی ہے اس لیے لازم ہے کہ "جب تک سانس تب تک آس" پر عمل کرو۔ مقصد حاصل ہو یا نہ ہو۔ حصولِ مقصد کی آرزو ضرور کیے جاؤ۔ مثلاً اگر میخانہ میں بیٹھے ہو اور وہاں شراب نہیں ہے تو وہاں سے اُٹھ کر مت جاؤ۔ وہیں بیٹھے ہوئے ساغر کا انتظار یعنی شراب کی آرزو کرتے رہو۔

بنیادی تصور:۔ دُنیا بامید قائم است۔

(۲) کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ ❊ برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

یہ ان اشعار میں سے ہے جن کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں دو مطلب لکھتا ہوں:۔

پہلا مطلب:۔ آئینہ سے مراد ہے آئینۂ حسرتِ دیدارِ یار۔ چونکہ غالب نے

حسرتِ دیدار کو آئینہ فرض کیا ہے اس لئے انہیں موقع مل گیا کہ اس فرضی یا خیالی آئینہ میں جوہر بھی ثابت کر دیں۔ چونکہ خار اور جوہر دونوں کی شکل یکساں ہوتی ہے اسلئے غالبؔ کو "برنگِ خار" کی ترکیب استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔

مطلب یہ ہے کہ دیدارِ یار کے سلسلہ میں جو انتہائی کوشش میں نے کی ہیں ان کی تفصیل مجھ سے کیا پوچھتے ہو! بس یہ سمجھ لو کہ صحرا نوردی میں اس قدر کانٹے چبھے ہیں کہ تلوے درکنار، آئینہ حسرتِ دیدار میں بھی کانٹے چبھ گئے۔ اگر تمہیں شک ہو تو اس آئینہ کو دیکھ لو تمہیں جوہر کی جگہ کانٹے ہی کانٹے نظر آئیں گے تم جب جوہر کی کھینچنے کی کوشش کرو گے تو جوہر کے بجائے ایک نہ ایک کانٹا کھنچ کر باہر آجائے گا!

بنیادی تصور:۔ سعیٔ تلاشِ دید۔

نوٹ:۔ بقول غالب اس شعر میں مضمون ہے دقیق مگر لطف زیادہ نہیں ہے۔

دوسرا مطلب:۔ جوہرِ آئینہ سے طبعِ موزوں یا بلکہ شعر و سخن مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اپنے جوہرِ آئینہ (جوہرِ شاعری) کے قدردانوں کی تلاش میں جس قدر صعوبت اٹھائی ہے اس کا حال مجھ سے نہ پوچھو بلکہ اب تو میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ان جوہروں کو جو میرے آئینہ طبع میں ہیں، اس طرح نکال لے جس طرح کانٹے نکالتے ہیں تاکہ مجھے چین آجائے۔ نہ یہ جوہر معانی ہوں گے، نہ مجھے ان کے قدردانوں کی تلاش میں زحمت اٹھانی پڑے گی۔

بنیادی تصور:۔ شکوہ ناقدریٔ ابنائے زمانہ۔

(۳) تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل ؎ کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

نازِ بستر کھینچ یعنی بستر کے ناز اٹھا کر ابرِ بے بستر پر لیٹے رہنے سے۔

مطلب:۔ اے دل! تو بظاہر انتظارِ محبوب میں بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ لیکن

دراصل تیرا یہ لیٹا رہنا، تیری راحت طلبی کا ایک بہانہ ہے تجھ سے کس نے کہا ہے کہ انتظارِ محبوب میں بستر پر لیٹا رہ! اگر تو واقعی طالبِ وصل ہے تو اس کے لئے جدوجہد کرنا لازمی ہے بستر پر لیٹے رہنے سے وصلِ یار میسر نہیں ہوگا.

بنیادی تصور:۔ ترغیب سعیٔ ملاقات۔

(۴) تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس ٭ بکوریٔ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ

رقیب سے نرگس مراد ہے جسے عموماً شعرا "بے نور"، یا "کور" باندھا کرتے ہیں۔

مطلب:۔ اے محبوب! نرگس تجھے دیکھنے کی بڑی آرزومند ہے مگر اندھی ہے اسلئے دیدار سے محروم ہے چونکہ وہ میری رقیب ہے اس لئے میں بصد منت تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ میرے رقیب کے اندھے ہونے کی خوشی میں خوب دل بھر کے شراب پی اور مجھے مسرور کر!

بنیادی تصور:۔ اظہارِ مسرت بر کوریٔ رقیب۔

(۵) بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز ٭ نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ!

غمزہ بمعنی آنکھ یا ابرو سے اشارہ کرنا + نیم غمزہ بمعنی خفیف اشارہ یا نگاہِ غلط انداز جو غمزہ کے مقابلہ میں زیادہ موثر ہوتی ہے + ودیعت بمعنی امانت + ناز بمعنی بے نیازی۔ یہ لفظ اس شعر کی جان ہے اسی پر شعر کی عمارت قائم ہے ناز کو شاعر نے خنجر قرار دیا ہے، یعنی معشوق کی بے پروائی یا تغافل شعاری ہی وہ خنجر ہے جو جگر میں پیوست ہو گیا ہے اس خنجر ناز سے زخم جگر پیدا ہوا یہی خنجر ناز، زخم جگر میں بطور امانت رکھا ہوا ہے + لفظی خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ خنجر، الف سے مشابہ ہوتا ہے اور نیام سے الف (خنجر) نکال دو۔ تو نیم باقی رہ جاتا ہے۔

مطلب:۔ یہ شعر غالب کے مشکل اشعار میں سے ہے مطلب یہ ہے کہ

اے محبوب! میرے جگر میں جو خنجر پیوست ہے وہ تیری بے نیازی کی سونپی ہوئی امانت ہے (تیری بے نیازی میرے حق میں خنجر بن گئی) اب تک یہ خنجر ناز میرے جگر میں بطور امانت رہا ہے اگر تو نیم غمزہ سے کام لے کر اس خنجر کو کھینچ لے یعنی باہر نکال لے۔ تو اس امانت کا حق پورا پورا ادا ہو جائے گا۔ یعنی میں اب تک محض اسلئے زندہ ہوں کہ تیری امانت میرے پاس ہے اگر تو اس امانت کو واپس لے لے (یعنی مجھے اور زخمی کر کے ختم کر دے) تو میرا مقصدِ حیات حاصل ہو جائے گا۔ بالفاظِ دگر، حقِ امانتِ ناز اس طرح ادا کر کہ نیم غمزہ سے زخمِ جگر کو اور کشادہ کر دے تاکہ مجھے درجۂ شہادت حاصل ہو جائے۔ انداز بیان کی خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ غالبؔ یہ نہیں کہتے کہ میرے زخمِ جگر کو نیم غمزہ سے اور زیادہ کشادہ کر دے (اور زیادہ زخمی کر دے تاکہ خاتمہ ہو جائے)، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے جو تیرے خنجر ناز کو اپنے جگر میں اتنے عرصہ تک بطور امانت رکھا ہے اس کا معاوضہ عطا کر۔

بنیادی تصوّر۔ تمنائے جگر دوختگی۔

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ، کبابِ دلِ سمندر کھینچ! (۶)

قدح بمعنی بڑا پیالہ۔ یہاں قدح کنایہ ہے ساغرِ دل سے + صہبا بمعنی شراب آتشِ پنہاں کنایہ ہے سوزِ عشق یا آتشِ محبت سے + بروئے سفرہ بمعنی دستر خوان پر + سمندر بمعنی آگ کا کیڑا + ۔

مطلب۔ چونکہ میرے دل میں آتشِ محبت کی شراب بھری ہوئی ہے اور میں یہی شراب پیتا رہتا ہوں اس لئے اے ہمنشین! تو میرے دستر خوان پر گزک کے لئے سمندر کے کباب مہیا کر یعنی جب میں محبت کی آگ کی شراب

پی رہا ہوں تو کباب آگ کے کیڑے (جانور) کا ہونا چاہیئے۔
بنیادی تصور :- ذوقِ جگر سوختگی۔

ردیف (د)

(۵۸)

(۱) حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ❊ بارے، آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
مطلب :- جبتک میں زندہ تھا، ہر حسین مجھے اپنے اُوپر فریفتہ کرنے کے لیے ناز و انداز دکھانے میں مصروف رہتا تھا، یعنی میری وجہ سے حسینوں میں ایک کشمکش جاری تھی۔ اب میرے مرنے کے بعد چونکہ کوئی شخص اس لائق نہیں ہے۔ کہ حسینانِ عالم اسے اپنا شیدا بنائیں اس لئے وہ کشمکش ختم ہو گئی اور اب تمام اہلِ جفا بڑے سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔
بنیادی تصور :- زمرۂ عشاق پر اپنی فوقیت ثابت کی ہے۔

(۲) منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ❊ ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
مطلب :- پہلے شعر سے ملتا جلتا مضمون باندھا ہے یعنی اسی مضمون کو باندازِ دگر نظم کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ چونکہ میرے مرنے کے بعد اب کوئی شخص منصب عاشقی پر فائز ہونے کے لائق نہیں رہا۔ اس لیے معشوقوں کے ناز و انداز، عشوے اور غمزے سب بیکار ہو گئے۔

بنیادی تصور :- تفوق بر زمرۂ عشاق۔

(۳) شمع بجھتی ہے تو اسمیں سے دھواں اُٹھتا ہے ❊ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
مطلب :- شاعر نے دھوئیں کو شعلۂ شمع کا ماتمی لباس قرار دیا ہے۔ اور اسی بات سے مضمون پیدا کیا ہے کہتے ہیں کہ جس طرح شعلۂ شمع، شمع

کے ماتم میں سیہ پوش ہو جاتا ہے، اسی طرح شعلۂ عشق میری وفات کے بعد میرے غم میں سیہ پوش ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مرنے سے عشق و محبت کا خاتمہ ہو گیا۔

بنیادی تصور:- میری وفات سے دُنیا میں عاشقی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

خون ہے دل، خاک میں، احوالِ بتاں پر یعنی
(۴) اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

خاک میں یعنی قبر میں + پہلے مصرع کی نثر یوں ہو گی + خاکِ تربت یعنی قبر کے اندر، میرا دِل، احوالِ بتاں پر خون ہو رہا ہے۔

مطلب:- دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) جب میں زندہ تھا تو حسینانِ شہر میرے خون سے اپنے ناخن رنگین کیا کرتے تھے۔ اب میری وفات کے بعد انہیں مہندی لگانے کی احتیاج لاحق ہو گئی۔ اس بات سے قبر کے اندر میرا دل خون ہو رہا ہے یعنی میں بہت رنجیدہ ہوں (۲) میرے سوگ میں حسینوں نے مہندی لگانی چھوڑ دی ہے اِس لئے اُن کے ناخن محتاجِ حنا ہیں اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس کا باعث میں ہوں۔

بنیادی تصور:- وہی اپنی فضیلت کا اظہار۔

(۵) درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو جا: نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

درخور بمعنی لائق، یا قابل + عرض بمعنی اظہار + بیدلؒ کے تتبع میں غالبؔ نے بھی جوہر اور عرض کا استعمال اکثر اشعار میں کیا ہے مثلاً۔

ع عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں

لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ جوہر کا مقابل عرض ہے نہ کہ عرض + جوہرِ بیداد یعنی بیداد + پہلے مصرع میں (کو، اور جا)، کے اجتماع سے لطفِ بندش

میں کمی واقع ہو گئی + جا بمعنی جگہ +
مطلب :۔ میرے مرنے کے بعد حسینوں کو اپنی بیداد کے اظہار کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ اب انہوں نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے بات یہ ہے کہ پہلے تو وہ سرمہ لگا کر مجھے تختۂ مشق ستم بنایا کرتے تھے مگر اب کس پر ظلم کریں؟ چونکہ اب کوئی شخص منصب شیفتگی کے قابل ہی نہیں ہے اس لئے سرمہ لگا کر کیا کریں، کس کو قتل کریں!
بنیادی تصور :۔ میری ذات حسینوں کے لئے سرمایۂ صد افتخار تھی۔

(۶) کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مطلب :۔ مولینا حالی فرماتے ہیں " اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں، مئے مرد افگن عشق کا ساقی (معشوق) بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے + اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں۔ اور اسی مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے " کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق " یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو! پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا۔ تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے۔ " کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق " یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی

سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے جب اسی طرح مصرع مذکور کی تکرار کرو گئے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے،، (یادگار غالب ص ۱۱۸)

بنیادی تصور:۔ میرے بعد عاشقی کا سلسلہ ہی درہم برہم ہو گیا۔

ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لئے آغوش وداع
(۷) چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

آغوشِ وداع سے مراد ہے بوقتِ رخصت بغلگیر ہونا + چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، یعنی چاک، گریباں سے رخصت ہوتا ہے +

مطلب:۔ میری وفات کے بعد عشق، اربابِ عشق سے اور چاک گریباں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہے۔ یعنی آئندہ نہ کوئی عشق کرے گا نہ گریباں چاک کرے گا۔ بنیادی تصور:۔ کاروبار عاشقی میرے دم سے قائم تھا۔

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
(۸) کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

مطلب:۔ مجھے سارا غم اس بات کا ہے کہ میرے بعد کوئی شخص اس قابل بھی نہیں ہے کہ مہر و وفا کے ساتھ اظہار ہمدردی کر سکے۔ یعنی مہر و وفا کرنا، عاشقی کرنا، تو بڑی بات ہے کوئی شخص مہر و وفا کا پرسان حال بھی نہ ہو گا۔

بنیادی تصور:۔ میرے بعد عاشقی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
(۹) کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

مطلب:۔ مجھے عشق کی بے کسی اور خانہ بربادی پر رہ رہ کر رونا آرہا ہے کہ میرے بعد یہ سیلاب بلا،، (عشق بلاؤں کا سیلاب ہی تو ہوتا ہے)، کس کے گھر قیام پذیر ہو سکے گا؟ کون ایسا باہمت ہے جو اسی سیلاب بلا کو

اپنے گھر بطور مہمان رکھنے کو تیار ہوگا؛ یعنی عاشقی کی بلائیں کون جھیلے گا!
بنیادی تصور:۔ ناز برداریٔ عشق میرے ہی دم سے تھی۔

ردیف۔ (۱۸)

(۵۹)

(۱) بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر، در و دیوار ٭ نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار
مطلب:۔ اگر محبوب کے دیدار میں، اس کے مکان کے در و دیوار حائل ہیں تو مجھے ان کی کوئی پروا نہیں ہے بلکہ میری نگاہ میں تو ان کا وجود، شوقِ دیدار کے لئے بال و پر کا کام دیتا ہے یعنی مزاحمت سے جذبۂ عشق (ذوقِ دید) میں اور ترقی ہوتی ہے۔
بنیادی تصور:۔ حجاب، مانع دید نہیں ہو سکتا۔

(۲) وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ ٭ کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
مطلب:۔ فراقِ یار میں اس قدر رو دیا کہ گھر میں سیلاب آگیا۔ اور اس کی وجہ سے پورا مکان منہدم ہو گیا۔ یعنی جہاں دیوار تھی، وہاں دروازہ ہو گیا۔ اور جہاں دروازہ تھا وہاں مٹی کے ڈھیر کی وجہ سے دیوار نظر آنے لگی۔
بنیادی تصور:۔ تباہ کاریٔ وفورِ اشک۔

(۳) نہیں ہے سایہ کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار ٭ گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار
مطلب:۔ جسے تم سایۂ در و دیوار سمجھتے ہو، یہ سایہ نہیں ہے بلکہ یار کے آنے کی خبر سُن کر میرے گھر کے در و دیوار اس کی پیشوائی کے لئے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔
بنیادی تصور:۔ مسرتِ نویدِ آمدِ یار۔

(۴) ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ ٭ کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار
مطلب:۔ اے محبوب! تیرے جلوہ کی ارزانی کا یہ عالم ہے کہ انسان تو درکنار تیرے کوچہ کے در و دیوار پر بھی مستی چھا رہی ہے۔
بنیادی تصور:۔ ارزانیٔ جلوۂ یار

(۵) جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ ٭ کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر، در و دیوار
سرِ سودائے انتظار یعنی جنسِ انتظار کی خریداری کا خیال + سودا، دکان اور متاع میں رعایتِ لفظی ہے +
مطلب:۔ اے مخاطب! اگر تجھے بھی میری طرح اس کے انتظار کا سودا (خیال) ہے تو آ۔ یہ سودا (انتظار) مجھ سے خریدے! میں نے اس کے انتظار میں اس کے مکان کے در و دیوار پر اپنی نظریں اس طرح جمائی ہیں کہ در و دیوار متاعِ نظر کی دکان بن گئے ہیں یعنی میری نظریں اس طرح قرینے سے سجی ہوئی ہیں جس طرح دکان میں سودا۔
بنیادی تصور:۔ کیفیتِ انتظارِ یار۔

(۶) ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے ٭ کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
مطلب:۔ جب کبھی میں نے رونے کا ارادہ کیا، تو میرے گھر کے در و دیوار میرے پاؤں پر گر پڑے یعنی میری منت سماجت کرنے لگے کہ ایسا نہ کرنا، ورنہ سیلابِ گریہ ہمیں بہا لے جائے گا۔
دوسرا مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے کہ محض رونے کا بندوبست دیکھ کر در و دیوار گر پڑتے ہیں، رونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

بنیادی تصور:۔ تاثیرِ سامانِ گریہ۔
(۷) وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے ٭ ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

مطلب :- جب محبوب میرے پڑوس میں آکر رہا۔ تو اس کے مکان کا سایہ میرے مکان کے در و دیوار پر پڑا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ میرے در و دیوار اس کے در و دیوار پر فدا ہو گئے۔

بنیادی تصوّر :- تاثیر حسن محبوب۔

(۸) نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار!

مطلب :- تیرے بغیر ہمیں اپنا گھر اس قدر سونا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے در و دیوار کی بے رونقی پر آنسو بہاتے رہتے ہیں لطف بیان اس بات میں مضمر ہے کہ نظر میں کھٹکے ہے" کے دو معنی ہیں (۱) ناگوار محسوس ہوتی ہے یا بُری معلوم ہوتی ہے (۲) جب آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے تو پانی نکلنے لگتا ہے گویا آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

بنیادی تصوّر :- تصوّرِ فراقِ یار۔

(۹) نہ پوچھ بے خودیٔ عیش مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر، در و دیوار

مطلب :- سیلاب کی آمد کی خبر سے در و دیوار کو ایسی مسرت حاصل ہوئی ہے کہ وہ عالمِ بیخودی میں رقص کر رہے ہیں یعنی سیلاب کے آنے کی خوشی میں پہلے ہی سے گر پڑے!

بنیادی تصوّر :- مسرتِ آمدِ سیلاب۔

(۱۰) نہ کہہ کسی سے، کہ غالب، نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار!

مطلب :- اے غالب! اپنا رازِ محبت کسی سے مت کہہ۔ کیونکہ کوئی شخص

اس راز کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ اگر کہنا ہی ہے تو در و دیوار سے کہدے۔ لیکن وہ سُن نہیں سکتے۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ کسی سے بھی مت کہہ۔ در و دیوار سے کہنے میں ایک مفہوم یہ بھی مضمر ہے کہ وہ کسی سے کہہ نہیں سکتے۔

بنیادی تصور:۔ تاکید اخفاءِ رازِ محبت۔

---

(۶۰)

(۱) گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر ؛ جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر

مطلب:۔ محبوب غالبؔ سے کہا کرتا تھا کہ مجھے تیرے گھر کا کچھ پتہ نہیں، ملوں تو کیسے؛ غالب کہتے ہیں کہ میں نے تیرے دروازے کو اپنا گھر بنا لیا ہے۔ کیا اب بھی تو یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے تیرے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ دفع عذرِ لنگِ محبوب۔

(۲) کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن ؛ جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر، کہے بغیر

مطلب:۔ جب میں حالِ دل بیان کیا کرتا تھا تو وہ متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ اب جبکہ شدتِ ضعف سے مجھ میں تابِ گویائی باقی نہیں رہی تو وہ یہ کہتا ہے کہ جب تک تو اپنا حالِ دل بیان نہ کرے میں تیری آرزو کس طرح پوری کر سکتا ہوں مجھے کیا معلوم تو کیا چاہتا ہے!

بنیادی تصور:۔ ستم طریفیٔ محبوب۔

(۳) کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جسکا جہان میں ؛ لیوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر

مطلب:۔ مجھے ایسے ستم شعار محبوب سے پالا پڑا ہے کہ دنیا میں جو شخص بھی اسکا نام لیتا ہے تو پہلے اس کے ظلم و ستم کا بیان کرتا ہے پھر کچھ کہتا ہے یعنی ستمگر اس کے نام کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ ستم شعاریٔ محبوب۔

(۴) جی ہی میں کچھ نہیں ہمارے، وگرنہ ہم ؎ سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

مطلب:۔ ہم جو خاموش ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم مرنے سے ڈرتے ہیں دراصل قصّہ یہ ہے کہ ہم اس درجہ مایوس ہو گئے ہیں کہ کوئی آرزو ہی دل میں باقی نہیں ہے۔ اگر کوئی آرزو ہوتی تو ہم ضرور زبان پر لاتے خواہ ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔

بنیادی تصوّر:۔ تصویرِ عالمِ مایوسی۔

(۵) چھوڑونگا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پُوجنا ؎ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

لفظ "چھوڑے" کی تکرار سے شعر میں بہت دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

مطلب:۔ خواہ دنیا مجھے کافر ہی کیوں نہ قرار دیدے مگر میں اس کی پرستش سے باز نہیں آؤں گا۔

بنیادی تصوّر:۔ وفاداری بشرطِ استواری۔

(۶) مقصد ہے نازو غمزہ، ولے گفتگو میں کام ؎ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

(۷) ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؎ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مطلب:۔ غالبؔ کے یہ دونوں شعر، اربابِ معنی کی نگاہ میں بہت وقیع ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ان شعروں میں وہ نکتہ بیان کیا ہے جو ہر شخص کے نزدیک مقبول اور مُسلّم ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ عوام الناس معقولات (غیر محسوس امور) کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے، ان کو سمجھانے کی صورت صرف یہ ہے کہ معقولات کو محسوسات کے لباس میں پیش کیا جائے۔ مثلاً ناز و ادا یا غمزہ و عشوہ سے عاشق کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو بیان کرنے کے لئے تشبیہہ و استعارہ کا سہارا لینا پڑتا ہے (کیونکہ وہ کیفیت لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں ہو سکتی)، یعنی عاشق اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُس کی ادا

کیا تھی؛ بس یہ سمجھو کہ ایک خنجر تھا جو میرے جگر میں پیوست ہو گیا۔ اس کی نگاہ کیا تھی! بس یہ سمجھو کہ ایک تیر تھا جو دل کے پار ہو گیا۔ اسی طرح جب انسان صفاتِ باری کا بیان کرنا چاہتا ہے تو ان حقائق کے اظہار کے لئے مجاز کا سہارا لیتا ہے مثلاً سالک پر جب عالمِ وجد طاری ہوتا ہے تو وہ اُس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے کہ ساقی نے اپنی محبت کی شراب پلا کر مجھے مدہوش کر دیا۔ خلاصۂ کلام اینکہ تشبیہہ و استعارہ کے بغیر کوئی عاشق یا شاعر اپنی قلبی کیفیت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اگر وہ حقیقت کو مجاز کے لباس میں پیش نہ کرے تو عوام ادراکِ حقیقت سے بالکل ہی محروم رہیں گے۔

بنیادی تصور:۔ معقولات کے بیان میں محسوسات سے کام لینا ناگزیر ہے۔

(۸) بہرا ہوں میں، تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات، مکرر کہے بغیر

مطلب:۔ میں چونکہ بہرا ہوں اس لئے جب تک دہرائی نہ جائے میں سن نہیں سکتا۔ لہٰذا آپ کو لازم ہے کہ ناراض ہونے کے بجائے میری طرف دگنا التفات کریں۔

بنیادی تصور:۔ حسنِ طلبِ التفاتِ یار۔

(۹) غالبؔ اِنکر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پہ کہے بغیر

مطلب:۔ اے غالبؔ! تجھے ان کی بارگاہ میں اپنا حالِ دل، بار بار عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ اس قدر قیافہ شناس ہیں کہ صرف تیری صورت دیکھ کر تیرے جذبات سے واقف ہو سکتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ غالبؔ کا محبوب اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْر کا مصداق ہے

(۶۱)

(۱) کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر ؎ جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
کیوں نہ جل گیا یعنی کیوں نہ فنا ہو گیا؟ + جلتا ہوں یعنی پیچ و تاب کھا رہا ہوں
یا مجھے اپنی طاقتِ دیدار پر غصّہ آرہا ہے + دیدار اور دیکھ کر میں معنوی مناسبت ہے
مطلب :۔ مجھے جلوۂ یار دیکھ کر فنا ہو جانا چاہیئے تھا + کیونکہ اس صورت میں
مقصدِ حیات حاصل ہو جاتا، مگر میں ایسا سخت جان نکلا کہ ابھی تک زندہ ہوں اس
لئے مجھے اپنی طاقت دیدار پر بیحد غصّہ آرہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب میں غصّہ
کی آگ میں جل رہا ہوں، اور اس جلنے میں کوئی لطف نہیں ہے مزہ تو جب تھا
کہ جلوۂ یار کی آگ میں جل کر تمام ہو جاتا یعنی فارغ المرام ہو جاتا۔

بنیادی تصوّر :۔ ماتمِ طاقتِ دیدار۔

(۲) آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے ؎ سرگرمِ نالہائے شرربار دیکھ کر!
مطلب :۔ چونکہ میں ہر وقت ایسے نالے کرتا رہتا ہوں، جن سے آگ برستی
ہے اس لئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آتش پرست ہوں۔ آتش، گرم اور شرر
تینوں لفظوں میں مناسبت ہے۔

بنیادی تصوّر :۔ ذوقِ نالہ کشی۔

(۳) کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا ؎ رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
مطلب :۔ چونکہ معشوق بے سبب آزار ہے یعنی ہر کس و ناکس پر جفا کرتا ہے
اور اس طرح اس نے اس امتیاز کو مٹا دیا جو سچّے اور جھوٹے عاشق میں پایا
جاتا ہے اس لئے غالبؔ کہتے ہیں کہ مجھے تم سے اظہارِ محبت کرنے میں تامل
ہے، کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو میرے عشقِ صادق کی توہین ہو جائے گی۔

بنیادی تصوّر :۔ احترامِ جذبۂ عشق۔

(۴) آتا ہی میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے ؛ مرتا ہوں اسکے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مطلب :۔ اگرچہ وہ میرے ہی قتل کے لیئے آرہا ہے مگر مجھے تلوار کی خوش نصیبی پر کہ اُسے قربِ محبوب حاصل ہے، اس قدر رشک آرہا ہے کہ موت سے پہلے مرا جاتا ہوں۔ بقول نظم طباطبائی "غالب نے معنیٔ رشک کے اتنے پہلو نکالے ہیں کہ ان کی تعریف حدِ امکان سے باہر ہے"

بنیادی تصوّر :۔ رشک بر خوش نصیبیٔ شمشیر۔

(۵) ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق ؛ لرزے ہے موجِ مے، تری رفتار دیکھ کر

مطلب :۔ معشوق جب شراب پی کر باہر نکلا، تو موجِ مے، شیشے میں اس خیال سے لرز اُٹھی کہ اس کی مستانہ چال کو دیکھ کر ہزاروں آدمی اپنی جان سے جاتے رہیں گے اور ان کا خون، مینا کی گردن پر ثابت ہو جائے گا۔

مومن نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے :۔

ہے ایک خلق کا خوں چشمِ خونفشاں پہ مری
سکھائی طرز اسے دامن اُٹھا کے آنے کی۔

بنیادی تصوّر :۔ مستانہ خرامیٔ محبوب۔

(۶) وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ؛ ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

مطلب :۔ صد افسوس! کہ جب محبوب نے یہ دیکھا کہ غالب میری ایذا رسانی سے لطف اندوز ہو رہا ہے تو اُس نے مشقِ ستم ترک کر دی۔ محبوب کی ایذا رسانی کو بڑے دلکش انداز سے ثابت کیا ہے۔

بنیادی تصوّر :۔ ستم کوشیٔ محبوب۔

(۷) بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ ؛ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

مطلب :۔ میرا کلام وُہی شخص خریدتا ہے جو سخن فہم ہوتا ہے اور چونکہ میں ہر

سخن فہم کی نہایت قدر و منزلت کرتا ہوں اس لئے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے میرا کلام ہی نہیں خریدا بلکہ مجھ کو بھی خرید لیا۔

بنیادی تصوّر:۔ قدر دانی اربابِ سخن فہم۔

(۸) زنار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ؛ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

مطلب:۔ اس شعر میں غالبؔ نے حسبِ معمول شعر کی بنیاد خیال بندی پر قائم کی ہے دعویٰ یہ کیا ہے کہ تسبیح (اسلام) کے مقابلہ میں زنار (کفر) لائقِ ترجیح ہے اس کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ یہ بات مسلّم ہے کہ رہرو ہمیشہ ہموار راستہ کو ترجیح دیتا ہے چونکہ تسبیح میں دانوں کی وجہ سے ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے اور زنار میں دانہ نہ ہونے کی وجہ سے سراسر ہمواری ہوتی ہے لہذا تسبیح کے بجائے زنار پہن لینا چاہیئے۔

بنیادی تصوّر:۔ ترجیح زنار بمقابلہ تسبیح۔

(۹) اِن آبلوں سے پاؤں کے، گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

مطلب:۔ یہ شعر غالبؔ کی افتادِ طبع کا مظہر ہے وہ ہمیشہ مسلّمات سے انحراف کرتے ہیں عام طور سے لوگ راہ کو پُر خار دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں مگر غالبؔ اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، کیوں؟ اس لئے جب آبلوں میں کانٹے چبھیں گے، تو اذیت میں شدّت ہوگی اور عاشقِ صادق کو جس قدر زیادہ اذیت نصیب ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ راحت محسوس ہوتی ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ اذیت دوستیٔ عاشق۔

(۱۰) کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے ؛ طوطی کا عکس سمجھے ہے، زنگار دیکھ کر

مطلب:۔ آئینہ فولاد کے جوہر سبزی مائل ہوتے ہیں اور شعراء ان کو طوطی سے

تشبیہ دیتے ہیں۔ اس تشبیہ سے غالب کی قوت تخیل نے یہ نکتہ طرازی کی کہ جب محبوب نے میرے آئینہ میں سبز رنگ دیکھا تو اس نے یہ گمان کیا کہ شاید غالب نے کوئی طوطی پال لیا ہے اور میرے بجائے اس سے محبت کرتے لگا ہے۔

میری رائے میں غالب نے یہ شعر محض قافیہ کی خاطر موزوں کیا ہے[۱] اس کے علاوہ اس میں اور کوئی خوبی نہیں ہے۔

بنیادی تصویر:۔ بدگمانیٔ محبوب۔

(۱۱) گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مطلب:۔ حالی فرماتے ہیں "اس شعر میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا۔ مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے، اور وہ ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ شاعر کہتا ہے کہ برقِ تجلی کے مستحق ہم تھے نہ کہ کوہِ طور۔ کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے۔ پس کوہِ طور جو منجملہ جمادات کے ہے وہ کیونکر تجلیٔ الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اس

---

[۱] پروفیسر حامد حسن صاحب قادری نے اس شعر پر تنقید کی ہے اس کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں کہ "اس شعر میں آئینہ اور طوطی کے مستعدلہ واضح نہیں ہیں۔ اگر استعارہ نہ مانا جائے اور آئینہ اور طوطی کے حقیقی معنی مراد لئے جائیں تو شعر کا مضمون نہایت بخیف ہو جاتا ہے کہ معشوق کو بدگمانی ہے کہ غالب نے کوئی طوطا پال لیا ہے۔ اور اگر آئینہ سے دل اور طوطی کے عکس سے کسی دوسرے معشوق کی تصویر مراد لی جائے تو اس پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔" (نقد و نظر صہ ۱۵)

تمثیل کے، جو اس میں بیان ہوئی ہے، بالکل اچھوتا معلوم ہوتا ہے"۔ (یادگارِ غالبؔ)

بنیادی تصور:۔ طنز بر حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

(۱۲) سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا ٭ یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مطلب:۔ اے محبوب! تیری دیوار دیکھ کر مجھے غالب شوریدہ حال کا سر پھوڑ کر مرجانا یاد آ گیا۔ چند لفظوں میں ایک عاشق ناکام کی زندگی بیان کر دی۔

بنیادی تصور:۔ انجامِ عاشقِ ناکام۔

---

(۶۲)

(۱) لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر ٭ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ میری ہستی شبنم کے قطرے سے زیادہ نہیں ہے اور قطرہ بھی ایسا جو نوکِ خار پر ہو جس کی ہستی ہر آن معرضِ فنا میں ہے۔ آفتاب ناحق مجھے فنا کرنے کے درپے ہے، میں تو خود ہی چند لمحوں کا مہمان ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زحمت کشی کے احساس سے لرزہ براندام ہوں۔

بنیادی تصور:۔ ع کیا اعتبار ہستیٔ ناپائدار کا!

(۲) نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے واں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

شعر کی بنیاد اس ایہام پر ہے جو لفظ سفیدی میں پایا جاتا ہے۔ غالب کو ایہام اور رعایت لفظی سے بہت دلچسپی ہے۔ دیوان کے اکثر اشعار میرے اس خیال پر شاہد ہیں۔ ایہام سے فائدہ اٹھا کر شعر موزوں کر دینے سے قدرتِ کلام اور قوتِ تخیل کا ثبوت تو مہیا ہو جاتا ہے مگر اس قسم کے اشعار سوز و گداز اور تاثیر سے خالی ہوتے ہیں۔

مطلب:۔ سفیدی کے دو معنی ہیں۔ ایک تو آنکھ کی سفیدی، دوسرے

وہ سفیدی جو آرائش کے لیے دیوار پر پھیرتے ہیں۔ چونکہ حضرت یعقوب کی آنکھیں حضرت یوسف کو قید خانہ کی چار دیواری میں تلاش کر رہی تھیں، اس بات سے غالب نے یہ مضمون پیدا کیا کہ حضرت یوسف نے زنداں میں بھی خانہ آرائی کا انتظام کر لیا۔ دیکھ لو! دیدۂ یعقوب کی سفیدی دیوارِ زنداں پر پھر رہی ہے!

بنیادی تصوّر:۔ حسن اپنی آرائش سے غافل نہیں ہوتا۔

(۳) فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فنا تعلیم۔ اسم صفت ہے، مراد ہے وہ شخص جسے فنا کی تعلیم ہوئی ہو + فنا تعلیم درس بیخودی یعنی بیخودی کے درس سے فنا کی تعلیم حاصل کرنے والا + لام الف میں خوبی یہ ہے کہ لام اور الف ملانے سے حرف "لا" بنتا ہے اور "لا" نفی یا نیستی پر دال ہے۔

مطلب:۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ میں اس وقت فنا کا سبق پڑھ چکا تھا یعنی فنانی المحبوب ہو چکا تھا، جب مجنوں عالمِ طفلی میں مکتب کی دیوار پر "لام الف" لکھتا تھا یعنی مقامِ فنا سے نا آشنائے محض تھا۔

بنیادی تصور:۔ تفوق بر قیس۔

نوٹ:۔ پروفیسر حامد حسن صاحب قادری فرماتے ہیں "فنا تعلیم کے معنی ہیں فنا کی تعلیم پائے ہوئے۔ یہ ترکیب خود فارسی میں بھی نامانوس ہے۔ پھر فنا تعلیم کی اضافت "درسِ بیخودی" کی طرف کر دینے سے اور بھی پیچ در پیچ ہو گیا۔ درس کے لفظ کی قطعاً ضرورت نہ تھی، "فنا تعلیم بیخودی" بالکل کافی تھا۔ لفظِ درس نے ایک اضافت اور بڑھا دی۔" (نقد و نظر ص ۱۵)

(۴) فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

مطلب:۔ اگر میرے دل کے ٹکڑے بل بانٹ کر نمک لگا لیا کرتے (بات یہ ہے کہ ہر ٹکڑا پورے نمکدان پر قابض ہونا چاہتا ہے تاکہ سارا نمک خود استعمال کر سکے) تو مجھے مرہم کی تلاش میں تشویش سے دوچار ہونے کی نوبت نہ آتی!

بنیادی تصور:۔ ایذا دوستیٔ عاشق۔

(۵) نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومارِ نازِ ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر

اقلیمِ الفت یعنی محبت کی دُنیا، طومارِ ناز بمعنی دفترِ ناز و ادا۔ کنایہ ہے دلِ عاشق سے، پُشتِ چشم۔ کنایہ ہے بدلی ہوئی نظر سے (معشوق ہمیشہ دل لینے کے بعد نگاہیں پھیر لیا کرتے ہیں) عنوان بمعنی سرنامہ۔

مطلب:۔ دنیائے الفت میں کوئی عاشق ایسا نہیں ہے جس کے دل پر معشوق کی بیرخائی کی مہر نہ لگی ہوئی ہو۔ یعنی جس نے معشوق کی کج ادائی کا صدمہ نہ اٹھایا ہو۔

بنیادی تصور:۔ بے اعتنائیٔ محبوب۔

نوٹ:۔ نظم طباطبائی لکھتے ہیں "الفت کو اقلیم سے تعبیر کرنا بلا وجہ ہے۔ دوسرے مصرع کی بندش میں گنجلک بہت ہو گئی ہے۔" (شرح دیوان غالب ص۲۶)

جوش ملسیانی لکھتے ہیں۔ "یہ شعر بھی پیچیدہ بیانی کی مثال ہے۔ طومارِ ناز سے دل مراد ہے مگر یہ استعارہ بہت بعید الفہم ہے" (شرح دیوان غالب ص۱۶)

(۶) مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

ابرِ شفق آلود اور آتش میں سرخی، وجہ مشابہت (تشبیہ) ہے۔

مطلب:۔ لفظ اب سے یہ مضمون مستنبط ہو سکتا ہے کہ عاشق اُس زمانہ

کا ذکر کر رہا ہے جب وہ محبوب کے فراق کی اذیت میں مبتلا تھا۔ اُس وقت اُسی ابرِ شفق آلود کو دیکھ کر (جو اب اسے دلکش معلوم ہوتا ہے) اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلشن کے اوپر آگ برس رہی ہے۔

بنیادی تصور:۔ یادِ ایامِ فرقت (جب دل افسردہ ہو تو اچھی چیز بھی بُری معلوم ہوتی ہے)۔

(۷) بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا ٭ قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

'پروازِ شوقِ ناز' سے مراد ہے محبوب کے ناز و انداز پر مر مٹنے کا جذبہ +

مطلب:۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ قیامت میں مُردے، اپنے جسم عنصری کے ساتھ زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ غالب کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے مگر اس کے شہیدوں میں اس کے ناز پر مر مٹنے کی آرزو کے سوا اور باقی ہی کیا رہا ہوگا جسے قیامت اٹھائے گی؛ ان کے حق میں قیامت زیادہ سے زیادہ اک ہوائے تند کا کام دے سکتی ہے یعنی صرف ان کی خاکِ مزار کو منتشر کر سکتی ہے۔

بالفاظِ دگر، ان پر جو قیامت گذرتی تھی وہ تو نازِ محبوب ہی کو دیکھکر گذر گئی۔ اب شوقِ ناز کے سوا ان میں کچھ باقی ہی نہیں ہے اور شوقِ ناز کوئی مادی شئے نہیں ہے جسے قیامت اٹھا سکے۔ اس لیے ان کے حق میں قیامت ایک ہوائے تند سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ ان کی خاکِ مزار کو پریشان کر دے۔

بنیادی تصور:۔ شہیدانِ محبت پر قیامت بھی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

(۸) لڑا ناصح سے غالب، کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مطلب:۔ اے غالب! اگر ناصح نے تجھ پر شدت کی یعنی تجھے ناحق ریلا سبب)

موردِ الزام بنایا تو اس کے اس بیجا یا ناروا طرزِ عمل پر اس سے مناقشہ مت کر۔ دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ طاقتور لوگ کمزوروں کو ستایا کرتے ہیں (ان پر شدت کیا کرتے ہیں) تو اپنے طرزِ عمل پر غور کر! اگر ناصح تجھ پر شدت کرتا ہے۔ حالانکہ تو بے قصور ہے تو، تو بھی گریبان چاک کرتا ہے حالانکہ وہ بالکل بے قصور ہے!

بنیادی تصور :۔ دنیا میں زبردست ہمیشہ زیردستوں کو تختۂ مشقِ ستم بنایا کرتے ہیں۔

(۶۳)

(۱) ہے بسکہ ہر اک اُنکے اشارے میں نشاں اور ؛ کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

مطلب :۔ چونکہ اُن کے ہر طرزِ عمل (اشارے) میں کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ جس کا اُن کے طرزِ عمل سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے جب وہ مجھ سے اظہارِ محبت کرتے ہیں تو فوراً میرے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ ضرور اس میں بھی کوئی مقصد (فریب) پوشیدہ ہے ورنہ وہ اور مجھ سے اظہارِ محبت کریں! ع این خیال است و محال است و جنوں

بنیادی تصور :۔ عدمِ اعتماد بر اظہارِ الفتِ محبوب۔

(۲) یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مطلب :۔ اے خدا! چونکہ وہ میری گفتگو سے میرا دلی مقصد نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے اگر تو مجھے ایسی زبان (قوتِ بیان) عطا نہیں کرنا چاہتا جو انہیں دلی مطلب سے آگاہ کر سکے تو انہیں ایسا دل عطا کر دے جو میری بات سمجھ سکے۔
حالی مرحوم لکھتے ہیں :۔ "یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے

(دیکھو مطلب مذکورہ بالا) مگر اس میں در پردہ، اُن لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنیٰ یا بعید الفہم کہتے تھے۔" (یادگارِ غالب صـ۱۲۹)

بنیادی تصور:۔ آرزوئے ایضاحِ مقصدِ دل۔

(۳) ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور

پیوند بمعنی ربط یا تعلق + مقرر بمعنی یقیناً یا بلاشبہ +

مطلب:۔ شعراء عموماً نگاہ کو تیر اور ابرو کو کمان سے تشبیہ دیا کرتے ہیں غالب اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیتے ہیں کہ اس کی نگہِ ناز تو بے شک تیر ہے مگر اس کو ابرو سے کوئی تعلق نہیں (ابرو، کمان نہیں ہے)۔ یہ تیر کمانِ ابرو سے نہیں نکلا کرتا بلکہ اس کی کمان، خود اس کے حسن کی دلکشی ہے یعنی خود اس کی دلربائی کا کمال ہے۔

بنیادی تصور:۔ نگہِ ناز کی تاثیر کا منبع ذاتِ محبوب ہے نہ کہ ابرو۔

(۴) تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

مطلب:۔ چونکہ تمہارے حسن نے قیامت برپا کر رکھی ہے یعنی جو شخص تمہیں دیکھ لیتا ہے، اپنے دل و جان سے تنگ آجاتا ہے (زندگی دوبھر ہو جاتی ہے) اس لیے ہمیں اپنے دل و جان کے ہاتھ سے جاتے رہنے کا کوئی غم نہیں ہے جس وقت ضرورت ہوگی، بازار سے سستے داموں خرید لیں گے، بیچنے والے ہر قدم پر موجود ہیں۔

بنیادی تصور:۔ شہر آشوبیِ حسنِ محبوب۔

(۵) ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

مطلب :۔ حالیؔ مرحوم لکھتے ہیں۔ "اس شعر میں سارا زور "ہم" کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک ہماری ہستی باقی ہے۔ اس وقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور بھاری پتھر، سدِ راہ (رکاوٹ) ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں مشاقی (سبکدوشی) حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔" (یادگارِ غالب صہ ۱۳۰)

بنیادی تصور :۔ تلقینِ وحدت الوجود۔

(۶) ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور

مطلب :۔ زار نالی، فریاد و شیون، خونفشانی، جگر کاوی بلکہ ہر بات میں مبالغہ — یہ غالبؔ کے محبوب موضوعات ہیں۔ اس شعر میں اس تمنا کا اظہار ہے کہ اگر ان دو آنکھوں کے علاوہ چند اور آنکھیں بھی ہوتیں تو میں دل کھول کے روتا۔ خونِ جگر جوش میں ہے۔ اس لیے طبیعت خود بخود رونے پر بلکہ خون برسانے پر آمادہ ہے۔ اس کام کے لیے صرف دو آنکھیں کافی نہیں ہیں!

بنیادی تصور :۔ تمنائے خوننابہ فشانی۔

(۷) مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے
جلّاد سے لیکن وہ کہیں جائیں کہ "ہاں اور"

مطلب :۔ میں ان کے ذوقِ ستم کوشی پر دل و جان سے فدا ہوں (مرتا ہوں)، مجھے ان کی زبان سے یہ جملہ بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ "ایک ہاتھ اور" اس لیے میں بڑی خوشی سے جان دینے پر آمادہ ہوں تاکہ ان کی زبان سے بوقتِ قتل، یہ دلکش جملہ بار بار سن سکوں۔

بنیادی تصور :- تحسینِ ذوقِ ستمگاریٔ محبوب۔

(۸) لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاںتاب کا دھوکہ
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

مطلب :- میں ہر روز لوگوں کو ایک نیا داغِ جگر دکھاتا ہوں۔ میرے داغہائے جگر پر لوگوں کو ایک خورشیدِ عالمتاب کا دھوکہ ہوتا ہے! یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ آفتاب ہے جو ہر روز طلوع ہوتا ہے۔

بنیادی تصور :- تابشِ داغِ جگر۔

(۹) دیتا نہ اگر دل تمہیں، لیتا کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

مطلب :- مرزا نے اِس شعر کا مطلب خود بیان کیا ہے "یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ "لیتا" کو ربط ہے "چین" سے اور "کرنا" مربوط ہے "آہ و فغاں" سے۔ عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب ہے مگر تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح و بلیغ ہے۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی حاصلِ معنیٔ مصرعین (دونوں مصرع) یہ ہے کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا۔ تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور، آہ و فغاں کرتا۔"

(خط بنام قاضی عبدالجلیل بریلوی ص۲۷۴)

(۱۰) پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں، اور

مطلب :- حالیؔ مرحوم لکھتے ہیں "نالے یعنی ندی نالے نہ کہ آہ و نالے۔ بہ مثال (جب راہ نہیں پاتے تو ندی نالے چڑھ جاتے ہیں یعنی پانی کناروں سے باہر نکل آتا ہے) کس قدر ممثل لہٗ کے مطابق ہے اور مضمون، کتنا مطابق

واقع کے ہے! فی الحقیقت، مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب، جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اسی قدر زیادہ رواں ہوتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسبِ حال لکھتا ہے، نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔"

(یادگارِ غالب صفحہ ۱۳۰)

نوٹ :- شعر کی نثر یوں ہوگی :- جس طرح جب نالے راہ نہیں پاتے تو اور چڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب میری طبیعت رکتی ہے تو اور رواں ہو جاتی ہے

بنیادی تصور :- رفعِ انقباض کے بعد کلام میں زیادہ روانی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۱۱) ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

مطلب :- چونکہ قبل ازیں (مقدمہ میں) اس شعر کی وضاحت ہو چکی ہے اسلئے یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ بس اس قدر لکھنا کافی ہے کہ جو شخص بھی کلامِ غالب کا بامعانِ نظر مطالعہ کرے گا اسے اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ واقعی غالب کا اندازِ بیان اور ہے۔ نیز وہ اپنے اندازِ بیان پر جس قدر فخر کرتے ہیں بالکل بجا ہے۔

بنیادی تصور :- بڑے دلکش پیرایہ میں اپنے اندازِ بیان پر فخر کیا ہے!

---

(۶۴)

(۱) صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر، آبِ برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر

دوسرے مصرع میں تعقید لفظی ہے (آج کل معیوب ہے۔ مگر ع
"عہد میں غالبِ ناشاد کے معیوب نہ تھی"

نثر یوں ہوگی :- آخر کار آبِ برجا ماندہ کا رنگ، تغیر پاتا ہے۔ یعنی

ٹھہرے ہوئے پانی کا رنگ اور ذائقہ بدل جاتا ہے۔

مطلب :۔ آئینۂ فولادی پر جو زنگ لگ جاتا ہے غالب نے اس شعر میں اس کی شاعرانہ توجیہہ پیش کی ہے یعنی اس شعر میں حسن تعلیل کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ آئینہ میں زنگ اس لیے لگ جاتا ہے کہ وہ حیران ہوتا ہے (شعراء عموماً آئینہ کو حیران باندھا کرتے ہیں) اور حیرانی مستلزم جمود ہے۔ اور جو شئے ساکن و جامد ہو جائے اس میں کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے مصرع میں مثال سے اپنے دعویٰ کو ثابت کیا ہے کہ دیکھ لو! جو پانی ٹھہرا ہوا ہوتا ہے اس کا رنگ اور ذائقہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ خلاصۂ کلام اینکہ سکون و جمود (حیرت) سے اشیاء کی ذاتی خوبیاں زائل ہو جاتی ہیں۔

بنیادی تصور :۔ درسِ عمل و حرکت۔

(۲) نہ نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

تدبیر نہ کی یعنی ازالہ نہ کیا + زمرد دافعِ وحشت ہے + پلنگ یعنی چیتا اپنی وحشت کے لیے مشہور ہے + داغِ پلنگ سے مراد ہے وہ سیاہ رنگ کے گول نشان جو چیتے کی کھال پر ہوتے ہیں + جامِ زمرد، داغِ پلنگ ہو گیا یعنی جامِ زمرد کے استعمال سے وحشت کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی۔

مطلب :۔ سامانِ عیش و عشرت سے عاشق کی وحشت کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھ لو! میں نے جامِ زمرد میں شراب پی (دولت مند لوگ جامِ زمرد استعمال کرتے ہیں) لیکن ازالہ کے بجائے میری وحشت میں اور اضافہ ہو گیا۔

بنیادی تصور:۔ دولت سے سکونِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۶۵)

(۱) جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

گریباں چاک، بمعنی چاکِ گریباں + حق ہو گیا یعنی اس کا مجھ پر احسان ہے

مطلب:۔ اگر عاشق عریاں نہ ہو تو اس کے جنون کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ چونکہ چاک گریبان نے مجھے عریاں کر کے میرے جنوں کی دستگیری (معاونت) کی اس لیے میں اس کا ممنون ہوں۔

بنیادی تصور:۔ توقیر و تحسینِ چاکِ گریبان۔

(۲) برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

برنگ بمعنی مانند یا مثل + نیرنگِ بیتابی یعنی بیتابی + ہزار آئینہ دل یعنی ہزاروں دل + بال بمعنی بازو + بیتابی، فعل باندھے ہے، کا فاعل ہے + شعر کی نثر یوں ہو گی:۔ نیرنگِ بیتابی نے، برنگِ کاغذِ آتش زدہ بال یک تپیدن پر، ہزار آئینہ دل، باندھ دیئے ہیں۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ بیقراری کی عجب کیفیت ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تڑپنے والے کے بازوؤں پر ہزاروں بیقرار دل باندھ دیئے ہیں اور یہ کیفیت جلے ہوئے کاغذ کی مانند ہے جس پر نقطے ایک چمک کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں۔ غالب نے بال یک تپیدن کو کاغذِ آتش زدہ سے اور اس کے نقاطِ روشن کو دلوں سے تشبیہہ دی ہے۔

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ تپش و اضطراب۔

(۳) فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

مطلب :- حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا۔ اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔" (یادگار غالب صد ۱۳۰)

بنیادی تصور :- عیش رفتہ، باز نمی آید۔ فلک سے عیش رفتہ کی واپسی کی توقع ایسی ہی ہے جیسے رہزن سے متاعِ بردہ کی واپسی کی توقع ۱۲

(۴) ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

بے سبب رنج بمعنی بے سبب رنجیدہ ہو جانے والا + آشنا دشمن بمعنی دوستوں کا دشمن۔

مطلب :- ہمیں ایسے بے سبب رنج اور آشنا دشمن (محبوب) سے پالا پڑا ہے جو شعاعِ مہر کو بھی میری نگاہ سمجھتا ہے اور مجھ سے لڑتا ہے کہ یہ شعاعِ مہر نہ تھی بلکہ تیری نگاہ تھی یعنی تو مجھے جھانک رہا تھا!

بنیادی تصور :- خوئے بد را بہانہ بسیار۔

(۵) فنا کو سونپ، اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

فنا کو سونپ یعنی اپنی خودی فنا کو سونپ یعنی ذاتِ مطلق میں فنا ہو جا + گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا یعنی اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے

یا اپنی معرفت حاصل کرنی چاہتا ہے + فروغ طالع خاشاک یعنی گھاس پھونس کی قسمت کا عروج۔ فروغ کا لفظ گلخن کی رعایت سے لائے ہیں۔ ورنہ اس کی جگہ "عروج" بھی لا سکتے تھے۔ موقوف بمعنی منحصر + گلخن بمعنی بھٹی +

واضح ہو کہ اس شعر میں لفظ فنا، تشریح طلب ہے۔ وہ اس لیے کہ جو لوگ فلسفۂ تصوف کی اصطلاحات سے واقف نہیں ہیں۔ وہ اس سے لغوی معنی یعنی فنائے ذات مراد لے کر شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں [۱] یہ لفظ فلسفۂ تصوف کی ایک اصطلاح ہے اور حضرات صوفیائے کرام رح اس سے فنائے ذات مراد نہیں لیتے۔ کیونکہ لے نہیں سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ فنائے ذات تو قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے، اور کوئی صوفی قرآنی تعلیمات سے انحراف نہیں کر سکتا۔

حضرات صوفیہ جب یہ لفظ بولتے ہیں۔ یعنی جب وہ یہ کہتے ہیں کہ اپنی خودی کو فنا کر دو۔ تو ان کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ اپنی ذات کو فنا کر دو۔ کیونکہ اگر سالک نے اپنی ذات کو فنا کر دیا۔ تو محبوب حقیقی کا

---

[۱] غلط فہمی کا مبنیٰ یہ ہے کہ جو لوگ عربی سے ناواقف ہیں وہ تصوف کا مطالعہ مستشرقین کی عینک لگا کر کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ خود تصوف کی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے جب لفظ فنا دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن بودھ دھرم کے "نروان" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اپنی نادانی سے یہ سمجھ لیتے ہیں۔ کہ اسلامی تصوف نے بھی بودھ دھرم کی طرح فنائے ذات کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ اسلامی تصوف اس کے برعکس تعلیم دیتا ہے یعنی فنا، سے مراد ہے فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جانا ۱۲

دیدار (لقاء رب) کون کرے گا؟ اسلامی تصوف کا نصب العین فنار ذات نہیں ہے بلکہ لقاءِ رب ہے اور لقاء کے لیے ذات کی بقار لازمی ہے. تو پھر کوئی صوفی اپنے نصب العین کے خلاف کیسے تعلیم دے سکتا ہے؟

پس فنا سے مراد یہ ہے کہ نفسِ امارہ کی خواہشات کو فنار کر دو۔ (نہ یہ کہ اپنی ذات کو فنار کر دو) اور ان خواہشات یا میلانات کے ازالہ کے بعد اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو۔ جب تم اپنے نفس کے اعتبار سے فانی ہو جاؤ گے تو ذات کے اعتبار سے باقی ہو جاؤ گے۔

فقر مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیر او، مولیٰ صفات (اقبال)

جب سالک مقامِ فنا حاصل کرتا ہے تو اس کی انفرادی شخصیت علی حالہ برقرار رہتی ہے صرف نفسانی خواہشات فنا ہو جاتی ہیں۔ ان کی فنار کے بعد وہ صفاتِ ایزدی اپنے اندر جذب کرتا ہے (یہ کام عشق کے ذریعہ سے ہوتا ہے) اور جب وہ پورے طور سے متصف بصفاتِ الٰہیہ ہو جاتا ہے تو اس میں بھی رنگِ دوام پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ باقی باللہ ہو کر حیاتِ ابدی اور سرورِ سرمدی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

عشق کا خاصہ یہ ہے کہ وہ عاشق میں معشوق کی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ معشوق غیر فانی ہے اس لیے عاشق بھی غیر فانی ہو جاتا ہے؛ بالفاظِ دگر، جس طرح معشوق کی تجلیات کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ اسی طرح عاشق کی سیر بھی کبھی ختم نہیں ہو گی ؎

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے، مرحلۂ شوق نہ ہو طے (اقبال)

مطلب :- اے مخاطب! خس وخاشاک بظاہر نہایت حقیر اور بے مایہ ہیں۔ لیکن جب یہی خاشاک اپنا وجود گلخن کو سونپ دیتا ہے تو اس میں آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں یہی اس کا فروغِ طالع ہے۔ یہی اس کے نصیبے کا چمکنا ہے اسی طرح اگر تو اپنی معرفت حاصل کرنی چاہتا ہے تو اپنے نفس کو عشق الٰہی کی آگ میں ڈال دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تجھ میں صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ یعنی جب نفس کی آلائش فنا ہو جائے گی تو تیری خودی کندن کی طرح چمکنے لگے گی۔ اس وقت تجھے اپنی حقیقت سے آگاہی ہو جائے گی۔ یعنی تجھے اس بات کا عرفان حاصل ہو جائے گا کہ میں مظہر ذاتِ باری ہوں۔

یہ ہے وہ فنا جس کی تعلیم صوفیائے کرام نے دی ہے اور یہ تعلیم آنحضرت صلعم کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے "مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوا"۔ یعنی موت سے پہلے مرجاؤ۔ بالفاظِ دگر زندگی ہی میں اپنے نفس پر موت (فناء) وارد کر دو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو یا اپنی مرضی کو حق تعالےٰ کی مرضی کے تابع کر دو۔ اسی اتباع ہی کا اصطلاحی نام فناء ہے۔

حضرت شیخ علی ہجویری فرماتے ہیں کہ نفی (فناء) سے صفات مذمومۂ بشری کی نفی مراد ہے نہ کہ نفیٔ ذات۔ سالک کو چاہیئے کہ نفیٔ صفات مذمومہ کرتا رہے اور ان کی جگہ (اتباع شریعت کی بدولت) صفاتِ محمودہ بصفاتِ حق تعالیٰ پیدا کرتا رہے۔ (کشف المحجوب ص ۲۹۷)

بنیادی تصور :- انسان فنا فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جاتا ہے (فناء ذریعۂ بقاء ہے)۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
(۶) تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

مطلب:۔ پہلے مصرع میں استفہام نہیں ہے بلکہ استعجاب ہے یعنی اسد محبوب کی اداؤں پر اس درجہ مٹا ہوا ہے کہ اس سے کہتا ہے کہ تو شوق سے مشق ناز کیے جا یعنی انسانوں کو اپنی تیغ ناز و ادا سے قتل کیے جا۔ قیامت میں باز پرس کا خیال دل میں ہرگز مت لائیں تیری طرف سے خونِ دو عالم اپنی گردن پر لے لوں گا تجھے ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچنے دوں گا۔

بنیادی تصور:۔ دلفریبی دلکشی ناز محبوب۔

نوٹ:۔ نظم طباطبائی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس شعر کی تعریف حد امکان سے باہر ہے ۱۲۔

---

(۶۶)

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر!

مطلب:۔ غالب اپنے معشوق کو چھیڑتے ہیں کہ میں جو تیرے ستم خاموشی کے ساتھ برداشت کر رہا ہوں اس میں یہ مصلحت ہے کہ دنیا کے تمام حسین افراد تجھ پر عاشق ہیں یعنی وہ سب میرے رقیب ہیں جس وقت مجھے کوئی ایسا رقیب مل جائے گا جو مجھ جیسا حسین ہو گا۔ میں فوراً اس سے دل لگا لوں گا مجھے تو اپنی دلبستگی کا ساماں درکار ہے۔ اتنے حسینوں میں سے ایک نہ ایک تو میرے ہتھے چڑھ ہی جائے گا۔

بنیادی تصور:۔ تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔

(۶۷)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اَور
(۱) تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اَور

نوٹ :۔ یہ غزل دراصل جوانمرگ عارف کا مرثیہ ہے لیکن ہر شخص اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوتا ہے اس لئے مرثیہ میں بھی طنز اور شوخی کا رنگ موجود ہے مثلاً۔

ع کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اَور

ع کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور

ع کرنا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

زین العابدین خاں عارف، مرزا صاحب کی بیوی کے بھانجے تھے اس کے علاوہ نہایت علم دوست اور سخن فہم اور ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے مرزا صاحب انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں وفات پائی ۱۲

مطلب :۔ اے عارف! تمہیں لازم تھا کہ ابھی نہ مرتے، میرے مرنے کا رستہ دیکھتے تاکہ ہم تم دونوں ساتھ ساتھ ملک عدم کو سدھارتے۔ اب چونکہ تم مجھے چھوڑ کر اکیلے ہی چلے گئے اس لئے کچھ دنوں تک (میری وفات تک) اکیلے ہی رہو۔

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا!
(۲) ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اَور

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ تیرے مزار کے دروازے پر میری ناصیہ فرسائی ہمیشہ کیلئے نہیں ہے اگر میرے اس فعل سے تیرے دروازے کا پتھر نہیں گھس سکے گا تو میرا سر تو یقیناً گھس کر مٹ جائے گا۔

ناصیہ فرسا بمعنی پیشانی گھسنے والا۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
(۳) مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

مطلب :۔ تمہاری پیدائش، کل کی بات ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا تھی، جو ہمیں داغ مفارقت دے گئے! مانا کہ ہمیشگی کسی کو نہیں ہے مگر یہ تو ممکن تھا کہ چند سال اور زندہ رہتے!

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے!
(۴) کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مطلب :۔ دوسرا مصرع بہت دلکش اور وجد آفرین ہے کہتے ہیں کہ تم جو بوقت رحلت یہ کہہ رہے ہو کہ اب ہم قیامت کو ملیں گے تو کیا قیامت کا دن کوئی اور ہوگا۔ ہمارے لئے تو آج ہی قیامت کا دن ہے، اس لئے تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیئے۔ کس خوبی سے اور کیسے دلکش انداز میں یہ بات ثابت کی ہے کہ ہمارے لئے تو تمہاری رحلت ہی کا دن "قیامت کا دن" تھا!

ہاں اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
(۵) کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور ؎

مطلب :۔ شعر بالکل صاف ہے دوسرا مصرع ایسا بہم پہنچایا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ناممکن ہے کہ ایک شخص اسے پڑھے اور متاثر نہ ہو۔ ہاں

؎ کلمۂ تنبیہ ہے بمعنی خبردار ۱۲-

تم ماہِ شب چاردہم تھے، مرے گھر کے
(۶) پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

مطلب :۔ تم میرے گھر کے لئے چودہویں رات کا چاند تھے۔ چودہویں کا چاند آہستہ آہستہ گھٹتا ہے لیکن تم نے یہ کیا غضب کیا ایک دم غائب ہو گئے۔

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد وستد کے
(۷) کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور!

مطلب :- اے عارف! تم اپنی زندگی میں داد و ستد (لین دین) کے معاملہ میں تو ایسے کھرے نہیں تھے یعنی قرضخواہوں کو ٹال دیا کرتے تھے پھر تم نے ملک الموت کے ساتھ لیت و لعل ٹال مٹول، کیوں نہیں کی؟ کیا حرج ہوتا اگر ملک الموت کچھ عرصہ اور تقاضے کرتا رہتا! اس شعر میں غالب کی جدت طرازی بلاشبہ قابل داد ہے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
(۸) بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

نیّر تخلص ہے نواب ضیاء الدین احمد خاں کا جو نواب احمد بخش خاں کے بیٹے اور نواب امین الدین احمد خان بہادر والئ ریاست لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ عارف کی طرح یہ بھی غالب کے شاگرد تھے۔

مطلب :- میں نے مانا کہ تمہیں مجھ سے نفرت تھی اور نیّر سے بھی اختلاف تھا اگر اپنے بچوں کی بہار دیکھنے کے لئے ہی زندہ رہتے تو کیا حرج تھا!

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
(۹) کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

مطلب :- جس طرح تم نے اتنی عمر کسی نہ کسی طرح خوشی یا ناخوشی کی حالت میں بسر کر دی، اسی طرح اے میرے جواں مرگ عزیز! تم کچھ عرصہ اور زندگی گذار لیتے تو کیا مضائقہ تھا۔

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
(۱۰) قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسے المناک حادثہ کے بعد غالب کو زندہ نہیں

رہنا چاہیئے تھا وہ اس نکتہ سے آگاہ نہیں ہیں کہ میری قسمت میں ابھی کچھ مدت مزید تک مرنے کی تمنا کرنی لکھی ہوئی ہے۔ اندریں حالات میں قبل از وقت کیسے مر سکتا ہوں۔

ردیف (ز)

(۶۸)

(۱) فارغ مجھے نہ جان، کہ مانندِ صبحِ مہر
ہے داغِ عشق، زینتِ جیبِ کفن ہنوز

فارغ بمعنی مطمئن + صبح مہر یعنی مہر صبح + جیب بمعنی گریباں۔

مطلب:۔ اے مخاطب! یہ مت سمجھ کہ مر کر مجھے سودائے عشق سے فراغت حاصل ہو گئی ہے۔ داغِ عشق، آفتاب صبح کی طرح ہنوز میرے گریبان کفن کی زینت بنا ہوا ہے یعنی میں بدستور عشق میں مبتلا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ دوامِ داغِ عشق۔

نوٹ:۔ اس مضمون کو حضرت شاہ نیاز احمد صاحب چشتی بریلویؒ نے یوں ادا کیا ہے:۔

رفتم اندر تہِ خاک، عشق بجانم باقی است
عشق جانم بربود، آفتِ جانم باقی است

(۲) ہے نازِ مفلساں: زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

زرِ از دست رفتہ بمعنی ضائع شدہ دولت + گل فروش ہوں یعنی ناز کرتا ہوں۔

مطلب :۔ جس طرح مفلس آدمی اپنی ضائع شدہ دولت پر ناز کیا کرتا ہے، تسکین قلب کا یہی ایک پہلو باقی رہ جاتا ہے، اس طرح میں بھی اپنے داغ کہن پر ناز کرتا ہوں کہ کبھی میں بھی کسی پر عاشق تھا اور وہ دور کس قدر دلکش تھا وغیرہ وغیرہ

بنیادی تصور:۔ یادِ ایامِ عشرت فانی۔

(۳) میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

میخانۂ جگر یعنی جگر + خاک بھی نہیں یعنی ایک قطرۂ خون بھی باقی نہیں۔ خمیازہ کھینچنا یعنی انگڑائیاں لینا اور انگڑائی کنایہ ہے طلبِ شراب سے۔

مطلب :۔ میرا محبوب (بت بیداد فن) ابھی تک خونِ جگر (کی شراب) کا طالب ہے اور میرے جگر میں اب خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں ہے یعنی میں اس کی بیداد سہتے سہتے فنا ہو گیا مگر وہ ابھی تک ظلم و ستم سے باز نہیں آیا۔

بنیادی تصور:۔ ستم کوشیٔ محبوب۔

---

(۶۹)

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

فسونِ نیاز بمعنی نیاز کا منتر یعنی نیاز + حریف بمعنی مدِ مقابل مطلب مشکل بمعنی مقصدِ دشوار + نیاز، حریف مطلب مشکل نہیں ہے یعنی ہماری نیازمندی سے ہمارا مقصد دشوار حاصل نہیں ہو سکتا۔

مطلب :۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "چونکہ خیال وسیع تھا اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا اس لئے پہلا مصرع اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے مگر بالکل ایک نئی

شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ ناچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔

(یادگار غالب ص ۱۱۰)

بنیادی تصور:۔ طنز بر عدم قبول دعا

(۳)

نہ ہو بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

بہ ہرزہ یعنی جہالت یا نادانی کی وجہ سے۔ بیاباں نورد یعنی جویا۔ وہم وجود یعنی ماسوی اللہ کا وجود امر تبہ وہم میں ہے یعنی خارج میں ماسوی اللہ کائنات کا حقیقی وجود نہیں ہے۔

واضح ہو کہ فلسفۂ تصوف کی رُو سے کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ اعتباری یا وہمی ہے جس طرح شعلۂ جوالہ کی گردش سریع سے دائرۂ آتشیں نمودار ہو جاتا ہے جو بظاہر موجود ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے خلاصۂ کلام ایں کہ یہاں وجود سے وجود ماسوی اللہ مراد ہے۔

نشیب و فراز سے مراتب وجود مراد ہیں مثلاً واجب لذاتہٖ یا واجب بالذات اور واجب بالغیر اور ممکن۔ لہ

مطلب:۔ اے مخاطب! از راہ نادانی، ماسوی اللہ کے وجود کی تلاش میں اپنی عمر ضائع مت کر۔ ماسوی اللہ درحقیقت موجود نہیں ہے اس کا وجود

لہ:۔ نشیب و فراز میں فراز سے وجود کا اعلیٰ مرتبہ یعنی وجوب مراد ہے اور نشیب سے وجود کا ادنیٰ مرتبہ یعنی امکان مراد ہے ۱۲۔

مرتبہ وہم سے آگے نہیں۔ ماسوی اللہ کو اگر موجود کہتے ہیں تو اس لئے کہ وہ وجود مطلق کا ظل ہے اور اسی کے سہارے قائم ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اگر تو ماسوی اللہ کی جستجو میں سرگرم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک تیرے تصور میں وجود کے مراتب کار فرما ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وجود، صرف ذات حق میں منحصر ہے اور واجب اور ممکن کا امتیاز محض فلاسفہ کے ذہن کی اختراع ہے وجود صرف واجب کے لئے ثابت ہے ممکن کا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے وہ تو واجب ہی کا پرتو یا ظل ہے۔

بنیادی تصور:۔ ع جز وہم نہیں ہستئ اشیا مرے آگے۔

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
(۳) کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز!

جلوہ تماشا ہے یعنی آمادہ جلوہ گری ہے + دماغ کہاں یعنی اس قدر ضبط و تحمل کیسے ہے آئینۂ انتظار کو پرواز دینا یعنی آئینۂ انتظار پر جلا کرنا یعنی زحمتِ انتظار گوارا کرنا +

مطلب:۔ یہ سچ ہے کہ اگر عرصۂ دراز تک انتظار کیا جائے تو وصالِ یار حاصل ہو سکتا ہے مگر زحمتِ انتظار کی طاقت کہاں ہے۔

بنیادی تصور:۔ ع صبوری و دلِ عاشق ہزار فرسنگ است

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز

خاک ہوئے پر یعنی مٹ جانے کے باوجود + ہوا یعنی آرزو یا تمنا

مطلب:۔ خاک کے ذرے جب آفتاب کے مقابل ہوتے ہیں تو چمکنے لگتے ہیں۔ غالب نے ان کی تابانی کو ان کی آفتاب پرستی سے تعبیر کیا اور اسی سے شعر

کا مضمون پیدا کیا ہے کہ فنا ہو جانے کے بعد بھی عاشق کے دل سے اشتیاقِ دید زائل نہیں ہوا۔ دیکھو! اس کی خاک کا ہر ذرہ آفتاب پرستی کر رہا ہے؛

بنیادی تصور:۔ دوامِ آرزوئے دید۔

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
(۵) جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

میخانہ جنوں یعنی جنوں + کاسۂ گردوں یعنی گردوں + جنوں اور میخانہ میں معنوی مشابہت ہے یعنی دونوں کا نتیجہ بیخودی ہے اور کاسہ اور گردوں میں مناسبت صوری ہے یعنی دونوں کی شکل ایک سی ہے + خاک انداز بمعنی وہ برتن جس میں کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں۔

مطلب:۔ اے غالبؔ! میخانہ جنوں میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کے سامنے آسمان بھی ایک خاک انداز معلوم ہوتا ہے یعنی عشق کی جولانیوں کے سامنے اس کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ وسعتِ عالمِ جنوں۔

---

(۷۰)

وسعتِ سعیٔ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک
(۱) گزرے ہے آبلہ پا، ابرِ گہربار ہنوز

مطلب:۔ مضمون تو پیش پا افتادہ ہے مگر اندازِ بیان نرالا ہے کہتے ہیں۔ کہ اربابِ جود و سخا کی جد و جہد کا میدان بہت وسیع ہے، اور وہ بخشش کرنے میں بہت زحمت گوارا کرتے ہیں۔ دیکھو! ابر گہربار؛ اپنی آبلہ پائی کے باوجود، زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک موتی برساتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ابر کو آبلہ پا

کہنا محض ایک شاعرانہ حسن بیان ہے کیونکہ آبلہ اور قطرۂ آب میں مشابہت پائی جاتی ہے۔
بنیادی تصور:۔ عفتِ ایثار اربابِ کرم۔

(۲) یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز!

یک قلم بمعنی سراسر۔ پہلے مصرع میں قلم، کاغذ اور صفحہ میں رعایتِ لفظی ہے اور غالبؔ اس صنعت کے بہت دلدادہ ہیں، سارا دیوان اس لکھنویت سے معمور ہے۔
مطلب:۔ میرے نقشِ پا میں گرمیٔ رفتار کا ابھی تک اثر اتنا ہے کہ دشت سراسر کاغذِ آتش زدہ کی مانند نظر آتا ہے۔ یعنی تاثیر تپ سے سارا جنگل جل گیا۔
بنیادی تصور:۔ مبالغۂ تپ گرمیٔ رفتار۔

---

(۱۷)

(۱) کیونکر اس بت سے رکھوں جاں عزیز ٭ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا، اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے!
بنیادی تصور:۔ جاں نثاری عین ایمان ہے۔

(۲) دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے ٭ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
مطلب:۔ مجھے تیرے تیر کا پیکاں (اگلا حصہ) اس قدر عزیز (محبوب) ہے کہ اگرچہ وہ دل سے نکل چکا ہے مگر اس کی یاد ہنوز میرے دل میں باقی ہے۔

بنیادی تصور :۔ دلفریبیٔ پیکانِ یار

(۳) تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ ؎ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

مطلب :۔ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ محبوب سے جدائی بہت روح فرسا واقعہ بلکہ سانحہ ہے مگر اس صدمہ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنی جان بہر حال عزیز ہوتی ہے۔ لیکن اس سے ۱۸۵۷ء کے حادثہ کی طرف اشارہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ خواہش زیست فطری ہے۔

---

(۷۲)

(۱) نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ؎ میں ہوں اپنی شکست کی آواز

گل بکار تحسین ہے گل نغمہ بمعنی نغمۂ خوش (بقیاس گل بانگ بمعنی صدائے خوش آئند) فی الجملہ گل نغمہ بمعنی نغمہ اور پردہ ساز بمعنی ساز ہے (مثلاً نفس امر بمعنی امر)۔

مطلب :۔ عموماً اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مجھے عیش و طرب سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ میں تو سراپا رنج و الم ہوں اور اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہوں لیکن اگر غور کیا جائے تو غالبؔ نے اس شعر میں یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ میرا وجود نہ کسی کا معلول ہے نہ کسی کی علت ہے بلکہ وہ بجائے خود اپنی نفی پر دلیل ہے یعنی میرا وجود زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ دراصل میری کوئی ہستی نہیں ہے وجود یا ہستی کا اطلاق، حقیقی معنی میں صرف ذات حق پر ہو سکتا ہے جس کا وجود ذاتی (خانہ ساز) ہے کسی کا عطا کردہ نہیں ہے "میں اپنی شکست کی آواز ہوں" یہ نہایت دلکش شاعرانہ انداز بیان ہے جسے غالبؔ نے اس حقیقت کے اظہار کے لئے اختیار کیا ہے کہ میری ہستی کیا ہے! اپنی نیستی یا نفی کی آواز ہے یعنی میری ہستی میری نیستی

پر گواہ ہے ۔

نوٹ:۔ فلسفیانہ انداز میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کریں گے کہ ہر ممکن الوجود زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میری حقیقت تو عدم ہے مگر میں کسی واجب الوجود کے موجود کرنے سے عارضی طور پر موجود ہو گیا ہوں "ممکن" کہتے ہی اُسے ہیں جسے کسی واجب نے موجود کیا ہو ۔

بنیادی تصور:۔ ع ہستی ہماری اپنی نفی پر گواہ ہے ۔

(۲) تو اور آرائشِ خمِ کاکل ☆ میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز

مطلب:۔ یہ شعر ابہام اور اجمال کی بہت عمدہ مثال ہے اور ارباب ذوق جانتے ہیں کہ یہ چیزیں غزل کی جان ہیں۔ علاوہ بریں اس شعر میں غالب نے تقابل کی صنعت بھی پیدا کی ہے جس سے شعر کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ تو اپنے حُسن کی آرائش میں مشغول ہے اور میرے دل میں مختلف قسم کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں مثلاً یہ کہ خدا معلوم تو کس کے لئے یہ بناؤ سنگار کر رہا ہے، یا یہ کہ خدا معلوم اب کون کون لوگ تجھ پر عاشق ہوں گے اور مجھے کیسے کیسے صدمے اُٹھانے پڑینگے۔

بنیادی تصور:۔ اظہار دلفریبی حُسن محبوب ۔

(۳) لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی ☆ ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز

لافِ تمکیں بمعنی ادعائے ضبط راز + سادہ دلی بمعنی نادانی ۔

مطلب:۔ رازِ عشق چونکہ سینہ گداز ہے یعنی حیطۂ برداشت سے باہر ہے اس لئے جلد یا بدیر ضرور ظاہر ہو جائے گا۔ اندریں صورت ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم اس راز کو پوشیدہ رکھ سکیں گے، ہماری سادہ لوحی کی دلیل ہے ۔

بنیادی تصور:۔ رازِ عشق پوشیدہ نہیں رہ سکتا ۔

(۴) ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد ☆ ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

مطلب:۔ میں اسیری کی زندگی محض اس لئے بسر کر رہا ہوں کہ بد قسمتی سے مجھے صیاد سے محبت ہو گئی ہے ورنہ مجھ میں ابھی تک طاقتِ پرواز باقی ہے۔

بنیادی تصور:۔ لذتِ گرفتاریٔ الفتِ صیاد۔

(۵) وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ؏ ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

مطلب:۔ خدا وہ بھی دن لائے کہ جب وہ میری طرف ملتفت ہو کر ناز کرے اور میں اس کے ناز اٹھاؤں (اس وقت صورت یہ ہے کہ میرے دل میں اس کے ناز اٹھانے کی حسرت ہے)

بنیادی تصور:۔ تمنائے ناز برداریٔ محبوب۔

(۶) نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں ؏ جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

مطلب:۔ میرے دل میں ایسا کوئی قطرۂ خوں نہیں ہے جس سے میرے پلک سرخ نہ ہوئے ہوں یعنی میں اپنا سارا خون آنکھوں کے راستہ بہا چکا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ کثرتِ خوننابہ فشانی۔

(۷) اے ترا غمزہ یک قلم انگیز ؏ اے ترا ظلم سر بسر انداز

مطلب:۔ اے محبوب! تیرا غمزہ میرے دل میں ہیجان برپا کر دیتا ہے، (جذبات انگیز ہے) اور تیرا ظلم سراسر تیرا انداز معشوقانہ ہے۔

بنیادی تصور:۔ صفتِ غمزہ و ظلمِ محبوب۔

(۸) تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو ؏ ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مطلب:۔ اے محبوب! تو میرے گھر آیا ہے، میرے سجدہ ہائے پیہم تجھے مبارک ہوں۔

بنیادی تصور:۔ اظہار جذبات امتنان

(۹) مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا ؏ میں غریب اور تو غریب نواز

شاعر پہلا مصرع یوں بھی لکھ سکتا تھا "مجھ کو پوچھا تو مہربانی کی" اگر دو کچھ غضب نہ ہوا ہیں وہ تیکھا پن پایا جاتا ہے جس سے لطفِ سخن دوبالا ہو گیا۔

مطلب:۔ اگر تو میری طرف متوجہ ہوا تو اس سے تیری شان میں بٹہ نہیں لگا۔ بلکہ تو نے اپنے مرتبہ کے اقتضا کے مطابق کام کیا یعنی تجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا کیونکہ میں غریب ہوں اور تو غریب نواز ہے (غریب نوازی کا اقتضا یہی ہے کہ غریب کی پرسش احوال کی جائے۔

بنیادی تصور:۔ شانِ غریب نوازئ محبوب۔

(۱۰) اسد اللہ خاں تمام ہوا ٭ اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

مطلب:۔ افسوس (دریغا) کہ اسد اللہ خاں جو ایک رند مشرب اور حُسن پرست آدمی تھا۔ دنیا سے کوچ کر گیا۔

بنیادی تصور:۔ بیان سیرت خویش۔

---

(۷۳)

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
(۱) دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

مطلب:۔ اپنے ذوقِ اسیری سے خطاب کرتے ہیں کہ تجھے خوشخبری سناتا ہوں کہ قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس خالی جال بچھا ہوا ہے چل اپنی آرزو پوری کرلے! یعنی گرفتار ہو جا!

بنیادی تصور:۔ اظہارِ ذوقِ اسیری۔

جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا!
(۲) جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

تشنۂ آزار بمعنی طالب آزار + تسلی نہ ہوا یعنی تسلی یاب نہ ہوا + بن بمعنی جڑ۔
مطلب :۔ اگرچہ ہم نے ہر کانٹے کی جڑ کے پاس خون کی نہر بہا دی یعنی اگرچہ صحرا میں کوئی کانٹا ایسا باقی نہ رہا جو ہمارے تلوؤں میں نہ چبھا ہو، اس کے باوجود ہمارے ذوق ایذا طلبی میں کمی واقع نہ ہوئی۔
بنیادی تصور :۔ شدت ذوقِ ایذا طلبی۔

(۳) مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

مند گئیں یعنی بند ہو گئیں۔ لفظ "مند" اب متروک ہے + خوب وقت یعنی اچھے وقت + خوب وقت میں بے اور واؤ کے اتصال سے ثقالت پیدا ہو گئی ہے جو معیوب ہے + خوب وقت یا اچھے وقت میں طنز مضمر ہے۔ مراد ہے بہت برے وقت آئے۔
مطلب :۔ تم ایسے برے وقت اپنے عاشق بیمار کے پاس (بغرض عیادت) آئے کہ اس نے تمہیں دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر نہ کھل سکیں یعنی عاشق ناشاد اپنے دل میں حسرتِ دیدار لئے ہوئے رخصت ہو گیا۔
بنیادی تصور :۔ حسرتِ دیدار

(۴) میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

مطلب :۔ اس شعر کا اندازِ بیان قابلِ تحسین ہے کہنا یہ چاہتے ہیں کہ غمخوار کی باتیں میرے دل میں تیر و نشتر کی طرح چبھتی تھیں یعنی اس کے طعنوں سے مجھے بڑی اذیت ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طعن و تشنیع کی تاب نہ لا کر آخر کار میرا کام تمام ہو گیا۔ مگر کہتے یوں ہیں کہ اگر میرے غمخوار کے پاس زبان کے بجائے ایک تیز خنجر

ہوتا تو میں اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مرتا۔ ایک ہی لمحہ میں کام تمام ہوجاتا۔ اور مجھے یہ اذیت نہ پہنچتی۔

بنیادی تصور:۔ ایذا رسانیٔ غمخوار۔

(۵)
درِ دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

مطلب:۔ ظالم معشوق سے دل لگانے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ آدمی شیر کے منہ میں چلا جائے۔ وہ ایک لمحہ میں ختم کردے گا لیکن ظالم معشوق برسوں تڑپانے کے بعد ہلاک کرتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تلقین اجتناب از صحبت خوبان دل آزار

(۶)
دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے!
خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس

مطلب:۔ اس قسم کے اشعار، شاعر کی قوتِ متخیلہ کا کرشمہ ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب محبوب باغ میں جاتا ہے تو چمن کی قوتِ نامیہ اس کے حسن کو دیکھ کر بیتاب ہوجاتی ہے یعنی خود پھولوں میں یہ آرزو پیدا ہوجاتی ہے کہ اس کا قرب حاصل کریں۔

بنیادی تصور:۔ کشش حسن محبوب۔

(۷)
مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی، ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

مطلب:۔ شاعر نے دوسرے مصرع میں "بیٹھنا" استعمال کرکے شعر میں بلاغت کی شان پیدا کردی۔ کہتے ہیں کہ غالب وحشی تیری دیوار سے اپنا سر پھوڑ کے مر گیا۔ اب مجھے اس کا تیری دیوار کے پاس آکر پہروں بیٹھا رہنا یاد آتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ حرماں نصیبیٔ عاشقِ ناشاد

ردیف شین

(۷۴)

(۱) نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

مطلب :- اگر محبوب کے سبزۂ خط سے جوہر آئینہ نمی حاصل نہ کرے تو اس کے رخسار کی گرمی سے آئینہ میں آگ لگ جائے۔

بنیادی تصور :- محبوب کے رخسار آتشین کی صفت میں مبالغہ مقصود ہے۔

(۲) فروغ حُسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

مطلب :- پہلے مصرع میں ایک دعویٰ کیا ہے دوسرے میں اس کو ثابت کیا ہے کہتے ہیں کہ محبوب کے فروغ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آتش، خار شمع نہ نکالے تو شمع کے پاؤں سے اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ شاعر نے شمع کی بتی کو پائے شمع میں خار قرار دیا ہے۔ جب شمع روشن ہوتی ہے تو بتی جل جاتی ہے۔ اس کو خار کے نکل جانے سے تعبیر کیا ہے۔

بنیادی تصور :- فروغ حسن، موجب حلِ مشکل عاشق ہے۔

نوٹ :- ان دونوں شعروں میں صرف شاعرانہ تخیل کی خوبی پائی جاتی ہے ۱۲

ردیف عین

(۷۵)

(۱) جادۂ رہ، خور کو وقت شام ہے، تار شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی :- تارِ شعاعِ خورشید، بوقتِ شام، خورشید کے لیے بمنزلۂ جادہ راہ ہے۔ ماہِ نو یعنی ہلال جو ہمشکلِ آغوش ہوتا ہے (دونوں ہاتھ پھیلانے سے ہلال کی شکل پیدا ہو جاتی ہے) اس ہلال کو شاعر نے چرخ کی آغوشِ رخصت سے تعبیر کیا ہے +

مطلب :- "شام کا وقت ہے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ اس کی زرد شعاعوں کے تار، جادہ را، بنے ہوئے ہیں۔ آسمان نے ہلال کی آغوش کھول رکھی ہے تاکہ آفتاب اس راہ سے گذر کر، آسمان کی آغوش میں پہنچ جائے" (فلسفہ کلام غالب ص ۳۶۹)

بنیادی تصور :- منظر کشی غروبِ آفتاب۔

---

(۷۶)

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع!

ہوئی ہے آتشِ گل، آبِ زندگانیٔ شمع

سوزِ جاودانیٔ شمع سے مراد یہ ہے کہ محبوب کے رخسار کو دیکھ کر شمع ہمیشہ رشک کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ آتشِ گل کنایہ ہے رخِ نگار کی تابش یا سرخی سے + شعر میں خوبی یہ ہے کہ شاعر نے آتشِ رُخِ محبوب کو شمع کے حق میں آبِ حیات ثابت کیا ہے +

مطلب :- چونکہ شمع، رُخِ محبوب کو دیکھ کر ہمیشہ رشک کی آگ میں جلتی رہتی ہے اس لیے آتشِ رخِ محبوب، شمع کے حق میں بمنزلۂ آبِ زندگانی ہے۔

بنیادی تصور :- صفتِ فروغِ رُخِ محبوب۔

زبانِ اہلِ زبان میں ہے مرگ، خاموشی

(۲) یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

زبانِ اہلِ زبان یعنی محاورۂ اہلِ زباں، روشن ہوئی یعنی ظاہر ہوئی یا ثابت ہوئی زبانیٔ شمع یعنی شمع کے طرزِ عمل سے۔ چونکہ شمع کی لَو کو بھی زبانِ شمع کہتے ہیں اس لیے زبانِ شمع میں ایہام کی صفت پیدا ہوگئی۔

مطلب:۔ شمع کے طرزِ عمل سے یہ بات بزم میں واضح ہوگئی کہ خاموشی بمنزلۂ موت ہے۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ جب شمع خاموش ہو جاتی ہے تو اُسے شمعِ مردہ کہتے ہیں۔ زبان، مرگ، خاموشی، بات، بزم، روشن اور شمع میں رعایتِ لفظی پائی جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ اہلِ زبان کا خاموش رہنا گویا ان کی موت ہے۔

(۳)
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ، قصہ تمام
بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

بایمائے شعلہ یعنی شعلہ کے ایک ادنیٰ اشارہ پر + قصہ تمام کرے ہے یعنی فنا ہو جاتی ہے۔ اہلِ فنا یعنی عاشقانِ خدا + فسانہ خوانی سے فنا ہو جانا مراد ہے۔

مطلب:۔ جس طرح عاشقانِ خدا عشقِ حقیقی کی آگ میں فنا ہو جاتے ہیں اسی طرح شمع بھی شعلہ سے لو لگا کر اس کے ایک اشارہ پر اپنی ہستی کو فنا کر دیتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ مسلکِ فنائیتِ شمع۔

(۴)
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

مطلب:۔ شمع کی لَو عموماً تھرتھراتی رہتی ہے۔ اس لرزش کی وجہ غالبؔ نے یہ بیان کی ہے کہ شمع، پروانے کے غم میں اس قدر ناتواں ہو گئی ہے کہ اس کا اثر شعلۂ شمع پر بھی مرتب ہو گیا یعنی لرزشِ شعلہ کا سبب، ناتوانیٔ شمع ہے۔

بنیادی تصور:۔ تاثیرِ عشقِ صادق۔

ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے
(۵) بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پر فشانیٔ شمع!

اہتزاز، لغوی معنی حرکت یا ہلنا۔ مرادی معنی خوشی ہونا یا خوشی سے جھومنا۔

دوسرے مصرع میں حرف "ب" قسم کے لیے ہے۔

مطلب:۔ مجھے قسم ہے ہوا کے چلنے کی اور شمع کے جھلملانے کی کہ تیرے تصور سے عاشق کی روح پر عالم وجد طاری ہو جاتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ وجد آفرینیٔ خیال یار۔

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
(۶) شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

شہید ہے یعنی اس پر مٹی ہوئی ہے یا اس پر نثار ہے + گل خزانیٔ شمع کنایہ ہے داغ عشق سے + گل میں ایہام ہے (۱) پھول (۲) گل شمع۔

مطلب:۔ غم عشق کے داغ میں ایسی بہار ہے کہ شگفتگی بھی اس پر نثار ہے یعنی غم عشق سے عاشق کے سینہ میں جو داغ پڑ جاتا ہے وہ اس قدر دلکش ہوتا ہے کہ اس کے سامنے شگفتگی کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ تفوقِ داغ عشق بر شگفتگی و شادابی

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
(۷) نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانیٔ شمع

مطلب:۔ شمع مجھ کو بالین محبوب پر دیکھ کر رشک کے مارے جل جاتی ہے اس بات سے ثابت ہوا کہ وہ مجھے اپنا رقیب سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس سے بدگمان ہوں۔

بنیادی تصور:۔ داغِ بدگمانیٔ شمع۔

ردیف (ف)

(۷۷)

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
(۱) مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

مطلب:۔ حالات کا اقتضا تو یہ ہے کہ ہم بیخودی (جنوں) کی منزل میں داخل ہو جائیں لیکن ڈر یہ ہے کہ رقیب ہمارے راز سے واقف ہو جائے گا۔ افسوس! ہمیں ہوش و حواس کو رخصت کر دینے کا اختیار ہے مگر بیم رقیب سے مجبور ہیں۔

دوسرے مصرع میں غالب نے دو متضاد المعنی لفظوں کو جمع کر کے صنعتِ تضاد کی خوبی پیدا کر دی ہے۔ جبر و اختیار آپس میں ضدین ہیں۔

بنیادی تصور:۔ مجبوریٔ بیم رقیب۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
(۲) اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار، حیف

مطلب:۔ میں بہت ملول اور رنجیدہ ہوں کہ اگرچہ میری ہر سانس شعلے برسا رہی ہے مگر کوئی شعلہ ایسا نہیں نکلا جو مجھے ہمیشہ کے لیے جلا کر خاک کر دیتا۔ اے نفسِ شعلہ بار! تیری کوتاہی پر کمال افسوس ہے!

بنیادی تصور:۔ تأسف بر سوختنِ ناتمام۔

ردیف (کاف)

(۷۸)

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
(۱) کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

مطلب :۔ بچوں کو اتنا شعور کہاں کہ پتھر مارنے کے بعد میرے زخموں پر نمک بھی
چھڑک دیتے! کاش پتھر میں نمک ہوتا تاکہ میری اذیت میں اضافہ ہو جاتا۔
بنیادی تصور :۔ ایذا دوستی۔

(۲) گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل!
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مطلب :۔ بات یہ ہے کہ یار کے کوچہ کی گرد ہمارے زخمِ دل کے لیے باعثِ
ناز ہے یعنی اس میں زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے ورنہ دنیا میں نمک کی کوئی کمی نہیں ہے
شاعر نے نمک پر گرد کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ ایک تو وہ گرد، کوئے یار کی ہے
دوسرے یہ کہ نمک سے زخم بھر جاتا ہے یعنی اچھا ہو جاتا ہے۔ مگر مٹی سے زخم

اور بڑھ جاتا ہے۔
بنیادی تصور :۔ تفوق گرد بر نمک۔

(۳) مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

مطلب :۔ شعر میں لف ونشر مرتب ہے کہتا ہے کہ خدا کرے نالۂ بلبل کا درد
میرے حصے میں آئے اور خندۂ گل کا نمک تجھے مبارک ہو! خوبی اس تقسیم میں یہ ہے
کہ عاشق کو فریاد نالہ پسند ہے اور معشوق کو ہنسی مرغوب ہے۔

بنیادی تصور :۔ رعایت مذاق ہمدگر۔

(۴) شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

شور بمعنی شور و غل نیز نمک + جولاں بمعنی جولانی اسپ نیز تموج بحر +
ب بمعنی برائے +

مطلب :- سمندر کے کنارے آج کس نے گھوڑا دوڑایا کہ ساحل سے جو گرد اٹھی اس نے سمندر کی موجوں کے زخم اپر نمک چھڑک دیا! یعنی موجوں کو رشک لاحق ہو گیا کہ ہمارے اندر یہ جولانی نہیں ہے جو محبوب کے گھوڑے میں پائی جاتی ہے۔

بنیادی تصور :- تفوق جولانیٔ اسپ محبوب بر امواج دریا۔

(۵)
داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ وا
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

مطلب :- محبوب میرے زخم جگر کا اس درجہ قدر دان ہے کہ جہاں کہیں نمک دیکھتا ہے مجھے یاد کرتا ہے کہ اگر اس وقت غالب ہوتا تو میں یہ نمک اس کے زخموں پر چھڑک دیتا!

بنیادی تصور :- ذوقِ ستم کوشیٔ محبوب۔

(۶)
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

مطلب :- اے محبوب! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تو محض میرے جسم کو زخمی کر کے چھوڑے جا رہا ہے! ابھی نہ تو نے میرے دل کو زخمی کیا ہے اور نہ زخمی اعضا پر نمک چھڑکا ہے۔

بنیادی تصور :- ایذا دوستی۔

(۷)
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیر درد
زخم، مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک!

توفیر بمعنی زیادتی + خندۂ معشوق کو شعرا نمکیں باندھا کرتے ہیں۔

مطلب :- میرا زخم قاتل کے خندۂ نمکین جیسے اثر سے خود سراپا نمک بن گیا ہے اس لیے میں اپنے درد میں زیادتی کے لیے کسی غیر کا احسان نہیں اٹھاؤں گا۔

بنیادی تصور: شان بے نیازئ عاشق۔

(۸) یاد ہیں غالبؔ مجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو تو پلکوں سے چنتا تھا نمک

نوٹ:۔ عام مطبوعہ نسخوں میں یہ شعر اس طرح مرقوم ہے:۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

لیکن نظم طباطبائی نے اس شعر کی شرح کے ضمن میں یہ لکھا ہے کہ "اس شعر میں "میں" کی جگہ "تو" زیادہ مناسب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہیں وہ بات یاد ہے؟ تو وہ بات اکثر ایسی ہوتی ہے جو مخاطب پر گذری ہوئی ہو۔ اپنی گذری ہوئی کوئی دوسرے کو یاد نہیں دلاتا۔ یا پھر "تجھے" کی جگہ "مجھے" ہوگا۔ کاتب نے غلطی سے "تجھے" لکھ دیا۔ لیکن پہلی صورت اس سے بہتر ہے" (شرح دیوان غالب ص ۸۶)

حسن اتفاق سے میرے پاس مرزا عزیز بیگ مرحوم کی "تضمین کلام غالب" موجود ہے اس میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے کہ پہلے مصرع میں "تجھے" کی جگہ "مجھے" ہے اور "میں" کی جگہ "تو" ہے چنانچہ میں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ واضح ہو کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کے پاس جو نسخہ تھا وہ ان کے استاد سوزاں مرحوم شاگرد غالب نے اپنے قلم سے لکھ کر مرزا غالب کو دکھا لیا تھا۔

مطلب:۔ اے غالب! مجھے وہ دن ابھی تک یاد ہیں جب تیری ایذا دوستی کا یہ عالم تھا کہ اگر زخم سے نمک گر جاتا تھا تو تو پلکوں سے چنا کرتا تھا، یعنی نمک کا ایک ایک ذرہ بڑے احترام کے ساتھ اٹھا کر دوبارہ اپنے زخم میں رکھ لیا کرتا تھا۔

بنیادی تصور: کمال ایذا طلبی۔

(۷۹)

(۱) آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

"زلف کے سر ہونے تک" اس میں لفظِ مہم (قید وزن کی وجہ سے) محذوف ہے۔ یعنی اس کا مطلب ہے زلف کی مہم کے سر ہونے تک۔ چونکہ محبوب کی زلف تک رسائی بھی بہت دشوار ہے اس لیے اسے مہم سے تعبیر کرنا بالکل صحیح ہے۔ جب تک زلف کی مہم سر ہو یعنی اس کی زلفوں تک ہماری رسائی ہو۔ زلف تک رسائی ہونا کنایہ ہے ذاتِ محبوب سے یعنی جب تک وصل محبوب نصیب ہو۔

مطلب:۔ مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں شعر کا مطلب بالکل واضح ہوگیا کہ عاشق کی آہ معشوق کے دل میں اثر تو کرتی ہے مگر اس کے لیے ایک مدتِ دراز درکار ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمیں یہ توقع نہیں ہے کہ جب تک تیری زلفوں تک ہماری رسائی ہو اس وقت تک ہم زندہ رہیں گے۔

بنیادی تصور:۔ دشواریٔ وصلِ محبوب۔

(۲) دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

مطلب:۔ قطرہ تربیتِ نفس ہی کی بدولت گوہر بن سکتا ہے اور اس راہ (تربیت) میں اُسے بے شمار دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس نکتہ کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے کہ سمندر کی ہر موج ایک جال ہے اور اس جال کا ہر حلقہ گویا مگرمچھ کا حلق ہے (حلقہ اور حلق دونوں گول ہوتے ہیں) دیکھیں قطرہ پر گوہر بننے تک کیا کیا آفتیں گزرتی ہیں! بقول حالی "جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت

مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" (یادگارِ غالب صد ۱۲۶)
بنیادی تصور:۔

(۳) عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

کیا رنگ کروں ؛ یعنی دل کو کیونکر سمجھاؤں ؛ خونِ جگر ہونے تک کنایہ ہے کام تمام ہونے سے +
مطلب :۔ عشق میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے صبر و تحمل لازمی ہے لیکن تمنائے وصال مجھے بیتاب کر رہی ہے ۔ اندریں صورت جب تک جگر خون ہو (کام تمام ہو) دل کو کیونکر سنبھالوں ؛ (اس کی تسکین کا کیا سامان کروں)
بنیادی تصور :۔ دشوارئ زندگئ عشق ۔

(۴) ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مطلب :۔ ہم نے مانا کہ جب تم کو ہمارے حال زار کی خبر ہوگی تو تم تغافل نہیں کروگے مگر اس کا کیا علاج کہ جب تک تمہیں خبر ہوگی ہمارا کام تمام ہو جائے گا! خوب شعر کہا ہے ۔

بنیادی تصور :۔ بیان حالِ زار ۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
(۵) میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نوٹ :۔ یہ شعر دراصل تصوف کے رنگ میں ہے اور قرینہ اس پر یہ ہے کہ پہلے مصرع میں تعلیم فنا کا ذکر ہے اور دوسرے مصرع میں وہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک تمہاری نظر عنایت مجھ پر نہیں ہوتی صرف اُس

وقت تک "میں بھی ہوں" ادھر تمہاری نظر عنایت مجھ پر ہوئی ادھر میں فنا ہوا (جس طرح قطرۂ شبنم، پرتو خورشید سے یعنی اس کی نظر عنایت سے فنا ہو جاتا ہے)

اگر یہ شعر مجاز میں ہوتا تو یہ اندازِ بیان ہرگز نہ ہوتا بلکہ شاعر یہ کہتا ہے کہ نظر عنایت نہ ہونے کی وجہ سے قریب مرگ ہوں۔ نظر عنایت ہو جائے تو زندہ ہو جاؤں گا۔ (وصل سے زندگی نصیب ہوتی ہے)

مطلب :- جب تک انسان عرفان (علم صحیح) سے محروم رہتا ہے وہ اپنے آپ کو موجود بالذات سمجھتا رہتا ہے یعنی زبان حال سے یہ کہتا رہتا ہے کہ جس طرح خدا موجود ہے میں بھی موجود ہوں۔"

غالب کہتے ہیں کہ یہ "میں بھی ہوں" کا ادعائے باطل اسی وقت تک ہے۔ جب تک کہ عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ (جب تک انسان اپنی حقیقت سے ناآشنا ہے) جب حق تعالیٰ بندے پر عنایت کی نظر کرتا ہے (عرفان عطا کرتا ہے) تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ لاموجود الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی حقیقی معنی میں موجود نہیں)۔

بنیادی تصور :- تلقین مسلکِ وحدت الوجود۔

(۶)
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے یک رقص شرر ہونے تک

مطلب :- فرصتِ ہستی (مدتِ زندگی) کو رقص شرر سے تشبیہ دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ تشبیہ بڑی موثر اور معنی خیز ہے۔ کہتے ہیں کہ اے غافل! فرصتِ ہستی (مدت زندگی) بہت قلیل اور مختصر ہے۔ بس یوں سمجھ لے جیسے محفل میں شرر کا رقص! ذوق نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے :-

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

بنیادی تصور:۔ قلتِ فرصت ہستی۔

(۷) غم ہستی کا اسدؔ، کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مطلب:۔ انسانی زندگی رنج والم، زحمت و اذیت اور درد وغم کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اس دکھ اور مصیبت (غم ہستی) کا علاج کسی سے نہیں ہو سکتا کیونکہ زندگی نام ہی ہے دکھ کا بلکہ دکھوں کے ایک طویل سلسلہ کا۔ یہ سلسلہ تو صرف موت سے ختم ہو سکتا ہے۔ دیکھ لو! شمع کی زندگی جلنے کے تسلسل کا نام ہے اس لیے وہ سحر ہونے تک (یعنی تادم وفات) بہر صورت جلتی رہتی ہے۔ "ہر رنگ" کا ٹکڑا بہت دلکش اور معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شمع خواہ محفل خوباں میں ہو یا گور غریباں پر، ہر حالت میں جلتی رہتی ہے اور جب تک ختم نہیں ہو جاتی اس کے جلنے میں کمی نہیں ہوتی اسی طرح انسان خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا مزدور، شاہ ہو یا گدا، جب تک زندہ ہے غم ہستی میں گرفتار ہے ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی یا دکھ میں مبتلا ہے!

بنیادی تصور:۔ ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

نوٹ:۔ یہ شعر وہ آئینہ ہے جس میں غالبؔ کی پوری زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے:۔

زندگی اپنی جب اس طرز سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ردیف (گ)

(۸۰)

(۱) گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

مطلب:۔ اگر تجھے اپنی دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے تو پھر تو صرف ایک دعا مانگ اور وہ یہ کہ اسے خدا مجھے ایسا دل عطا کر دے جس میں کوئی مدعا (آرزو) نہ ہو۔ جب تجھے ایسا دل مل جائے گا تو تجھے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

بنیادی تصور:۔ تحسین و توصیف دلِ بے مدعا۔

(۲) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا نہ مانگ

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "اس شعر میں ایک نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر شاعر درخواست کرتا ہے کہ اسے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، اور درپردہ الزام دیتا ہے گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں؟ وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیئے ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، ان کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا ارتکاب کیا تو بسبب عدم استطاعت، اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً اگر شراب پینے کو مل گئی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آگیا تو شراب نہ مل سکی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں اتنے داغ دل پر کھائے ہیں۔" (یادگارِ غالب صہ!!!)

بنیادی تصور:۔ تمنّیٔ بادۂ حسرتِ گناہ۔

ردیف (ل)

(۸۱)

(۱) ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

مطلب:۔ پھول، بلبل کی اس سادہ لوحی پر ہنستے ہیں کہ وہ یہ سمجھے بیٹھی ہے کہ پھولوں میں رنگِ وفا ہے یعنی ان کا حُسن و جمال ہمیشہ قائم رہے گا۔

بنیادی تصور:۔ بے ثباتیٔ حُسن۔

(۲) آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

ہوائے گل سے بوئے گل مراد ہے ؛ حلقۂ دام سے غنچے مراد ہیں۔ ٹوٹے پڑے ہیں یعنی شگفتہ ہو گئے ہیں۔

مطلب:۔ غنچے شگفتہ ہو گئے، پھول کھل گئے۔ خوشبو جو غنچوں میں قید تھی، آزاد ہو گئی اس لیے نسیم باغ کو جو بوئے گل سے معمور ہے آزادیٔ بوئے گل مبارک ہو!

بنیادی تصور:۔ کیفیتِ عالمِ رنگ و بو۔

(۳) جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکہ میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

مطلب:۔ پھول کا رنگ دراصل اس کی فریاد ہے کہ اے خدا! تو نے مجھے ثبات کیوں نہیں عطا کیا۔ یہ فریاد پھول کے لبِ خونیں سے نکل رہی ہے (لبِ خونیں کنایہ ہے اس کی سرخ پتیوں سے)، لیکن ظاہر بین لوگ اسے رنگ سمجھ کر دھوکہ کھا گئے اور اس پر فریفتہ ہو گئے۔ مر گیا (۱) فریفتہ ہو گیا (۲) دھوکہ کھا گیا۔

انتخابِ الفاظ، رفعتِ تخیل اور جدتِ طرازی کے اعتبار سے یہ شعر بہت بلند پایہ ہے

بنیادی تصور :۔ کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا (میرؔ)

(۴) خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا، کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل، سر بپائے گل

مطلب :۔ وہ عاشق کس قدر خوش نصیب ہے جو سایۂ گل کی طرح معشوق کے قدموں پر سر رکھے ہوئے عرضِ حال کر رہا ہو اور اپنے دل کی لگی بجھا رہا ہو!

بنیادی تصور :۔ رشک بر عاشق خوش نصیب۔

(۵) ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

مطلب :۔ اے محبوب بہار نے گلاب کی خوشبو محض تیرے لیے ایجاد کی ہے اس لیے یہ خوشبو لامحالہ میری رقیب بن گئی کیونکہ اگر پھولوں میں خوشبو نہ ہوتی تو وہ تیرے گلے کا ہار ہر گز نہ بنتے۔

بنیادی تصور :۔ رشک بر خوشبوئے گل۔

(۶) شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

مطلب :۔ اگر کوئی شخص موسم بہار میں باغ میں بیٹھ کر شراب نوشی نہ کرے تو یقیناً اسے موسم بہار کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا یعنی بہار میں شراب نوشی لازمی ہے

بنیادی تصور :۔ اظہار تقاضائے موسم بہار۔

(۷) سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی
خوں ہے میری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

سطوت بمعنی دبدبہ + حُسنِ غیور یعنی غیرت مند معشوق + خوں ہے یعنی اچھا نہیں لگتا۔

مطلب:۔ چونکہ تو اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تیرا عاشق غیر کی طرف ملتفت ہو اس لیے رنگ ادائے گل (گلوں کی خوشبو اور تازگی اور دلکشی کا رنگ) مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

بنیادی تصور:۔ سطوتِ حسن غیور۔

(۸) تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکہ کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل، در قفائے گل

قفا کے لغوی معنی ہیں گدھی یہاں مراد ہے گل کے پیچھے یعنی ایک پھول کے بعد دوسرا پھول۔

مطلب:۔ یہ جو باغ میں ایک پھول کے پیچھے دوسرا اور دوسرے کے پیچھے تیسرا پھول تیزی کے ساتھ شاخوں پر نکلتا چلا آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ تو صحن چمن میں مصروف گلگشت ہے اس لیے تیرے دیدار کے اشتیاق میں پھول یکے بعد دیگرے پیہم کھلتے چلے جاتے ہیں۔ (اس شگفتگی پیہم کو شاعر نے دوڑنے سے تعبیر کیا ہے)

بنیادی تصور:۔ دلکشی حسن محبوب۔

(۹) غالب! مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

گل جیب بمعنی زینتِ گریباں۔

مطلب:۔ اے غالب! میں اس محبوب سے ہم آغوشی کی آرزو رکھتا ہوں جو اس قدر حسین و جمیل ہے کہ اس کا تصور خود گل کے گریباں کی زینت کا باعث

ہے یعنی پھول اس کا تصور کرتے ہیں تو ان میں خوشبو رعنائی دلکشی اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ انوکھے انداز سے اپنے محبوب کی مدح و ثنا کی ہے۔

ردیف (میم)

(۸۲)

(۱) غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مطلب:۔ جو لوگ علائق دنیوی سے آزاد ہوتے ہیں انھیں کسی شئی کے جاتے رہنے کا غم ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس نکتہ کو واضح کرتے کے لیے شاعر نے یہ مثال دی ہے کہ وہ لوگ اپنے ماتم خانہ کی شمع برق سے روشن کرتے ہیں یعنی جس طرح برق کی روشنی ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی اسی طرح انھیں غم بھی ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

بنیادی تصور:۔ مردِ آزاد، رنج و راحت سے متاثر نہیں ہوتا۔

(۲) محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگ یک بت خانہ ہم

گنجفہ۔ ایک کھیل کا نام ہے جو تاش کے پتوں سے کھیلا جاتا ہے۔ ورق گردانی یعنی ورق گرداں۔ گنجفہ کی رعایت سے ورق گرداں لائے ہیں بعض نسخوں میں دوسرا مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے۔ ع

ہیں ورق گردان نیرنگی یک بتخانہ ہم

اس ترکیب سے مصرع کا مفہوم بآسانی واضح ہو سکتا ہے۔

مطلب :۔ اس شعر میں محفلِ نشاط کے درہم و برہم ہو جانے کو گنجفہ کی ورق گردانی سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عالمِ خیال میں بتوں کی ان محفلوں کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں جو انقلابِ روزگار سے درہم و برہم ہو گئی ہیں۔ گویا ہر محفل، گنجفہ کا ایک ورق ہے اور ہم ورق گردانی میں مصروف ہیں۔

بنیادی تصور :۔ یادِ ایامِ عشرتِ فانی۔

(۳) باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

یک جہاں ہنگامہ یعنی ہنگامۂ بسیار + پیدائی بمعنی ظہور +

مطلب :۔ پروانے کے دل میں جس چراغاں نے اس قدر ہنگامہ برپا کر دیا ہے اس کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے۔ یہی حال ہماری ہستی کا ہے کہ دیکھنے میں ہر طرف ہنگامہ برپا ہے۔ مگر دراصل ہماری ہستی خارج میں موجود نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہستی (ذاتِ واجب) موجود ہے اور یہ کائنات اس ہستیِ مطلق کا پرتو ہے۔

بنیادی تصور :۔ تلقینِ وحدت الوجود۔

(۳) ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

مطلب :۔ ہم نے اگر جستجو ترک کر دی ہے تو اس کا سبب قناعت نہیں ہے بلکہ ہماری کمزوری ہے یعنی ہمارے اندر جستجو کی طاقت ہی نہیں ہے۔ گویا مجبوری کا نام صبر رکھ لیا ہے۔ اس لیے ہم ہمتِ مردانہ کے حق میں وبالِ جان بن گئے ہیں یعنی ہماری ہستی ہمتِ مردانہ کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔ بالفاظِ دگر ہم اگر قانع ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہم نے ہمتِ مردانہ سے کام لے کر دنیا ترک کر دی ہے

یعنی شیوۂ قناعت اختیار کر لیا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم میں حصولِ مقصد کی طاقت ہی نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ مذمتِ پستیٔ ہمت۔

(۵)
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

مطلب:۔ ہمارے سینہ میں لاکھوں تمنائیں ایسی ہیں جن کے پورے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے ہم اپنے سینہ کو ایک قید خانہ تصور کرتے ہیں جن میں وہ تمنائیں ہمیشہ کے لیے قید کر دی گئی ہیں۔

بنیادی تصور:۔ ہر شخص کے دل میں لاکھوں آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں۔

---

(۴۸۳)

(۱) یہ نالہ حاصلِ وابستگی فراہم کر ❊ متاعِ خانۂ زنجیر، جز صدا معلوم

حاصلِ وابستگی یعنی دنیا سے تعلقِ خاطر پیدا کرنے کا نتیجہ + متاع بمعنی اثاثہ جز صدا معلوم یعنی آواز کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے :: وابستگی کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے +

مطلب:۔ دنیا سے دل لگانے کا نتیجہ نالہ (رنج وغم) کے سوا اور کچھ نہیں ہے یقین نہ ہو تو خانۂ زنجیر کو دیکھ لو! اس کا اثاثہ صدا (نالہ) کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیا سے تعلق پیدا کرے گا اسے نالہ کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مضمون تو پامال ہے مگر اندازِ بیان اور ندرتِ تشبیہ نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔

بنیادی تصور :۔ مذمتِ علائق دنیوی ۔

---

(۸۴)

(۱) مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور !
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

مطلب :۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لیے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور یہ کس رتبے کا آدمی تھا ؟ لیکن وطن میں مرنا، جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو مگر خریدار و غم خوار ایک بھی نہ ہو وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں موت دے کر میری بے کسی کی شرم رکھ لی۔ اس شعر میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے لیکن دراصل اہل وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔" (یادگارِ غالب ص ۱۱۱)

بنیادی تصور :۔ شکوۂ بے مہریٔ ابنائے وطن ۔

(۲) وہ حلقہ ہائے زلف، کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو مرے دعوئ وارستگی کی شرم

مطلب :۔ اے خدا ! محبوب کی زلفیں مجھے اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لیے گھات میں بیٹھی ہوئی ہیں (یعنی محبوب مجھے اپنا اسیر بنانے کے لیے بڑی کوشش کر رہا ہے) ادھر میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں اس کی زلفوں میں اسیر نہیں ہوں گا اس لیے میرے اس دعوئ کی لاج اب تیرے ہی ہاتھ ہے ۔

بنیادی تصور :۔ شرم دعوئ وارستگی ۔

ردیف (نون)

(۸۵)

لوں دام، بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش دے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

دام بمعنی قرض، خواب کی رعایت سے بختِ خفتہ لائے ہیں ۔ انداز بیان، حسن ترکیب، جدت طرازی اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے بہت بلند پایہ شعر کہا ہے
مطلب :۔ میں اپنے بختِ خفتہ سے ایک رات کی نیند قرض تو لے سکتا ہوں مگر میں تو نعمتِ خواب سے محروم ہوں اس لیے ڈر یہ ہے کہ یہ قرضہ ادا کیسے کروں گا۔ یعنی بختِ خفتہ کو یہ نیند واپس کہاں سے کروں گا۔ مجھے تو نیند آتی ہی نہیں۔ "بختِ خفتہ کہہ کر اپنی بدنصیبی ثابت کر دی اور "کہاں سے ادا کروں" کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ میں خوابِ خوش سے یکسر محروم ہوں !
بنیادی تصور :۔ بیان کیفیت بے خوابی ۔

---

(۸۶)

(۱) وہ فراق اور وہ وصال کہاں ⁂ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
نوٹ :۔ اس پوری غزل میں برنگ قطعہ ایک ہی مضمون ادا کیا ہے ۔ یعنی یادِ ماضی جب ۔
(ا) جوانی کے دن تھے عیش و عشرت کا زمانہ تھا ۔
(ب) کسی سے جدائی تھی تو کسی کا وصال نصیب تھا ۔
(ج) ہر روز نیا پروگرام، نیا انتظام، نیا سامان تھا ۔
(د) فرصتِ کاروبارِ عاشقی حاصل تھی ۔

(۷) دل میں ذوقِ نظارۂ جمال کارفرما تھا۔

(۸) دن رات کسی کے تصور میں محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔

چونکہ اس غزل میں واردات قلبی نظم کی ہیں اس لیے سلاست زبان بھی ہے اور سادگیٔ بیان بھی۔

مطلب :۔ اب نہ کسی کی جدائی ستا رہی ہے اور نہ کسی کا وصل حاصل ہے۔ نہ وہ راتیں ہیں نہ وہ دن، نہ وہ مہینے ہیں نہ وہ سال۔

بنیادی تصور :۔ پوری غزل کا بنیادی تصور نوٹ میں درج کر دیا گیا ہے۔ پہلے چار شعروں میں یاد ماضی ہے اور آخری چار شعروں میں اپنی موجودہ حالت زار پر ماتم کیا ہے۔

(۲) فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ٭ ذوق نظارۂ جمال کہاں

مطلب :۔ اب نہ عاشقی کی فرصت نصیب ہے اور نہ دل میں ذوقِ نظارہ حسن ہے۔ عاشقی کے لیے دولت اور فرصت یہ دو چیزیں شرط اولین ہیں۔ جو شخص دن رات قرض میں گرفتار رہتا ہو وہ عشق کیسے کر سکتا ہے؛

(۳) دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا ٭ شورِ سودائے خط و خال کہاں

مطلب :۔ جذبات عاشقانہ کا تو ذکر ہی فضول ہے اب تو دماغ میں کسی حسین کا تصور بھی نہیں آتا۔

(۴) تھی وہ اک شخص کے تصور سے ٭ اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

خوب شعر کہا ہے ایک مصرع میں اپنی جدائی کی پوری داستان نظم بند کر دی ہے

مطلب :۔ میرے خیالات میں رعنائی اور دلکشی محض محبوب (ایک شخص) کے تصور سے تھی اب نہ وہ محبوب ہے نہ میرے خیالات میں رعنائی ہے۔ یوں سمجھو کر میرے جذبات کا نشانِ مزار بھی باقی نہیں رہا۔

(۵) ایسا آساں نہیں لہو رونا ٭ دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

مطلب :۔ چونکہ اب نہ دل میں طاقت ہے نہ جگر میں قوت، اس لیے خونابہ نشانی کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

(۶) ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق ٭ واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں!

مطلب :۔ اس کا مطلب شعر ۲ کے ذیل میں لکھ چکا ہوں۔ قمار خانۂ عشق میں صرف وہی جا سکتا ہے جس کی گرہ میں مال ہو۔ مفلسی میں عشق کا تصور بھی دماغ میں نہیں آسکتا۔ بلکہ مفلس تو عشق کو یکسر فراموش کر دیتا ہے :۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق ٭ کہ یاراں فراموش کردند عشق

(۷) فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں ٭ میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مطلب :۔ یہ شعر غالب کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ ساری عمر (۱۸۳۸ء سے ۱۸۶۸ء تک) بلا مبالغہ فکر دنیا میں سر کھپاتے رہے اور خون جگر پیتے رہے ان کی ساری زندگی ان کی مرضی کے خلاف بسر ہوئی۔ اس حقیقت کو انھوں نے دوسرے مصرع میں واضح کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اس قدر بے ساختگی خلوص اور اثر ہے۔

(۸) مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ ٭ اب عناصر میں اعتدال کہاں

مطلب :۔ اے غالب! عالم پیری میں قوائے جسمانی مضمحل ہو جاتے ہیں اور جب ایسا ہوتا ہے تو پھر عناصر میں اعتدال بھی باقی نہیں رہتا۔ اور اس اختلال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں کوئی آرزو یا کوئی امنگ پیدا نہیں ہوتی۔ بالفاظِ صحیح تر انسان کی زندگی تو ختم ہو جاتی ہے مگر چونکہ کوئی شخص موت سے پہلے مر نہیں سکتا اس لیے وہ سانسیں پوری کیے جاتا ہے۔

(۸۷)

(۱) کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

مطلب :- محبوب نے ہم سے وفا کی تو رقیبوں نے جل کر اس کی وفا کو جفا سے تعبیر کیا (غالب پر مہربانی قدرتاً رقیبوں کی ناخوشی کا باعث ہوئی اسی لیے انھوں نے محبوب کو بدنام کرنا شروع کر دیا) غالب رفع ملال کے لیے محبوب سے کہتے ہیں کہ آپ اس کا مطلق خیال نہ کریں۔ ع ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔

بنیادی تصور :- مذمتِ شیوۂ بدگویاں۔

(۲) آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر، اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

"کیا کہتے ہیں" (۱) ہم کیا کہتے ہیں (۲) وہ کیا کہتے ہیں۔

مطلب :- آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر کا حال ان سے کہنے جا رہے ہیں۔ دیکھئے وہاں جا کر ہم ان سے کیا کہتے ہیں یعنی ایک تو ہم ویسے ہی پریشان ہیں اور پریشانی میں آدمی کے حواس بجا نہیں ہوتے، علاوہ بریں جب ہم ان کے سامنے جائیں گے تو رعب حسن سے ہمارا مرعوب ہو جانا یقینی امر ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں جا کر ہم کیا کہیں گے؟

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا معلوم ہماری پریشانی کا حال سن کر اس کے جواب میں وہ کیا کہتے ہیں؟

بنیادی تصور :- رعبِ حسن

(۳) اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں!

محاورۂ زبان میں اگلے وقتوں کے لوگوں سے بھولے بھالے سیدھے سادھے سادہ لوح یا کم فہم لوگ مراد ہوتے ہیں۔

مطلب :- اگلے وقتوں کے لوگ سیدھے سادھے (سادہ لوح) ہوتے تھے اس لیے وہ مے ونغمہ کو اندوہ ربا (غم غلط کرنے والا) سمجھتے تھے۔ درحقیقت غم (یعنی غم عشق) ایسی چیز نہیں ہے جو مے یا نغمہ سے دور ہو سکے۔ غم تو حقیقتِ زندگی ہے۔ اس لیے جب تک دم ہے تب تک غم ہے۔

بنیادی تصور :- مے و نغمہ سے ازالۂ غم نہیں ہو سکتا۔

(۴) دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں!

مطلب :- غالبؔ کے اندازِ بیان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ ابہام پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ یا جملے ایسے لاتے ہیں جن کو پڑھ کر ذہن مختلف معانی کی طرف مائل ہو سکے۔ علاوہ بریں اجمال سے بھی کام لیتے ہیں اور اجمال ہمیشہ ابہام کا موجب ہوتا ہے۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ جب غش سے فرصت ملتی ہے یعنی ہوش میں آتا ہوں تو خیال یار فوراً دل میں آجاتا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے نالے کی رسائی کا۔ اگر نہیں تو پھر اور کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟ (تصورِ محبوب)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب غش سے افاقہ ہوتا ہے تو نالہ کرنے کا خیال دل میں آجاتا ہے۔ یہ تصورِ نالہ کی رسائی کا ثبوت ہے۔ اگر نہیں تو پھر اور کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟ (تصورِ نالہ)

دونوں صورتوں میں غالبؔ نے نالہ کی نارسائی پر لطیف طنز کیا ہے۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ عاشقوں کی اصطلاح میں نالۂ رسا وہ ہے جس کو سن کر محبوب

بے قرار ہو جائے اور بن بلائے عاشق کے پاس چلا آئے۔ غالب تجاہل عارفانہ سے کام لے کر کہتے ہیں کہ ہمارے نالے ہیں یہ تاثیر کہاں! ہم تو اسی نالہ کو رسا سمجھتے ہیں جس کی بدولت تصور محبوب ہمارے دل میں آجائے یا جس کی طرف ہماری طبیعت مبذول ہو جائے۔ مختصر یہ کہ غالب نے طنزاً نارسائی کو رسائی سے تعبیر کیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ طنز بر نارسائی نالہ۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
(۵) قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں!

مطلب:۔ غالب نے اس شعر میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ مسلمان، کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارا مسجود (معبود) عقل کی دسترس سے بالاتر ہے۔ کیونکہ عقل صرف محسوسات کا ادراک کر سکتی ہے اور خدا تو غیر محسوس ہے۔ چونکہ سجدہ کرنے کے لیے جہت کا تعین ضروری ہے اس لیے ہم نے خانۂ کعبہ کو جہتِ سجدہ قرار دیا ہے یعنی وہ دراصل قبلہ نما ہے نہ کہ مسجود۔ مسلمان موحد ہیں یعنی شرک سے دور ہیں اور بت پرستی سے نفور اس لیے وہ کعبہ کو مسجود نہیں قرار دے سکتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فقہ میں یہ مسئلہ مسلم ہے کہ اگر صحرا میں کسی کو کعبہ کی سمت معلوم نہ ہو تو وہ جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھ لے کیونکہ خدا تو ہر طرف ہے۔

بنیادی تصور:۔ کعبہ مسجود نہیں ہے بلکہ قبلہ نما ہے۔

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
(۶) خارِ راہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں!

مہر گیا۔ ایک جنگلی بوٹی ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جس کے پاس ہوتی ہے لوگ اس پر مہربان ہو جاتے ہیں۔

مطلب:۔ اے محبوب! جب سے تجھے ہمارے زخمی پاؤں پر رحم آیا ہے، ہم

ان کانٹوں کو جن سے ہمارے پاؤں زخمی ہوئے ہیں، کانٹے نہیں بلکہ مہر گیا سمجھتے ہیں۔

بنیادی تصور:- اظہار جذبۂ امتنان۔

(۷)
اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں

ہوا کہتے ہیں یعنی ہوا طلب کرتے ہیں۔

مطلب:- ہم دل کی آگ سے نہیں گھبراتے بلکہ اسے اور بھڑکانا چاہتے ہیں۔ پس اگر ہم ہوا طلب کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد گرمی سے تسکین پانا نہیں بلکہ آگ کو بھڑکانا ہے۔

بنیادی تصور:- گوارائی سوزِ عشق۔

(۸)
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم 'نامِ خدا' کہتے ہیں

نامِ خدا کہتے ہیں یعنی تعریف کرتے ہیں، نخوت بمعنی تکبر۔

مطلب:- چونکہ ہم (عشاق) اس کی ہر بات اور ہر فعل پر اس کی توصیف کرتے ہیں اور ہماری اس جا و بیجا خوشامد سے اس کی نخوت (خود بینی) میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے اب ہم ڈرتے ہیں کہ خدا جانے اس کی نخوت کیا رنگ لائے گی!

(۹)
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا، کہتے ہیں!

غلام علی خاں وحشت اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ دونوں غالب کے خاص قدردان اور معتقد تھے۔ ان کے تخلص کی رعایت سے غالب نے اپنے آپ کو

'آشفتہ نوا' لکھا ہے۔

مطلب:۔ لوگ کہتے ہیں کہ غالب آشفتہ نوا دنیا سے کوچ کر گیا۔ شاید وحشت اور شیفتہ اس کی وفات پر مرثیہ لکھ کر حق دوستی ادا کریں۔

بنیادی تصور:۔ تمنائے تعزیت بر وفات خویش۔

---

(۸۸)

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
(۱) ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ننگِ پیراہن یعنی پیراہن کے لیے باعث شرم۔ جو دامن میں نہیں یعنی جس کا چاک دامن کے چاک سے نہ مل جائے۔

مطلب:۔ جس طرح اس پھول کی کوئی وقعت نہیں ہوتی جو گلشن میں نہ ہو وشاخ پر نہ ہو اسی طرح وہ گریباں بھی ننگِ پیراہن ہے جس کا چاک، دامن کے چاک سے نہ جا ملے۔ یعنی وہ عاشق ہی نہیں جس کا گریباں چاک نہ ہو۔

بنیادی تصور:۔ گریباں چاک کرنا شیوۂ عاشقی ہے۔

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
(۲) رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

مطلب:۔ گریہ سے خطاب کرتے ہیں کہ اب میرے جسم میں خون بالکل باقی نہیں ہے۔ زیادہ تر خون تو آنکھوں کی راہ سے نکل گیا، جس کا ثبوت میرے خون آلود دامن سے مل سکتا ہے، اور جو باقی رہ گیا تھا وہ رنگ بن کر اڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ ضعف میں رنگ پیلا پڑ جاتا ہے جس کو رنگ اڑ جانے سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ گریہ۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب!
(۳) ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

ذرات کو اجزائے نگاہِ آفتاب سے تعبیر کرنا شاعر کی رفعتِ تخیل کی دلیل ہے مراد یہ ہے کہ آفتاب بھی مشتاقِ دید ہے۔

مطلب:- اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں جو ذرات نظر آتے ہیں، یہ ذرات نہیں ہیں بلکہ اجزائے نگاہ آفتاب ہیں یعنی آفتاب کو بھی اُسے جھانک کر دیکھنے کی آرزو ہے۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم، اندھیر ہے!
(۴) پنبہ، نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اُندھیر ہے، اس کے دو معنی ہیں (۱) تاریکی ہے (ب) استم برپا ہے، پنبہ یعنی روئی۔ چونکہ روئی سفید ہوتی ہے اس لیے اسے نورِ صبح سے تشبیہ دی ہے

مطلب:- زندانِ غم (شبِ فرقت) کی تاریکی کا حال کیا بیان کروں! مجھ پر ناقابل بیان ستم ٹوٹا ہے! بس یہ سمجھ لو کہ جس زنداں کے روزن میں، روئی بھی نورِ صبح معلوم ہوتی ہے، اس کی تاریکی کا کیا عالم ہوگا! قاعدہ ہے کہ گھپ اندھیرے میں معمولی سفیدی بھی بہت زیادہ چمکتی ہے۔

بنیادی تصور:- شدتِ تاریکیٔ زندانِ غم۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
(۵) انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

مطلب:- حالی مرحوم لکھتے ہیں، ہماری دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے۔ خواہ زن، فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی خواہ ملک و ملت کی خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دل میں محبت

نہیں تو اس دل کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔"
(یادگار غالب صفہ ۱۳)

بنیادی تصور :- عشق باعثِ رونق ہستی ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
(۶) غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

مطلب :- رقیب اس راز سے واقف نہیں ہے کہ میں زخم اس لیے سلوا رہا ہوں کہ مجھے سوئی کے چبھنے سے لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نادانی کی وجہ سے طعنہ دیتا ہے کہ میں زخم کی چارہ جوئی (یعنی اس کا علاج) کر رہا ہوں!

بنیادی تصور :- لذت زخم سوزن۔

بسکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے
(۷) جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

جلوۂ گل کے اثبات کے لیے معشوق کو "بہار ناز" سے تعبیر کیا ہے یعنی ایسا معشوق جس کا ناز بہار آفریں ہے۔

مطلب :- چونکہ ہم کشتۂ بہارِ ناز ہیں اس لیے ہمارے مدفن میں خاک بالکل نہیں ہے بلکہ ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔

بنیادی تصور :- تاثیر نازِ بہار آفریں۔

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
(۸) خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

مطلب :- میرے خون کے ہر قطرے میں ناسور بن جانے کا مادہ (ہیولیٰ) موجود ہے۔ یعنی ہر قطرے میں ناسور بن جانے کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خون کے ہر قطرے میں لذتِ درد پنہاں ہے۔

بنیادی تصور :۔ عشق ہر قطرۂ خوں کو ناسور میں تبدیل کر دیتا ہے۔

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
(۹) موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں

لے گئی یعنی میری قلزم آشامی، ساقی کی نخوت کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئی مطلب یہ ہے کہ میری قلزم آشامی نے ساقی کے غرور کو توڑ دیا + رگ گردن کنایہ ہے غرور سے۔ مینا کی گردن میں موجِ مے کی رگ نہیں ہے یعنی بوتل خالی ہو گئی۔ قلزم آشامی کنایہ ہے کثرتِ مے نوشی سے۔

مطلب :۔ ساقی کو اپنے شراب پلانے پر بہت غرور تھا مگر میں نے بوتل خالی کر کے اس کا غرور توڑ دیا۔

بنیادی تصور :۔ اظہار کثرتِ مے نوشی۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
(۱۰) قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

فشار یعنی دبانا، نچوڑنا، بھینچنا + ناتوانی کی نمود یعنی ناتوانی کا اظہار۔

مطلب :۔ چونکہ ضعف ہر طرف سے مجھے دبا رہا ہے یعنی چاروں طرف سے میرے اوپر غالب ہے اس لیے کسی طرف کو جھک نہیں سکتا۔ بالفاظِ دگر میں اس قدر ضعیف ہوں کہ اپنی ناتوانی (اپنے ضعف) کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔

اس شعر میں غالب نے اپنی ناتوانی کے باب میں مبالغہ کیا ہے، اور مقصد اس مبالغہ سے اپنی مضمون آفرینی کی قوت کا اظہار ہے۔ مثلاً مومن نے اپنی مضمون آفرینی کا کمال اس انداز سے دکھایا ہے :۔

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو !!
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

بنیادی تصور:۔ شدتِ ضعف۔

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ، کہ ہو غربت میں قدر
(۱۱) بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

شان بمعنی قدر و قیمت + غربت بمعنی پردیس + بے تکلف بمعنی سچ تو یہ ہے مشتِ خس گھاس پھوس یا کوڑا کرکٹ + گلخن بمعنی بھٹی۔

مطلب:۔ حالیؔ لکھتے ہیں "اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔"

مولانا سید ہاشمی نے حالی سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شاعر کا اصلی مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے مخفی جوہر نہ دیس میں ظاہر ہو سکے نہ پردیس میں۔ سچ تو یہ ہے کہ میری حالت اس مشتِ خس کی سی ہے جو اپنے موزوں مقام یعنی گلخن میں نہ ہو۔ مگر وہ گلخن میں ہوتا تو اس کے کمالات ظاہر ہو جاتے یعنی وہ خود بھی روشن ہو جاتا اور بھٹی کو بھی روشن کر دیتا۔

چونکہ غالب نے اپنی نظم اور نثر دونوں میں جگہ جگہ اپنی ناقدری کا شکوہ کیا ہے اس لیے ہاشمی صاحب کا مطلب بہتر معلوم ہوتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ شکوۂ بیقدری خویش۔

---

(۸۹)

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
(۱) گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

عہدے سے باہر نہ آسکا یعنی عہدہ برآ نہ ہو سکا یا فرض مدح ادا نہ کر سکا۔ مدح ناز یعنی محبوب کے ناز و انداز کی تعریف۔

مطلب :۔ مضمون آفرینی کے لحاظ سے بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔ مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ اس کی ہر ادا جاں ستاں ہے یا ہر ادا پر جان فدا کر دینے (مر مٹنے) کو جی چاہتا ہے لیکن اس سیدھی سادی بات کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے اور یہی ان کا وہ انداز بیان ہے جس پر دنیا مٹی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر اس میں صرف ایک ادا ہوتی تو میں یہ کہہ کر اس کی تعریف سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا کہ وہ ادا ایسی دلکش ہے کہ اس پر قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ اس کی ہر ادا جاں ستاں ہے اب جان تو پہلی ہی ادا پر نثار کر دی اور جان سے بڑھ کر کوئی شئے ہے نہیں تو دوسری اداؤں کی دلکشی کا اظہار کیسے اور کن الفاظ میں کروں ! یعنی ان کی تعریف میں کیا کہوں ! اس لیے میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس کی اداؤں کی تعریف نہیں کر سکتا۔

بنیادی تصور :۔ محبوب کی ہر ادا، جاں ستاں (قضا) ہے۔

(۲)
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ، بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگاہِ سرمہ سا کہوں

زلفوں کے حلقوں کو آنکھوں سے اور تارِ زلفِ سیاہ کو نگاہِ سرمہ سا سے تشبیہہ دی ہے۔

مطلب :۔ چونکہ اس کی زلف کے حلقے، کھلی ہوئی آنکھوں کی مانند ہیں جو میرے دل کی طرف دیکھ رہے ہیں اس لیے اگر میں تارِ زلف کو نگاہِ سُرمہ سا کہدوں تو بے جا نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ دلکشی حلقہ ہائے زلف۔

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
(۳) تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

شعر کا لطف صنعت تقابل میں مضمر ہے، اور اس میں شک نہیں کہ غالب نے اس صنعت کو اپنے کلام میں بہت خوبی سے استعمال کیا ہے۔

مطلب :- مطلب بالکل صاف ہے کہ میں ایک وہ نہیں ہزاروں جگر خراش نالے سرزد کر رہا ہوں مگر تو ایسا سنگدل ہے کہ تجھ پر کسی ایک کا بھی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

بنیادی تصور :- اظہار بے اعتنائی محبوب۔

ظالم! مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
(۴) ہے ہے! خدا نکردہ، تجھے بے وفا کہوں

منفعل نہ چاہ یعنی میرے گمان سے مجھے شرمندہ مت کر۔ یہ ترکیب اس لیے غیر مانوس ہے کہ فارسی محاورہ "منفعل خواستن" کا اردو ترجمہ ہے۔

مطلب :- شاعر کا گمان یہ کہتا ہے کہ محبوب بے وفا ہے۔ شاعر اس سے کہتا ہے کہ نہیں وہ باوفا ہے۔ اب شاعر اپنے محبوب سے یہ کہتا ہے کہ تو مجھ سے وفا کر تاکہ میں اپنے گمان کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ میرے گمان کا کہنا سچ ہو جائے اور میں تجھے بے وفا کہنے پر مجبور ہو جاؤں۔ شعر کی خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ غالب نے انوکھے انداز میں معشوق کو وفا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

بنیادی تصور :- ترغیب اختیار شیوۂ وفا۔

(۱) مہرباں ہو کے بلالو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

مطلب: شعر بالکل صاف ہے کہ میں تمہارے بلانے کا منتظر ہوں۔ جب مہرباں ہو کے مجھے بلاؤ گے میں اسی وقت تمہارے پاس دوڑا چلا آؤں گا۔ میں گذرا ہوا وقت (زمانہ) تو نہیں ہوں جو کبھی واپس نہیں آسکتا۔

بنیادی تصور:۔ آمادگی تجدیدِ تعلقات۔

(۲) ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات، کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

بات یعنی طعنۂ اغیار + بات اٹھانا یعنی طعنہ برداشت کرنا۔

مطلب: ضعف کی حالت میں اگر اغیار مجھے طعنے دیتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ طعنہ، بہر کیف سر تو نہیں ہے جسے میں اٹھا نہیں سکتا یعنی اُن کا طعنہ برداشت کر سکتا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ اظہار شدت ضعف و ناتوانی۔

(۳) زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر، ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی، کہ کھا بھی نہ سکوں

مطلب:۔ زہر، تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ میں کسی صورت سے نہیں کھا سکتا لہٰذا اگر میں زہر نہیں کھاتا تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ دستیاب نہیں ہوتا۔

بنیادی تصور:۔ عاشق اپنے معشوق سے ملنے کی قسم نہیں کھا سکتا۔

نوٹ:۔ ان تینوں شعروں میں خوبی یہ ہے کہ ہر شعر میں ایسا فعل لائے ہیں جس کا استعمال حقیقی معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور مجازی معنی

میں بھی۔ مثلاً کھانا۔ یہ فعل دو معنوں میں مشترک ہے۔(۱) زہر کھانا۔ یہاں یہ فعل اپنے حقیقی معنیٰ میں مستعمل ہے۔(۲) قسم کھانا ــ یہاں مجازی معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح اٹھانا۔ (۱) سر اٹھانا ــ یہاں اٹھانا حقیقی معنی میں مستعمل ہے (۲) بات اٹھانا ــ یہاں مجازی معنی میں مستعمل ہے۔ اس اشتراک معنوی کی وجہ سے شعروں میں جو بداعت اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے اس کا اظہار لفظوں کے ذریعہ سے بہت دشوار ہے۔

---

(۹۱)

(۱)
ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کے عذرِ مستی ایکدن

کھل جاؤ یعنی بے تکلف ہو جاؤ۔ عذر مستی یعنی نشہ کا بہانہ۔

مطلب:۔ شعر صاف ہے کہ بوقت شراب نوشی ہم سے بے تکلف ہو جاؤ تو بہت مناسب ہے ورنہ ہم نشہ کا بہانہ کر کے خود تم سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیں گے

بنیادی تصور:۔ ترغیب بے تکلفی۔

(۲)
غرۂ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن

غرہ بمعنی مغرور + عالم امکاں یعنی کائنات یا دنیا + پستی بمعنی فنا + لفظ پستی اوج کی رعایت سے لائے ہیں۔

مطلب:۔ اس دنیا کی دلکشی اور ترقی سے دھوکہ مت کھاؤ۔ یہ سارا کارخانہ انجام کار فنا ہو جائے گا۔

بنیادی تصور:۔ بے ثباتیٔ عالم۔

(۳) قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ہاں بمعنی یقیناً + رنگ لائے گی یعنی اس کا انجام بہت برا ہوگا۔

مطلب:۔ ہم قرض لے کر شراب پیتے تو تھے لیکن اس بات کا یقین تھا کہ ہماری اس فاقہ مستی (قرض لے کر شراب پینے) کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔

بنیادی تصور:۔ قرض لینے کا نتیجہ ذلت و خواری ہے۔

(۴) نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

نغمہ ہائے غم یعنی نالہ و فریاد + سازِ ہستی کنایہ ہے جسم انسانی سے۔

مطلب:۔ اے دل! نالہ و فریاد کو بھی غنیمت سمجھ۔ نغمۂ شادی نہ سہی نغمۂ غم ہی سہی۔ کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ نہ کچھ ہونا بہر حال بہتر ہے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب یہ جسم فانی بالکل خاموش ہو جائے گا، نہ اس سے آہ نکلے گی نہ واہ۔

بنیادی تصور:۔ رنج و الم میں بھی تسکین کا پہلو تلاش کرنا چاہیے۔

(۵) دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

مطلب:۔ شعر کا مطلب بالکل واضح ہے کہ محبوب دراصل دھول دھپے کا عادی نہیں تھا۔ یہ بری عادت ہم ہی نے اسے سکھائی (پیش دستی بمعنی ابتدا کرنا)

نوٹ:۔ مطلع اور مقطع دونوں میں معاملہ بندی ہے اور یہ غالب کا رنگ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطری شوخیٔ طبع کی بنا پر یہ شعر موزوں ہو گئے ۱۲

(۹۲)

(۱)
ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے، وگرنہ مراد، امتحاں نہیں

مطلب: محبوب کی جفائیں محض ہمیں چھیڑنے کے لیے ہیں، ان سے اس کی مراد ہمارا امتحان نہیں ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ میں خواہ کتنی ہی جفائیں کیوں نہ کروں غالب ترکِ وفا (مجھ سے بیوفائی) نہیں کرے گا۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ وفا کیشئ خویشتن۔

(۲)
کس منہ سے شکر کیجیئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

لطفِ خاص بمعنی انداز معشوقانہ یا ادائے دلربایانہ + پائے سخن درمیاں نہیں ہے یعنی زبان سے کچھ نہیں کہتا۔

مطلب:۔ میں محبوب کی اس مہربانی کا کس منہ سے شکر ادا کروں کہ وہ زبان سے حال دریافت کرنے کے بجائے محبت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ لیتا ہے! میری نگاہ میں اس کا یہ التفات ہی گویا پرسشِ احوال ہے۔

بنیادی تصور:۔ تحدیثِ نعمتِ لطفِ خاص۔

(۳)
ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

مطلب:۔ ہم اس کے ستم کو عزیز رکھتے ہیں اور چونکہ وہ ہمیں عزیز رکھتا ہے یعنی اسے ہماری خاطر منظور ہے اس لیے وہ ہم پر ستم کرتا ہے لہذا اگر وہ ہم پر ستم کرتا ہے (مہربان نہیں ہے) تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ ہم پر ظلم کرتا ہے بلکہ یہ ثابت ہوا کہ وہ ہم پر مہربانی کرتا ہے (نامہرباں نہیں ہے) کیونکہ

ہمیں وہی شی عطا کرتا ہے جو ہمیں مرغوب ہے۔
اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ شاعر نے محبوب کی نامہربانی (ستم) کو مہربانی ثابت کیا ہے۔ اور اس کا اثبات اس انداز سے کیا ہے کہ اس میں صنعتِ تضاد پیدا ہو گئی ہے۔ مہربان، نامہربان کی ضد ہے۔ یہ خوبی اکثر اشعار میں پائی جاتی ہے۔ اور شاعر کی قادر الکلامی پر شاہد ہے مثلاً

ع دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بنیادی تصور :۔ اثباتِ مہربانی محبوب۔

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
(۴) آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

مطلب :۔ شعراء نے دہنِ محبوب کو معدوم فرض کر لیا ہے۔ اس مفروضہ کو مدنظر رکھ کر یہ بات پیدا کی ہے کہ تم بوسہ نہیں دے سکتے تو کم از کم گالی ہی دو! کیونکہ اگر تم دہن نہیں رکھتے تو زبان تو رکھتے ہو۔

بنیادی تصور :۔ آنچہ از دوست می رسد نیکوست۔

ہر چند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے
(۵) ہر چند پشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
(۶) لب، پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

پشت گرمی یعنی برداشت کی طاقت + ہل من مزید۔ قرآن حکیم کی آیت ہے جس کا مطلب ہے کیا کچھ اور بھی ہے؟ اردو میں اس آیت کو طلب مزید کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں + پردہ سنج بمعنی نغمہ سنج مطرب، ترانہ، پردہ،

زمزمہ اور لب میں رعایت لفظی ہے۔

مطلب:۔ اگرچہ اس کے قہر سے جان پگھل جاتی ہے اور مجھ میں اس کے ظلم برداشت کرنے کی قوت بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں اس سے یہ التجا نہیں کرتا کہ وہ ظلم کرنا چھوڑ دے بلکہ یہ کہتا ہوں کہ کیا تیرے پاس مزید ظلم ہے! یعنی جتنا جی چاہے مجھ پر ظلم کر، میں برداشت کروں گا۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ ذوقِ ایذا طلبی۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
(۷) دِل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں

مطلب:۔ اگر تیرا دل رنج و غم سے دو ٹکڑے نہیں ہوا ہے تو اپنے سینہ میں خنجر بھونک لے اور اگر تیری پلکوں سے خون نہیں ٹپک رہا ہے تو دل میں چھری چبھو لے، تاکہ عاشقی کا تقاضا پورا ہو سکے۔ اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو دنیائے عاشقی میں تجھے کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

بنیادی تصور:۔ کمال عاشقی اس بات میں منحصر ہے کہ دل دو نیم ہو اور مژہ خونچکاں ہو۔

ہے ننگِ سینہ دِل، اگر آتش کدہ نہ ہو
(۸) ہے عارِ دل نفس، اگر آذر فشاں نہ ہو

ننگ بمعنی عار یا شرم + آذر بمعنی آتش

مطلب:۔ وہ دل جو آتش کدہ نہ ہو یعنی جس میں عشق کی آگ نہ بھڑک رہی ہو سینے کے لیے باعثِ شرم ہے اور وہ سانس جو آتش فشاں نہ ہو یعنی جس سے آگ نہ برسے، دل کے لیے موجب خجالت ہے۔

بنیادی تصور:۔ صفتِ قلب و نفسِ عاشق۔

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
(۹) سو گز زمیں کے بدلے، بیاباں گراں نہیں

مطلب:۔ اگر عاشقی (جنوں) میں ہمارا گھر برباد ہو جائے تو چنداں نقصان نہیں ہے کیونکہ گھر کا رقبہ زیادہ سے زیادہ سو دو گز ہوگا لیکن اس کے عوض پورا بیاباں ہمارے تصرف میں آجائے گا۔ جس میں ایسے ہزاروں گھر بن سکتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ عاشق کی خانہ بربادی میں بھی ایک نفع کا پہلو مضمر ہے۔

کہتے ہو، "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں"
(۱۰) گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

مطلب:۔ اس شعر میں مومن کا رنگ جھلکتا ہے۔ معشوق سے کہتے ہیں کہ تم جو مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ تری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ کیا تمہیں میری پیشانی پر سجدۂ بت کا نشان نظر نہیں آتا۔ کیسے دلکش پیرایہ میں اپنی تقدیر کا حال بتایا ہے کہ ساری عمر بت پرستی میں گذرے گی!

بنیادی تصور:۔ بت پرستی تقدیر عاشق ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
(۱۱) رُوح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "یہاں ہمزباں کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی لیکن در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں۔"
(یادگار غالب صد ۱۳۱)

یہ شعر شاعرانہ تعلی کی بہت عمدہ مثال ہے۔ غالب کا مطلب یہ ہے کہ انسان

در کنار فرشتے" بھی میرے کلام کو پورے طور سے نہیں سمجھ سکتے۔ پہلے مصرع میں لفظ "کچھ" غور طلب ہے یعنی روح القدس (جبریل) بھی میرے کلام کو پورے طور سے نہیں سمجھ سکتا۔

بنیادی تصور:۔ تعلیٔ شاعرانہ

جاں ہے بہائے بوسہ، دے کیوں کہے ابھی
(۱۲) غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مطلب:۔ ابھی وہ مجھ سے کیوں کہے کہ جاں دے کر بوسہ لو؛ وہ جانتا ہے کہ ابھی مجھ میں جان باقی ہے۔ جب میں نیم جان ہو جاؤں گا تو مجھے ستانے کے لیے اعلان کرے گا کہ بوسہ کی قیمت جان ہے۔

شعر کا لطف نیم جاں میں مضمر ہے کیونکہ اس میں ایہام ہے اور ایہام سے ہمیشہ شعر میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے لغوی معنی ہیں وہ شخص جس کی جان آدھی رہ گئی ہو۔ مجازی معنی ہیں ضعیف و ناتواں۔

بنیادی تصور:۔ ذوق ایذا رسانیٔ محبوب۔

---

(۹۳)

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
(۱) ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "چکر سے پھرنے کی وحشت مراد ہے۔ مثلاً اس کے پاؤں میں چکر ہے۔" اس کے معنی ہیں کہ اس کو پھرنے کی دھت ہے کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے نہیں روک سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے کہ میں دشت نوردی نہ کر سکوں،

اسے زنجیر مت سمجھو بلکہ چکر سمجھو" (یادگار غالب ص۱۳۱)

نوٹ :۔ لفظِ چکر میں ایہام ہے اور اسی سے شعر میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اس کے پاؤں میں چکر ہے تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) اس کو پھرنے کی دھت ہے۔ یہاں چکر مجازی معنی میں مستعمل ہے (۲) حلقۂ زنجیر بھی چکر ہی ہوتا ہے۔ یہاں لفظِ چکر حقیقی معنی میں مستعمل ہے۔

بنیادی تصور :۔ شوقِ صحرا نوردی۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں (۲)

شوق بمعنی عشق + جادہ بمعنی راستہ + غیر از نگاہ دیدۂ تصویر سے مراد یہ ہے کہ جس طرح دیدۂ تصویر میں نگاہ نہیں ہوتی اسی طرح اس دشت میں کوئی جادہ نہیں ہے۔

مطلب :۔ عشق مجھے اس جنگل میں دوڑاتا ہے جس میں کوئی راستہ نہیں ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جنگل میں عاشق، مثل دیدۂ تصویر حیران رہ جاتا ہے کہ کدھر کو جاؤں۔ (کیونکہ راستہ تو کوئی نظر آتا نہیں)

بنیادی تصور :۔ سرگشتگیٔ عشاق اور صحرائے بے جادہ

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں (۳)

مطلب :۔ جادہ یعنی بٹیا کو دم شمشیر (تلوار کی باڑھ) سے تشبیہ دی ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے، جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں۔ مگر چونکہ وفا کی راہ، سراسر تلوار کی

دھار پر ہے، اسی لیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت، دل کی دل میں رہی جاتی ہے۔ (یادگار غالب صہ ۱۴۲)

بنیادی تصور:۔ بیانِ حسرتِ لذتِ آزار۔

(۴) رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو ✽ خوش ہوں گر نالہ، زبونی کشِ تاثیر نہیں

زبونی کشِ تاثیر یعنی تاثیر کے احسان کی ذلت اٹھانے والا۔

مطلب: صرف اس قدر ہے کہ تاثیر کا احسان اٹھانے سے دائمی ناکامی کا رنج قابلِ ترجیح ہے۔ غالب کے یہاں اس قسم کے کئی اشعار ملیں گے جن میں کسی کا احسان لینے سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا الخ

بنیادی تصور:۔ اظہارِ شانِ استغنا۔

(۵)
سر کھجاتا ہے، جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جہاں بمعنی جب ✽ باندازۂ تقریر نہیں یعنی بذریعہ الفاظ اس کا بیان نہیں ہو سکتا

مطلب:۔ جب زخم سر اچھا ہو جاتا ہے تو میرا سر پھر کھجانے لگتا ہے یعنی پھر زخمی ہونے کو دل چاہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب لڑکے پتھر مارتے ہیں تو مجھے اس قدر لذت محسوس ہوتی ہے کہ لفظوں کے ذریعہ سے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ ایذا طلبی۔

(۶)
جب کرم، رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر نہیں

کرم بمعنی محبوب کا لطف و کرم یا اس کی عنایت ✽ رخصت بمعنی اجازت تقصیر بمعنی گناہ، خجلتِ تقصیر یعنی قصور کرنے سے شرمانا یا قصور نہ کرنا۔

مطلب :۔ جب محبوب اپنی مہربانی سے عاشق کو بے تکلفی اور گستاخی (دست درازی) کی اجازت دیدے تو اس وقت اس کی شان میں گستاخی یعنی دست درازی نہ کرنے سے بڑا کوئی اور گناہ نہیں ہے۔ یعنی اس کی مہربانی سے دل کھول کر فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

بنیادی تصور :۔ محبوب کی عنایت سے متمتع نہ ہونا، مذہب عشق میں گناہِ کبیرہ ہے۔

(۷)
غالب ! اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مطلب :۔ اے غالب ! مجھے ناسخ کے اس قول سے کلی اتفاق ہے کہ جو شخص میر کی استادی اور برتری کا معترف نہیں ہے وہ بڑا بدنصیب ہے۔

ذوق لکھتے ہیں :۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب !
ذوق ! یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سودا لکھتے ہیں :۔

سودا تو اس زمین میں غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

بنیادی تصور :۔ اعترافِ عظمتِ میر۔

---

(۹۴)

(۱)
مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

مردمکِ دیدہ بمعنی آنکھ کی پتلی + سویدا بمعنی سیاہ نقطہ جو دل میں ہوتا ہے جس طرح پتلی میں سیاہ تل ہوتا ہے اسی طرح دل میں سیاہ نقطہ ہوتا ہے لہذا تل کو سویدا سے تشبیہ دی ہے۔ دلِ چشم سے پتلی مراد ہے + نگاہوں کو دل کی آہوں سے تشبیہ دی ہے +

مطلب :۔ اس شعر میں غالب نے بہت تصنع سے کام لیا ہے۔ اگر تشبیہات کا پردہ اٹھا دیا جائے تو مطلب صرف اس قدر برآمد ہوتا ہے کہ میری آنکھ کے تل میں نگاہیں نہیں ہیں بلکہ سویدائے دلِ چشم (پتلی) میں آہیں جمع ہو گئی ہیں۔ بالفاظِ دگر میری نگاہیں دراصل وہ آہیں ہیں جو پتلی میں ایک مرکز پر جمع ہو کر سیاہ نقطہ (تل) بن گئی ہیں۔

بنیادی تصور :۔ دل کی آہوں نے آنکھ کے تل کی صورت اختیار کر لی ہے

---

(۹۵)

برشگال گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے
(۱) کھِل گئی مانندِ گل، سو جا سے دیوارِ چمن

برشگال بمعنی برسات + کھل گئی یعنی شق ہو گئی + چمن کی کھلی ہوئی دیوار کو پھول سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ جب پھول کھلتا ہے تو وہ بھی کئی جگہ سے شق ہو جاتا ہے۔

مطلب :۔ عاشق کی گریہ وزاری سے برسات کا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ دیکھئے اس شدتِ گریہ کا انجام کیا ہو! ابتداء تو یہ ہے کہ چمن کی دیوار، پھول کی طرح سو جگہ سے شق ہو گئی ہے۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ گریۂ عاشق۔

اُلفتِ گل سے غلط ہے دعوئ وارستگی
(۲) سرو ہے باوصف آزادی گرفتارِ چمن

گُل کنایہ ہے دنیا کی دلچسپیوں سے + وارستگی بمعنی بے تعلقی یا آزادی۔ سرو کنایہ ہے انسان سے + چمن کنایہ ہے دنیا سے + شعراء سرو کو آزاد باندھا کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خزاں کے اثر سے آزاد ہوتا ہے یعنی وہ اس موسم میں بھی سرسبز ہی رہتا ہے +

مطلب :۔ چمن میں جو بھی ہے وہ الفتِ گل میں گرفتار ہے۔ سرو کو دیکھ لو! دعوئ آزادی کے باوجود، باغ سے باہر نہیں جا سکتا۔ اسی طرح دنیا میں جو بھی ہے وہ اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ جو لوگ دنیا سے بے تعلق ہونے کے مدعی ہیں وہ بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں اس سے باہر نہیں جا سکتے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے :۔

ترکِ دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا
غور جب ہم نے کیا سانس کو دُنیا پایا

بنیادی تصور :۔ دنیا میں رہ کر کوئی شخص دنیا سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ بقول حالی "کوئی کیسا ہی آزاد وراستہ مزاج ہو، دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔"

---

(۹۶)

(۱) عشق، تاثیر سے نومید نہیں ؛ جاں سپاری، شجر بید نہیں

جاں سپاری بمعنی عاشقی + شجر بید میں پھول نہیں لگتا۔ اس لیے شجر بید کنایہ ہے ایسے فعل سے جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔

مطلب :۔ سچا عاشق کبھی نا امید نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ عشق شجرِ بید نہیں ہے جس پر کوئی پھل نہیں لگتا یعنی عشق ضرور موثر ہوتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ اثباتِ تاثیرِ عشق۔

(۲) سلطنت دست بدست آئی ہے ❊ جامِ مے ، خاتمِ جمشید نہیں

مطلب :۔ شاعر نے جام مے اور خاتمِ جمشید کا مقابلہ کیا ہے اور جام مے کی فضیلت ثابت کی ہے۔ سلطنت سے جام مے یا سلطنتِ مینوشی مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ جامِ مے اصل سلطنت ہے جو رندوں کو دست بدست ایکے بادیگرے پہنچا ہے یہ خاتم جمشید تو نہیں ہے جس پر اسی کا نام کندہ تھا اور اس لیے اسی کے پاس رہی ۔ (اردو غزل ص۲۰۵)

بنیادی تصور :۔ عمومیتِ فیضانِ مے نوشی۔

(۳) ہے تجلی تری سامانِ وجود ❊ ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

مطلب :۔ اے خدا! تیری جلوہ گری، باعثِ وجودِ عالم ہے۔ یہ کائنات کچھ نہیں ہے مگر تجلی ہے تیری ذات وصفات کی۔ جس طرح خورشید کی پرتو فشانی کے بغیر کسی ذرے میں تابانی نہیں ہو سکتی اسی طرح تیری تجلی کے بغیر کوئی شئے موجود نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور :۔ تعلیم وحدت الوجود۔

(۴) رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ❊ ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

مطلب :۔ "بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں خواہ پوشیدہ مصلحت ہو یا پوشیدہ قباحت۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔" (یادگارِ غالب ص۱۳۲)

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں جو زندہ ہوں تو اس لیے نہیں کہ میرے مر جانے

میں کوئی قباحت پوشیدہ ہے بلکہ اس لیے کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے مرنے سے محبوب کی رسوائی نہ ہو جائے ۔ یعنی میں محض اس کو رسوائی سے بچانے کے لیے زندہ ہوں ورنہ اس کی محبت میں جان دے دینا میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی ۔

بنیادی تصور :- پاسِ ناموسِ محبوب ۔

(۵) گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے ؛ غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

مطلب :- مجھے دائمی ناکامی (محرومیٔ جاوید) کا ڈر نہیں ہے یعنی اس حالت کو میں گوارا کر سکتا ہوں کیونکہ اس میں بھی تسکینِ قلب کا ایک پہلو مضمر ہے اور وہ یہ کہ یہ حالت محرومی ہمیشہ رہے گی ۔ اور قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان ، رنج کا خوگر ہو جاتا ہے تو رنج کا احساس مٹ جاتا ہے ۔

ع مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ہاں جس بات سے ڈرتا ہوں وہ "گردشِ رنگِ طرب" ہے یعنی اگر عیش و عشرت کے بعد رنج و مصیبت کا دور آ جائے تو وہ حالت ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ دنیا میں رنگِ طرب (دورِ عشرت) کو ثبات نہیں ہے اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ میں غمِ محرومیٔ جاوید کی بجائے گردشِ رنگِ طرب سے ڈرتا ہوں ۔

بنیادی تصور :- اندیشۂ گردشِ رنگِ طرب ۔

(۶) کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ؛ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

مطلب :- یہ شعر غالب کی جودتِ طبع اور الفاظ پر قدرت کی بہت عمدہ مثال ہے ۔ ان کے دیوان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں انھوں نے محض لفظوں کے الٹ پھیر سے مضمون پیدا کر لیا ہے ۔

کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو امید کے سہارے جینے

رہتے ہیں لیکن ہم ایسے بدبخت ہیں کہ جینے کی امید ہی سے محروم ہیں تو پھر ہمارے جینے کی کیا صورت (امید) ہو سکتی ہے؟

بالفاظِ دگر امید پر وہ جیتا ہے جسے جینے کی امید ہوتی ہے مگر میری نومیدی کا یہ عالم ہے کہ مجھے جینے کی بھی امید نہیں ہے تو پھر میں امید پر کیسے اور کیونکر جی سکتا ہوں؟ بقول حالی یہ شعر سہل ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا ناممکن ہے۔"

بنیادی تصور:۔ غایتِ ناامیدی۔

---

(۹۷)

(۱) جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں ؎ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

مطلب:۔ اے محبوب! ہم جس جگہ تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں وہاں بہشت کے جلوے بکثرت نظر آتے ہیں یعنی تیرا نقشِ قدم جہاں پڑتا ہے وہ جگہ بہشت کی مانند سرسبز اور شاداب ہو جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ تاثیر نقشِ قدمِ محبوب۔

(۲) دل آشفتگاں، خالِ کنجِ دہن کے ؎ سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مضمون آفرینی کے لحاظ سے یہ شعر بہت دلکش ہے دل آشفتگاں یعنی عشاق۔ خالِ کنج دہن۔ وہ تل جو دہن معشوق کے کنارے پر واقع ہو۔ لفظ "دہن" عدم کی رعایت سے لائے ہیں اور لفظِ عدم قافیہ کی وجہ سے باندھا ہے۔ شعرا دہن محبوب کو عدم قرار دیتے ہیں اس لیے غالب نے اس مفروضہ سے فائدہ اٹھا کر عشاق کو بآسانی عدم کی سیر کرا دی! لفظِ سویدا، خال کی رعایت سے لائے ہیں کیونکہ سویدا بھی خال کی طرح سیاہ ہوتا ہے۔ لفظِ سویدا

میں ابہام ہے (۱) اپنے دل کے سویدا میں (۲) خالِ محبوب میں اس ابہام سے شعر کی دلکشی میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

مطلب:۔ جو لوگ محبوب کے خالِ دہن پر فریفتہ ہیں وہ اپنے دل میں عدم کی سیر کرتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اس تل میں عدم کی سیر کرتے ہیں۔ اور اس میں شک کیا ہے کہ جب دہن بمنزلۂ عدم ہے تو خالِ دہن بھی بمنزلۂ عدم ہے اس لیے جو لوگ خالِ دہن پر فریفتہ ہیں وہ یقیناً اپنے دل میں یا اس تل میں عدم کی سیر کرتے ہیں۔

خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ کوئی شخص جب تک خود معدوم نہ ہو جائے عدم کی سیر نہیں کر سکتا لیکن غالب کی مضمون آفرینی کے صدقے میں عشاق نے جیتے جی عدم کی سیر کر لی۔

بنیادی تصور:۔ لطفِ سیرِ عدم۔

(۳) ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم ؛ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سرو قامت بمعنی قامت، اک قدِ آدم یعنی بقدر قدِ آدم

مطلب: حالی لکھتے ہیں اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ چونکہ تیرا قد اسی فتنۂ قیامت میں سے بنایا گیا ہے اس لیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے (یادگارِ غالب ص ۱۱۹)

بنیادی تصور:۔ فتنہ سامانیٔ قامتِ محبوب

(۴) تماشا کر اے محوِ آئینہ داری ؛ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

تماشا کر یعنی دیکھ، محوِ آئینہ داری یعنی وہ شخص جو آئینہ دیکھنے میں محو ہو۔

مطلب:۔ اے محوِ آئینہ داری! آئینہ کیا دیکھتا ہے! ہمیں دیکھ کہ ہم کس تمنا سے تجھے دیکھ رہے ہیں! مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنے حسن میں وہ دلکشی نظر نہیں آئے گی جو ہمارے دیکھنے میں پائی جاتی ہے۔ بنیادی تصور:۔ دلکشیٔ اندازِ دیدِ عاشق۔

(۵) سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے ؛ کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

سراغ تف نالہ بمعنی نالہ کی گرمی کا حال، شب رو بمعنی رات کو چلنے والا، نالۂ دل کو شب رو سے اور داغ دل کو شب رو کے نقش سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب: جس طرح نقوش قدم سے شب رو کا سراغ مل سکتا ہے اسی طرح میرے داغ دل سے نالہ کی سوزش کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

بنیادی تصور:- داغ دل مظہر سوزش نالہ ہے۔

(۶) بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب ؛ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

مطلب:- ہم نے فقیروں کا بھیس اس لیے نہیں بنایا کہ ہم گداگری کرنی چاہتے ہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس دنیا میں اہل کرم کتنے ہیں اور کہاں ہیں۔

بنیادی تصور:- کمیابی اہل کرم۔

---

(۹۸)

(۱) ملتی ہے خوئے یار سے نار، التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

التہاب بمعنی بھڑکنا، نار، التہاب، کافر اور عذاب میں رعایت لفظی ہے۔

مطلب:- چونکہ بھڑکنے اور شعلہ مارنے کے اعتبار سے آگ بھی میرے محبوب کی عادت سے ملتی جلتی ہے اس لیے مجھے عذاب نار (دوزخ) میں یقیناً راحت محسوس ہوتی ہے۔ "کافر ہوں" کے ٹکڑے نے بلا کا زور پیدا کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں اس صداقت کا (کہ مجھے عذاب میں راحت محسوس ہوتی ہے) انکار کر دوں تو بلاشبہ کافر ہو جاؤں گا۔

غالب کی شوخی ملاحظہ ہو کہ دوزخ میں جل رہے ہیں اس کے باوجود اپنے آپ کو مومن سمجھ رہے ہیں!

بنیادی تصور:- عاشق کو ہر وہ شی محبوب ہوتی ہے جو معشوق سے مشابہ ہو۔

(۲) کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہان خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

مطلب :- خوبی اس شعر کی اس کے اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ دراصل کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ بہت سی راتیں اس کے ہجر میں بسر کر چکا ہوں لیکن اس سیدھی سادی بات کو ایسے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ روح وجد کرتے لگتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اگر میں شبہائے ہجر کو بھی اپنی عمر کے حساب میں شامل کر لوں تو پھر میں دریافت کرنے والے کو صحیح صحیح نہیں بتا سکوں گا کہ اس جہانِ خراب میں کب سے ہوں۔

بنیادی تصور :- کثرتِ شبہائے ہجر۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں (۳)

مطلب :- میں ان کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ وہ خواب میں آئے اور آنے کا وعدہ کر گئے۔ ان کی اس ستم ظریفی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے انتظار کرتے کرتے تھک جاتا تھا تو دو گھڑی کو سو جاتا تھا اب آنکھ جھپکانے سے بھی محروم ہو گیا۔ یعنی پہلے خواب میں دیکھ لیا کرتا تھا اب یہ صورت بھی ناممکن ہو گئی ہے۔ بہت خوب شعر ہے۔

بنیادی تصور :- بیانِ شوخیٔ معشوق۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں (۴)

آتے آتے یعنی جب تک قاصد آئے۔

مطلب :- اس شعر میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے، کیونکہ دو مصرعوں میں غالب نے کئی باتیں جمع کر دی ہیں۔ مثلاً معاملات عاشقی میں اپنی تجربہ کاری، معشوق کی طبیعت سے آگاہی اور خود معشوق کی بیوفائی، بدعہدی اور عیاری وغیرہ۔

کہتے ہیں کہ جب تک قاصد آئے اور میرے خط کا جواب لائے میں اُنکے

جواب کا جواب لکھ لوں تو اچھا ہے۔ میرے لیے یہ کام اس لیے ممکن ہے کہ میں ان کی بد عہدی سے واقف ہوں وہ اپنے خط میں یقیناً ٹال مٹول سے کام لیں گے یعنی وصل سے انکار کریں گے۔ بالفاظِ دگر، میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

بنیادی تصور:۔ مزاجدانیٔ معشوق۔

(۵) مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں کہ اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کیے گئے ہوں وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔ (یادگار غالب ص ۱۳۲)

شعر کی نثر یوں ہو گی۔

مجھ تک ان کی بزم میں دورِ جام کبھی بھی نہیں آیا کرتا تھا آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے اس سے میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ساقی نے شراب میں کچھ ملا نہ دیا ہوا۔

ع ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس مصرع میں شاعر نے دانستہ طور پر کنایہ سے کام لیا ہے کچھ کنایہ ہے زہر سے اور علم معانی میں یہ بات مسلم ہے کہ اَلْکِنَایَۃُ اَبْلَغُ مِنَ التَّصْرِیْح یعنی کنایہ میں تصریح سے زیادہ بلاغت پائی جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ التفات غیر متوقع موجب بدگمانی ہوتا ہے۔

(۶) جو منکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے!
کیوں بد گمان ہوا، دوست سے دشمن کے باب میں

مطلب :۔ دوست (محبوب) منکرِ وفا ہے یعنی وہ کسی سے وفا نہیں کرتا اور منکرِ وفا پر رقیب کا فریب ہرگز نہیں چل سکتا یعنی وہ کبھی رقیب سے وفا نہیں کرے گا اس لیے مجھے محبوب سے بدگمان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے

بنیادی تصور :۔ بیانِ بے وفائی محبوب۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
(۷) ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

مطلب :۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ مجھے مضطرب دیکھ کر تم پیچ و تاب کھا رہے ہو کہ میرے اضطراب کی کیا وجہ ہے! تمہارے وہم کو دور کرنے کی غرض سے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں خوفِ رقیب کی وجہ سے مضطرب ہوں۔ کہیں وہ ایسے میں یہاں آ کر میرا لطف کرکرا نہ کر دے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں تو خوفِ رقیب کی وجہ سے مضطرب ہوں لیکن میرے اس اضطراب سے تم کو یہ وہم لاحق ہو گیا ہے کہ میں کسی دوسرے معشوق سے چھپ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔

بنیادی تصور :۔ ازالۂ پیچ و تابِ محبوب۔

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے
(۸) جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

مطلب :۔ مجھے وصل کی کوئی امید نہ تھی، لیکن یہ خدا کا کرم ہے کہ مجھے اس کے وصل کی لذت نصیب ہو گئی۔ اس نعمتِ عظمیٰ کے حصول کی خوشی میں مجھے اپنی جان نذر کر دی لازم تھی اور میں ضرور ایسا کرتا مگر اس غیر متوقع خوشی سے ایسا مبہوت ہوا کہ یہ فرض ادا کرنا بالکل بھول گیا۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ وفورِ مسرتِ وصل۔

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
(۹)
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

مطلب :- یہ شعر نزاکت خیال کی بہت عمدہ مثال ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ عاشق نے نقاب پر شکن دیکھی تو اُسے یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی وجہ سے محبوب کے ماتھے پر شکن پڑ گئی ہے اور اس کا عکس نقاب پر پڑ رہا ہے۔ شاید وہ مجھ سے خفا ہے لہ

بنیادی تصور :- مع میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا !!
(۱۰)
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

لگاؤ بمعنی لگاوٹ یا محبت + نگاہ چرانا بمعنی شرما کر نگاہ نیچی کر لینا۔

مطلب :- حالی مرحوم لکھتے ہیں "یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اسی طرح اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جن میں حسن ترصیع کا پورا

لہ بعض نسخوں میں پہلا مصرع یوں لکھا ہے :-

"تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے"

میری رائے میں یہ مصرع بہتر ہے مطلب واضح ہے کہ چونکہ نقاب کے اندر اُن کی تیوری چڑھی ہوئی ہے اس لیے طرف نقاب میں شکن پڑی ہوئی ہے ۱۲

پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نگاہ کیجے تو ہر ایک مصرع میں ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے مگر اس کا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے، عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب اور دلآویز ہوتا ہے اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے مگر اس کا غصہ میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے اس شعر کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا"

(یادگار غالب صہ ۱۳۳)

بنیادی تصور :۔ اظہار دلکشی محبوب۔

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
(۱۱)
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

مطلب :۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ نالہ جس کے اثر سے آفتاب میں شگاف پڑ جائے (حالانکہ وہ زمین سے کروڑوں میل دور ہے) معشوق کے دل میں مطلق اثر نہ کرے (حالانکہ وہ بہت قریب ہے)

بنیادی تصور :۔ شکوۂ عدمِ تاثیرِ نالہ۔

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
(۱۲)
جس سحر سے رواں ہو سفینہ سراب میں

سحر بمعنی جادو + سفینہ سراب میں رواں ہو بمعنی ریت میں کشتی چلنے لگے یعنی ناممکن بات ممکن ہو جائے۔

مطلب :۔ بڑی حیرت کا مقام ہے کہ جس جادو کے اثر سے ناممکن بات ممکن ہو

ہو جائے، اس جادو سے ہماری دلی آرزو پوری نہ ہو (حالانکہ وہ ناممکن نہیں ہے)
بنیادی تصور:- شکوۂ عدم تاثیر سحر۔

غالبؔ چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
(۱۴) پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

مطلب:- شعر بالکل واضح ہے یعنی اگرچہ میں نے شراب چھوڑ دی ہے مگر برسات کے دنوں میں اور چاندنی راتوں میں طبیعت پر قابو نہیں رہتا۔
بنیادی تصور:- ع بدلی کو دیکھ کر مری نیت بدل گئی۔

---

(۹۹)

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
(۱) یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

خست بمعنی کنجوسی، سوءِ ظن بمعنی بدگمانی + کوثر۔ بہشت میں ایک حوض ہے ساقیٔ کوثر یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم + کل کے دو معنی ہیں (۱) گذرا ہوا دن جو "آج" کی ضد ہے۔ (۲) یوم قیامت۔ یہاں دوسرا مفہوم مراد لیا ہے۔
مطلب:- ساقی سے خطاب ہے کہ تو مجھے اس خیال سے آج شراب نہیں دیتا کہ جو شخص دنیا میں شراب نوشی کرے گا اسے آنحضرت صلعم قیامت میں شرابِ طہور نہیں پلائیں گے۔ اس خیال کو دماغ سے نکال دے کیونکہ یہ خیال ساقیٔ کوثر (آنحضرتؐ) کی فیاضی کے باب میں سراسر سوءظن پر مبنی ہے۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ بروزِ قیامت آپؐ اپنے غلاموں کو اپنے فیضِ عمومی سے محروم رکھیں گے۔
بنیادی تصور:- حسنِ طلبِ شراب۔

(۲) ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

مطلب :- حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ " اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ ہوتی، اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا ہے۔ دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدمؑ اور فرشتوں کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا "کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خون ریزی کرے!" وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔ پھر آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ غالب کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں؛ کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔"

بنیادی تصور :- مجد و شرف آدم۔

(۳) جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

سماع کے لغوی معنی ہیں سننا مگر اصطلاح میں سماع سے مراد ہے حمد یا نعت سننا

مطلب :- اس شعر میں استفہام سے اظہار تعجب مراد ہے اور اس تعجب کا مقصد مخاطب کو متنبہ کرنا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر یہ سچ ہے (اور واقعی سچ ہے) کہ چنگ و رباب یعنی ہر ساز میں اسی کی صدا سمائی ہوئی ہے۔ تو پھر یہ بات بہت تعجب خیز ہے کہ اس آواز کو سن کر جسم سے جان نکلنے لگتی ہے! معشوق کی آواز تو زندگی بخش ہوتی ہے نہ کہ مہلک! تنبیہ کا پہلو یہ مضمر ہے کہ دراصل بات یہ ہے کہ جب

عشاق معشوق کی آواز سنتے ہیں تو ان کو اپنی ہستی ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے یعنی ان پر فنا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ ہستیٔ باری کے سامنے کائنات کی ہستی ہیچ ہے۔

(۴) رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ" سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اسکے قابو سے باہر ہونا، چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا۔ عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسن تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔"
(یادگار غالب صـــ۱۳۴)

غالب کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی (عمر) اس کے اختیار میں نہیں ہے انسان اس سوار کی مانند ہے جو ایسے گھوڑے پر بیٹھا ہو جو اس کے قابو سے باہر ہو یعنی انسان کو مطلق معلوم نہیں ہے کہ اس کی زندگی کب ختم ہو جائے گی۔

بنیادی تصور:۔ مجبوریٔ حضرتِ انسان۔

(۵) اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

نوٹ:۔ اس شعر اور اگلے دو شعروں میں غالب نے وحدتِ وجود کو مختلف طریقوں سے سمجھایا ہے اور یہی ان تینوں شعروں کا بنیادی تصور ہے۔

مطلب: حالی مرحوم لکھتے ہیں "غیر سے یہاں ما سوی اللہ مراد ہے جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے، اس لیے کہ وہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجودِ ما سوی کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں

رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجودِ واجب سے بُعد ہے۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں لفظِ بعد سے دوری یا فاصلہ مراد نہیں ہے بلکہ بیگانگی یا عدم واقفیت مراد ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ جب تک انسان غیر اللہ (ماسوی اللہ) کو بھی حقیقی معنی میں موجود سمجھتا رہے گا یعنی جب تک وہم وجود غیر میں گرفتار رہے گا اس وقت تک اسے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے گی۔

انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت تو صرف حق سبحانہٗ کی ہے یعنی حقیقت کا اطلاق صرف وجود مطلق پر ہو سکتا ہے جو الحق ہے یعنی واجب الوجود ہے۔

تو پھر انسان ہے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ظل ہے ذاتِ حق سبحانہٗ کا۔ اور ظل سے مراد ہے ظہور حضرتِ حق سبحانہٗ در مراتب تنزلات۔ (تفصیلات کے لیے دیکھو مکتوب ص۲۲۴ جلد اول، مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی) بس یہی انسان کی حقیقت ہے۔

خلاصۂ کلام ایں کہ ان تصریحات کی روشنی میں انسان کی "حقیقت" یہ ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے یعنی وہ بذاتِ خود موجود نہیں ہے بلکہ وہ ظل یعنی مظہر ذات وصفاتِ حق ہے۔

ہستی ہے جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں
جوں موج آ پھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں (درد)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (۶)

مشہود کے لغوی معنی ہیں حاضر ہونا یا معائنہ کرنا لیکن تصوف کی اصطلاح میں

مشہود سے وہ کیفیت یا حالت مراد ہے جب سالک کو ہر شئ میں خدا ہی کا جلوہ نظر آئے یا ہر طرف وہی جلوہ گر نظر آئے۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

سمایا ہے تو جب سے نظروں میں میری
جا بجا دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

مطلب:۔ ازراہِ تعجب کہتے ہیں کہ جب شہود، شاہد اور مشہود تینوں کی اصل (حقیقت) وہی ذاتِ واجب ہے یعنی جب ہر شئی میں وہی جلوہ گر ہے اور شاہد (دیکھنے والا) بھی وہی ہے اور مشہود (جو کچھ نظر آتا ہے) بھی وہی ہے تو مشاہدہ یعنی دیکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

مشاہدہ یعنی دیکھنے کے لیے شاہد اور مشہود میں مغائرت یا امتیاز لازمی ہے لیکن وحدت الوجود کی رو سے مغائرت ممکن نہیں اس لیے غالب حیران ہو کر پوچھتے ہیں کہ جب مغائرت نہیں ہے تو مشاہدہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔؟

(۷) ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

مطلب: حالی مرحوم لکھتے ہیں "وحدتِ وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے قطرہ و موج و حباب کے ہیچ اور ناچیز (نیست) ہونے کو ایک عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ "یاں کیا دھرا ہے" منتہائے بلاغت ہے۔"
(یادگارِ غالب ص۱۳۴)

اس اجمال کی تشریح یہ ہے کہ قطرہ و موج و حباب کا کوئی مستقل یا ذاتی وجود نہیں ہے۔ جسے تم قطرہ یا موج یا حباب کہتے ہو وہ بحر ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ وجودِ بحر انہی صورتوں کے نمود پر مشتمل ہے۔

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موج زن تمام یہ دریا حباب میں (درد)

(۸)
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

مطلب:- شرم و حجاب دراصل ایک ادائے ناز ہے یعنی اس کا اقتضاء یہ ہے کہ محبوب کو اپنے آپ سے بھی شرم آنی چاہیئے۔ لیکن پردے میں رہ کر وہ اپنی ذات سے بالکل نہیں شرماتے (اپنے آپ سے بالکل بے حجاب ہیں) اس لیے ثابت ہوا کہ وہ بظاہر تو حجاب میں ہیں مگر دراصل بے حجاب ہیں (کیونکہ اپنے سے حجاب نہیں کرتے)

مولینا حسرت موہانی مرحوم لکھتے ہیں۔

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

بنیادی تصور:- ذاتِ حق حجاب میں رہنے کے باوجود بے حجاب (عیاں) ہے

(۹)
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مطلب:- بہت بلند پایہ شعر کہا ہے، اور اندازِ بیان بھی بہت دلکش ہے کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ اس کائنات کو پیدا کر کے فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ وہ ہر لحظہ فعلِ تخلیق یا اپنی ذات کی جلوہ گری (اپنے حسن کی نمائش) میں مصروف رہتا ہے یہ شعر تشریح ہے اس آیت کی "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" یعنی اللہ تعالیٰ ہر لحظہ اپنی ذات کی جلوہ گری میں مصروف ہے۔

خلاصۂ کلام ایں کہ اگرچہ خدا تعالیٰ پردے میں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے علمِ ازلی کے مطابق ہر لحظہ نئے نئے مظاہر میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

بنیادی تصور:- کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ

(۱۰) ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غیبِ غیب یا غیب الغیب۔ اصطلاح تصوف میں مرتبۂ احدیت کو کہتے ہیں اس مرتبہ میں ذاتِ حق، فہم و ادراک سے وراء الوراء ہے۔ بالفاظِ دگر غیب الغیب سے ذاتِ بحت (ہوّیت مطلقہ) مراد ہے جس کی کنہ وراء الفہم ہے + شہود اصطلاح تصوف میں کہتے ہیں "مشاہدۂ حق در جمیع صُور موجودات" یعنی ہر شی میں حق کا مشاہدہ کرنا +

مطلب:- حالی مرحوم لکھتے ہیں "سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد، مرتبۂ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود (کائنات) سمجھے ہوئے ہیں وہ حقیقت غیب الغیب ہے۔ اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب میں ہے یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کی مثال نہیں ہو سکتی۔"
(یادگارِ غالب صہ ۱۱۱)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں "شاعر کہتا ہے جس کو تم عالم سمجھ رہے ہو جو کثرت و تعدد کی صورت میں نظر آتا ہے وہ دراصل ذاتِ احدیت ہی ہے لیکن اس کی جلوہ فرمائیوں سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ مظاہر کونیہ اس سے علیحدہ ہستی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس سے جدا نہیں ہیں۔ غالب نے بڑی دقیقہ سنجی سے بذریعہ تمثیلِ خواب، اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی ہے یعنی اگر خواب کی حالت میں کوئی شخص یہ دیکھے کہ وہ جاگ رہا ہے تو کیا وہ واقعی بیدار ہے؟ نہیں

خواب میں اپنی بیداری کا خواب دیکھنے والا خواب ہی میں ہوگا" (اردو غزل ص ۱۵۶)

نظیر اکبر آبادی لکھتے ہیں :-

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل
عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

خواجہ میر درؔد فرماتے ہیں :-

غافل! جہاں کی دید کو مفتِ نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں

غالب نے مہر نیم روز میں اس شعر کا مطلب خود بیان کر دیا ہے :-
"در عالم در خارج وجود ندارد۔ ہماں ذاتِ اقدس و مقدس، در ہر عالم از خویش بر خویش جلوہ گر است" یعنی عالم کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔ وہی ذاتِ اقدس و مقدس، ہر عالم میں، از خویش، بر خویش جلوہ گر ہے۔ بالفاظِ دگر جسے تم شہود (کائنات) سمجھتے ہو وہ دراصل غیب غیب (ذاتِ احدیت) کا جلوہ ہے۔

بنیادی تصور۔ لاموجود الا اللہ [1]

(۱۱)
غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بو تراب میں

دوست سے خدا اور ندیمِ دوست سے حضرت علیؓ مراد ہیں + بوتراب کنیت ہے حضرت علی رضؓ کی۔

---

[1] میں نے ان اشعار کی تشریح "مقدمہ" میں کر دی ہے۔ اس لیے یہاں اجمال سے کام لیا ہے ۱۲

مطلب :- چونکہ مجھے حضرت علیؓ کی ذات میں صفاتِ ایزدی کا جلوہ نظر آتا ہے اس لیے ان کی عبادت کرتا ہوں تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت کر رہا ہوں۔

بنیادی تصور :- غلو در محبتِ علیؓ۔

---

(۱۰۰)

(۱) حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مطلب :- حیران ہوں کہ میں اکیلا آدمی کس کس کا ماتم کروں! اگر میرا بس چلے تو ایک نوحہ گر کی مستقل خدمات حاصل کر لوں تاکہ دل کا ماتم میں کروں تو جگر کا نوحہ وہ پڑھے۔

بنیادی تصور :- شدتِ ہجوم مصائب۔

(۲) چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

مطلب :- شدتِ رشک کی وجہ سے میں تیرے گھر کا نام نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اندیشہ یہ ہے کہ جب میں تیرا نام لے کر لوگوں سے تیرے گھر کا پتہ پوچھوں گا تو وہ تجھ سے واقف ہو جائیں گے اور یقیناً میرے رقیب بن جائیں گے۔ اس لیے میں ان سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ کدھر کو جاؤں؟

بنیادی تصور :- شدتِ جذبۂ رشک۔

(۳) جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں!

مطلب :۔ چونکہ محبوب، رقیب کے گھر اکثر جایا کرتا ہے اور غالب کو محبوب کے دیدار کی تمنا ہے اس لیے انہیں بار بار رقیب کے در پر جانا پڑا۔ چونکہ اس میں ان کی ذلت ہے اس لیے افسوس کے لہجہ میں کہتے ہیں کاش مجھے تیری رہگذر کا علم ہی نہ ہوتا تو اس ذلت سے محفوظ رہتا۔

مومن نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے :۔

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بنیادی تصور :۔ احساسِ تذلیلِ نفس۔

(۴) ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

مطلب :۔ تم جو یہ دھمکی دے رہے ہو کہ میں نے تجھے قتل کرنے کے لیے کمر کس کے باندھ لی ہے تو میں تمہاری اس دھمکی سے بالکل نہیں ڈرتا کیونکہ تمہاری کمر ہے کہاں جو اسے کس کے باندھوگے؟

شعراء معشوق کی کمر کو اس کے دہن کی طرح معدوم قرار دیتے ہیں۔ غالب نے اسی مفروضہ سے اس شعر کا مضمون پیدا کیا ہے۔ اس شعر میں شوخی کا رنگ قابلِ داد ہے۔

بنیادی تصور :۔ معدومیتِ میانِ محبوب۔

(۵) لودہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

بے ننگ و نام یعنی ذلیل و خوار یا بے عزت۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جس کا گھر بار لٹ جاتا ہے وہ سوسائٹی کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ اسی بات سے

غالب نے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے۔

مطلب :- میں نے ان کی محبت میں اپنا گھر بار لٹا دیا اور قلاش ہو گیا لیکن صلہ اس کا یہ ملا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ غالب تو ایک ذلیل شخص ہے لہذا اس سے ملنا میرے لیے موجب توہین ہے۔ اگر میں یہ جانتا کہ اس قربانی کا یہ نتیجہ نکلے گا تو اپنا گھر بار ہرگز نہ لٹاتا۔

بنیادی تصور :- شکوۂ ناقدری محبوب۔

(۶) چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مطلب :- حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے۔ اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ نو آموز ہونے کی بنا پر کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔" (یادگار غالب صفحہ ۱۳۴)

بنیادی تصور :- دشواری جویائے حقیقت۔

(۷) خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

مطلب :- میں تو اس بتِ بیداد گر سے وصل کا خواہش مند ہوں، اس کی پوجا نہیں کرتا لیکن عام لوگ چونکہ بندگانِ نفس ہوتے ہیں اس لیے حصولِ مقصد کی خاطر محبوب کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ ان کو یہ بات معلوم نہیں کہ خواہشِ وصل اور پرستش میں زمین

و آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے غالب نے ان لوگوں کو "احمق" قرار دیا ہے)

بنیادی تصور:۔ امتیاز ما بین خواہشِ نفسانی و پرستش

نوٹ:۔ جناب اثر لکھنوی نے اس شعر کا مطلب یہ لکھا ہے کہ جسے احمق (ظاہر پرست) پرستش سمجھتے ہیں وہ در اصل میری خواہش پرستش ہے۔ پرستش کا مفہوم میرے ذہن میں اور ہی کچھ ہے۔ ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی مگر اس کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ خواہش پرستش پر لوگوں کو پرستش کا دھوکہ ہونے لگا۔" (مطالعۂ غالب صـ ۶۳)

(۸) پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

یہ شعر شاعرانہ تخیل کا کرشمہ ہے۔ اگر اسے منطق کی عینک لگا کر پڑھیں تو بالکل مہمل معلوم ہوگا کیونکہ کوئی شخص اپنی خبر لینے نہیں جا سکتا۔ یہ بات سراسر خلاف عقل ہے لیکن اگر شاعرانہ نازک خیالی کو ملحوظ رکھ کر اس شعر کو پڑھیں تو عالمِ وجد طاری ہو جاتا ہے اور جو لطف اس شعر کو پڑھ کر آتا ہے اس کا بیان لفظوں کے ذریعہ سے بہت دشوار ہے۔

مطلب:۔ میں ایک دن کوئے یار میں گیا تھا۔ وہاں کی دلکشی سے ایسا بیخود ہوا کہ اپنے آپ کو وہیں چھوڑ آیا۔ اب چونکہ مجھ پر عالم بیخودی طاری ہے۔ اس لیے کوئے یار کا راستہ یاد نہیں۔ اگر راستہ یاد آجاتا تو میں اپنی خبر لینے وہاں ضرور جاتا!

بنیادی تصور:۔ اظہارِ کیفیتِ عالم بیخودی۔

(۹) اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر، متاع ہنر کو میں

مطلب:۔ چونکہ میں خود متاعِ ہنر (شاعری) کو بہت دل پذیر اور قابل ستائش سمجھتا ہوں اس لیے قدرتی طور پر یہ قیاس کرتا ہوں کہ اہل دہر بھی میری طرح اس کے قدردان ہوں گے لیکن افسوس کہ میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ دنیا والوں کی نظر میں شاعری متاعِ دلپذیر نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ شکوۂ ناقدریِ ابنائے زماں۔

(۱۰) غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

مطلب:۔ خدا کرے میں نواب عالی گہر علی بہادر کو سمندِ ناز پر سوار دیکھوں۔ سمندِ ناز سے وہ گھوڑا مراد ہے جو بڑے ناز و انداز سے چلے۔

نوٹ:۔ نواب علی بہادر والیٔ ریاست باندہ (یوپی) غالب کے قدردانوں میں سے تھے، اور خود بھی فکرِ سخن کرتے تھے۔ چونکہ انھوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا اس لیے فاتحین نے ان کو ریاست سے معزول کر کے اندور میں نظربند کر دیا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔

بنیادی تصور:۔ آرزوئے دیدِ نواب علی بہادر۔

---

(۱۰۱)

(۱) ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

مطلب:۔ محبوب مجھ سے اس قدر خفا ہے کہ وہ میرا ذکر برائی کی صورت میں بھی سننا پسند نہیں کرتا۔ رقیب چونکہ میرا دشمن ہے اس لیے یقیناً محبوب سے

میری برائیاں کرے گا۔ اور چونکہ وہ میرا ذکر کسی صورت سے بھی نہیں سُننا چاہتا اس لیے اگر وہ رقیب سے ناراض ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے خاص مومن کے رنگ کا شعر ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ شدتِ خفگیٔ محبوب۔

(۲) وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

مقدر بمعنی محذوف یا پوشیدہ۔ یہ لفظ مذکور کی ضد ہے۔

مطلب:۔ اگرچہ محبوب نے بظاہر مجھ سے سیر گلستاں کا وعدہ کیا ہے مگر دراصل اس سیر سے اس کا مقصد مجھے قتل کرنا ہے۔ بہرحال میں اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں شہادت کی عزت حاصل ہو گی۔

پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں "بات یہ ہے کہ اگر قتل کا اشارہ خود اس شعر میں نہ ہو تو شعر ناقص یا پست ہو جاتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ لالہ و گل کی سیر کرانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہم تجھے قتل کر دیں گے اور خون بہا کر لالہ و گل دکھاویں گے۔

فانی بدایونی کہتے ہیں:۔

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسمِ گل آگیا، زنداں میں بیٹھے کیا کریں

اس کے سوا جو مطلب ہو مہمل ہے۔ نظم طباطبائی نے اس شعر کی شرح جن الفاظ میں کی ہے اس سے غالب کا صحیح مفہوم نکل سکتا ہے مگر انھوں نے مبہم عبارت لکھی ہے۔ (نقد و نظر صد ۲۱)

بنیادی تصور:۔ اظہارِ مسرت بر مژدۂ قتل۔

(۳) شاہدِ ہستئ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاہدِ ہستئ مطلق یعنی ذاتِ واجب الوجود + لفظ شاہد (معشوق) کمر کی رعایت سے لائے ہیں۔ چونکہ دہن کی طرح معشوقوں کی کمر بھی معدوم ہوتی ہے اسلیئے "عالم" کو شاہدِ ہستئ مطلق کی کمر قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ عالم معدوم ہے۔ "منظور" کے دو معنی ہیں (۱) مشہود، مرئی یا مُبصَر (وہ چیز جو دیکھی جائے) (۲) مقبول یا مسلم جیسے کہتے ہیں اچھا تمہاری تجویز ہمیں منظور ہے۔

پہلا مطلب:۔ یہ عالم درحقیقت، معدوم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ موجود ہے مگر ہمیں تو نظر نہیں آتا۔

دوسرا مطلب:۔ یہ عالم درحقیقت معدوم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ موجود ہے مگر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ یعنی ہمارے نزدیک عالم کا کوئی وجود نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ مسلکِ وحدت الوجود

(۴) قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفئ منصور نہیں

اپنا قطرہ، کنایہ ہے اپنی ذات یا انائے مقید سے + دریا کنایہ ہے ذاتِ باری یا انائے مطلق سے + تنک ظرفی کے لفظی معنی ہیں سمائی یا برداشت یا حوصلہ کی کمی لیکن یہاں تنک ظرفی کنایہ ہے منصور کے اعلانِ انا الحق سے + دوسرے مصرع کی نثر یوں ہوگی:۔ مگر ہم کو منصور کی تنک ظرفی کی تقلید پسند نہیں ہے

مطلب:۔ جس طرح قطرہ اپنی ذات یا تقلید کے اعتبار سے تو غیر دریا ہے مگر اپنے وجود یا اطلاق کے اعتبار سے عین دریا ہے۔ اسی طرح میں بھی اگرچہ اپنی ذات یا تقلید کے اعتبار سے غیر دریا (غیر حق) ہوں مگر اپنے وجود یا اطلاق کے اعتبار

سے عین دریا (عین حق) ہوں۔ لیکن میں منصور کی طرح تنگ ظرف نہیں ہوں اس لیے "انا الحق" کہنے سے اجتناب کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ قطرہ یا حباب یا موج، اپنے وجود کے اعتبار سے عین دریا ہے مگر چونکہ وجودِ بحر، بشکلِ قطرہ وحباب وموج متعین و متشخص ہو گیا ہے اس لیے جب تک یہ تعین و تشخص قائم ہے اس وقت تک قطرہ یا حباب اپنے آپ کو بحر نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ از روئے عقل ونقل ان پر بحر کے بجائے قطرہ اور حباب ہی کا حکم لگایا جائے گا۔ اسی طرح انائے مقید (انسان) جب تک مقید ہے اس وقت تک وہ انائے مطلق (خدا) ہونے کا اعلان نہیں کر سکتا۔ یہ سچ ہے کہ حقیقت یا وجود کے اعتبار سے وہ عین دریا ہے مگر ذات یا تعین کے اعتبار سے بلاشبہ غیر دریا ہے۔

خدا اور بندے میں اگر باعتبار وجود عینیت ہے تو باعتبارِ ذات، غیریت ہے۔ جب تک بندہ، قیدِ تعین میں ہے وہ بندہ ہی رہے گا اور اس پر وہی حکم لگایا جائے گا جو وجودِ متعین کے لیے مخصوص ہے یعنی مرتبۂ تعین میں رہ کر کوئی بندہ اپنے آپ کو خدا نہیں کہہ سکتا۔ اگر ایسا کرے گا تو زندیق ہو جائے گا۔ کما قال الجامیؒ۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی

غالب نے دوسرے مصرع میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ از روئے اطلاق یا بحسب الوجود ہم عین حق ہیں مگر جب تک ہم، ہم ہیں یعنی تعین کی قید میں ہیں اس وقت تک "انا الحق" نہیں کہہ سکتے۔ اس نکتہ کو انہوں نے شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ع ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ مسلکِ وحدت الوجود۔

(۵) حسرت اے ذوقِ خرابی! کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں، تنِ رنجور نہیں

عشقِ پر عربدہ بمعنی عشق جنگجو + گوں بمعنی مقابلہ کے لایق۔ دوسرے مصرع میں فارسی ترکیب کے ساتھ لفظِ گوں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

مطلب:۔ اپنے ذوقِ بربادی سے خطاب کرتے ہیں کہ افسوس اب میں اس لائق نہیں رہا کہ عشقِ جنگجو کا مقابلہ کر سکوں۔

بنیادی تصور:۔ حسرت معاشقہ۔

(۶) ظلم کر ظلم! اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے مجبور نہیں

اگر لطف دریغ آتا ہو بمعنی اگر لطف کرنا پسند نہیں + تو تغافل میں کسی رنگ سے مجبور نہیں یعنی تو کسی طرح یا کسی صورت سے بھی تغافل پر تو مجبور نہیں ہے۔

مطلب:۔ اے محبوب! جو بات ناقابلِ برداشت ہے وہ تیرا تغافل ہے اور تو مجھ سے تغافل کرنے پر کسی طرح بھی مجبور نہیں ہے اس لیے مجھ سے تغافل مت کر، اگر تو مجھ پر لطف و کرم کرنا نہیں چاہتا تو ظلم کر۔ میں اسے بڑی خوشی سے برداشت کر لوں گا۔ بہر حال قطع تعلق (تغافل) مت کر۔ اسی مضمون کو غالب نے یوں ادا کیا ہے:۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ٭ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

بنیادی تصور:۔ ترغیبِ اجتناب از تغافل

(۷) میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

غالب نے معشوق کی حاضر جوابی کے پردے میں اپنی شوخیٔ طبع کا اظہار کیا ہے
مطلب:۔ جب میں ان سے کہتا ہوں کہ اچھی بات ہے! ہم تمہیں قیامت میں حاصل کر لیں گے تو وہ بڑی رعونت سے جواب دیتے ہیں کہ ہم حور تو نہیں ہیں جو تم وہاں ہمیں حاصل کر لو گے!

بنیادی تصور:۔ حاضر جوابیٔ معشوق۔

(۸) صاف دُردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

صاف بمعنی بلاشبہ یا یقیناً۔ یہ لفظ دُردی (تلچھٹ) کی رعایت سے لائے ہیں
افشردۂ انگور بمعنی وہ شراب جو انگوروں کو نچوڑ کر بنائی گئی ہو۔
پیمانۂ جم۔ کنایہ ہے انگوری شراب سے۔ قرینہ اس پر یہ ہے کہ جمشید انگوری شراب پیا کرتا تھا۔
مطلب:۔ ہم لوگ جمشید کی تقلید میں انگوری شراب پیتے ہیں اس لیے اس شراب کی بدنصیبی پر افسوس ہے کہ جو انگوری نہ ہو۔ کیونکہ وہ ہماری بزم میں بار نہیں پا سکتی۔

بنیادی تصور:۔ اظہار علوِ مرتبۂ مے نوشیٔ خویش۔

(۹) ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائیٔ غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ظہوریؔ فارسی کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے۔ غالب نے اس کا تتبع کیا ہے جس پر ان کا یہ شعر شاہد ہے:۔

بہ نظم و نثرِ مولنا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

ظہور اور خفا میں صنعت تضاد ہے۔ ظہور کنایہ ہے شہرت سے اور خفا کنایہ ہے گمنامی یا عدم شہرت سے +

مطلب :- اے غالب میں ظہوری کے مقابلہ میں خفائی ہوں اور میرے اس دعوے پر دلیل یہ ہے کہ ظہوری مشہور ہے لیکن میں مشہور نہیں ہوں۔ کہنا در اصل یہ مقصود ہے کہ میں بھی ظہوری کا ہم پلہ ہوں مگر فرق یہ ہے کہ وہ مشہور ہے لیکن مجھے اس کی سی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ مگر اس بات کو اس انداز سے کہا ہے کہ ظہوری کا مرتبہ اپنے مرتبے سے بالاتر دکھایا ہے۔

بنیادی تصور :- اظہار ہمسری ظہوری۔

---

(۱۰۲)

(۱) نالہ، جز حسن طلب، اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بے داد نہیں

مطلب :- اے ستم ایجاد! میں جو نالہ و فریاد کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تیرے ستم کا شکوہ کر رہا ہوں بلکہ یہ نالہ کشی اس لیے ہے کہ تو اس بات سے خفا ہو کر مجھ پر اور ظلم کرے گا۔ لہذا میری نالہ کشی، طلب ستم ہی کی ایک صورت ہے

بنیادی تصور :- حسنِ طلبِ ستمِ محبوب۔

(۲) عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسرو، کیا خوب
ہم کو تسلیم، نکونامیٔ فرہاد نہیں

مطلب :- روایت ہے کہ فرہاد نے اس خیال سے خسرو کے محل (عشرت گاہ) کی تعمیر میں حصہ لیا تھا کہ شیریں کا دیدار حاصل ہو سکے گا۔ غالب نے اس شعر میں فرہاد پر طنز کیا ہے کہ اس نے اپنے رقیب کی ملازمت اختیار کر کے عشق کو بٹہ لگا دیا۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ فرہاد بہت نیک نام عاشق گذرا ہے۔ اگر اس میں عزتِ نفس کا مادہ ہوتا تو وہ اپنے رقیب کی ملازمت کبھی ہرگز اختیار نہ کرتا۔

بنیادی تصور:۔ اظہار علوِ مرتبۂ عشق

(۳) کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

پہ وسعت معلوم یعنی اس میں اس قدر وسعت نہیں ہے۔

مطلب:۔ اجاڑ ہونے کے لحاظ سے میرا گھر بھی دشت سے کم نہیں ہے لیکن اس میں اس قدر وسعت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ صحرا میں مجھے وہ راحت نصیب ہے کہ گھر یاد نہیں آتا۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ صحرا نوردی۔

(۴) اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج، کم از سیلیٔ استاد نہیں

مکتب کنایہ ہے ذریعۂ عبرت آموزی سے + لطمہ یعنی تھپیڑا سیلی معنی تھپڑ۔

مطلب:۔ جو لوگ عقل مند ہیں وہ حوادثِ روزگار سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ یعنی ان کی نگاہ میں لطمۂ موجِ حوادث بمنزلہ سیلیٔ استاد ہے۔ استاد کا تھپڑ شاگرد کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل مند لوگ جب حادثات کے تھپڑے کھاتے ہیں اور جب حوادث سے دوچار ہوتے ہیں تو ان سے سبق حاصل کرتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ عبرت آموزی از طوفانِ حوادث۔

(۵) وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

تسلیم بمعنی شیوۂ تسلیم و رضا + محرومیٔ تسلیم سے مراد یہ ہے کہ ہمارا شیوۂ تسلیم و رضا قدر و منزلت سے محروم ہے، بد ابمعنی بہت بڑا۔

مطلب :- جب محبوب ہم پر ظلم و ستم کرتا ہے تو ہم اس لیے خاموش رہتے ہیں (فریاد نہیں کرتے) کہ تسلیم و رضا کا تقاضا یہی ہے کہ زبان سے اُف نہ کی جائے۔ مگر افسوس ہے کہ محبوب کی نگاہ میں ہمارے شیوۂ تسلیم و وفا کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس لیے خاموش ہیں کہ ہم میں فریاد کی طاقت ہی نہیں ہے۔

بنیادی تصور :- شکوۂ بے قدریٔ تسلیم و وفا۔

(۶) رنگِ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں

رنگ تمکیں بمعنی اندازِ خودداری + رنگ کا لفظ و لالہ کی رعایت سے لائے ہیں تمکیں کنایہ ہے ہیئتِ گل و لالہ سے + یعنی جب پھول کھلتا ہے تو اس کے اوراق مجتمع ہوتے ہیں یہ اجتماعِ اوراق ہی ان کی شانِ تمکیں ہے + پریشاں کنایہ ہے اوراق کے بکھر جانے سے + رنگِ تمکین گل کو چراغانِ سرِ رہگذرِ باد سے تشبیہ دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ تشبیہ بہت موزوں ہے کیونکہ جس طرح وہ چراغ جلد بجھ جاتا ہے جو رہگذرِ باد میں رکھا ہو اسی طرح پھول کی پتیاں بھی بہت جلد بکھر جاتی ہیں۔

مطلب :- ان تصریحات کے بعد مطلب بالکل واضح ہو گیا کہ اگر رنگ تمکین گل و لالہ بمنزلہ چراغانِ رہگذرِ باد نہیں ہے یعنی اگر رنگ تمکیں عارضی نہیں ہے تو وہ اس قدر جلد پریشاں (زائل) کیوں ہو جاتا ہے ؟ یہاں استفہام افراری ہے۔

بنیادی تصور :- بے ثباتی تمکیں گل و لالہ۔

(۷) سَبَدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

سبدِ گل یعنی پھولوں کی ٹوکری۔

مطلب:۔ بلبل سے خطاب کرتے ہیں کہ تجھے مبارک ہو! گلزار میں صیاد نہیں ہے جو تجھے قفس میں بند کر کے باغ سے باہر لے جاتا بلکہ گلچیں نے تجھے پھولوں کی ٹوکری میں بند کیا ہے اور اس صورت میں تجھے پھولوں کا قرب حاصل ہو گیا جو تیرا مقصدِ حیات ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہار خوش نصیبیٔ بلبل۔

(۸) نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

نفی سے "نہیں" مراد ہے۔ اثبات سے اثباتِ دہن مراد ہے یعنی جب وہ زبان سے بار بار لفظِ "نہیں" ادا کرتا ہے (محبوب) عاشق کی ہر بات کے جواب میں "نہیں" کہا کرتا ہے۔ تو اس نہیں (نفی) سے اس کے دہن کا اثبات ہو جاتا ہے۔ غالب نے یہاں تراوش کی مناسبت سے اثبات کو مونث باندھا ہے ورنہ یہ لفظ مذکر ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔ ع ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے۔

لفظِ "گویا" دہن کی رعایت سے لائے ہیں۔ ناسخ کی تقلید میں غالب کو بھی ضلع جگت بولنے کی عادت ہو گئی تھی۔ دمِ ایجاد یعنی بوقتِ پیدائش۔ جائے دہن بمعنی بجائے دہن۔

مطلب:۔ شعراء عموماً معشوقوں کے دہن کو معدوم باندھتے ہیں۔ اس مفروضہ سے غالب نے حسبِ عادت یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ چونکہ محبوب ہماری ہر بات کے جواب میں "نہیں" کہتا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اسے پیدا کرتے وقت، دہن کے بجائے لفظِ "نہیں" عطا کر دیا) اس لیے اس لفظ کی بدولت ہمیں اس کے دہن کا ثبوت مل گیا۔

بنیادی تصور :۔ اثباتِ دہن محبوب بواسطۂ خوئے افکار۔

(۹) کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہے دلے اس قدر آباد نہیں

مطلب :۔ دلکشی اور جلوہ گری کے لحاظ سے بہشت بھی تیرے کوچہ سے کم نہیں ہے، بس اتنا فرق ہے کہ وہاں اس قدر آبادی نہیں ہے۔ کیسے دلکش انداز سے کوچہ جاناں کو بہشت پر فوقیت دی ہے! دوسری خوبی یہ ہے کہ روشِ عام سے ہٹ کر بہشت کو کوچہ محبوب سے تشبیہ دی ہے (عام طور پر شعراء کوچہ محبوب کو بہشت سے تشبیہ دیا کرتے ہیں)

بنیادی تصور :۔ فوقیتِ کوئے جاناں۔

(۱۰) کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

مطلب :۔ اے غالب! تم کس منہ سے پردیس کی شکایت کرتے ہو؟ کیا تمہیں اہلِ وطن کی بے وفائی اور بے مروتی یاد نہیں رہی!

بنیادی تصور :۔ ع نہیں وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر

---

(۱۰۳)

(۱) دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

مطلب :۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "اس شعر میں اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ فراخ حوصلگی نفس کا اظہار کیا ہے، یعنی ہم جو دونوں جہان لے کر خاموش ہو رہا اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ ہم ان پر قانع ہو گیا۔ بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے

شرم آئی اس لیے خاموشی اختیار کرلی۔" (یادگارِ غالب ص ۱۳۵)

بنیادی تصور:۔ بیان علوئے ہمتِ خویش۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
(۲) تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مطلب:۔ اگرچہ یہ شعر مجاز پر بھی محمول ہو سکتا ہے مگر حقیقت پر محمول کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے کہتے ہیں کہ اے خدا! چونکہ تو کہیں نظر نہیں آتا اس لئے جو شخص بھی تیری تلاش میں نکلتا ہے وہ انجام کار تھک کے بیٹھ جاتا ہے لفظ مقام تصوف کی اصطلاح ہے اس سے مقاماتِ سلوک مراد ہیں۔

بنیادی تصور:۔ دشواریٔ عرفانِ الٰہی۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
(۳) ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

مطلب:۔ بلاشبہ اہلِ بزم، شمع کے ہمدرد اور غمگسار ہیں جب اُسے جلتے دیکھتے ہیں تو ان کا جی کڑھتا ہے مگر شمع کی تقدیر ہی میں جلنا لکھا ہے اس لئے وہ لوگ مجبور ہیں، کچھ امداد نہیں کر سکتے۔

بنیادی تصور:۔ عاشق کے لئے آتشِ فراق میں جلنا اور جل کر فنا ہو جانا مقدر ہے

---

(۱۰۴)

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں، ہم بے زبانوں پر نہیں

مطلب:۔ رقیب نے اپنی چرب زبانی سے کام لے کر معشوق کو اپنے عشق کا یقین دلا دیا ہے ہم چونکہ خاموش رہتے ہیں اس لئے وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کے

عاشق نہیں ہیں۔

بنیادی تصور:۔ سادگیٔ محبوب۔

---

(۱۰۵)

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
(۱) تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"

مطلب:۔ میں نے اسے اپنے اوپر مہربان کرنے کے لئے یہ قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ لیلیٰ، مجنوں سے ملنے کے لئے جنگل میں گئی تھی لیکن میری بد قسمتی دیکھو کہ یہ قصہ سُن کر وہ بڑے تعجب سے کہنے لگا کہ کیا دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے؛ یعنی مجھ پر مہربان ہونے کے بجائے وہ لیلیٰ کے طرزِ عمل پر اعتراض کرنے لگا کہ اگر اس نے ایسا کیا، تو بہت برا کیا بھلا کہیں معشوق بھی عاشق سے ملنے جایا کرتا ہے؛

بنیادی تصور:۔ عدم التفاتِ محبوب۔

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
(۲) نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

مطلب:۔ اے غالبؔ! محبوب کو اس بات پر آمادہ مت کر کہ وہ تیری الفت کی آزمائش کرے کیونکہ آزمائش کے لئے وہ تجھ کو قتل کرے گا لیکن اس کا دل بہت نازک ہے اس لئے تیرے قتل کے بعد اسے بہت صدمہ لاحق ہو گا۔

بنیادی تصور:۔ پاسِ خاطرِ محبوب۔

---

(۱۰۶)

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا!
(۱) بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد، یاں

لگ گیا یعنی اچھا معلوم ہونے لگا + یاں سے دنیا مراد ہے
مطلب :- جب سے انہوں نے کسی سے دل لگایا ہے وہ بھی ہماری طرح خلوت پسند ہو گئے ہیں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں دنیا ہی میں اپنی بے کسی کی داد مل گئی۔
بنیادی تصور :- اثباتِ پہلوئے تسکین۔

ہیں زوال آمادہ، اجزا آفرینش کے تمام
(۲) مہر گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد، یاں

زوال آمادہ بمعنی آمادۂ زوال یا روبزوال + آفرینش کے اجزا یعنی جملہ اشیائے کائنات + چراغ رہگذار باد، جو چراغ ہوا کے جھونکوں میں رکھا ہوا ہو وہ بہت جلد بجھ جاتا ہے یعنی وہ آمادۂ زوال ہوتا ہے اسی لئے مہر گردوں کو اس چراغ سے تشبیہ دی ہے۔
مطلب :- کائنات میں ہر شی روبزوال ہے یہاں تک کہ آفتاب بھی جو بظاہر بہت پائیدار معلوم ہوتا ہے درحقیقت روبزوال ہے یعنی اس کی روشنی، اگرچہ ہمیں محسوس نہیں ہوتی، ہر لحظہ کم ہو رہی ہے اور ایک زمانہ ایسا آجائے گا جب وہ بالکل بے نور ہو جائے گا۔
بنیادی تصور :- فنا پذیریٔ کائنات۔

---

(۱۰۷)

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں۔
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں۔

مطلب :- شعرا عموماً صبا کو قاصد باندھا کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم جو فراق یار میں کبھی دیوار کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی دروازے کی طرف، تو اس خیال سے کہ

شاید دیوار کی طرف سے صبا یا دروازے پر قاصد اس کا پیغام لے کر آئے۔

بنیادی تصور:۔ شدت انتظار پیام یار۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
(۲) کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں،

مطلب:۔ بہت مشہور شعر ہے اور اس کی شہرت اس کی سلاست، روانی، لطفِ زبان، اندازِ بیان، مضمون آفرینی اور حقیقت نگاری پر مبنی ہے عاشق مہجور کی غیر متوقع شادمانی کا نقشہ ایسے دلکش انداز میں کھینچا ہے کہ لفظوں کے ذریعہ سے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ان اشعار میں سے ہے جن کی شرح کرنے سے شعر کی معنویت کا خون ہو جاتا ہے۔

حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے! یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا۔"
(یادگار غالب ص ۱۲۵)

بنیادی تصور:۔ وفورِ حیرت وشادمانی بر ورودِ محبوب۔

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
(۳) یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

یہ شعر بھی مذکورہ بالا شعر کی مانند بے مثل کہا ہے بقولِ نظم طبا طبائی "اس شعر کی خوبی بیان سے باہر ہے بڑے بڑے مشاہیر شعراء کے دیوانوں میں اس کا جواب نہیں نکل سکتا۔

مطلب:۔ محبوب نے ایسا کاری زخم لگایا ہے کہ جو شخص بھی دیکھتا ہے وہ محوِ حیرت ہو جاتا ہے اس بات سے مجھے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں اس کے

دست وبازو کو نظر نہ لگ جائے۔

بنیادی تصور:۔ کمالِ ناوک افگنیٔ محبوب۔

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
(۴) ہم اوجِ طالعِ لعل وگہر کو دیکھتے ہیں

مطلب:۔ اے محبوب ہم ان جواہرات کو نہیں دیکھتے یعنی ان کی تعریف نہیں کرتے جو تیری ٹوپی میں لگے ہوئے ہیں، ہم کو تو ان جواہرات (لعل وگہر) کی خوش قسمتی پر رشک آرہا ہے کہ اس طرح انہیں تیرا قرب حاصل ہو گیا یعنی ان کا مرتبہ بلند ہو گیا۔

بنیادی تصور:۔ رشک بر اوجِ طالعِ جواہر۔

---

(۱۰۸)

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
(۱) شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

مطلب:۔ میں روزِ قیامت کا منکر نہیں ہوں مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ اضطراب اور پریشانی کے لحاظ سے روزِ قیامت، شبِ فراق سے بڑھ کر نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ اذیتِ شبِ فراق۔

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
(۲) بلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں۔

مطلب:۔ اگر شراب نوشی کے لئے آج کا دن مناسب نہیں ہے تو کیا پروا ہے ہم چاندنی رات میں اس نعمت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ شراب نوش عموماً روزِ ابر اور شبِ ماہتاب میں پیا کرتے ہیں۔

جو آوٗں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں!
(۳) جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

مطلب:- اگر ان سے ملنے جاتا ہوں تو خوش آمدید نہیں کہتے اور اگر ان سے رخصت ہوتا ہوں تو خدا حافظ نہیں کہتے۔

بنیادی تصور:- بیان بے التفاتیٔ محبوب

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
(۴) کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں۔

مطلب:- اول تو وہ مجھے کبھی یاد نہیں کرتے اور اگر یاد بھی کرتے ہیں تو یہ کہ کر کیا بات ہے، آج ہماری محفل میں کوئی فتنہ یا فساد برپا نہیں ہوا یعنی وہ مجھے موجب فتنہ و فساد خیال کرتے ہیں۔

بنیادی تصور:- اظہار بدگمانیٔ محبوب۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
(۵) گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں!

مطلب:- عموماً فقیروں کو تہواروں کے دن زیادہ خیرات ملتی ہے لیکن میخانہ کے فقیروں کو ہر روز شراب ملتی ہے یعنی ان کے لئے ہر روز، روز عید ہے۔

بنیادی تصور:- عموم فیضِ ساقی۔

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام!
(۶) دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

مطلب:- دنیا میں عموماً لوگوں کو غم کے ساتھ کبھی کبھی خوشی بھی نصیب ہو جاتی ہے مگر ہم ایسے بد قسمت ہیں کہ ہمیں کبھی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

بنیادی تصور:- شکوۂ بد نصیبیٔ

تم اُن کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
(۷) یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

مطلب :۔ بڑے دلکش انداز سے معشوق کی وعدہ خلافی کا اثبات کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے غالبؔ! بہتر یہی ہے کہ تم ! انہیں ان کا وعدہ یاد نہ دلاؤ، کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو وہ اس کے جواب میں فوراً کہہ دیں گے کہ ہمیں تو یاد نہیں آتا کہ ہم نے تم سے کبھی کوئی وعدہ کیا تھا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤ گے۔

بنیادی تصوّر :۔ اثباتِ خوئے بدعہدئ محبوب۔

---

(۱۰۹)

(۱) تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ؛ ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

صبا باندھنا یعنی سرعت کے اعتبار سے صبا قرار دینا۔ یا صبا سے تعبیر کرنا مضمون کی ہوا باندھنا یعنی مضمون رکلام میں دلکشی یا جاذبیت پیدا کرنا۔

مطلب :۔ ہم جو تیرے گھوڑے کو باعتبارِ سرعت رفتار، صبا سے تعبیر کرتے ہیں یا تشبیہ دیتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مضمون میں دلکشی پیدا ہو جائے

بنیادی تصوّر :۔ ذوقِ قافیہ پیمائی یا شوقِ محاورہ بندی۔

(۲) آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ؛ ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

اپنی ہوا باندھتے ہیں یعنی تجھے مرعوب کرنا چاہتے ہیں + ہوا باندھنا ایک مشہور محاورہ ہے یعنی کوئی ایسا کام کرنا جس سے انسان کی شہرت ہو جائے یا دوسروں پر رعب طاری ہو جائے۔

مطلب :۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری آہ میں اثر نہیں ہے لیکن محض اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ ہمارے عشق کی شہرت ہو جائے یا تو مرعوب ہو جائے۔

بنیادی تصوّر:۔ عدمِ تاثیر آہ۔

(۳۳) تیری فرصت کے مقابل اے عمر ÷ برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

فرصت بمعنی مدت یا دوران + پا بہ حنا بمعنی وہ شخص جس کے پاؤں میں مہندی لگی ہو چونکہ ایسا شخص چلنے پھرنے (حرکت) سے معذور ہوتا ہے اس لئے یہاں کنایہ ہے سستی رفتار سے یعنی عمر انسانی، برق سے بھی زیادہ سریع السیر ہے،

مطلب:۔ اے عمر! تو اس قدر سرعت کے ساتھ گذرنی ہے کہ تیری سرعت رفتار کے سامنے برق بھی پا بہ حنا (سست رفتار) ہے یعنی عرصۂ عمر بہت قلیل ہے

بنیادی تصوّر:۔ قلتِ عرصۂ عمر۔

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائیدار کا !
چشمک ہے برق کی کہ کہ تبسم شرار کا

(۳۴) قید ہستی سے رہائی معلوم ÷ اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

رہائی معلوم یعنی رہائی نہیں ہو سکتی + بے سر و پا یعنی جس کی کوئی ہستی نہ ہو۔ شعر کی نثر یوں ہوگی، ہمیں معلوم ہے کہ قید ہستی سے رہائی نہیں ہو سکتی دیکھ لو! شعرا اشک جیسی بے مایہ شئے کو بھی اپنے کلام میں باندھتے ہیں یعنی اشک بے سر و پا (بے حقیقت) ہونے پر بھی باندھا جاتا ہے اگرچہ شعر ہی میں سہی یعنی بندش (قید) سے وہ بھی بے نیاز نہیں ہے باندھتے ہیں، میں ابہام ہے (۱) نظم کرتے ہیں (یہی معنی مراد ہیں (۲) قید کرتے ہیں۔

مطلب:۔ اشک کی صفت یہ ہے کہ وہ بے سر و پا ہوتا ہے یعنی ایک ہستیٔ بے بود ہے اس لئے اس لائق نہیں کہ اسے باندھا جائے لیکن پھر بھی مضمون کی بندش میں آجاتا ہے اس بات سے معلوم ہوا کہ قید ہستی سے کسی کو رہائی نہیں مل سکتی۔

بنیادی تصوّر:۔ ناگزیریٔ قید ہستی۔

(۵) نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل ٭ مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ یعنی وہ مستی جو احساسِ حسن کی وجہ سے پیدا ہو۔ اور پھول کا رنگ ہی اس کا حسن ہے واشدِ گل بمعنی شگفتگیٔ گل شاعر نے شگفتگی کو بند ہائے قبا کے کھل جانے سے تعبیر کیا ہے۔

مطلب:۔ قاعدہ ہے کہ مستی کی حالت میں انسان اپنے بندِ قبا کھول دیا کرتا ہے غالب نے اس بات سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ پھول نے اپنے بند قبا اس لئے کھول دئے ہیں کہ وہ نشۂ رنگ سے مست ہو گیا ہے اس شعر میں حسن تعلیل کی خوبی پائی جاتی ہے، پھول کی پتیاں اس لئے کھل گئیں (غنچہ اس لئے شگفتہ ہو گیا) کہ وہ نشۂ رنگ سے مست ہے۔

بنیادی تصور:۔ حسنِ تعلیل۔

(۶) غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ ٭ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں۔

مطلب:۔ شعراء عموماً نالے کو رسا باندھتے ہیں غالب نے ظریفانہ انداز میں تنقید کی ہے کہ عاشق کا نالہ تو کبھی رسا ہوتا ہی نہیں (معشوق تک پہنچتا ہی نہیں اس کے باوجود شعراء یہ غلطی کرتے ہیں کہ اسے رسا باندھتے ہیں، یہاں "باندھتے ہیں" ایہام ہے اس لئے دوسرا مطلب یہ ہوا کہ نالے کو رسا باندھنا سراسر غلط ہے کیونکہ اگر وہ رسا ہوتا تو بندھ نہیں سکتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ نارسائی نالہ یعنی نالہ تو جاری ہی رہتا ہے رسائی کی کیفیت اسے کہاں میسر ہے۔

(۷) اہلِ تدبیر کی واماندگیاں ٭ آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

واماندگیاں بمعنی عقل کی نارسائی یا مجبوری + پہلے مصرع کے آخر میں "دیکھو" محذوف ہے۔

مطلب :- کہتے ہیں کہ میرے تیمار دار بھی کس قدر سادہ لوح ہیں! ذرا اُن کی یہ بیوقوفی تو دیکھو کہ وہ میرے آبلوں پر حنا باندھ رہے ہیں تاکہ وہ اچھے ہو جائیں وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ جب وہ اچھے ہو جائیں گے تو میں پھر صحرا نوردی شروع کر دوں گا۔

نوٹ :- اس صورت میں لفظ 'بھی' بے کار ہے۔

بنیادی تصور :- واماندگیٔ اہلِ تدبیر۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ آبلہ ہو ہی گیا تو اب تدبیر سے کیا حاصل! پھر وہ تدبیر بھی ایسی کہ سامانِ زیب و زینت یعنی مہندی کو جو متقاضیٔ صحت و توانائی ہے جراحت کے لیے استعمال کیا جائے! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ تدبیر وا ماندہ ہیں اور اب ایسی ایسی حرکات مذبوحی پر اُتر آئے ہیں

(۸) سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالب ؛ ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

سادہ بمعنی سادہ لوح یا بیوقوف + پرکار بمعنی عیار یا چالاک۔

مطلب :- اے غالب! اگرچہ یہ حسین اپنی دانست میں بہت عیار بنتے ہیں کہ ہمیں فریب دینے کی نیت سے ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں مگر دراصل یہ لوگ بہت بیوقوف ہیں کیونکہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہم اُن کے اس فریب میں ہرگز نہیں آ سکتے۔

بنیادی تصور :- بدعہدیٔ خوبانِ عالم۔

---

(۱۱۰)

(۱) زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ ؛ وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

فارسی محاورہ میں سخت بمعنی بہت مستعمل ہے + بجانِ اسد (۱) اسد کی جان پر (۲) اسد کی جان کی قسم +

مطلب :- اگرچہ ہم پر زمانہ نے بہت کم ظلم کیا ہے مگر ہم اس سے بھی زیادہ ظلم وستم کی توقع رکھتے ہیں۔

بنیادی تصور :- شدتِ جورِ فلک ۔

---

(۱۱۱)

(۱) دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

مطلب :- مجھے افسوس ہے کہ میں تیرے در پہ دائم پڑا ہوا نہیں ہوں یعنی تیرے در پہ میرا قیام مستقل طور سے نہیں ہے۔ آتا ہوں جبہ سائی کر کے چلا جاتا ہوں کاش میں پتھر ہوتا۔ تاکہ تیرے در پر دائم پڑا رہتا، اور اس طرح مقصدِ حیات حاصل ہو جاتا یعنی تیرے در پر پڑا رہنا یا تیرے در کا پتھر ہونا ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ تیرے در سے دوری میرے لئے بمنزلۂ موت ہے۔

بنیادی تصور :- حسرتِ قربِ درِ جاناں۔

(۲) کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
اِنسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

مطلب :- کہتے ہیں کہ میں اپنی بے سروپا زندگی سے بہت عاجز آگیا ہوں کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے کسی جگہ بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہو تو وہ گھبرا جاتا ہے دوسرے مصرع میں اس بات کو یوں واضح کیا ہے کہ میں انسان ہوں، جام یا ساغر تو نہیں ہوں جو مسلسل گردش کو برداشت کر سکوں، بہت عمدہ شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور :- کلفتِ گردشِ مدام۔

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
(۳) لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

مطلب:۔ قاعدہ ہے کہ جس لفظ یا حرف کو سہواً دو جگہ لکھ دیتے ہیں تو دوسرے لفظ کو مٹا دیتے ہیں غالب کہتے ہیں کہ اے خدا! زمانہ مجھے مٹانے پر کیوں تلا ہوا ہے میں لوحِ جہان پر حرف مکرر تو نہیں ہوں یعنی تو نے مجھے اس دُنیا میں بیکار تو پیدا نہیں کیا ہے بہت خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ شکوۂ جورِ زمانہ۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
(۴) آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

مطلب:۔ مذہبی تعلیم کی رو سے صرف کافروں کو دائمی عذاب دیا جائے گا مسلمان گنہ گاروں کے عذاب کی حد مقرر ہے یعنی سزا بھگتنے کے بعد انہیں عذاب سے رہائی مل جائے گی۔ غالب اس تعلیم کو مدنظر رکھ کر کہتے ہیں کہ میں گناہ گار تو بے شک ہوں مگر کافر تو نہیں ہوں، اس لئے میرے عذاب کی ایک حد ہونی چاہیئے پھر کیا وجہ ہے کہ عذاب کا سلسلہ جو شروع ہوا ہے تو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا! خوب نکتہ پیدا کیا ہے

بنیادی تصور:۔ شکوۂ درازیِ عرصۂ عذاب۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
(۵) لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
(۶) رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس، کس لئے
(۷) کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

یہ تینوں اشعار قطعہ بند ہیں۔ ان کا مخاطب محبوب بھی ہو سکتا ہے اور بادشاہ وقت بھی مقطع اس پر قرینہ ہے جس میں صاف طور سے بادشاہ کا ذکر کیا ہے خوبی ان اشعار میں یہ ہے کہ اشعار تو محبوب یا بادشاہ کی شان (مدح) میں ہیں مگر ہر شعر میں اپنی عظمت کا اظہار بھی کر دیا ہے اور یہ انداز بیان غالبؔ ہی کا حصہ ہے۔

مطلب:۔ آپ مجھے کیوں عزیز نہیں رکھتے! میں لعل و زمرد تو نہیں ہوں (جن کی قدر آپ کی نگاہ میں اس لئے نہیں ہے کہ وہ آپکے خزانے میں بکثرت موجود ہیں) میں تو غالبؔ ہوں اور سب جانتے ہیں کہ آج میرا ثانی سارے زمانے میں نہیں ہے چنانچہ خود کہتے ہیں۔

آج مجھ سا نہیں زمانے میں ؛ شاعر نغز گو د خوش گفتار

تم میری آنکھوں پر اپنے پاؤں کیوں نہیں رکھتے! میں تو مرتبے کے اعتبار سے مہر و ماہ کا ہم پلہ ہوں۔ اس لئے اس فعل سے آپ کی تذلیل کا کوئی امکان نہیں ہے جب آپ نے آسمان کو قدمبوسی کی اجازت دے دی تو مجھے بھی یہ شرف عطا فرمائیے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ شہرت اور عظمت کے لحاظ سے میں آسمان سے کسی طرح کم نہیں ہوں!

بنیادی تصور:۔ مدح بادشاہ متضمن علو نفس خویش۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا !

(۸) وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

مطلب:۔ دعا میں بھی شوخی اور طنز کا پہلو مضمر ہے کہتے ہیں کہ وہ دن گئے جب تم یہ کہا کرتے تھے کہ میں کسی کا نوکر نہیں ہوں جو اسے بیٹھا دعائیں دیا کروں اب تم بادشاہ کے وظیفہ خوار ہو گئے ہو اس لئے دعا گوئی تمہارا فرض منصبی ہے دوسرے مصرع کے الفاظ پر غور کرو تو صاف نظر آجائے گا کہ غالبؔ نے شکر کے

پردے میں خدا سے شکایت کی ہے کہ اگر آبائی پنشن حسب مرضی مل جاتی تو کاہے کو
پچاس روپے ماہوار کی ملازمت کی نوبت آتی!
بنیادی تصور:- طنز بر حالتِ خویش

---

(۱۱۲)

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
(۱) خاک میں کیا صورتیں ہوں گی، کہ پنہاں ہو گئیں

"کیا صورتیں ہوں گی"، یعنی بہت حسین اور دلکش صورتیں ہوں گی۔
دوسرے مصرع کی نثر یوں ہو گی:- کیسی کیسی حسین صورتیں ہوں گی جو خاک میں پنہاں ہو گئیں۔
مطلب:- کیسی کیسی حسین صورتیں خاک میں پنہاں ہو گئیں۔ اُن میں سے بہت تو نہیں، ہاں کچھ حسین صورتیں بشکل لالہ و گل نمایاں ہو گئیں۔ شاعر نے حسن تعلیل سے کام لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ لالہ و گل میں جو اس قدر حسن اور دلکشی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حسینانِ عالم، جن کو بعد وفات زیر زمین دفن کیا گیا، ان پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں!
بنیادی تصور:- حسن تعلیل۔
نوٹ:- نظیر اکبر آبادی نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے:-

تھے کل یہ خطِ عارض خوبان سبزہ رنگ
کہتی ہے آج خلق جنہیں سبزہ زار ہا!

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
(۲) لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

مطلب :- کسی زمانے میں ہم بھی نت نئی بزم عیش منعقد کیا کرتے تھے لیکن اب وہ سب باتیں (عیش کی محفلیں) فراموش ہو چکی ہیں ۔

بنیادی تصور :- تصویر انقلاب روزگار ۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
(۳) شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں!

بنات النعش گردوں ۔ آسمان میں قطب شمالی کے قریب سات ستارے ہیں ان میں سے چار ستارے چارپائی کی شکل کے ہیں ہندوستان میں ان کو سات سہیلیوں کا جھمکا کہتے ہیں ۔

مطلب :- یہ سات سہیلیاں دن کے وقت تو پوشیدہ تھیں خدا معلوم رات کے وقت ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں ۔

نوٹ :- بجز ایک شاعرانہ تخیل کے اس شعر میں اور کوئی خوبی نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ شاعر رات کی ایک کیفیت مستی و سرور کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ رات ایسی سہانی تھی کہ یہ کچھ ہو گیا ۔

بنیادی تصور :- کیف انگیزئی شب ماہتاب ۔

قید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر
(۴) لیکن آنکھیں، روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

مطلب :- حالی لکھتے ہیں کہ "یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت یوسفؑ پر کشادہ رہتا تھا اُن کو دیکھتا رہتا تھا، اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف علیہ السلام کی طرف نگراں رہتی تھیں " (یادگار غالب ص ۱۳۲)

"روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں" یعنی بے نور ہو گئیں ۔ اس صورت میں مطلب

یہ ہوگا کہ اگرچہ یعقوب علیہ السلام کو قید خانہ میں آکر اپنے فرزند سے ملنے کا موقع نہ مل سکا تاہم وہ ان کے فراق میں اس قدر روئے کہ ان کی آنکھیں روزنِ زنداں کی طرح بے نور ہوگئیں۔

بنیادی تصور:۔ تاثیر عشقِ صادق۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہوگئیں (۵)

ماہِ کنعاں کنایہ ہے حضرت یوسف سے کیونکہ کنعان ان کا وطن تھا۔

مطلب:۔ عام طور سے عاشق اپنے رقیبوں سے نفرت کرتا ہے مگر زلیخا اپنے رقیبوں (زنانِ مصر) سے ناخوش نہیں ہوئی کیونکہ یوسفؑ کو دیکھ کر وہ سب ان پر عاشق ہوگئی تھیں۔

اس شعر میں تلمیح ہے اس واقعہ کی طرف کہ جب زنانِ مصر نے زلیخا کو مطعون کرنا شروع کیا کہ وہ اپنے غلام پر فریفتہ ہوگئی ہے تو اس نے ان سب عورتوں کی دعوت کی اور یوسف کو پس پردہ بٹھا دیا جب وہ عورتیں پھل تراشنے لگیں تو زلیخا نے یوسف سے کہا "ذرا پردے سے باہر تو آجاؤ"، جب ان عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو اس درجہ از خود رفتہ ہوگئیں کہ پھلوں کے بجائے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ اس پر زلیخا نے ان سے کہا "یہی ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم مجھے مطعون کیا کرتی تھیں۔

بنیادی تصور:۔ معقولیتِ عذر فریفتگی۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو، فروزاں ہوگئیں (۶)

مطلب:۔ اگر شب فراق میں میری آنکھوں سے خون کی ندیاں بہ رہی ہیں، تو

کوئی مضائقہ نہیں ہے میں یہ سمجھوں گا کہ تاریکیٔ شب فراق کو دور کرنے کے لیے دو شمعیں روشن ہو گئیں۔

بنیادی تصور :۔ خونابہ فشانی در شب فراق۔

(۷)
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

پری زادوں سے وہ عورتیں مراد ہیں جن سے غالب نے یہاں محبت کی تھی۔
مطلب :۔ کہتے ہیں کہ اگر قدرتِ حق سے یہی عورتیں جنت میں ہم کو حوروں کی شکل میں مل گئیں تو ہم ان سے اس ظلم و ستم کا جی بھر کے بدلہ لیں گے جو انھوں نے ہم پر دنیا میں روا رکھا ہے (شعر کی شوخی قابل داد ہے۔)

بنیادی تصور :۔ پہلوئے تسکین قلب محزوں۔

(۸)
نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مطلب :۔ یہ شعر بلاشبہ بیت الغزل ہے۔ اس کی خوبی بلکہ نشتریت اس بات میں ہے کہ غالب نے محبوب کی زلفوں کو عاشق کے بازو پر پریشان کر کے حالتِ وصل کی تصویر کھینچ دی ہے۔ جب دوسرے مصرع کا مفہوم پیش نظر ہو جائے گا تو ہر شخص بلا تامل پہلے مصرع کی تصدیق کر دے گا۔

بنیادی تصور :۔ شرط لطف زندگی۔

(۹)
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

مطلب :۔ جب میں نے باغ میں جا کر فراقِ یار میں نالہ و فریاد کی تو بلبلیں بھی میری تقلید میں نغمہ سرائی کرنے لگیں۔ میں باغ میں کیا گیا گویا مکتب قائم ہو گیا!

بنیادی تصور:- تاثیر نالہ و فریاد۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
(۱۰) جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

نگاہوں کا مژگاں ہو جانا کنایہ ہے نیچی یا شرمگیں نگاہوں سے اور سب جانتے ہیں کہ محبوب کی نیچی نگاہیں عاشق کو بہت مرغوب ہوتی ہیں۔ نگاہوں کا دل کے پار ہو جانا کنایہ ہے ان کی دلکشی سے۔

مطلب:- غالب نے ایک امر واقعی کو (کہ نیچی نظریں ہمیشہ عاشق کے دل کے پار ہو جاتی ہیں یعنی اسے بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں) حیرت اور تعجب کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ:-

"نگاہوں کے مژگاں ہو جانے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب سے اوپر نہیں اٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔"

بنیادی تصور:- تاثیر نگاہِ شرمگیں۔

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
(۱۱) میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

مطلب:- میں نے چونکہ بار بار اپنی آہوں کو ضبط کیا بایں طور کہ جب وہ ابھریں تو میں نے انہیں دبا یا اسلئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میری آہیں میرے چاک گریباں کا بخیہ ہو گئیں۔

غالب نے اس شعر میں آہوں کے دبانے کو چاک گریباں کا بخیہ ہونے سے تشبیہ دی ہے بخیہ کرنے وقت تاگا ابھرتا اور دبتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں ہے، اسی لیے نظم طباطبائی نے یہ لکھا ہے کہ باعتبار مضمون کے شعر بے معنی ہے" (شرح دیوانِ غالب ص ۱۲۸)

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
(۱۲) یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

مطلب :- حالی لکھتے ہیں "یعنی اب کوئی نئی دعا تو ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں، محبوب کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص جانتا ہے، اسی لیے حیران ہو کر سب سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جب کہ دعائیں تو سب نبٹ گئیں (ختم ہو گئیں)

(یادگار غالب ص ۱۳۶)

بنیادی تصور :- قدر و قیمت دشنام طرازی محبوب۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
(۱۳۱) سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

مطلب :- شراب بہت جانفزا شئے ہے۔ دوسرے مصرع میں اس دعویٰ پر دلیل دی ہے کہ جو شخص بھی جام شراب ہاتھ میں لے لیتا ہے تو شراب کی تاثیر سے اس کے ہاتھ کی لکیریں گویا رگ جاں بن جاتی ہیں یعنی ان میں زندگی کی لہر جاری ہو جاتی ہے۔

بنیادی تصور :- مبالغہ در تحسین شراب۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
(۱۴۲) ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

مطلب :- حالی لکھتے ہیں "تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا، موحد کا اصل مذہب ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں۔" (یادگار غالب ص ۱۳۶)

شاعرانہ خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ معدومیتِ مذاہب کو اجزائے ایمان قرار

دیا ہے۔ حالانکہ قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب کوئی شی مٹ جاتی ہے تو وہ کسی موجود شئی کا جزء نہیں بن سکتی۔ بالفاظِ دگر، غالب نے اپنے اندازِ بیان کی ندرت سے محال کو ممکن اور معدوم کو موجود بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک شخص رسوم (مذاہبِ مروجہ) کو جس قدر ترک کرتا جائے گا اسی قدر مومن (موحد) بنتا جائے گا۔

بنیادی تصور:۔ حقیقتِ توحید یا شناختِ موحد

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
(۱۵) مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرالا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ (امرِ واقعی) ہے اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ، ان کی ضد یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسنِ مبالغہ کی معراج ہے جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔
(یادگارِ غالب صـ۱۱۲)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس شعر میں غالب نے انسانی نفسیات کی بڑی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ انسان پر جب پہلے پہل کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو وہ بہت گھبراتا ہے لیکن جب مصائب کا نزول پے درپے ہوتا ہے تو وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے یعنی وہ مشکلات اُسے آسان معلوم ہونے لگتی ہیں۔

بنیادی تصور:۔ تصویرِ فطرتِ انسانی۔

یونہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
(۱۶) دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!

مطلب:۔ گریہ میں مبالغہ کرنا غالب کا محبوب شیوہ اور پسندیدہ موضوع ہے مطلب بالکل واضح ہے کہ اگر غالب اسی طرح روتا رہا تو کچھ عرصے کے بعد دلّی ہی

نہیں بلکہ اس کے گرد و نواح کی سب بستیاں، اشکوں کے سیلاب سے تباہ ہو جائیں گی۔

بنیادی تصور:۔ وفورِ گریہ۔

نوٹ:۔ غالب نے یہ غزل ۱۸۵۲ء میں اپنے قلم سے لکھ کر منشی نبی بخش حقیر کو بھیجی تھی جو ان کے کلام کے بڑے قدردان تھے اور خط میں لکھا تھا کہ "بھائی! خدا کے واسطے اس غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا (میر تقی اور مرزا سودا) کیا کہتے تھے، اور وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟ ایک صاحب لکھنؤ سے یہ زمین لائے تھے، حضور (ظفر) نے خود بھی غزل لکھی اور مجھے بھی حکم دیا ۔ ۔ ۔ ۔"

اس خط کے مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ

(۱) غالب اپنی تسکین کے لیے اپنے قدردانوں سے داد کے خواہاں رہتے تھے اور

(ب) انہیں اپنی اس غزل پر بہت ناز تھا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ بقول حسرت موہانی مرحوم "یہ پوری غزل ریختہ کا اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہے" اور شعر ۳ تو بلاشبہ بیت الغزل ہے ۱۲

---

(۱۱۳)

(۱) دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اِک تار بھی نہیں

مطلب:۔ ہماری دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے زنار بھی توڑ کر پھینک دیا (حالانکہ اس کا باقی رکھنا از روئے مذہب بت پرستی بہت ضروری تھا) اس پر طرہ یہ ہے کہ

ہم نے اپنے گریبان کی بھی دھجیاں اڑادیں ورنہ اگر کوئی تار باقی رہ جاتا تو ہم اسی کو زُنّار کا قائم مقام سمجھ لیتے۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ جوشِ جنوں۔

(۲)
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

نیاز بمعنی نذر۔ دوسرے مصرع میں لفظ "دیکھا" بہت برمحل صرف ہوا ہے اس کے دو معنی ہیں (ا) دیکھا (ب) معلوم ہوا۔

مطلب:۔ پہلے تو دیدار کی آرزو میں ہم نے اپنے دل کو نذرِ جاناں کر دیا (مٹا دیا) لیکن بعد ازاں ہمیں معلوم ہوا کہ اب ہمارے اندر دیدار کی طاقت ہی باقی نہیں رہی ہے یعنی ہم نے مفت میں اپنے دل کو تباہ کیا! خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ بربادیٔ دلِ زار۔

(۳)
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

مطلب:۔ (ا) خود غالب نے اس کا مطلب، قاضی عبدالجمیل صاحب جنونؔ بریلوی کو یہ لکھ کر بھیجا تھا۔ یعنی تیرا ملنا اگر آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں، نہ سہی۔ نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا، دشوار بھی نہیں (یعنی) جس سے تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل کر لیا تھا (لیکن) رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے۔

(خطوطِ غالب جلد دوم صـ۲۷۴)

(ب) حالی مرحوم نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے ایک فیکٹ (امرِ واقعی) کے بیان میں ایسے مناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا، عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون

کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں۔ اس لیے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔ (یادگارِ غالب ص۱۱۲)

(ج) حسرت موہانی مرحوم نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے "تحصیلِ امرِ دشوار، اگرچہ آسان نہیں ہوتی مگر ممکن ضرور ہے اور تحصیلِ امرِ محال سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرا ملنا اگر آسان نہ ہو یعنی دشوار ہو، تاہم سہل (آسان) ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں یعنی محال ہے جس پر میرا کسی طرح قابو نہیں ہے اس لیے میں محض مجبور ہوں یا یہ کہ تیرا ملنا اگر سب کے لیے مشکل ہو تو مجھ کو بھی صبر آ جائے۔ مشکل تو یہ ہے کہ اغیار کے لیے آسان ہے، میرے ہی لیے دشوار ہے۔" (شرح دیوانِ غالب ص۲)

گزارشِ راقم:۔ اگر اس شعر کو مجاز پر محمول کیا جائے تو پھر وہی مطلب صحیح تسلیم کرنا پڑے گا جو غالب نے بیان کیا ہے کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ

"تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں"

چنانچہ حسرت موہانی نے بھی اپنی شرح مذکورہ بالا میں اس کا دوسرا مطلب جو بیان کیا وہ غالب ہی کے مطلب سے مقتبس ہے۔

لیکن اگر اس شعر کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اے خدا! اگر تیرے ملنے کی صرف یہی اک صورت ہوتی کہ وہ آسان نہیں ہے یعنی دشوار ہے تو میں اپنی جد و جہد کے ذریعہ سے اس دشواری کو اپنے لیے سہل بنا سکتا تھا مگر دشواری یہ ہے کہ اگر ایک طرف، تیرا ملنا آسان نہیں ہے یعنی دشوار

ہے تو دوسری طرف دشوار بھی نہیں ہے یعنی آسان ہے کیونکہ تو جسے چاہتا ہے خود اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ چنانچہ جو راستہ ایک شخص بیس سال کی ریاضت (جدوجہد) کے بعد طے کرتا ہے، دوسرا شخص ایک لمحہ میں طے کر لیتا ہے:۔

ع طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

مذکورہ بالا تشریح قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

"اللّٰہ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ" (۴۲-۱۳)

یعنی اللہ جسے چاہتا ہے خود اپنی بارگاہِ قرب کے لیے منتخب فرما لیتا ہے اور (عام قاعدہ یہ ہے کہ) جو شخص اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنے ملنے کی راہ دکھا دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وصول الی اللہ کے دو طریقے ہیں:۔

ایک طریق اجتباء (انتخاب) ہے جو آسان (سہل) ہے۔

دوسرا طریق انابت (جدوجہد) ہے جو دشوار ہے۔

بنیادی تصور:۔ دشواریٔ وصول الی اللہ (بزنگِ حقیقت)

دشواریٔ وصلِ محبوب (بزنگِ مجاز)

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت، بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں (۴)

مطلب:۔ اس شعر میں اپنی باطنی کشمکش کا اظہار کیا ہے کہ ایک طرف میری فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی ساری عمر عشق میں بسر کروں (عشق کرنا میری فطرت ہے) دوسری طرف مجھ میں فراقِ یار کی سختیاں جھیلنے کی طاقت بھی نہیں ہے اس لیے پریشان ہوں کہ زندگی کیسے بسر کروں؟ عشق نہ کروں تو مشکل (کہ عشق کرنا میری فطرت ہے) اور کروں تو بھی مشکل (کہ اس کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتا)

بنیادی تصور :- تصویرِ کشمکشِ ذہنی

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
(۵)
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

مطلب :- شدتِ جنوں کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی دوبھر معلوم ہوتی ہے سر وبالِ دوش ہے اے خدا! صحرا میں کوئی دیوار بھی تو نہیں ہے جو میں اس سے اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں۔

بنیادی تصور :- بے قدریٔ زیست۔

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
(۶)
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

مطلب :- ہجر کے صدمے اٹھاتے اٹھاتے میرا دل اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ رقیبوں سے عداوت کا جذبہ درکنار، اس میں تو یار سے ملنے کی آرزو بھی باقی نہیں رہی ہے۔

بنیادی تصور :- شدتِ مایوسی۔

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
(۷)
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

مطلب :- اے محبوب! خدا کا خوف کر اور میرے نالوں سے ڈر، میرے نالے، نوائے مرغِ قفس تو نہیں ہیں جن کا کوئی اثر نہیں ہوا کرتا۔ یاد رکھ! ان کا اثر ہوگا اور ضرور ہوگا۔

بنیادی تصور :- ترغیبِ ہمدردی۔

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
(۸)
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

مطلب :- شعر کا لطف صنعتِ تقابل میں پوشیدہ ہے کہتے ہیں ذرا میرا حوصلہ تو دیکھو! ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ خلشِ خار بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود یار کی پلکوں کی صف کا مقابلہ کرنے کی آرزو ہے!

بنیادی تصور :- بلند حوصلگیٔ عاشقِ ناتواں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
(۹) لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مطلب :- یہ ان شعروں میں سے ہے جن کا مطلب بذریعۂ الفاظ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ "لڑتے ہیں" کنایہ ہے شبِ وصل میں ہاتھا پائی سے + "ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" کنایہ ہے نزاکتِ جسمانی سے +

کہتے ہیں کہ ان کی اس ادا (سادگی) پر جان قربان کرنے کو دل چاہتا ہے کہ وہ تابِ مقاومت نہیں رکھتے اس کے باوجود ہاتھا پائی کر رہے ہیں۔ اس بات کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ؎

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

بنیادی تصور :- بیانِ ادائے معشوقانہ۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
(۱۰) دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مطلب :- اس شعر میں غالب نے عاشق کی نفسیاتی کیفیت واضح کی ہے کہ اسے دیوانہ تو اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک مقصدِ معین اپنے سامنے رکھتا ہے اور اس کے حصول کے لیے دن رات کوشاں رہتا ہے اور ہشیار اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ وہ دنیا والوں کے زاویۂ نگاہ سے کوئی کام عقل کا نہیں کرتا بلکہ ان کی رائے میں اس کی پوری زندگی حماقتوں سے بھرپور ہوتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ طرزِ حیاتِ عاشق۔

(۱۱۴)

(۱) نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور، میرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں

بخیہ کے درخور، بمعنی بخیہ کے قابل۔ یہ ترکیب اردو میں غیر مانوس ہے + تارِ اشک چشمِ سوزن کی رعایت سے لائے ہیں، اور اس کو انھوں نے رشتۂ سوزن قرار دیا ہے۔

مطلب:۔ تشبیہ اور استعارے کے پردوں کو ہٹایا جائے تو مطلب صرف اس قدر ہے کہ میرے جسم میں کوئی زخم اس قابل نہیں کہ جراح اس کو سی سکے، اس لیے زیست سے نا امیدی ہو گئی ہے۔ اس بات کو انھوں نے یوں کہا ہے کہ اس لیے نا امیدی، (مایوسی) کے اشکوں کا تار، سوئی کی آنکھ رشتہ (سوئی کے ناکے کا تاگہ) بن گیا ہے یعنی سوئی کو بھی میری صحت سے نا امیدی ہو گئی ہے اس لیے رو رہی ہے۔

بنیادی تصور:۔ عالمِ مایوسی۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی
(۲) کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

مطلب:۔ محض لفظوں کا طلسم باندھا ہے ورنہ بات کچھ بھی نہیں ہے کہتے ہیں کہ ویرانی سے پہلے، جب میرا دل گھبراتا تھا تو گھر کے روزنوں سے جھانک کر دل بہلا لیا کرتا تھا لیکن شدتِ گریہ سے سیلاب آگیا اور گھر برباد ہو گیا۔ پانی تو نکل گیا مگر کفِ سیلاب نے روئی کی طرح روزنوں کو بند کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس خانہ ویرانی نے مجھے بیرونی دنیا کے تماشے سے بھی محروم کر دیا۔ شعر میں سب کچھ ہے مگر شعریت نہیں ہے۔ بقولِ جوش ملسیانی "شعر کا مضمون تکلف اور تصنع سے پر ہے۔"

بنیادی تصور:۔ محرومیٔ ذوقِ تماشا۔

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
(۳)
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

مطلب:۔ مژگانِ یار نے میرے خون کے ہر قطرے پر اسم محبوب کندہ کر دیا ہے گویا ہر قطرہ ایک نگینہ ہے جس پر محبوب کا نام کھدا ہوا ہے۔ اس لیے میں کہا ہوں! کاوشہائے مژگاں کی بیداد کا ودیعت خانہ ہوں! ودیعت یعنی امانت ۱۲

بنیادی تصور:۔ ع خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
(۴)
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

مطلب:۔ یہ غالب کا محبوب موضوع ہے۔ ان کے کلام میں "پنبہ" اور "روزن دیوار" کئی جگہ آیا ہے۔ اس قسم کے اشعار محض مبالغہ آرائی کے شوق کا نتیجہ ہیں کہتے ہیں کہ میرے گھر کی تاریکی کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اگر اس کی دیواروں کے روزن میں روئی رکھ دی جائے تو کوٹھری میں اجالا ہو جائے!

بنیادی تصور:۔ ع پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

نکوہش مانع بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی!
(۵)
ہوا ہے خندۂ احباب، بخیہ جیب و دامن میں

نکوہش یعنی ملامت۔ بے ربطیٔ شورِ جنوں یعنی عالمِ دیوانگی (قاعدہ ہے کہ جوشِ جنوں میں انسان کے افعال میں کوئی ربط نہیں ہوتا) خندۂ احباب کنایہ ہے ملامت سے۔ لیکن یہاں خندہ سے خندۂ دنداں نما مراد ہے تاکہ بخیہ سے مشابہت پیدا ہو سکے۔ بخیہ کنایہ ہے اصلاحِ احوال سے۔

مطلب:۔ احباب کی ملامت (جسے شاعر نے خندۂ دنداں نما قرار دیا ہے) میرے

حق میں موجب اصلاح احوال ہوگئی یعنی میں عالم دیوانگی سے کنارہ کش ہوگیا اور جب میری طبیعت اعتدال پذیر ہوگئی تو میں نے اپنے پھٹے ہوئے گریبان اور دامن پر بخیہ کرلیا۔ اس بات کو شاعر نے یوں کہا ہے کہ خندۂ احباب باعث بخیۂ جیب و دامن ہوگیا۔ خندۂ دنداں نما اور بخیہ میں مشابہت ظاہر ہے اور اسی تشبیہ کی خاطر غالب نے یہ شعر موزوں کیا ورنہ اس میں نہ کوئی لطف ہے نہ تاثیر۔

بنیادی تصور:۔ ثمرۂ نکوہش احباب۔

(۶)
ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینہ میں مثل ذرہ روزن میں

پنبہ اور روزن کی طرح جلوۂ تمثال، پر افشاں، جوہر آئینہ اور ذرہ بھی غالب کے محبوب الفاظ ہیں۔ جن کو انہوں نے اکثر استعمال کیا ہے۔ ان تمام الفاظ کی تشریح قبل ازیں ہوچکی ہے۔ اس لیے اعادہ فضول ہے۔

مطلب:۔ جس طرح شعاع آفتاب سے روزن میں ذرات پر افشاں (متحرک) ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح اس مہروش کے عکس رُخ کے آگے (یعنی اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر) آئینۂ فولادی کے جوہر پر افشاں (مضطرب) ہوگئے، بالفاظِ دگر اس کی تابش جمال کے سامنے آئینہ بھی ماند پڑ گیا۔

بنیادی تصور:۔ تفوق حسن محبوب بر جوہر آئینہ۔

(۷)
نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے!
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

مطلب:۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں نیک ہوں یا بد ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرا ماحول میری طبیعت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، اور اسی لیے میری

فطری صلاحیتیں بروئے کار نہ آسکیں، اور اسی لیے میری وہ قدر نہ ہو سکی جس کا میں مستحق ہوں۔ میرا حال یہ ہے کہ اگر مجھے گل قرار دیا جائے تو میں گلشن کے بجائے گلخن میں ہوں اور اگر خس (گھاس پھونس) تصور کیا جائے تو گلخن کے بجائے گلشن میں ہوں۔ یعنی میں جس سوسائٹی میں رہتا ہوں وہ میری فطرت اور افتادِ طبع کے خلاف ہے۔

بنیادی تصور:۔ شکایت از کارکنانِ قضا، وقدر۔

(۸)

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرۂ خوں، تن میں

مطلب:۔ جوشِ جنوں سے خون میں سوداوی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خون کا ہر قطرہ سیاہ ہو گیا۔ (قاعدہ ہے کہ جب خلطِ سودا کا غلبہ ہوتا ہے تو خون سیاہ ہو جاتا ہے) یہاں تک تو بات ٹھیک تھی اب شاعری شروع ہوتی ہے یعنی غالب کی قوتِ تخیل نے ہر سیاہ قطرے کو سویدا (سیاہ نقطہ) بنا دیا۔ اور چونکہ سویدا کا مقام دل ہے اس لیے شاعر نے بڑی آسانی سے ہر قطرے کو دل بنا دیا یعنی جوشِ جنونِ عشق نے غالب کو بیٹھے بٹھائے ہزاروں دل عطا کر دیئے! شعر کی خوبی مضمون آفرینی میں پوشیدہ ہے۔

بنیادی تصور:۔ کرشمہ سازیٔ جوشِ جنوں۔

اسدؔ زندانیٔ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

زندانی بلفظی معنی قیدی لیکن یہاں مراد ہے ممنونِ احسان ہونے سے۔

مطلب:۔ اے اسدؔ! میں حسینوں کی محبت کی تاثیر کا قیدی ہوں۔ انہوں نے جو ازراہِ نوازش، اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈالیں تو میں ان کا ممنونِ احسان ہو

گیا یعنی ان کے اس طرز عمل نے مجھے ان کا گرویدہ (قیدی) بنا دیا۔ واضح ہو کہ جب کوئی شخص کسی کے گلے میں باہیں ڈالتا ہے تو طوق کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور چونکہ قیدیوں کے گلے میں طوق اسیری ڈالا جاتا ہے اس لیے غالب نے اس صورت کو زندانی سے تعبیر کر کے اپنی مضمون آفرینی کا ثبوت دیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تاثیر الفتِ خوباں۔

(۱۱۵ز)

(۱)
مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مطلب:۔ عاشقی اختیار کرنے کے بعد میرے لیے دنیا کی کسی شی میں کوئی لذت باقی نہیں رہی مے دے کے خونِ جگر پینے میں کچھ لذت محسوس ہوتی تھی لیکن اب جگر میں بھی خون کا کوئی قطرہ باقی نہیں رہا۔ بہت خوب شعر کہا ہے۔ اس کی تاثیر میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اور یہ خوبی (تاثیر) محض انداز بیان سے پیدا ہوئی ہے دو مصرعوں میں عاشق کی زندگی کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

بنیادی تصور:۔ مرقع حیاتِ عاشق۔

(۲)
مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
دگرنہ، تاب و تواں، بال و پر میں خاک نہیں

مطلب:۔ مجھ میں تو کوچۂ جاناں تک پہنچنے کی بالکل طاقت نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مرنے کے بعد ہوا میری خاک کو اڑا کر وہاں تک پہنچا دے۔

بنیادی تصور:۔ تصویر نامرادی و مایوسی۔

(۳)
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل، رہگذر میں خاک نہیں

"خاک نہیں" (۱) دھول یا مٹی نہیں ہے۔ (۲) اور کچھ نہیں ہے + چونکہ بہشت میں خاک یا دھول نہیں ہو گی اس لیے محبوب کو بہشت شمائل قرار دیا ہے۔ شمائل بمعنی خصائل۔

مطلب :۔ یہ کس بہشت خصائل محبوب کی آمد آمد ہے کہ راستہ میں ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ خاک دھول کا نام ونشان بھی نہیں ہے!

بنیادی تصور :۔ صفت حسن محبوب۔

بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
(۴) اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں

مطلب :۔ اگر میری آہوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو کم از کم مجھی پر اتنا اثر مرتب ہو جاتا کہ میں اس شغل عبث سے باز آجاتا۔ چونکہ اتنا بھی نہ ہوا اس لیے بلاشبہ میری آہ بالکل بے اثر ہے۔

بنیادی تصور :۔ عدم تاثیر آہ۔

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
(۵) شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل کنایہ ہے تصورِ محبوب سے + خراب بمعنی مدہوش۔ شراب خانہ کنایہ ہے دنیا سے۔

مطلب :۔ بظاہر مطلب یہ ہے کہ عاشقوں کی مستی کا باعث شراب نہیں ہے بلکہ تصور جاناں ہے۔ لیکن دراصل کہنا یہ مقصود ہے کہ لطفِ زیست یادِ حق سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ دنیا کی مسرتوں سے، جو سراسر عارضی اور فانی ہیں۔ بلکہ ان کا انجام ہمیشہ تلخی اور نامرادی ہوتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ مستی شراب میں نہیں ہے بلکہ تصورِ محبوب سے حاصل ہوتی ہے یعنی

حقیقی مستی کا منبع خارج میں نہیں ہے بلکہ خود ذاتِ عاشق میں پوشیدہ ہے مستی باہر سے نہیں آتی بلکہ اندر سے پیدا ہوتی ہے، یعنی شراب خانے کے دیوار و در میں کوئی تاثیر نہیں ہے یہ تصور مرشد رومیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
(۶) سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں

مطلب:۔ اس شعر کی خوبی اس کے انداز بیان میں مضمر ہے کہنا دراصل یہ مقصود ہے کہ عاشقی نے اس درجہ تباہ اور برباد کر دیا کہ ساری عمر کہیں اپنا گھر نہ بنا سکا۔ لیکن اس بات کو اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ میرے گھر میں (حالانکہ اس کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے کیونکہ ساری عمر کرائے کے مکانوں میں رہے) حسرتِ تعمیر کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور چونکہ وہ غیر مادی شئی ہے اس لئے عشق کے سامنے سخت شرمندہ ہوں کہ جب کچھ بھی نہیں تو وہ غارت کیسے کرے گا؟

بنیادی تصور:۔ حسرتِ تعمیر۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
(۷) کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں!

مطلب:۔ ہم نے اپنے اشعار میں کمالاتِ فن کا اظہار کیا مگر افسوس کہ پڑھنے والوں نے ان کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ ان کو ہدفِ استہزاء بنایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اظہارِ فن (عرضِ ہنر) میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ شکوۂ ناقدریٔ سخن۔

نوٹ:۔ غالب کے بعض معاصرین ان کے بعض اشعار پر چیستان کی

پھبتی چسپ کیا کرتے تھے چنانچہ ایک محفل میں عیشؔ نے ان کی طرف مخاطب ہوکر ایک قطعہ پڑھا تھا جس کا آخری مصرع یہ ہے:۔

ع۔ مگر اپنا کہا، یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔

اس شعر میں معاصرین کے اسی طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہے۔

---

(۱۱۶)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

(۱) روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رلائے کیوں

لفظِ "کوئی" سے معشوق مراد ہے مطلب یہ ہے کہ تم ہمیں رلاتے کیوں ہو؟

مطلب:۔ معشوق عاشق پر جفا کرتا ہے مگر چاہتا ہے کہ وہ زبان سے اُف تک نہ کرے اس پر عاشق کہتا ہے کہ دل ہی تو ہے نہ کہ بے جان اور بے حس پتھر یا اینٹ اگر تم ہم پر جفا کرو گے تو ہم ضرور روئیں گے۔ اگر تمہیں ہمارا رونا پسند نہیں ہے تو تم ہمیں رلاتے کیوں ہو؟۔

بنیادی تصور:۔ عذرِ گریہ و زاری۔

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں!

(۲) بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

مطلب:۔ مندر، مسجد، دروازہ اور آستاں یہ ایسے مقامات ہیں جہاں سے کسی کو اٹھا سکتے ہیں شاعر کہتا ہے کہ میں تو رہگذر یعنی راستہ میں بیٹھا ہوا ہوں، اور رہگذر پہ بیٹھنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اس لئے رقیب کو کیا حق ہے کہ وہ مجھے یہاں سے اٹھائے؟ بقول نظمؔ طباطبائی "اس شعر کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں مل سکتے۔

بنیادی تصور:- شانِ آزادہ روی۔

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز!

(۳) آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

مطلب:- محبوب کے جمالِ دلفروز کا یہ عالم ہے کہ آفتاب کی طرح اس کے دیدار کی بھی کوئی شخص تاب نہیں لا سکتا۔ اندریں صورت (جب کوئی اسے دیکھ ہی نہیں سکتا) سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر وہ اپنے چہرے پر نقاب کیوں ڈالے ہوئے ہے؟ یعنی پردے میں کیوں پوشیدہ ہے؟ بہت خوب شعر کہا ہے۔ اسے حقیقت اور مجاز دونوں پر محمل کر سکتے ہیں۔

بنیادی تصور:- استعجاب بر حجابِ محبوب۔

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ!

(۴) تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

دشنۂ غمزہ، غمزے کی چھری یعنی غمزہ + ناوکِ ناز + ناز وادا کا تیر یعنی ناز۔

مطلب:- چونکہ تیرا غمزہ جاں ستاں اور تیرا ناز و انداز بے پناہ ہے اس لئے اغیار کی تو حقیقت ہی کیا ہے! اگر تیرا عکسِ رُخ تیرے سامنے آئے گا تو یقیناً وہ بھی مارا جائے گا۔

بنیادی تصور:- اثباتِ امتناعِ نظیرِ محبوب۔

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں

(۵) موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مطلب:- انسان جب تک زندہ ہے اس وقت تک غم میں مبتلا رہنا لازمی ہے یعنی غم وہ بری بلا ہے کہ موت سے پہلے اس کے پنجے سے رہائی ناممکن ہے

بنیادی تصور:- زندگی اور غم دراصل ایک ہی شئی کے دو رُخ ہیں۔

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم

(۶) اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں!

مطلب:۔ اس کا مطلب غالب نے خود بیان کیا ہے "مولوی صاحب! کیا لطیف معنی ہیں، داد دینا! حسن عارض اور حسن ظن، دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت بھی اچھی ہے اور گمان بھی صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیر کبھی خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے! یعنی حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا رقیب عاشق صادق نہ تھا، ہوسناک تھا، اگر پائے امتحاں درمیاں آتا، تو حقیقت کھل جاتی۔" (خطوطِ غالب جلد دوم ص ۲۷)

بنیادی تصور:۔ شانِ اعتماد علی النفس۔

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع

(۷) راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

مطلب:۔ انہیں اپنی عزت اور اپنے حسن پر غرور ہے، ادھر مجھ کو اپنی وضع داری کا پاس ہے اس لئے وہ خود مجھے اپنی بزم میں نہیں بلا سکتے اور میں راستہ میں ان سے نہیں مل سکتا خوب شعر کہا ہے اور اس میں لف و نشر غیر مرتب کی صنعت پائی جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ وجہ عدمِ امکان ملاقات۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!

(۸) جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

مطلب:۔ غالب نے یہ شعر معشوق کی حمایت (ڈیفنس) میں کہا ہے اور

اس میں شک نہیں کہ بیت الغزل ہے۔ مفہوم بالکل واضح ہے کہ بیشک وہ نہ خدا پرست ہے اور نہ باوفا ہے لہٰذا جسے اپنا دین اور دل عزیز ہو وہ اس کی گلی میں ہرگز نہ جائے۔ گلی میں جانا کنایہ ہے دل لگانے سے۔

بنیادی تصوّر:۔ حمایت شیوۂ معشوق۔

(۹)
غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

مطلب:۔ واقعی بہت عمدہ شعر کہا ہے بظاہر اپنے ماتم داروں کو ضبط غم کی تلقین کر رہے ہیں مگر دراصل یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کا عجب کارخانہ ہے کتنا ہی بڑا یا مفید قوم شخص مر جائے، نہ کسی کا کوئی کام بند ہوتا ہے اور نہ دنیا کی چہل پہل میں کوئی فرق آتا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ ع ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی۔

---

(۱۱۷)

(۱)
غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں!
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

مطلب:۔ غالب نے معشوق سے پوچھا کہ بوسہ کسے کہتے ہیں؟ اس نے دور سے غنچۂ ناشگفتہ دکھایا جس کا مطلب یہ تھا کہ بوسہ کی صورت ایسی ہوتی ہے اس پر غالب کہنے لگے کہ اس طرح تو میں سمجھ نہیں سکتا تم اپنے منہ سے بوسہ لے کر بتاؤ کہ دیکھو بوسہ اسے کہتے ہیں؛ بلاشبہ خوب شعر کہا ہے۔

اگر غنچۂ ناشگفتہ سے دہن معشوق مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے دور سے اپنے ہونٹ بند کر کے دکھا دئے۔

بنیادی تصور:۔ ترغیب بوس و کنار۔

پرسش طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے!
(۲) اسکے ہر اک اشارے سے نکلے ہی یہ اداکہ یوں

مطلب:۔ ہم اس سے کیا پوچھیں کہ دل کس طرح لیتے ہو؟ اس کے جسم کی ہر حرکت دستاں ہے یعنی اس کی ہر ادا زبانِ حال سے طرزِ دلبری کا اظہار کر رہی ہے۔ خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ دلکشیٔ سراپائے محبوب۔

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
(۳) آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

مطلب:۔ خدا کرے کہ وہ میرے یہاں آئے اور ضرور آئے مگر نشہ کی حالت میں رقیب کو ساتھ لے کر نہ آئے، کیونکہ لطفِ صحبت بالکل زائل ہو جائے گا۔

بنیادی تصور:۔ بیم زوال لطف صحبت۔

غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا تو دیکھئے
(۴) سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

مطلب:۔ میرا یہ خیال تھا کہ محبوب غیر کے ذکر سے شرما جائے گا مگر اس کے برعکس ہوا یہ کہ جب میں نے پوچھا کہ غیر کے ساتھ رات تم پر کیا بیتی؟ تو شرم سے منہ چھپا لینے کے بجائے وہ الٹا میرے سامنے آ بیٹھا۔ اس کا سامنے آ بیٹھنا اور میرا یہ دیکھنا کہ وہ رقیب کے پاس اسی طرح بے تکلفی سے بیٹھا ہو گا میرے لئے جس قدر جلاپے کا باعث ہے اس کا اندازہ اس شعر کے پڑھنے والے خود کر سکتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ رشکِ صحبتِ غیر۔

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
(۵) اس کی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

مطلب :- آسان شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ چونکہ بزم میں وہ خاموش ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سب خاموش بیٹھے رہیں یہی وجہ ہے کہ ہم بھی خاموش بیٹھے ہیں
بنیادی تصور :- پاس ادب۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
(۶) سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مطلب :- حالی لکھتے ہیں "ستم ظریف بمعنی وہ ظریف جس کی ظرافت کے ساتھ ستم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھ کر کہا تھا کہ آپ کی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیئے۔ یہ سن کر اس نے مجھے بزم سے اٹھوا دیا یعنی انہوں نے مجھ پر یہ ثابت کیا کہ یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے
(یادگار غالب ص ۱۳۵)

بنیادی تصور :- ستم ظریفئ محبوب۔

مجھ سے کہا جو یار نے، جاتے ہیں ہوش کس طرح
(۷) دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یوں

مطلب :- یار نے مجھ سے پوچھا کہ ہوش کس طرح جاتے رہتے ہیں؟ میں چونکہ ہمیشہ عالم بے خودی میں رہتا ہوں اس لئے جواب نہ دے سکا۔ میری بیخودی دیکھ کر ہوا نے میری مدد کی یعنی فوراً چلنے لگی گویا اس نے زبانِ حال سے بتا دیا کہ ہوش اس طرح اڑ جاتے ہیں۔
بنیادی تصور :- بیان حالتِ بے خودی۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
(۷) آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں!

آئینہ دار بن گئی یعنی حیرتِ نقشِ پا نے مجھے کوئے یار میں رہنے کا طریقہ بتا دیا۔ حیرتِ نقشِ پا۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جو شخص متحیر یا حیران ہو جاتا ہے اس میں سکون اور جمود کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چونکہ نقشِ پا بھی ساکن ہوتا ہے اس لئے شعراء اسے حیران باندھا کرتے ہیں۔ آئینہ دار بمعنی مظہر، چونکہ آئینہ کو بھی حیران باندھتے ہیں اس لئے یہاں مناسبت کا پہلو بھی پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے شاعرانہ لطف میں اضافہ ہو گیا۔

مطلب:۔ مجھ کو کوئے یار میں رہنے کا طریقہ معلوم نہ تھا مگر حیرتِ نقشِ پا نے زبانِ حال سے بتا دیا کہ اگر یہاں رہنا مطلوب ہے تو میری طرح بے حس و حرکت یعنی محو حیرت ہو جاؤ۔

بنیادی تصور:۔ محویتِ عشق۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ *(crossed)*

گر تیرے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال

(۹) موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

مطلب:۔ ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں کہ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ سمجھو کہ وصل کی حالت میں جذبۂ شوق سرد پڑ جاتا ہے تو یہ غلط ہے شوق کا زوال تو بڑی بات ہے اس میں کمی تک نہیں ہوتی۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ موجیں، دریا سے ہم آغوشی کے باوجود برابر ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہیں۔ جو دراصل ان کے اضطراب و شوقِ وصال کی ایک کھلی ہوئی علامت ہے۔ وہ وصل ہی کیا جو باعثِ زوالِ شوق ہو۔" (فلسفہ کلام غالب ص۱۰۳)

بنیادی تصور:۔ بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل

شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد (غالب)

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی

(۱۰) گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

مطلب :- جو شخص یہ پوچھے کہ اردو شاعری کیونکر فارسی شاعری کے لئے قابلِ رشک ہو سکتی ہے؟ اس کے جواب میں اسے غالب کے اشعار پڑھ کر سنا دو۔

بنیادی تصور :- میری اردو شاعری، فارسی شاعری کے لئے قابلِ رشک ہے

---

(۱۱۸)

ردیف واؤ

خد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
(۱) کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مطلب :- حالی لکھتے ہیں کہ "یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقت کو نہایت عمدہ پیرایے میں بیان کیا ہے فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی اور تنزلی کے اسباب سے بیخبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر یہ بات اس پر ظاہر ہوتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر حسد کیا جائے بلکہ ان کی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے اس لئے اس کے دل میں معدلت شعاری اور رفیا ضی پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بھی کوشش کی طرف مائل ہوتا ہے اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ "چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو" جس طرح شعراء نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔" (یادگارِ غالب ص ۱۳۷)

بنیادی تصور :- علاجِ افسردگیٔ حسد۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی!
(۲) بھروں یک گوشۂ دامن، گر آپ ہفت دریا ہو

مطلب :۔ کہنا تو یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں گناہ کم ہیں اور میرا ذوق گناہ بہت زیادہ ہے لیکن اس بات کو کہتے اس طرح ہیں کہ اگر گناہوں کے ساتھ سمندر بھی ہوں تو میرا صرف گوشۂ دامن تر ہوگا۔ شاعرانہ لطف اس گوشۂ دامن کے بھرنے میں یہ ہے کہ فارسی میں گناہ گار کو تر دامن کہتے ہیں :۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

بنیادی تصور :۔ شدتِ ذوقِ معاصی۔

اگر وہ سرو قد، گرم خرامِ ناز آجائے
(۳) کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

چونکہ قمری، سرو پر عاشق ہوتی ہے اس لئے قمری کی رعایت سے معشوق کو سرو قد باندھا ہے اور چونکہ قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اس لئے کفِ خاک لائے ہیں :۔

ع قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ

غالب کے کلام میں مناسبات و رعایاتِ لفظی کا التزام اول سے آخر تک پایا جاتا ہے۔

مطلب :۔ اگر وہ سرو قد معشوق باغ میں آکر مصروف خرام ناز ہو جائے تو اس کی تاثیر سے گلشن میں ہر کفِ خاک، مثل قمری اس پر عاشق ہو کر نالہ و فریاد کرنے لگے۔

بنیادی تصور :۔ تاثیر خرامِ ناز

(۱۱۹)

(۱) کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

مطلب :- اگر میں مصلحتاً کعبہ میں مقیم ہو گیا ہوں تو اے دوستو! مجھے بیوفائی کا طعنہ مت دو۔ میں نے بت پرستوں کے حقِ صحبت (روابطِ قدیمی) کو فراموش نہیں کیا ہے۔

در اصل اس شعر میں کعبہ اور اہلِ کعبہ کو ہدفِ ناوکِ طنز بنایا ہے یعنی مسلمان ہو گیا ہوں تو کیا ہوا بتوں کی محبت ابھی تک نہاں خانۂ قلب میں جاگزیں ہے۔

بنیادی تصور :- تعریض بر کعبہ و اہلِ کعبہ۔

نوٹ :- کنشت دراصل آتش کدہ کو کہتے ہیں، یہاں بتخانے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ۱۲

(۲) طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مطلب :- حالی لکھتے ہیں "جب تک بہشت قائم ہے، لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب وغیرہ ملے گی۔ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے تا کہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصتاً لوجہ اللہ (محض اللہ کے لئے) عبادت کیا کریں۔" (یادگارِ غالب ص ۱۱۲)

بنیادی تصور :- ترغیبِ اختیارِ اخلاص۔

(۳) ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو

رسمِ ثواب سے تقویٰ اور پارسائی کی زندگی مراد ہے + قط ٹیڑھا لگا ہے یعنی

طبیعت نیکی اور پارسائی سے منحرف ہے + قلم سر نوشت۔ وہ قلم جس سے کارکنان قضاء و قدر نے میری سر نوشت (تقدیر) لکھی ہے۔

مطلب :- اس شعر میں غالب نے اپنا عقیدہ نظم کیا ہے کہ انسان فطرتاً مجبور ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نیکی اور پارسائی کی راہ سے اس لئے منحرف ہوں کہ میری تقدیر ہی میں اس سے انحراف کرنا لکھا ہوا ہے اور نوشتۂ تقدیر کو کوئی شخص نہیں بدل سکتا۔

بنیادی تصور:- جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(۴) غالب! کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

ہندی زبان میں فائدے یا پھل یا ثمرۂ ریاضت کو لہنا کہتے ہیں + ملخ بمعنی ٹڈی +

مطلب :- میں ازلی بدبخت ہوں اگر میری کھیتی کو ٹڈی دل نہیں کھائے گا تو اس پر بجلی گر پڑے گی۔ واضح ہو کہ اس شعر میں "آپ بیتی" بیان کی ہے۔

بنیادی تصور:- بیانِ شوخیٔ تقدیر۔

---

(۱۲۰)

(۱) وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

مطلب :- ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ آپ ہمارے ساتھ محبت ہی کریں نہیں صرف اتنا چاہتے ہیں کہ غیر سے کوئی رابطہ نہ رکھئے اپنی توجہ صرف ہم پر مبذول

کیجیے۔ اب اگر آپ ہم سے محبت کرنا نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ عداوت کیجے اور بڑے شوق سے کیجے ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔ خلاصہ کلام ایں کہ رابطہ کی دو ہی صورتیں ہیں۔ محبت یا عداوت۔ آپ ان دونوں کے لئے صرف ہم کو منتخب فرمائیں۔

بنیادی تصور:۔ آرزوئے رنگِ اختصاص۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
(۲)
ہے دل پہ بار، نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

اختلاط لفظی معنی آپس میں ملنا۔ یہاں اس سے محبت مراد ہے اختلاط کا رنگ یعنی محبت کا جذبہ یا میلان۔ لفظِ رنگ محض نقش (تصویر) کی رعایت سے لائے ہیں۔

مطلب:۔ صرف بیان ضعف میں مبالغہ مقصود ہے اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے اور یہ بات کئی دفعہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ غالب کو مبالغہ میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ شدتِ ضعف سے محبت کی کیفیت بھی زائل ہو گئی چنانچہ اب تو میرے دل کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ اسے نقشِ محبت بھی (جس میں مطلق وزن نہیں ہوتا) بار یعنی ناگوار معلوم ہوتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ ضعف و ناتوانی۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ!
(۳)
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

مطلب:۔ اگرچہ تو نے رقیب کا ذکر مجھ سے شکایت کے رنگ میں کیا ہے یعنی اس کی برائی بیان کی ہے مگر اس کے باوجود مجھے تجھ سے گلہ ہے کہ اس کا

ذکر کیا ہی کیوں؟ اس کا نام تیری زبان پر آیا ہی کیوں؟
بنیادی تصور :۔ شدتِ جذبۂ رقابت۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
(۴) یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

مطلب :۔ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے، غلط ہے اگر ایسا ہوتا تو غم الفت کا بھی کوئی علاج ہوتا۔
بنیادی تصور :۔ فقدانِ علاجِ غم الفت۔

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ!!
(۵) اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

خجالت کھینچنا۔ فارسی محاورہ کا اردو ترجمہ ہے اسی لئے غیر مانوس اور غیر فصیح ہے، مطلب ہے شرمندہ ہونا۔
مطلب :۔ بے کسی کا ممنون ہوں کہ اس نے مجھے دوسروں کا احسان اٹھانے سے بچایا۔ چنانچہ اب یہ صورت ہے کہ اگر مجھے شرمندگی بھی ہے تو اپنے ہی آپ سے ہے، کسی غیر سے نہیں ہے۔
بنیادی تصور :۔ حذر از احسانِ غیر۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال!
(۶) ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

مطلب :۔ اس شعر میں غالب نے ایک اہم نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے یعنی انسان اگر بظاہر تنہائی (خلوت) میں بیٹھا ہو تو کبھی تنہا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے دماغ میں تصورات و خیالات کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اور اس دنیا میں ہر وقت ایک ہنگامہ (محشر) برپا رہتا ہے محشرِ خیال کی ترکیب بہت برجستہ ہے،

غالب نے افکارِ ذہنی کے ہنگامہ کو محشرِ خیال سے تعبیر کر کے شعر میں بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے۔

بنیادی تصورہ۔ تصویرِ محشرِ خیال۔

ہنگامۂ زبونیٔ ہمّت ہے انفعال!

(۷) حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

"ہنگامہ" غالب نے اس لفظ کو دلیل یا ثبوت کے معنوں میں استعمال کیا ہے

زبونیٔ ہمت بمعنی، پست ہمتی + انفعال بمعنی شرمندگی یا اثر پذیری۔

مطلب:۔ کسی کا احسان اٹھاؤ گے تو شرمندگی ہوگی اور شرمندگی دلیل ہے پستیٔ ہمت یا کم حوصلگی کی۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ انسان دنیا (دہر) سے کچھ حاصل نہ کرے۔ حتیٰ کہ عبرت بھی (جو غیر مادی ہے)، حاصل نہ کرے۔

عبرت اگرچہ غیر مادی اور غیر محسوس ہے مگر کہتے تو ہیں کہ اس نے فلاں واقعہ سے عبرت حاصل کی۔ غالب نے لفظ "حصول" کو مدِ نظر رکھ کر یہ نکتہ پیدا کیا کہ عبرت اگرچہ غیر محسوس ہے مگر اسے بھی حاصل نہ کرو۔

بنیادی تصورہ۔ تلقینِ بے نیازی۔

وارستگی، بہانۂ بے گانگی نہیں!!

(۸) اپنے سے کر، نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بمعنی ہر قسم کی پابندیوں سے آزادی + وحشت بمعنی اجتناب کرنا، دور بھاگنا، نفرت کرنا۔

مطلب:۔ آزادہ روی یعنی شانِ قلندری اس بات کا نام نہیں ہے، کہ انسان دوسروں سے بیگانگی اور بے تعلقی اختیار کرے۔ دراصل قلندر (مردِ آزاد) وہ ہے جو اپنے آپ (نفسِ امارہ) سے نفرت (وحشت) اور رنجیدگی کا مظاہرہ

کرے۔ بلاشبہ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔ تصوف کا حقیقی مفہوم شاعرانہ
انداز میں واضح کیا ہے۔
بنیادی تصور :۔ صحیح معنی میں وارستہ (آزاد) وہ ہے جو اپنے نفس سے بیگانہ ہو۔

(۹) ملتا ہے خوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

فوت بمعنی ضائع ہو جانا۔ فرصتِ ہستی بمعنی مدتِ عمر یا عرصۂ حیات۔
مطلب :۔ خواہ ہم اپنی عمر عبادت ہی میں کیوں نہ صرف کر دیں، پھر بھی ہم کو مرتے وقت یہ رنج یا افسوس ضرور لاحق ہوگا کہ ہم نے اپنی فرصتِ ہستی یعنی عمر کو ضائع کر دیا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو اس کو اس سے بھی بہتر کاموں مثلاً عاشقی یا خدمتِ خلق میں صرف کر سکتے تھے۔
بنیادی تصور :۔ طنز بر زہد و عبادت

(۱۰) اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مطلب :۔ خواہ ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے (قیامت کے دن ہر شخص اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوگا) مگر ہم درِ جاناں سے اٹھنے والے نہیں ہیں،
بنیادی تصور :۔ موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا !

۱۲۱

(۱) قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو

مطلب :- بلبلوں اور قمریوں (نوا سنجانِ گلشن) کو مجھ سے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں قفس میں نالہ و فریاد کر رہا ہوں مگر اس سے ان کی آزادی اور مسرتوں میں تو کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ پھر میری موجودگی انہیں کیوں بری لگتی ہے؟

بنیادی تصور :- عذر موجودگی در گلشن۔

(۲)
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست، دشمن کو

مطلب :- اگرچہ رقیب کو محبوب کی صحبت (ہمدمی) حاصل نہیں ہے مگر میرے لیے یہ بات بھی کچھ کم موجبِ رشک نہیں ہے کہ اس کے دل میں میرے محبوب سے ملنے کی آرزو تو ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ جذبۂ رشک۔

(۳)
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

مطلب :- اے محبوب! جب سرجن (جراح) نے میرے زخم کو سینا شروع کیا تو زخم کی حالت دیکھ کر سوئی بھی خون کے آنسو رونے لگی لیکن تو کس قدر سنگدل ہے کہ اس زخم کو دیکھ کر تیری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا!

جب زخم سیتے ہیں تو قدرتی بات ہے کہ سوئی خون آلودہ ہو جاتی ہے۔ اسی کو شاعر نے سوزن کی خونچکانی سے تعبیر کر دیا ہے۔

بنیادی تصور :- بیانِ سنگدلیٔ محبوب۔

(۴)
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

مطلب :۔ خدا میرے ہاتھوں کو شرمائے یہ کبھی چین سے نہیں بیٹھتے ۔ بوقت رخصتِ محبوب اس کے دامن کو کھینچتے ہیں اور جب وہ چلا جاتا ہے تو بحالتِ فراق، میرے گریباں کی دھجیاں اڑاتے ہیں ۔ اندازِ بیاں کی خوبی قابل داد ہے کہ اپنا قصور بے گناہ ہاتھوں کے سر تھوپ دیا ہے ۔

بنیادی تصور :۔ تصویرِ حیاتِ عاشق ۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں !
(۵) نہیں دیکھا شناور، جوئے خوں میں تیرے توسن کو

مطلب :۔ چونکہ ابھی تک ہم نے مقتل کا یہ رنگ نہیں دیکھا ہے کہ وہاں جا کر تو اس قدر خوں ریزی کرتا ہے کہ تیرا گھوڑا خون کے دریا میں تیرتا پھرتا ہے ۔ اس لیے ہم مقتل کے نظارہ کو ایک معمولی بات سمجھے ہوئے ہیں ۔ غالب نے حسب عادت مبالغہ کو اغراق کی حد تک پہنچا دیا ہے کیونکہ خون کا دریا اسی وقت بہہ سکتا ہے جب محبوب کم از کم بیس لاکھ آدمیوں کو تن تنہا قتل کر دے اور یہ بات محال عادی ہے ۔ علاوہ بریں اگر یہ محال ممکن ہو جائے تو بھی کوئی جاندار خون کے دریا میں نہیں تیر سکتا فوراً مر جائے گا ۔

بنیادی تصور :۔ صفتِ خونریزئ محبوب ۔

نوٹ :۔ اس قسم کی شاعری اس زمانہ میں مرغوب خاص و عام تھی ۔ اس لیے غالب بھی اس رنگ سے اپنا دامن نہ بچا سکے ۱۲۔

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
(۶) کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

دوسرے مصرع میں "کاں میں" خلافِ فصاحت بھی ہے اور کانوں کو ناگوار بھی

مطلب :۔ جب میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا چرچا ہوا تو اڑتے اڑتے یہ خبر

لوہے کی کان میں بھی پہنچ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہن کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوگئی کہ میرے پاؤں کی زنجیر بن کر میری قدمبوسی کی عزت حاصل کرے۔ اس آرزو کی وجہ سے اس کے جوہر میں حرکت پیدا ہو گئی۔ یعنی جنبش جوہر، دلیل بے تابیٔ آہن ہے۔ اس شعر میں بھی اغراق کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خوبی نہیں ہے۔

بنیادی تصور: مجد و شرف عالمِ دیوانگی۔

خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
(۷) سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

مطلب: اگر میری کھیتی پر سو بار بھی ابر آئے تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوگی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس ابر میں جو بجلی پوشیدہ ہے وہ ابھی سے میرے خرمن کو تلاش کر رہی ہے یعنی میں ازلی بدبخت ہوں اس لیے مجھے دنیا میں راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور: ع خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وفاداری بشرطِ استواری، اصل ایماں ہے
(۸) مرے بتخانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

مطلب: ایمان کی بنیاد وفاداری بشرطِ استواری ہے۔ یعنی غالب کی رائے میں "مومن" وہ ہے جو اپنے عقائد و خیالات پر استواری کے ساتھ تادم مرگ قائم رہے اس کلیہ کی روشنی میں اگر ایک برہمن ساری عمر بتوں سے وفا کرے یعنی اپنے عقیدے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے تو وہ مومن ہے اور چونکہ وہ مومن ہے اس لیے اسے کعبہ میں دفن کرنا چاہیئے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں "جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانہ میں کاٹ دے اور وہیں

مر رہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبہ میں دفن کیا جائے۔ کیونکہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا اور یہی (وفاداری) ایمان کی اصل ہے۔"
(یادگارِ غالب صہ ۱۱۲)

بنیادی تصور:۔ وفاداری اصلِ ایماں ہے۔

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
(۹) جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

مطلب:۔ چونکہ میری قسمت میں شہادت لکھی ہوئی تھی اس لیے کارکنانِ قضاد قدر نے میرے اندر یہ عادت پیدا کر دی تھی کہ جہاں تلوار کو دیکھتا تھا، سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔

بنیادی تصور:۔ اثباتِ شوقِ شہادت۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
(۱۰) رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

مطلب:۔ بظاہر مطلب یہ ہے کہ جب دن میں مجھے رہزنوں نے لوٹ لیا، تو قدرتی طور پر رات کو پاؤں پھیلا کر سو گیا۔ میرے پاس تھا کیا، جس کی وجہ سے نیند نہ آتی؟ اس لیے رہزن کو دعا دیتا ہوں کہ اس نے مجھے فارغ البال کر دیا۔ لیکن دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر ایک شخص علائق دنیوی سے آزاد ہو جائے تو اسے کسی قسم کی تشویش لاحق نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور:۔ دولتِ دنیوی موجب تشویش ہوتی ہے۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے
(۱۱) جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

مطلب:۔ شعر کی خوبی اس کے اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ پہلے مصرع میں

اپنے اشعار کو جواہرات کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور دوسرے مصرع میں جگر کو معدن جواہر ثابت کیا ہے۔ مگر اس بات کو یوں ادا کیا ہے کہ کیا ہم شعر نہیں کہہ سکتے جو جواہرات کی تلاش میں نکلیں؟ کیا ہمارے پاس جگر نہیں ہے جو معدن کو کھود دیں!

بنیادی تصور:۔ طبع موزوں خود کان جواہر ہے۔ یا کلام موزوں ہم پلۂ جواہر ہے

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
(۱۲) فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو!

مطلب:۔ بالکل واضح ہے۔ دوسرے مصرع میں قدیم ایران کے نامور بادشاہوں کے نام جمع کر دیئے ہیں تاکہ "شاہ سلیمان جاہ" کو ان پر فضیلت دے سکیں غالب نے اپنے ممدوح کو سلیماں سے اس لیے تشبیہ دی ہے کہ دنیا کے بادشاہوں میں صرف وہی ایسے بادشاہ گذرے ہیں جن کی حکومت انسانوں کے علاوہ اجنّہ، حیوانات، طیور اور عناصر کائنات پر تھی۔

بنیادی تصور:۔ تفوقِ ممدوح بر شاہانِ عالم۔

---

(۱۲۲)

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
(۱) رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

مطلب:۔ شعر میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ خالص لکھنؤ کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب میں اس سیم تن کے پاؤں دھو کر پینا چاہتا ہوں تو وہ میری ضد میں، اپنے پاؤں لگن سے باہر نکال لیتا ہے تاکہ میں اس لذت عظمیٰ سے محروم رہوں!

بنیادی تصور:۔ خوئے ستم۔

نوٹ:۔ غالب نے اس شعر کا مضمون عورتوں کی اس دعا سے پیدا کیا

ہے جو وہ نئی دلہن کو بوقت رخصت دیا کرتی تھیں کہ خدا کرے تیرا شوہر تیرے پاؤں دھو دھو کر پیا کرے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ خدا کرے وہ تیری پوجا کیا کرے۔ ورنہ کوئی عاشق اپنے معشوق کے پاؤں دھو کر نہیں پیا کرتا۔ ۱۲

(۲)
دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانوٗ
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانوٗ

سادگی بمعنی سادہ لوحی یا نادانی + "کوہکن کے پاؤں پڑوں" محاورہ میں کوہکن کا احترام مراد ہے۔ یہ محاورہ اظہار ہمدردی اور التجا کے موقع پر بھی بولتے ہیں، ہیہات بمعنی افسوس۔ غالب اس کی جگہ "افسوس" بھی لکھ سکتے تھے مگر ضلع بولنا مقصود تھا اس لیے پاؤں کی رعایت سے قصداً ہیہات کا لفظ لائے ہیں۔

مطلب:۔ کوہکن کے قربان جاؤں! اس نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر اپنی جان دے دی! افسوس! اس پیرزن کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے۔ جس کے فریب میں آکر اس نے خودکشی کر لی!

دوسرے مصرع میں تلمیح ہے اس واقعہ کی طرف کہ جب کوہکن جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گیا تو خسرو بہت پریشان ہوا۔ مصاحبوں نے ایک بڑھیا کو کوہکن کے پاس بھیجا جس نے رونی صورت بنا کر اس سے یہ کہا کہ آج شیریں کا انتقال ہو گیا۔ فرہاد نے یہ سن کر تیشہ اپنے سر میں مار لیا اور زندۂ جاوید ہو گیا۔

بنیادی تصور:۔ ماتم بر سادگیٔ فرہاد۔

(۳)
بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر، دابتے ہیں راہزن کے پانوٗ

مطلب:۔ چونکہ اس غزل کی ردیف "پانوٗ" ہے اس لیے اس غزل میں کئی شعر

ایسے ہیں جن میں قافیہ پیمائی کے سوا اور کوئی معنوی خوبی نہیں ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم راہزن کی دستبرد سے بچنے کے بہت بھاگے مگر اس نے ہمیں اسیر کر ہی لیا اور بطور سزا اب اس کے پانؤ داب رہے ہیں لیکن کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی۔ بہت کھینچا تانی کے بعد یہ معنی پیدا ہو سکتے ہیں کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ نوشتۂ تقدیر سے کسی کو مفر نہیں ہے۔

(۴)
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانؤ

مطلب:۔ اس شعر میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ مرہم کی جستجو میں اس قدر دور دور پھرا ہوں کہ جسم سے زیادہ میرے پانؤ زخمی ہو گئے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ شومیٔ تقدیر یا شدتِ مصائب۔

(۵)
اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے پانؤ

مطلب:۔ ذوقِ دشت نوردی میں مبالغہ کیا ہے کہ مجھے زندگی میں دشت نوردی کا اس قدر شوق تھا کہ مرنے کے بعد بھی میرے پاؤں کفن کے اندر متحرک تھے۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ صحرا نوردی۔

(۶)
ہے جوشِ گل، بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغ چمن کے پانؤ

مطلب:۔ بہار میں پھولوں کی اس قدر کثرت ہے کہ جب بلبل چمن میں ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑ کر جاتی ہے تو اس کے پاؤں پھولوں میں الجھ جاتے ہیں

بنیادی تصور:۔ طوفانِ بہار۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
(۷) دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانوٗ

مطلب:- چونکہ اس بت نازک بدن کے پاؤں دکھ رہے ہیں۔ اس لیے گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ بحالتِ خواب، رقیب کے گھر گیا ہوگا!

بنیادی تصور:- حسنِ تعلیل یا اغراق دربیان نزاکتِ محبوب۔

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟
(۸) پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانوٗ

مطلب:- چونکہ میں خسروِ شیریں سخن (بہادر شاہ ظفر مرحوم) کے پاؤں دھو دھو کر پیتا ہوں یعنی ان سے عقیدت رکھتا ہوں اس لیے میرے کلام میں بھی لطف پیدا ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور:- تاثیر عقیدت با ممدوح۔

---

(۱۴۳)

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
(۱) یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

مطلب:- معشوق اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ میں اپنی جگہ بہت شرمندہ ہوں کیونکہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مرض اس کو میری آہ کی تاثیر سے لاحق ہوا ہے۔

بنیادی تصور:- خجالتِ تاثیرِ آہ۔

اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
(۲) آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

تا کہ بمعنی جب تک + دیدۂ نخچیر بمعنی شکار کی آنکھ + شکار سے عاشق مراد ہے
مطلب :۔ اے مخاطب ذرا اس کا ذوقِ ستم تو دیکھ! معمولی جلبی آئینہ کے بجائے
وہ اپنا چہرہ دیدۂ عاشق میں دیکھتا ہے۔
بنیادی تصور :۔ ذوقِ ستم۔

---

(۱۲۴)

(۱) واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ، آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

پئے ہم بمعنی پیہم یا مسلسل + صدرہ بمعنی سو سو طرح سے۔ آہنگ بمعنی ارادہ۔
پئے ہم بمعنی پیہم، اردو میں محاورۂ زبان کے خلاف ہے۔ دوسرے مصرع کی بندش
خلاف فصاحت بھی ہے اور اس میں تعقیدِ لفظی بھی ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی :۔
ہم کو صدرہ، آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے۔ ہم کو آہنگ ہے یعنی ہم ارادہ
کرتے ہیں۔
مطلب :۔ معشوق کے کوچہ میں پہنچ کر جو ہم کو بار بار غش آ رہا ہے تو اس کی وجہ
یہ ہے کہ ہم سو سو طرح سے اپنے قدموں کو بوسہ دینا چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں اس
کے کوچہ میں لے آئے۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے کوچہ کی زمین
کو بوسہ دینا چاہتے ہیں۔
بنیادی تصور :۔ حسنِ تعلیل۔

(۲) دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو

"ذوقِ گرفتاریٔ ہم" ذہم بمعنی رنج والم) یعنی غم میں مبتلا ہونے کی آرزو +

مطلب :۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ظالم معشوق سے وفا کا نتیجہ رنج وغم (ہم) کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس کے باوجود ہمیں مبتلائے رنج وغم رہنے میں اس قدر لذت محسوس ہوتی ہے کہ میں ہمیشہ دل کو ترغیب وفا دیتا رہتا ہوں اور دل مجھے راہ وفا میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ ذوق گرفتاری ہم (غم)

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
(۳) تیرے کوچہ سے کہاں طاقتِ رَم ہے ہم کو

نقشِ پئے مور۔ چیونٹی کے پاؤں کا نشان + طوقِ گردن کنایہ ہے گرانباری سے

مطلب :۔ چونکہ میں اس قدر ضعیف ہوں کہ چیونٹی کے پانوُ کا نشان بھی میرے حق میں طوق گردن (وزنی شئے) کا حکم رکھتا ہے اس لیے تیرے کوچے سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں۔

بنیادی تصور :۔ فقدانِ طاقت رمیدن۔

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
(۴) یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

جان کر یعنی اپنا عاشق جان کر + نگاہِ غلط انداز یعنی نگاہ نا آشنایانہ جس سے بیگانگی ظاہر ہو۔

مطلب :۔ آپ شوق سے شیوۂ تغافل اختیار کریں مگر مجھے اپنا عاشق سمجھ کر ایسا کیجیے تاکہ یہ امید قائم رہے کہ شاید کسی دن آپ مہربان ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کی یہ بیگانہ وشی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ یہ طرزِ عمل تو زہر سے بھی زیادہ اذیت دہ اور روح فرسا ہے۔

بنیادی تصور :۔ آرزوئے تجاہلِ عارفانہ۔

رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
(۵) نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

مطلب :۔ نالۂ مرغ سحر میرے حق میں دو دھاری تلوار ہے یعنی اس سے مجھے دو قسم کی تکلیفیں پہنچتی ہیں ۔ ایک تکلیف تو رشک کی وجہ سے ہے کہ وہ بھی میری طرح اس کا عاشق ہے ۔ دوسری یہ کہ خود اس کے نالوں میں اثر ہے یعنی اس کے نالے سن کر میرے دل پر چوٹ لگتی ہے ۔

بنیادی تصور :۔ ناگواریٔ نالۂ مرغِ سحر ۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
(۶) ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

مطلب :۔ حالی لکھتے ہیں کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ ترے سر کی قسم ہم ترا سر ضرور اڑائیں گے ۔ دوسرے یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم تیرا سر کبھی ہرگز نہ اڑائیں گے ۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے یہاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی ہمارے یہاں کھانا نہیں کھاتے ۔" (یادگار غالب صـ ۱۱۹)

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ؟ ولیکن ناچار
(۷) پاسِ بے رونقیٔ دیدہ ، اہم ہے ہم کو

مطلب :۔ ہم خون کے آنسو ہرگز نہ روتے مگر کیا کریں ؟ ہمیں یہ خیال دامنگیر ہے کہ اگر ایسا نہیں کریں گے تو ہماری آنکھیں بے رونق ہو جائیں گی ۔

بنیادی تصور :۔ پاسِ بے رونقیٔ دیدہ ۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
(۸) ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

مطلب :۔ اس شعر میں تقابل کی صنعت پائی جاتی ہے اور یہ ان کے کلام کی

خصوصاً بت ہے۔ کہتے ہیں کہ کاروبارِ عاشقی نبھے تو کیونکر؟ تم اس قدر نازک مزاج ہو کر میری خموشی بھی تمہاری طبیعت پر گراں گذرتی ہے اور میں اس قدر عاجز ہوں کہ ستم تو خیر ستم ہے ہی، مجھے تمہارا تغافل بھی ستم معلوم ہوتا ہے!

بنیادی تصور:۔ دشواریٔ راہِ عشق۔

لکھنو آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
(۹) ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
(۱۰) عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
(۱۱) جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

مطلب:۔ یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مرزا ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ گئے تھے اور یہ غزل انہوں نے لکھنو کے ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی۔

کہتے ہیں کہ لکھنو آنے کا سبب ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم بغرض سیر و تفریح یہاں آئے ہیں تو یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم اس کے عادی نہیں ہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ شہر ہمارے سفر کا اختتام نہیں ہے کیونکہ ہمارا ارادہ تو نجف اور مکہ کی زیارت کا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم کسی امید پر کہیں (کلکتہ) جا رہے ہیں۔ بالفاظِ دگر، انگریزوں کے کرم کی امید ہمیں کھینچے لئے جا رہی ہے۔ یعنی اسی کرم کے کاف کی کشش ہمارے لیے نشانِ راہ بن گئی ہے۔

آخری مصرع میں لفظِ کشش بہت خوب ہے کیونکہ اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) کشش یعنی کشیدن کا حاصل مصدر ہے جس کا مطلب ہے کھینچنا یعنی کرم کی امید ہمیں کھینچے لیے جا رہی ہے۔ (۲) کاف کے اوپر جو خط کھینچ دیتے ہیں اسے

بھی کشش کہتے ہیں۔ یہاں پہلے معنی مراد لئے ہیں۔
بنیادی تصور:۔ توجیہہ زحمتِ سفر۔

---

(۱۲۵)

(۱) تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مطلب:۔ میں تمہیں ملاقاتِ رقیب سے منع نہیں کرتا۔ تم مختار ہو شوق سے ملو۔ مگر کبھی کبھی میری طرف بھی توجہ کر لیا کرو، یعنی میرا حال بھی پوچھ لیا کرو۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ التجائے پرسشِ حال زار۔

(۲) بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

مطلب:۔ میں نے مانا کہ میرا قاتل رقیب ہے کیونکہ نہ وہ تم سے ملتا نہ میں صدمۂ رقابت سے جاں بحق ہوتا لیکن قیامت کے دن باز پرس تم سے بھی ہوگی، کیونکہ بنائے قتل تو تم ہو، اس لیے تمہیں گواہی دینی پڑے گی کہ غالب کی جان رشکِ غیر کی وجہ سے گئی۔

بنیادی تصور:۔ تخویف مواخذۂ روزِ حشر۔

(۳) کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو

مطلب:۔ میں نے مانا کہ تم انسان نہیں ہو بلکہ حسن و جمال کے اعتبار سے سورج اور چاند ہو۔ مگر سورج اور چاند نہ تو تمہاری طرح کسی بے گناہ کو قتل کرتے

ہیں اور نہ حق ناشناس ہیں۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر تمہیں تمثیل خورشید و ماہ ہونے
کا دعوٰے ہے تو پھر ظلم و ستم سے باز آجانا چاہیئے ورنہ یہ دعوٰی باطل ہو جائے گا۔
بنیادی تصور:۔ ترغیبِ ترکِ ستم۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
(۴) مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

مرتا ہوں یعنی شدتِ رشک سے مرا جاتا ہوں +

مطلب:۔ مجھے ان کی نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ چونکہ
مجھے یہ گمان لاحق ہو گیا ہے کہ ہو نہ ہو یہ کسی رقیب کا تارِ نگاہ ہے جو نقاب پر
جم کر رہ گیا ہے۔ اس لیے شدتِ رشک سے میری جان پر بنی ہوئی ہے۔
شاعرانہ تخیل کے اعتبار سے بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔
بنیادی تصور:۔ بیانِ شدتِ رشک۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
(۵) مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "اس شعر میں ازراہِ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا
جس کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ
جب میکدہ ہی چھٹ گیا جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا
تو اب مسجد میں پیے یا مدرسہ میں یا خانقاہ میں سب جگہ پی یعنی برابر ہی ہے
مسجد و خانقاہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے
لیے بالکل موزوں نہیں ہیں، میکدہ چھٹنے کے بعد وہاں بھی پی لینے سے انکار
نہیں ہے۔ شعر میں شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے"
(یادگار غالب ص ۱۳۸)

بنیادی تصور:۔ تضحیک مسجد و خانقاہ۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
(۶) لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو

مطلب:۔ اہل مذہب، جنت کی تعریف میں بہت مبالغہ کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ وہاں باغ ہوں گے، نہریں ہوں گی، انواع واقسام کے ماکولات و مشروبات ہوں گے، حوریں ہوں گی وغیرہ۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ لوگ جنت کی جس قدر تعریف و توصیف کرتے ہیں، میں اس کو صحیح تسلیم کرتا ہوں لیکن خدا کرے کہ وہاں تو بھی ہو کیونکہ اگر وہاں تیرا جلوہ نظر نہ آیا تو پھر سب ہیچ ہے۔

بنیادی تصور:۔ تفوق محبوب بر نعمائے جنت۔

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
(۷) دنیا ہو یارب! اور مرا بادشاہ ہو

مطلب:۔ شعر کی خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ بظاہر ممدوح (بادشاہ) کی مدح و ثنا کی ہے اور اس کی ذات کو باعث رونق کائنات قرار دیا ہے۔ لیکن درپردہ اپنی شخصیت کی اہمیت بھی واضح کر دی ہے کہ غالب جیسے باکمال شخص کے اٹھ جانے سے بھی دنیا کی رونق میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی لیکن اگر ممدوح نہ رہا تو بلاشبہ یہ دنیا سونی ہو جائے گی۔

بنیادی تصور:۔ دعائے درازی عمر ممدوح۔

---

(۱۲۶)

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
(۱) کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

گئی وہ بات یعنی اب ہمیں اس کی آرزو نہیں ہے۔ کہے سے یعنی منت و کاجت کرنے سے + کچھ نہ ہوا یعنی ان پر کچھ اثر نہ ہوا + تو کیونکر ہو یعنی تو کیا فائدہ

مطلب :۔ اب ہمیں یہ آرزو نہیں ہے کہ کسی طرح اُن سے گفتگو کا موقع مل جائے تو ان کو اپنی طرف ملتفت کرلیں۔ کیونکہ جب ہمیں ان سے گفتگو کا موقع ملا تو ہم نے انہیں اپنے اوپر مہربان کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اب دوبارہ کہنے سننے یا التجا کرنے سے کیا حاصل ہوگا!

بنیادی تصور :۔ اظہار سنگدلیٔ محبوب۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
(۲) کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں؟ ہو تو کیونکر ہو

مطلب :۔ چونکہ ان کے وصال سے ناامیدی ہو چکی ہے، اس لیے ہم نے اپنے دل کو بہلانے کے لیے اس بات کا نام وصال رکھ لیا ہے کہ اگر وصال نہ ہوا اور (بظاہر اس کی کوئی امید نہیں) تو زندگی کیسے بسر ہوگی اور اگر ہو سکتا ہے تو کیسے ہو سکتا ہے (بظاہر اس کی کوئی صورت نہیں ہے) یعنی اس ذہنی کشمکش میں مبتلا رہنے کو وصال قرار دے لیا ہے!

بنیادی تصور :۔ طنز برناکامیٔ خواہش۔

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
(۳) حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

مطلب :۔ پاس ادب کی وجہ سے میں تو اس کشمکش میں گرفتار ہوں کہ اپنی آرزوئے وصل کا اظہار کروں یا نہ کروں اور حیا کے سبب سے وہ اس گومگو میں پڑے ہوئے ہیں کہ اس بات کی اجازت دیں یا نہ دیں؛ ان دریں حالات مقصدِ دلی حاصل ہو تو کیونکر؟

بنیادی تصور:۔ مشکلاتِ جانبین

تمہی کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا
(۴) بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیونکر ہو

صنم پرستوں سے عشاق اور بتوں سے معشوق مراد ہیں۔

مطلب:۔ اگر دنیا کے تمام معشوقوں کا طرزِ عمل تمہاری ہی طرح ظالمانہ ہو جائے تو تم خود انصاف کرو کہ پھر عاشقوں کا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ ان کی زندگی کیسے بسر ہوگی؟ یعنی عاشقی کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔

بنیادی تصور:۔ شکایت سنگدلی محبوب۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ!
(۵) جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں: "اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج اگر شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو گا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین اور موجود ہوں تو خدا معلوم تم کیا کیا آفت برپا کرو" (یادگارِ غالب صفحہ ۱۱۳)

بنیادی تصور:۔ عالمِ غرورِ حسن۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
(۶) وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

مطلب:۔ شعر کی خوبی اس کے اندازِ بیان میں مضمر ہے روزِ سیاہ کے دو معنی ہیں (ا) کنایہ ہے بدبختی سے اور یہی معنی مراد ہیں۔ (ب) تاریک دن اسی ایہام سے دوسرے مصرع کا مضمون پیدا کیا ہے۔

میری سیاہ بختی (بدنصیبی) کا یہ عالم ہے کہ اس کے سامنے رات کی سیاہی بھی

دن کی روشنی معلوم ہوتی ہے! اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے غالب کے روز سیاہ کا! اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے۔" (حالی)

بنیادی تصور:۔ اظہار سیاہ بختی خویش۔

ہمیں پھر اُن سے امید، اور انہیں ہماری قدر

(۷) ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ، تو کیونکر ہو

مطلب:۔ جب وہ ہماری بات ہی نہیں پوچھتے، ہماری طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے تو پھر ہم ان سے وفا کی کیا امید کر سکتے ہیں اور وہ ہماری محبت کی کیا قدر کر سکتے ہیں، یہ دونوں باتیں تو التفات پر موقوف ہیں۔

بنیادی تصور:۔ شکوۂ بے رضائی محبوب۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا

(۸) نہ مانے دیدۂ دیدار جُو، تو کیونکر ہو

مطلب:۔ ہمارا یہ گمان غلط نہیں تھا کہ ان کے خط سے ہمارے دل کو تسلی حاصل ہو جائے گی، چنانچہ جب ان کا خط آیا تو ہمیں تسلی ہو گئی مگر ہماری آنکھوں کو محض وصولِ خط سے تسلی نہ ہو سکی کیونکہ وہ ان کے دیدار کی آرزومند تھیں۔

بنیادی تصور:۔ ناشکیبائیٔ چشم عاشق۔

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار

(۹) یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیونکر ہو

نیش بمعنی ڈنگ۔ یہاں کنایہ ہے مژۂ محبوب سے۔ شعر میں تعقید ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی:۔

دوستو! اس مژہ کو دیکھ کر بتاؤ کہ جب یہ نیش میری رگ جاں میں فرو ہو، تو مجھے قرار کیونکر ہو سکتا ہے۔

مطلب :۔ دوستو! خود انصاف کرو کہ جب اس کی مژہ میری رگِ جاں میں خلش برپا کر رہی ہے تو مجھے کس طرح قرار آسکتا ہے۔
بنیادی تصور :۔ خلشِ مژۂ محبوب۔

مجھے جنوں نہیں غالب، ولے بقولِ حضور
(۱۰) فراقِ یار میں، تسکین ہو، تو کیونکر ہو

حضور سے بہادر شاہ ظفر مرحوم کی طرف اشارہ ہے دوسرا مصرع انہی کا ہے اور یہ غزل غالب نے انہی کی فرمائش پر لکھی تھی۔
مطلب :۔ میں جو اس قدر بے قرار ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں مجنوں ہوں بلکہ فراقِ یار میں تڑپ رہا ہوں اور بقول حضور فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو۔
بنیادی تصور :۔ وجہ اضطراب۔

---

(۱۲۷)

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو!
(۱) نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

مطلب :۔ غالب نے اس شعر میں عاشق کے لئے دستورِ حیات مرتب کیا ہے یعنی عاشق کو لازم ہے کہ اپنا دل محبوب کو دے دینے کے بعد شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرے، اور اس راہ میں جس قدر مصائب آئیں سب کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرے۔ آہ و فغاں، آئینِ عشق کے خلاف ہے اس نکتہ کو دوسرے مصرع میں شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ کہ جب سینہ میں دل نہیں ہے تو منہ میں زبان بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ خوب شعر کہا ہے۔
بنیادی تصور :۔ تلقینِ شیوۂ تسلیم و رضا۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
(۲) سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

مطلب:- جب ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنی بے رخائی کی عادت کبھی نہیں چھوڑیں گے تو پھر ہم اپنی خودداری کی روش کیوں ترک کر دیں؟ اس لئے ہم ان سے بے رخائی کی وجہ دریافت کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کریں گے، بقول طباطبائی، "اس نظم نے وہ بندش پائی ہے کہ نثر میں بھی ایسے برجستہ فقرے نہیں ہو سکتے۔

بنیادی تصور:- شانِ خودداری۔

کیا غم خوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو،
(۳) نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو

مطلب:- اس شعر کی خوبی اس کے اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے اپنے اضطراب کی کیفیت کنائے میں ظاہر کی ہے یعنی یہ کہنے کے بجائے کہ میں اس قدر غمگین ہوں کہ مجھے دیکھ کر میرا غم خوار بھی ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار آہ و فریاد کرنے لگا یا میرے حال زار پر آنسو بہانے لگا۔ اور اس کی حالت دیکھ کر دوسرے لوگ میرے راز سے آگاہ ہو گئے۔ یہ کہا ہے کہ آگ لگے غم خوار کی ایسی محبت کو جس نے میرا راز فاش کر دیا۔ دوسرے مصرع کا تیکھا پن تحسین سے بالاتر ہے اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے عاشق الٹا اس پر ناراض ہو رہا ہے کہ جو شخص اس قدر رقیق القلب ہو کر میرے غم کی تاب نہ لا سکے اسے میرا رازداں نہیں بننا چاہئے یہ اندازِ بیان جس کی سرزنش کا پہلو نمایاں ہے محض اس لئے اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر عاشق کے غم کی شدت کا اثر مرتب ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار اپنے اندر جو معنویت رکھتے ہیں ان کا اظہار لفظوں کے ذریعے

بہت دشوار ہوتا ہے بقول طباطبائی اس شعر میں مصنف کی انشا پردازی داد طلب ہے۔

بنیادی تصور:۔ شدت غم

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا!
(۴) تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

مطلب:۔ شعر کا مطلب بالکل واضح ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے وفا کی لیکن تو نے جفا کی، ہم نے تجھ سے محبت کی تو نے ہم سے نفرت کی، نتیجہ تیری بے اعتنائی کا یہ نکلا کہ ہم نے سر پھوڑ کر مر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اچھا تو جب سر پھوڑنا ہی ٹھہرا تو پھر ہم پاس وفا یا پاس عشق کیوں کریں یعنی تیرے ہی سنگ آستاں سے اپنا سر کیوں پھوڑیں تیرے ہی دروازے پر جان کیوں دیں؟ جب تو نے جیتے جی ہماری قدر نہ کی تو ہمارے اس فعل کے بعد ہمارے لاشے کی بھی تیری نگاہ میں کوئی قدر نہیں ہو گی تو تذلیل نفس کیوں کریں؟ دنیا میں پتھروں کی کوئی کمی نہیں ہے جہاں دل چاہے گا سر پھوڑ لیں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کے انتخاب دوسرے مصرع کے تیور، زبان کی خوبی اور مضمون کی دلکشی کی بدولت یہ شعر، سحرِ حلال کے مرتبہ کو پہنچ ہے بالفاظِ دگر یہ شعر غالب کے نشتروں میں سے ہے۔ شارحین کے علاوہ غالب کے تمام شائقین بھی اس شعر کی معنویت کے معترف ہیں۔

بنیادی تصور:۔ شانِ خودداری۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
(۵) گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مطلب:۔ اس شعر کی بلاغت اور تاثیر، دونوں باتیں حدِ تحسین سے بالاتر ہیں۔ دو

مصرعوں میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے۔ ایک پرندہ بدقسمتی سے صیاد کے دام میں اسیر ہو گیا جس نے اسے پنجرے میں بند کر دیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتی دیکھی۔ اب وہ اس خیال سے پریشان ہے کہ خدا جانے میرے آشیاں پہ کیا گذری! جل گیا یا بچ گیا؟ اتفاقاً دوسرا پرندہ اس کے قفس کے سامنے کسی شاخ پر آ بیٹھا۔ اس اسیر قفس نے اس سے پوچھا کہ یہ تو سناؤ کس کس کے آشیاں پر بجلی گری! آزاد پرندہ جانتا ہے کہ اسیر قفس کا آشیاں جل چکا ہے مگر یہ منحوس خبر سنا کر اس کے رنج اسیری میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے چپ ہو گیا۔ اسے خاموش دیکھ کر اسیر قفس نے کہا کہ ع۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم

آخر یہ کیا ضروری ہے کہ جس پہ کل بجلی گری ہے وہ میرا ہی آشیاں تھا، بہت ممکن ہے کسی اور کے آشیاں پر گری ہو۔ اسیر قفس کو اس طرح مطمئن کر کے شاعر نے اس شعر میں بڑی تاثیر پیدا کر دی اور شعر کی خوبی اسی تاثیر میں مضمر ہے چنانچہ ہر پڑھنے والے کے دل میں اس اسیر قفس کے ساتھ ہمدردی ہو جاتی ہے،

بنیادی تصور:۔ پہلوئے تسکین قلب۔

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ تو بتلاؤ!

(٦) کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

مطلب:۔ تم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم تمہارے دل میں نہیں ہیں"، یعنی تم ضرور میرے دل میں (مقیم) ہو۔ تو اب یہ بتاؤ کہ جب میرے دل میں تمہی تم ہو تو پھر تم میری آنکھوں سے پوشیدہ کیوں ہو؟ یعنی پھر میرے سامنے کیوں نہیں آتے؟ مجھے اپنا جلوہ کیوں نہیں دکھاتے!۔

بنیادی تصور:۔ ترغیب ملاقات بالمشافہ۔

غلط ہے جذب دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے!
(۷) نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو

غالب کو ضلع جگت، ایہام، رعایت لفظی، تجنیس اور دوسری صنعتوں کے استعمال کا بہت شوق ہے۔ وہ ہر اس لفظ کا خیر مقدم کرتے ہیں جس کے دو معنی ہوسکیں۔ ان کا دیوان اول سے آخر تک اس صنعت سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں لفظ "کھینچنا" شعر کی بنیاد ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) کسی شئی کو کھینچنا جسے فارسی میں کشیدن کہتے ہیں۔ اور لفظ کشاکش اسی کشیدن سے بنا ہے (۲) کسی سے اظہار نفرت کرنا (یہی معنی مراد ہیں)

مطلب:۔ محبوب سے کہتا ہے کہ تم بلا وجہ میرے جذب دل کا شکوہ کرتے ہو میرا اس معاملہ میں کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ کشاکش خود تمہاری پیدا کردہ ہے وہ اس طرح کہ جب میں تمہیں بتقاضائے محبت اپنی طرف کھینچتا ہوں تو تم میری طرف مائل ہونے کی بجائے مجھ سے انحراف کرتے ہو (مجھ سے دور بھاگتے ہو، تمہارے اس طرز عمل کا نتیجہ کشاکش کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے نہ تم اپنے آپ کو کھینچو نہ کھینچا تانی (کشاکش) کی شکل پیدا ہو۔

غور کیجیے! کس خوبصورتی سے معشوق کو مورد الزام بنایا ہے!

بنیادی تصور:۔ وجہ کشاکش باہمی۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے!!
(۸) ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

مطلب:۔ تمہارا کسی سے اظہار الفت کرنا دراصل ایسا فتنہ ہے، جو اس بیچارے کی خانہ بربادی کے لئے بالکل کافی ہے۔ کیونکہ تم ہو عیار، جفا پیشہ، بیوفا سنگدل اور ہرجائی چند روز اس پر مہربانی کروگے اس کے بعد اسے چھوڑ کر کسی

اور پر مائل ہو جاؤ گے اور وہ بیچارہ ساری عمر اپنی تقدیر کو روتا اور آنسوؤں سے منہ دھوتا رہے گا۔ چونکہ تمہارا طرزِ عمل یہ ہے اس لئے آسمان کو کیا پڑی ہے کہ تمہارے ہوتے اس کے ساتھ دشمنی پر کمر بستہ ہو؛ تم کچھ کم ہو؛ بہت عمدہ شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ سنگدلئ محبوب۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
(۹) عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

مطلب:۔ جب تم نے میرے رقیب کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ لیا تو پھر اب میری محبت کی آزمائش کیوں کر رہے ہو؛ میرا امتحاں کیوں لے رہے ہو؛ یہ امتحان یعنی آزمانا، آزمانا نہیں ہے بلکہ ستانا (ظلم و ستم) ہے، امتحان (آزمانا) تو اس وقت ہوتا جب تم رقیب سے پیمانِ وفا استوار نہ کرتے، خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ عدمِ ضرورتِ آزمائش۔

نوٹ:۔ داغ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہیں؟
جس سے مطلب نہیں رہتا ہے ستاتے بھی نہیں

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"
(۱۰) بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

مطلب:۔ غالب نے معشوق سے کہا کہ دیکھو غیر سے مت ملو، ہر نام ہو جاؤ گے اس پر معشوق نے ڈھٹائی سے جواب دیا "غیر سے ملنے میں میری رسوائی کیوں ہونے لگی! آخر اس میں کیا قباحت ہے؛ وغیرہ وغیرہ"، یہ سن کر غالب نے اپنے ترکش سے طنز کا تیر نکالا اور محبوب کو نشانہ بنا دیا کہ ہاں صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں،

رقیب سے ملنے میں مطلق رسوائی نہیں ہے! دوسرے مصرع کی بندش بقول نظم طباطبائی "سحر کے مرتبہ تک پہنچ گئی ہے"، جو لطف ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں پوشیدہ ہے۔ اس کا اظہار لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے اگر اس مصرع کی تکرار کی جائے تو بلا مبالغہ وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے!

بنیادی تصوّرہ۔ تشنیع بے حیائی محبوب۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ!
(۱۱) ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

مطلب:۔ اے غالب! تو اسے بے مہری کا طعنہ دیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس طعنہ سے متاثر ہو کر تجھ پر مہربان ہو جائے گا۔ تیرا یہ خیال بالکل غلط ہے اسے کیا پڑی ہے کہ وہ تیرے طعنوں سے کسی قسم کا اثر قبول کرے؟۔

بنیادی تصوّرہ۔ شکوہ بے مہری محبوب!

نوٹ:۔ غالب نے اپنی یہ غزل ۱۸۵۳ء میں اپنے قدردان، منشی نبی بخش حقیر کو بھیجی تھی اور داد طلب کی تھی! اس میں شک نہیں کہ یہ ان چند غزلوں میں سے ہے جن پر غالب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے بقول حضرت جوش ملسیانی "مرزا نے یہ پوری غزل بہت ہی مرصع کہی ہے، اس غزل کو ان کا بہت بڑا کارنامہ کہنا چاہئیے (بلاشک فیہ) ایک ایک شعر اپنا جواب نہیں رکھتا"، (شرح دیوان غالب صہ ۲۵۳)

---

(۱۲۸)

رہئیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
(۱) ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
(۲) کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
(۳) اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

چونکہ یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں اس لئے ان کا مطلب بھی بحیثیت مجموعی درج کرنا مناسب ہے۔ غالب نے ان شعروں میں ایک خاص نفسیاتی کیفیت نظم کی ہے یعنی شاعر کا دل، اہل دنیا کا طرز تپاک (منافقانہ طرز عمل) دیکھ کر بالکل جل گیا ہے بلکہ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص خود غرض اور مطلب پرست ہے۔ خلوص اور ہمدردی عنقا ہو گئی ہے۔ اندریں حالات اس کا دل اس دنیا سے بالکل سیر ہو گیا ہے یعنی بقول اقبال وہ دنیا کی محفلوں سے بالکل اکتا گیا ہے اس لئے وہ ایسی جگہ جا کر بقیہ زندگی بسر کرنی چاہتا ہے جہاں کوئی نہ ہو۔ نہ ہم سخن نہ ہم زباں۔

چونکہ یہ دنیا "سرائے فانی" ہے اس لئے گھر بنانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے بس کسی درخت کے نیچے ایک "کٹیا" بالکل کافی ہو گی۔ یہ کٹیا ایسے جنگل میں ہونی چاہیئے جہاں دور دور تک کوئی انسان آباد نہ ہو۔ چونکہ کوئی سامان زندگی ساتھ نہیں ہو گا۔ اس لئے کسی پاسباں کی بھی حاجت نہیں ہو گی۔ مجھے اس طرح عالم تنہائی میں زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ اگر میں بیمار پڑ جاؤں تو کوئی تیمار دار نہ ہو اور اگر مر جاؤں تو کوئی نوحہ خواں نہ ہو، تیسرے شعر کی اثر آفرینی قابل داد ہے۔

بنیادی تصور:- ترکِ تعلقاتِ دنیوی،

ردیف (ہ)

(۱۲۹)

از مہر تابہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
(۱) طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

کائنات میں جسامت اور روشنی کے اعتبار سے سب سے بڑی چیز آفتاب ہے اور سب سے چھوٹی چیز ذرہ ہے۔ اس تقابل سے غالب کا مقصود یہ ہے کہ آفتاب سے لے کر ذرہ تک ہر شئی مظہر ذات وصفاتِ حق ہے۔ ہر شئی میں وہی جلوہ گر ہے اور ہر شئی سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور اُس کا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور اُس کا

طوطی سے مردِ عارف مراد ہے۔ آئینہ مقابل ہے یعنی عارف کو ہر شئی میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

مطلب:۔ آفتاب سے لے کر ذرے تک ہر شئی بمنزلہ دل ہے اور دل بمنزلہ آئینہ ہے جس میں ذاتِ حق جلوہ گر ہے اس لئے عارف کو ہر شئی میں وہی وہ نظر آتا ہے یعنی ساری کائنات، پرتو یا ظل ہے ذات وصفاتِ حق کا۔

بنیادی تصوّر:۔ تلقینِ وحدت الوجود

---

(۱۳۰)

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ
(۱) جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

سبزہ زار کنایہ ہے گھر کی بربادی سے کیونکہ جب کوئی مکان ویران ہو جاتا ہے

تو کچھ عرصہ کے بعد اس کے ملبہ پر سبزہ اُگ آتا ہے + غم کدہ کنایہ ہے خانۂ عاشق سے

مطلب:۔ میرا گھر عشق کے ہاتھوں برباد ہوگیا۔ دیواریں گر گئیں چھتیں بیٹھ گئیں ملبہ پر سبزہ اُگ آیا۔ گویا گھر میں بہار آئی ہے۔ شاعر اس سبزہ کو دیکھ کر طنزاً یہ کہتا ہے کہ جس گھر کی بہار میں تباہی اور بربادی کا یہ عالم ہے تو جب اُس پر خزاں آئے گی تو اس کی بربادی کا اندازہ کون شخص کر سکتا ہے؟

بنیادی تصور:۔ ویرانی خانۂ عاشق

ناچار، بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے
(۲) دشواریٔ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

مطلب:۔ ایک تو راہ عاشقی کا طے کرنا ویسے ہی دشوار تھا، اوپر سے رفیقانِ سفر نے مجھ پر اس قدر ستم کئے کہ اب مجھے رہ رہ کے یہ خیال آتا ہے کہ اس سے تو تنہا روی یعنی بے کسی ہی بہتر تھی۔ لیکن ہمراہی کی وجہ سے بے کسی کی حالت نصیب نہ ہو سکی۔ اس لئے بے کسی کی حسرت دل میں رہ گئی۔

شعر کی خوبی اس بات میں ہے کہ غالب نے اس شئی کی آرزو کی ہے جس کی آرزو کوئی نہیں کرتا۔ یعنی بے کسی۔

بنیادی تصور:۔ حسرتِ بیکسی۔

ردیف (ی)

(۱۳۱)

صد جلوہ رُو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے
(۱) طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

مطلب:۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیں تو ہم کو کائنات کی ہر شئی

میں اس کا جلوہ نظر آسکتا ہے مگر ہماری نازک مزاجی، دید کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کرسکتی اس لئے ہم ظاہری آنکھوں کو بند کر کے دل کی آنکھوں سے اس کا جلوہ دیکھ رہے ہیں اور اسی عالم میں خوش ہیں۔

بنیادی تصور:۔ دل کے آئینے میں ہے تصویر یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق

(۲) یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

برات بمعنی حصہ یا بخرہ، ہنڈی، تنخواہ + منتِ طفلاں بمعنی لڑکوں کا احسان کنایہ ہے پتھروں سے جو لڑکے دیوانوں کو مارا کرتے ہیں۔

مطلب:۔ چونکہ عاشقوں کی روزی پتھروں پر موقوف ہے اس لئے ہمیں، کاروبارِ عاشقی میں لڑکوں کا احسان اٹھانا پڑے گا، یعنی اگرچہ ہماری آرزو تو یہ تھی کہ کسی کا احسان نہ اٹھائیں مگر مجبوراً یہ ذلت برداشت کرنی پڑے گی۔

بنیادی تصور:۔ ناگزیریٔ احسانِ طفلاں۔

دیوار، بارِ منتِ مزدور سے ہے خم!

(۳) اے خانماں خراب! نہ احسان اٹھائیے

مطلب:۔ اس شعر میں حسنِ تعلیل کی صنعت پائی جاتی ہے یعنی شاعر نے دیوار کی کجی کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ وہ مزدور کے احسان کے بوجھ سے خمیدہ ہو گئی ہے۔ مطلب یہ کہ انسان کو لازم ہے کہ کسی کا احسان نہ اٹھائے کیونکہ احسان کا بوجھ دیوار بھی برداشت نہیں کر سکتی، حالانکہ وہ احساس سے عاری ہے، لہذا انسان کو دیوار سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ اجتنابِ احسان۔

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے
(۴) یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

زخم رشک یعنی رشک + رسوا نہ کیجئے یعنی مجھ پر اعتراض نہ کیجئے + پردہ اٹھائیے یعنی رقیب سے اختلاط ترک کر دیجئے۔

مطلب :۔ آپ رقیب کو دیکھ کر از راہ محبت تبسم کرتے ہیں۔ یہ صورت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں رشک کی آگ میں جلتا ہوں۔ اس پر آپ مجھے بدنام کرتے ہیں کہ دیکھو یہ شخص بلاوجہ رشک کی آگ میں جل رہا ہے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں رشک نہ کروں تو آپ رقیب کو دیکھ کر مسکرانا چھوڑ دیں۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر مجھے رسوا نہ کیجئے۔ کیونکہ اندریں صورت میں رشک کرنے میں حق بجانب ہوں۔

بنیادی تصور :۔ عذر رشک۔

---

(۱۴۲)

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے!
(۱) بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے

دوسرے مصرع میں "بھوں پاس" کی ترکیب غیر فصیح ہے حسرت موہانی مرحوم لکھتے ہیں کہ "بھوں کا لفظ یہاں بہت برا معلوم ہوتا ہے"

آنکھ کو خرابات سے اور بھوں کو محراب مسجد سے تشبیہ دی ہے، اور یہ تشبیہ بہت مشہور و معروف ہے قبلہ حاجات سے واعظ یا ناصح مراد ہے قبلہ چونکہ مسجد کے ضلع کا لفظ ہے۔ اس لئے یہاں بہت برمحل استعمال ہوا ہے۔

مطلب :۔ اے واعظ اگر ہم نے مسجد کے زیر سایہ خرابات (میخانہ) بنا لیا۔

ہے تو اس پر تجھے معترض ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے کیونکہ خود خدا نے محراب ابرو کے زیر سایہ (نیچے) آنکھ بنائی ہے۔ یہ شعر مضمون آفرینی کی بہت عمدہ مثال ہے۔

بنیادی تصور:- جوازِ خراباتِ زیرِ سایۂ مسجد۔

(۲)
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے،

مطلب:- محبوب پر طنز کرتے ہیں کہ الحمد للہ آپ بھی کسی کے عشق میں گرفتار ہو گئے ہیں، چونکہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ آپ پر ظلم و ستم کرے گا، اس لئے ہم کو خوشی ہے کہ اب آپ کو اس ظلم و ستم کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا جو آپ نے ہم پر روا رکھا تھا۔

بنیادی تصور:- امید مکافاتِ ستم۔

(۳)
دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے

تلافیٔ مافات بمعنی نقصان کا معاوضہ، مافات لغوی معنی جو چیز جاتی رہے

مطلب:- اے فلک! تو نے ساری عمر میری کوئی آرزو پوری نہیں کی اس لیے میرا دل حسرتوں کا خزانہ بن گیا ہے اور اب میں ان حسرتوں کی پرستش کرتا رہتا ہوں۔ اگر تو میرے دل حسرت پرست کے حوصلے کی داد ہی دیدے تو کسی حد تک تلافیٔ مافات ہو جائے گی۔ بالفاظ دیگر، تو نے کوئی آرزو پوری نہیں کی تو کم از کم یہی ایک آرزو پوری کر دے۔ اس شعر میں طنز کا پہلو واقعی قابل داد ہے۔

بنیادی تصور:- آرزوئے تحسینِ حسرت پرستی۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
(۴) تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے!

مطلب:۔ مزاحیہ رنگ میں کہتے ہیں کہ ہم نے فنِ مصوری اس لئے سیکھا ہے کہ اس کی بدولت مہ رخوں کی محفل میں بار مل سکے گا۔ کیونکہ وہ ہمیں اپنی تصویر بنوانے کے لئے ضرور بلائیں گے۔

بنیادی تصور:۔ تقریبِ ملاقاتِ مہ رخاں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
(۵) اِک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے

مطلب:۔ شراب پینے سے میرا مقصد حصول نشاط نہیں ہے بلکہ محض اس لئے پیتا ہوں کہ ایک عالمِ بیخودی طاری رہے اور اس طرح غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں سے نجات حاصل ہو جائے۔ شعر کی بندش اور مضمون آفرینی دونوں خوبیاں قابلِ تحسین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر ضرب المثل ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ وجہِ مے نوشی۔

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
(۶) خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
(۷) ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے!

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بےخودی
(۸) رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
(۹) عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

واضح ہو کہ عام مطبوعہ نسخوں میں چھٹا شعر بطور مقطع آخر میں درج ہے لیکن روح کلام غالب میں یہ اشعار مذکورہ بالا ترتیب کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں۔ روح کلام غالب میں مرزا اعظیم بیگ مرحوم نے جو بیک واسطہ غالب کے شاگرد تھے غالب کے کلام پر تضمین کی ہے اور ان کے پاس جو نسخہ تھا وہ ان کو ان کے استاد سوزاں مرحوم نے عنایت کیا تھا جو غالب کے شاگرد تھے اور انہوں نے اس نسخہ میں مقطع کو چھٹا شعر لکھا ہے۔ اس لئے میں نے اسی ترتیب کو ترجیح دی ہے نظم طباطبائی نے بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔

اصل کے لغوی معنی ہیں جڑ۔ مگر یہاں یہ لفظ کنایہ ہے ذاتِ باری سے جس کی وضاحت غالب نے چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں خود ہی کر دی ہے۔

عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

فروع جمع ہے فرع کی اور فرع کہتے ہیں شاخ کو۔ جو بات چاہئے یعنی جو بات ہمیں بتانی مقصود ہے وہ صرف خاموشی ہی سے ادا ہو سکتی ہے۔ ہر رنگ میں یعنی ہر حال میں یا ہر بات میں۔ بہار کنایہ ہے اصلِ گل والا سے۔ مئے ذات کی رعایت سے پیمانۂ صفات اور پیمانہ کی رعایت سے گردش کا لفظ لائے ہیں۔

مطلب:۔ اصل سے فروع کی نشو و نما کا مطلب یہ ہے کہ ہر شی کا محرک یا اولی ایک ہی ہستی (ذات ایزدی) ہے لیکن یہ بات کہ اصل کائنات صرف ایک ہستی ہے، ایسی ہے جو لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ مدعا خاموشی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جو بات ہمیں بیان کرنی مقصود ہے اس کے بیان کا طریقہ یہ ہے کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔

ع خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمی آید

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نکتہ صرف تدبر اور تفکر ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کائنات میں جس قدر اشیاء ہیں اگرچہ بظاہر وہ متضاد معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی اصل صرف ایک ہستی ہے۔

دوسرا شعر پہلے شعر کے مصرعِ اول کی تمثیل ہے کہ اگرچہ ہم مختلف پھولوں میں مختلف رنگ دیکھتے ہیں مگر ہمیں لازم ہے کہ ہر رنگ کی علت ایک ہی شئے یعنی بہار کو قرار دیں۔ سخت غلطی ہوگی اگر مختلف رنگوں کو دیکھ کر ان کے لئے مختلف اسباب کی جستجو شروع کر دی جائے۔ (لفظ "چاہئے" یہاں کلمۂ تاکید ہے)

تیسرا شعر مظاہر کائنات سے مبداء کائنات کی طرف رجوع کرنے کی تلقین دیتا ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ جب وہ بے خود ہو تو اپنی بے خودی کے اصل مبداء یعنی خم مے کی طرف مائل ہو اور جب عبادت کرے تو اپنے معبود (قبلۂ حاجات) کی طرف متوجہ ہو۔ غرض ہر بات میں مبداء حقیقی کو مدنظر رکھے۔

آخری شعر، اسی تعلیم (رجوع از مظاہر کائنات بسوئے مبداء حقیقی) کا تتمہ ہے کہ معرفت ذاتِ حق کی شراب، خواہ کسی پیمانہ اصفات (مظہر) میں تقسیم ہو رہی ہو، اہل معرفت کو لازم ہے کہ ہر حال میں ذات ہی سے سرخوشی حاصل کریں (مست مئے ذات رہیں) ایسا نہ ہو کہ گردش پیمانۂ صفات، ان کو مئے ذات (خدا) سے غافل کر دے۔ بالفاظِ دگر ایسا نہ ہو کہ وہ صفات کے جلووں میں مستغرق ہو کر ذاتِ حق سے غافل ہو جائیں۔

بنیادی تصور:۔ ع عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے۔

---

(۱۳۳)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، ایک قطرہ خوں وہ بھی
(۱) سو رہتا ہے باندازِ چکیدن، سرنگوں وہ بھی!

بساطِ عجز بمعنی عاجزی کا سرمایہ کنایہ ہے عاشق کی زندگی یا اس کی کائنات سے، چکیدن بمعنی ٹپکنا + یک قطرۂ خوں رکنا یہ ہے دل کی حالتِ زار سے +
مطلب :- میری زندگی کی کل کائنات، صرف ایک دل تھا جو ہجر کے صدمے اٹھاتے اٹھاتے خون ہو گیا تھا۔ اور اب وہ سرنگوں رہتا ہے۔ گویا ٹپک پڑنے کے لئے آمادہ ہے،
بنیادی تصوّر :- تصویرِ بیچارگیٔ دل۔

(۲)
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی!

چندے بمعنی کچھ دنوں کے لئے + تکلف سے یعنی بناوٹ کی راہ سے یا دیدہ و دانستہ + تکلف برطرف یعنی سچی بات تو یہ ہے +
مطلب :- ہم اس شوخ سے چند دنوں کے لئے دیدہ و دانستہ کھنچے رہے مصلحت اس میں یہ تھی کہ جب وہ ہمیں کشیدہ خاطر دیکھے گا تو ہمیں راضی کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ بھی ہماری ایک حماقت تھی بھلا اُسے ہماری آزردگی کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے!
بنیادی تصوّر :- ع وہ کب خاطر میں لاتا ہے مرے آزردہ ہونے کو

(۳)
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے!
مرے دامِ تمنا میں ہے اِک صیدِ زبوں وہ بھی

مطلب :- بات کچھ بھی نہیں ہے مگر دوسرے مصرع کی بندش نے شعر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ تمناؤں کو دام فرض کر کے خیالِ مرگ کو صیدِ زبوں قرار دینا شاعرانہ تخیل کی نہایت عمدہ مثال ہے،
کہتے ہیں کہ میرا دل اس قدر آزردہ ہو چکا ہے کہ اب اُسے خیالِ مرگ سے

بھی کوئی تسکین نہیں ہوتی۔ میرے دامِ تمنا میں یہ خیال ایک صیدِ زباں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یعنی دل کے بھلانے کی ایسی ایسی سیکڑوں صورتیں میرے تصور میں موجود ہیں مگر سب غیر مؤثر اور بے کار ہیں۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ مایوسی۔

نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
(۴) کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

مطلب:۔ اس شعر میں غالب نے یہ نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے کہ رونے دھونے یا آہ و نالہ کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا بلکہ رنج و غم کی کیفیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ میں نے آہ و نالہ اس لئے کیا تھا کہ بچپن سے یہ سنتا چلا آیا تھا کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور اس کی وجہ سے قدرے سکونِ خاطر نصیب ہو جاتا ہے مگر افسوس کہ تجربے کے بعد یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا نالہ کرنے سے دل کے درد میں کمی کے بجائے اور زیادتی ہو گئی۔

بنیادی تصور:۔ افزائشِ درد بسبب نالہ۔

نہ اتنا برّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ! !
(۵) مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

بُرّشِ تیغِ جفا یعنی جفا کی تلوار کی تیزی۔ مراد ہے شدتِ جفا۔

مطلب:۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ تم اپنی جفا پر اس قدر ناز مت کرو۔ عالم بیتابی میں جو آرے مجھ پر چل رہے ہیں یعنی جو قیامت کی اذیتیں میرے دل پر گذر رہی ہیں، ان کے سامنے تمہاری جفا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ بیتابی۔

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
(۶) لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مے، ساقی اور جام میں رعایت لفظی ہے۔ لفظ اک، یہاں شمار کے لئے نہیں ہے بلکہ قلتِ شی کے اظہار کے لئے ہے واژگوں بمعنی اوندھا۔ جام واژگوں کنایہ ہے آسمان سے کیونکہ وہ اوندھے پیالے کی طرح نظر آتا ہے۔
مطلب:- ہم ساقیٔ گردوں سے شراب عشرت کی آرزو کیا کریں! اس کے پاس ہے کیا جو وہ ہمیں دے گا؛ اس کی کل کائنات بس یہی دو چار اوندھے پیالے ہی تو ہیں جو شراب (عیش) سے خالی ہیں!
بنیادی تصور:- تہی مایگیٔ ساقیٔ گردوں۔

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں!
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

مطلب:- میرے دل میں وصل کی آرزو بھی ہے اور ہجر کی شکایت بھی ہے۔ خدا وہ دن لائے کہ اس سے ملاقات نصیب ہو۔ تاکہ میں یہ دونوں باتیں اس سے کہہ سکوں۔
بنیادی:- آرزوئے اظہار جذبات۔

---

(۱۳۴)

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے!
(۱) تنگ آئے ہیں ہم ایسے، خوشامد طلبوں سے

سخن لبوں سے آزردہ یعنی بولنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایسے، کلمۂ تشبیہ نہیں ہے بلکہ کلمۂ مبالغہ ہے بمعنی اس قدر۔

شعر کی نثر یوں ہوگی۔

ہم دنیا میں خوشامد طلبوں سے اس درجہ تنگ آچکے ہیں کہ بزم بتاں میں بھی سخن لبوں سے آزردہ ہے۔

مطلب:۔ چونکہ دنیا میں خوشامد پسندوں کی کثرت ہے اس لئے ہم ان لوگوں سے اس درجہ تنگ آچکے ہیں کہ حسینوں کی محفل میں بھی (حالانکہ وہ محفل تحسین ہے) کچھ کہنے یعنی کسی حسین کی خوشامد کرنے کو یعنی اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

بنیادی تصوّر:۔ تنفرانہ خوشامد۔

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا!

(۲) یکبار لگا دو خُم مے، میرے لبوں سے

مطلب:۔ پریشانی سے فائدہ اٹھاکر شعر کا مضمون پیدا کیا ہے کہتے ہیں کہ اگر شراب بہت سے پیالوں میں ڈال ڈال کر پلائی گئی تو یہ بات اس کی پریشانی کا موجب بن جائے گی۔ ظاہر ہے جب وہ متعدد پیالوں میں ڈالی جائے گی تو متفرق یا منتشر ہو جائے گی۔ اور اسی انتشار کو پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔ اور چونکہ پریشانی کے دو معنی ہیں (۱) انتشار (۲) ہجوم آلام یا افسردگیٔ خاطر۔ اس لئے شاعر نے دوسرے معنی مراد لے کر مضمون آفرینی کا ثبوت بہم پہنچا دیا، یعنی حسن تعلیل کی صنعت پیدا کر دی۔

دراصل شاعر ساری شراب خود پینی چاہتا ہے لیکن اپنی آرزو کو صاف لفظوں بیان کرنے کے بجائے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے جس سے شراب کے ساتھ ہمدردی مترشح ہوتی ہے۔

کہتا ہے کہ میں گوارا نہیں کر سکتا کہ پیالوں میں تقسیم کر کے شراب کو پریشان

کیا جائے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ پورا مٹکا صرف میرے منہ سے لگا دیا جائے
بنیادی تصور :۔ آرزوئے بلانوشی۔

رندانِ درِ میکدہ، گستاخ ہیں زاہد!
(۳) زنہار نہ ہونا طرف، ان بے ادبوں سے

زنہار یعنی ہرگز۔ طرف ہونا، یہ قدیم محاورہ ہے۔ اب بالکل متروک ہے۔ بمعنی (۱) منہ لگنا (۲) مقابلہ کرنا (۳) برابری کرنا، دوسرے مصرع کی نثر اس طرح ہوگی :۔ ان بے ادبوں سے زنہار طرف نہ ہونا

مطلب :۔ اے زاہد! یہ بلانوش جو میخانہ کے دروازے پر شراب کی آرزو میں کھڑے ہوئے ہیں بہت گستاخ اور بے ادب ہیں اس لئے ان کے منہ ہرگز نہ لگنا یعنی ان کے سامنے شراب کی مذمت مت کرنا۔

بنیادی تصور :۔ ترغیب اجتناب از مذمتِ شراب۔

بیدادِ وفا دیکھ کے جاتی رہی آخر!
(۴) ہر چند مری جاں کو تھا ربط لبوں سے

بیداد وفا دیکھ کے یعنی وفاداروں پر ظلم و ستم ہوتے دیکھ کر + جاتی رہی یعنی جدا ہوگئی یا قطع تعلق کر لیا +

مطلب :۔ دوسرے مصرع کی بلاغت واقعی قابلِ تحسین ہے کہتے ہیں کہ اگرچہ ایک مدت سے (بوجہ ظلم محبوب) میری جان لبوں پر رہا کرتی تھی۔ (اس محاورہ سے غالب نے مضمون آفرینی کی ہے) اور اس طرح اسے میرے لبوں سے

سودا تو اس زمین میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف ؎۵

ایک ربط پیدا ہو گیا تھا، مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ دنیا میں وفا کا ثمرہ ظلم و ستم (بیداد) ہے تو اس نے بھی میرے لبوں سے پیمانِ وفا (ربط) توڑ دیا یعنی انجام کار میری جان نے جو لبوں پر رہا کرتی تھی۔ شدتِ بیداد سے تنگ آکر لبوں سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔ یعنی میرا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

"جان کو لبوں سے ربط تھا" اس کے دو معنی ہیں (۱) میں شدتِ کرب و الم سے مرنے کے قریب تھا۔ (۲) میری جان لبوں پر رہتی تھی۔ غالب نے پہلے معنی مراد لئے ہیں مگر اندازِ بیان ایسا اختیار کیا ہے جس سے پڑھنے والے کا ذہن دوسرے معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ بس یہی غالبیّت ہے۔ جس کی طرف قبل ازیں اشارہ کر چکا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ نتیجۂ بیدادِ وفا۔

---

(۱۳۵)

(۱)
تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص محبوب کے سامنے ہمارا ذکر کرتا ہے تو وہ اسے سُن لیتا ہے، محض اس خیال سے کہ ہمیں شکایت کا موقع نہ مل سکے۔ مگر از خود ہمارا ذکر کبھی نہیں کرتا۔

بنیادی تصور:۔ بے اعتنائی محبوب۔

(۲)
غالب! ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارہ نہیں کرتے

یہ اجارہ نہیں کرتے یعنی اس بات کا ذمہ نہیں لیتے۔

مطلب :- غالب نے دوستوں سے کہا کہ کسی طرح میرے حالِ زار سے محبوب کو آگاہ کر دو وہ شاید انہیں رحم آجائے اور مجھے بھی اپنی محفل میں بلالیں۔ دوستوں نے یہ بات سُن کر غالب سے یہ کہا کہ ہم تیرا حال تو ان سے کہہ دیں گے مگر اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتے کہ تیرا حال سُن کر وہ تجھے اپنے دیدار سے سرفراز کر دیں۔ شعر کی بلاغت قابلِ تحسین ہے۔

بنیادی تصور :- شانِ استغنائے محبوب۔

---

(۱۳۶)

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا !!

(۱) وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

مطلب :- شعر تو صاف ہے لیکن اندازِ بیان نے اس میں بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میرے پاس گھر تھا ہی کہاں، جو غمِ عشق اُسے برباد کرتا مگر کہتے یہ ہیں کہ حسرتِ تعمیر کے سوا میرے گھر میں تھا کیا جو غمِ عشق اسے غارت کرتا۔ خوبی اس اندازِ بیان میں یہ ہے کہ حسرتِ تعمیر تو خود معلول یا نتیجہ ہے غمِ عشق کا یعنی غمِ عشق علت ہے حسرتِ تعمیر کی اور یہ بات ناممکن ہے کہ علت موجود ہو اور معلول موجود نہ ہو۔ اس لئے حسرتِ تعمیر بدستور موجود ہے۔ اسی بات کو انہوں نے اس طرح ادا کیا ہے :-

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ

سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

بنیادی تصور :- حسرتِ تعمیر۔

---

(۱۳۷)

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
(۱) فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

مطلب :- حالی لکھتے ہیں کہ "جب غمِ دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اس لئے اس کے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے یعنی تیری جُدائی کا غم دامنگیر ہو جاتا ہے غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں"۔ (یادگارِ غالب ص ۱۳۸)

بنیادی تصور :- ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
(۲) قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

کاغذ جلانے کی قسم کھائی ہے یعنی کاغذ نہ جلانے کا عہد کر لیا ہے۔

مطلب :- اگر کاغذ کو جلا کر دکھا دیا جاتا تو میرے خط کا مضمون، جو میری سوختہ سامانی پر مشتمل تھا، محبوب پر واضح ہو جاتا یعنی کاغذ جلانے سے میری حالتِ زار کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی آتشِ فراق میں اسی طرح جل رہا ہوں لیکن محبوب نے کاغذ نہ جلانے کا عہد کر لیا ہے۔ اب چونکہ کاغذِ سوختہ کے سوا اور کوئی شی، میری سوختہ سامانی اور سوزشِ درونی کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ اس لئے میرا حال (مضمونِ مکتوب) اس پر آشکار ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

بنیادی تصور :- عالمِ مایوسی۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا، آساں ہے! ا!
(۳) دے مشکل ہے حکمت، دل میں سوزِ غم چھپانے کی

پرنیاں - اعلیٰ قسم کا باریک ریشمی کپڑا جس میں آگ بہت جلد لگ جاتی ہے۔
مطلب :- یہ تو ممکن ہے کہ شعلۂ آتش سے ریشمی کپڑا نہ جلے مگر یہ ممکن نہیں کہ دل سوزِ غم سے نہ جل اٹھے۔ بالفاظِ دگر، ریشمی کپڑا آگ کو اپنے اندر پوشیدہ کر سکتا ہے مگر سوزِ غم دل میں پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ وہ یقیناً دل کو جلا کر خاک کر دے گا۔
بنیادی تصور :- شدتِ سوزِ عشق۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
(۴) اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مطلب :- محبوب اپنے گھر سے یہ کہہ کر چلا کہ ہم باغ کی سیر کو جاتے ہیں لیکن دراصل اس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے زخمیوں کو دیکھ آئیں۔ شوخی کا پہلو یہ ہے کہ محبوب کی نگاہ میں عاشقوں کے زخموں کو دیکھنا گویا پھولوں کی سیر ہے۔ شاعرانہ خوبی اس مضمون میں یہ ہے کہ شعراء عموماً دہنِ زخم کو خندۂ گل سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔
بنیادی تصور :- بیانِ ستم ظریفیِ محبوب۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
(۵) ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

مطلب :- جب تو ہمارے گھر آیا تو ہم یہ سمجھے کہ ہماری کشش تجھے کھینچ کر لائی ہے اور تو ہم پر واقعی مہربان ہو گیا ہے لیکن تو نے یہ غضب کیا کہ آ کے بیٹھا بھی نہ تھا کہ جانے کا ذکر چھیڑ دیا۔ تیرے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ تیرے متعلق جو گمان ہم نے کیا تھا وہ ہماری سادہ لوحی تھی یعنی ہم نے اپنی سادہ لوحی سے تیرے ناز کو التفات سمجھ لیا۔
بنیادی تصور :- بیانِ سادگیِ عاشق۔

لکدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی!!!!
(۶) مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

لگدکوب لفظی بمعنی لات مارنا۔ لگد کوب حوادث بمعنی روزگار کے صدمے۔
مطلب :۔ شعر کا مضمون اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ بتوں کے ناز کا تحمل، لگد کوب حوادث کے تحمل سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے عشق میں میرے اندر اس قدر طاقت تھی کہ میں بتوں کے ناز برداشت کرسکتا تھا لیکن اب ہجر کے صدمے سہتے سہتے اس قدر کمزور ہوگیا ہوں کہ حوادث روزگار کے صدمے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ ضعف و ناتوانی۔

(۷) کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں، غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اوضاع جمع ہے وضع کی مراد ہے طرزِ عمل + ابنائے زماں یعنی اہل دنیا۔
مطلب :۔ دنیا والوں کے طرزِ عمل پر طنز کرتے ہیں کہ ان کے طرزِ عمل کی خوبی کیا بیان کروں، بس یہ سمجھ لو کہ جس شخص کے ساتھ ہم نے بارہا نیکی کی تھی اس نے بھی ہمارے ساتھ بدی کی یعنی اس دنیا میں نیکی کا بدلہ بدی ہے۔

بنیادی تصور :۔ احسان فراموشیٔ ابنائے زماں۔

نوٹ :۔ اس غزل کے تمام اشعار میں لفظ "نے" قافیہ کا جزو ہے مثلاً آنے، جلانے، بہانے، لیکن مقطع میں یہ لفظ ردیف کا جزو ہے۔ فنِ عروض میں ایسے قافیہ کو "معمول" کہتے ہیں اور اسے عیوب میں شمار کرتے ہیں، لیکن بعض شعرا اسے صنعت قرار دیتے ہیں ۱۲۔

---

(۱۳۸)

(۱) حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے، ڈوبی ہوئی اسامی

اس شعر میں "آرزو خرامی" کی ترکیب بہت بھدی، غیر مانوس اور غیر فصیح ہے چنانچہ نظم طباطبائی نے لکھا ہے کہ "ایسی ترکیبوں کے واہیات ہونے میں شک نہیں"۔ (شرح دیوان غالب ص ۱۵۷)

اس لفظ کی وجہ سے شعر میں سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس سے مراد وہ تحریک ہے جو کسی آرزو سے پیدا ہوتی ہے۔ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھو یعنی جد و جہد سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ڈوبی ہوئی اسامی سے وہ کاشتکار مراد ہے جس سے لگان وصول ہونے کی مطلق امید نہ ہو۔ دل کو ڈوبی ہوئی اسامی قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ دل، جوشِ گریہ و زاری سے اس قدر بے کار ہو چکا ہے کہ وہ حصولِ مقصد میں کوئی معاونت نہیں کر سکتا۔

مطلب:۔ دل زار زار روتے روتے اس درجہ مایوس ہو چکا ہے کہ اب اس سے کسی تمنا کے بر آنے کی امید رکھنی فضول ہے۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ مایوسی۔

اس شمع کی طرح جس کو کوئی بجھا دے
(۲) میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

جلے ہوؤں میں یعنی عاشقوں کی جماعت میں، داغِ ناتمامی ہوں یعنی مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں پوری طرح نہ جل سکا۔ ناتمامی کنایہ ہے عشق میں مرتبۂ کمال حاصل نہ کر سکنے سے۔

مطلب:۔ میری حالت اس شمع کی سی ہے جو پوری نہ جل سکی۔ اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں ان عاشقوں کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکا جنھوں نے اپنے آپ کو آتشِ عشق میں پوری طرح فنا کر کے مرتبۂ کمال حاصل کر لیا ہے۔ اسی مضمون کو انھوں نے یوں ادا کیا ہے:۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامئ نفسِ شعلہ بار، حیف

بنیادی تصور:۔ داغ ناتمامی۔

---

(۱۳۹)

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا مکان ہے
(۱) جس میں کہ ایک بیضۂ مور، آسمان ہے

مکان کنایہ ہے جہان سے + غالب، مکان کی جگہ "جہان" بھی باندھ سکتے تھے مگر جہان کے مقابلہ میں مکان بہت تنگ (مختصر) ہوتا ہے اور انہیں تنگی میں مبالغہ کرنا مقصود ہے۔ اس لئے جہان کے بجائے مکان کا لفظ لائے کسی پر جہان کے تنگ ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ بہت مظلوم اور ستم زدہ ہے۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ ہمارا جہان اس قدر تنگ ہے (ہم اس قدر ستم زدہ ہیں) کہ چیونٹی کا انڈا بھی (جو نہایت چھوٹا ہوتا ہے) اس جہان کا آسمان نظر آتا ہے۔ یعنی ہمارے جہان کی تنگی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ چیونٹی کے انڈے میں سما گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ تنگئ مکان (مبالغۂ مظلومی، خوبش)

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
(۲) پرتو سے آفتاب کے، ذرے میں جان ہے

چونکہ حرکت، علامتِ زندگی ہے اس لئے یہاں حرکت سے زندگی مراد ہے اس کو دوسرے مصرع میں "جان" سے تعبیر کیا ہے + تیرے ذوق سے یعنی تجھ

سے محبت کی وجہ سے۔

مطلب:۔ تمام دنیا کو تیری ہی لو لگی ہوئی ہے اور اسی لگن کی وجہ سے اس میں حرکت اور زندگی پائی جاتی ہے، جس طرح آفتاب، باعثِ تابشِ ذرات ہے اسی طرح آفتابِ حقیقی یعنی حق تعالیٰ، باعثِ رونقِ کائنات بلکہ منبعِ حرکت وحیات ہے، بالفاظِ دگر، کائنات کی ہر شئی کے دل میں تیرا عشق کارفرما ہے اور یہی جذبۂ عشق ان کی زندگی کا سبب ہے۔ عشق نہ ہوتا تو یہ کائنات کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔

بنیادی تصور:۔ ع رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ دیراں ساز سے

حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ!

(۳) غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

سیلی بمعنی تھپڑ + خارا بمعنی ایک قسم کا پتھر جو بہت سخت ہوتا ہے + سیلیٔ خارا سے مراد ہے ضربِ صدمات و مصائبِ دنیوی + شیشہ کنایہ ہے دل سے

مطلب:۔ میرا دل صدمے اٹھاتے اٹھاتے خون ہو گیا ہے لیکن جو شخص میرے حال سے واقف نہیں ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے شیشے (دل) میں سرخ رنگ کی شراب بھری ہوئی ہے۔

یہاں سیلیٔ خارا کے لفظی معنی مراد لینا مناسب نہیں کیونکہ پتھر کی چوٹ سے شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے، سرخ (لالہ رنگ) نہیں ہوا کرتا بقول حضرت جوش ملسیانی "اس شعر میں تکلف ہی تکلف ہے"

ہے تجلی تری، سامانِ وجود

(۵) ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

بنیادی تصور :- خوں شدگیٔ دلِ عاشق۔

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
(۴) آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی "اس نے سینۂ اہل ہوس میں جا (جگہ) گرم کی" یعنی اہل ہوس کے سینے میں اپنا ٹھکانا بنایا۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اس نے اہل ہوس سے محبت کی، چونکہ اہل ہوس کے دل میں عشق کی گرمی نہیں ہوتی اس لیے ان کے سینے کو ٹھنڈے مکان سے تعبیر کیا ہے۔ اس شعر میں ناسخ کا رنگ جھلکتا ہے یعنی یہ شعر محض رعایت لفظی کی خاطر کہا ہے۔

مطلب :- ہمارے محبوب نے سینۂ اہل ہوس میں قیام اس لیے پسند کیا کہ ہر شخص ٹھنڈے مکان میں رہنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اہل ہوس کا سینہ سوزِ عشق سے یکسر خالی ہے یعنی بالکل ٹھنڈا ہے۔

بنیادی تصور :- مذمتِ اہلِ ہوس۔

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا!
(۵) بس چپ رہو! ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

مطلب :- حالی لکھتے ہیں "ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اس میں دو معنی رکھے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر ہم بولنے پر آئے تو تمہیں قائل کر دیں گے۔ دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں" (یادگار غالب ص ۱۱۹)

بنیادی تصور :- طعن بہ لغزش محبوب۔

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
(۶) فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

مطلب :- اپنی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ شخص جو با حالِ زار، محبوب کی دیوار کے سایہ میں بیٹھا ہوا ہے (عاشق ہمیشہ کوچۂ محبوب میں پڑا رہتا ہے) دراصل فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے، یعنی اقلیمِ سخن کا بادشاہ ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس اعتبار سے، کہ اُسے سایۂ دیوارِ یار میں بیٹھنے کی عزت حاصل ہو گئی، وہ گویا فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے۔ قرینہ اس پر یہ ہے کہ شعراء محبوب کے کوچے کی گدائی کو بادشاہی پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔

بنیادی تصور :- مجدو شرفِ دیوارِ یار۔

(۷)
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا !!
کس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے

مطلب :- جگر کو جس پر ہستی کا دار و مدار تھا، غم نے مٹا دیا۔ اور اس کے بجائے داغ باقی رہ گیا ہے۔ اب میں لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ یہ داغ ہی جگر کا نشان ہے، یعنی اس کی ہستی کا ثبوت ہے۔ کس سے کہوں، یعنی لوگ اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے کہ دراصل داغِ عشق ہی زندگی (جگر) کا ثبوت ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ غالب نے یہ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو شخص عاشق نہیں ہے وہ جگر رکھنے کے باوجود جگر نہیں رکھتا۔ اگر رکھتا ہوتا تو عشق ضرور کرتا اور عشق کرتا تو جگر کے بجائے داغ موجود ہوتا جو اس کے صاحبِ جگر ہونے کا ثبوت ہوتا۔ بالفاظِ دگر غالب یہ کہتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جگر ہو تو زندگی ہے میں کہتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے۔ داغ ہو (جگر نہ ہو) تو زندگی ہے۔ اسی داغ سے جگر کا ثبوت ملتا ہے۔

بنیادی تصور :- ع گر نبودے عشق بفسردے جہاں (رومی)

(۸)
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر !
غالبؔ! ہم اس میں خوش ہیں، کہ نامہرباں ہے

مطلب :۔ اس میں شک نہیں کہ محبوب ہم پر نامہرباں ہے یعنی ظلم و ستم کرتا ہے مگر ہم اس کے باوجود خوش ہیں کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم پر جفا اس لئے کرتا ہے کہ اسے ہماری وفاداری پر کامل اعتماد ہے۔ یعنی اسے یقین ہے کہ میں لاکھ جفا کروں مگر غالبؔ پھر بھی میرا ہی کلمہ پڑھتا رہے گا۔

بنیادی تصوّر :۔ اثباتِ وفائے خویش :۔

---

(۱۴۰)

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
(۱) کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تمام شارحین متفق ہیں کہ یہ غزل معشوق کا مرثیہ ہے، ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے کیونکہ ہر شعر جذبات فراق کا آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شعر مشکل نہیں ہے۔

مطلب :۔ معشوق عالم نزع میں ہے۔ عاشق اُسے اس حال میں دیکھ کر درد فراق سے بے قرار ہو رہا ہے، معشوق اسے دیکھ کر بے قرار ہو رہا ہے۔ اس پر عاشق اس سے کہتا ہے کہ مجھے بڑا افسوس ہے کہ تو میرے درد سے بے قرار ہو رہا ہے۔ کاش تو اس وقت بھی مجھ سے وہی تغافل ملحوظ رکھتا جو ساری عمر ملحوظ رکھا! تو اس وقت تجھے بیقراری تو نہ ہوتی!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ!
(۲) تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

مطلب :۔ اگر تجھ میں غموں کے برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا تو پھر تو نے میری غمگساری کیوں کی! یعنی اگر تو مجھ سے محبت نہ کرتا تو آشوبِ غم سے تیری زندگی

کا خاتمہ نہ ہوتا۔

کیوں مری خم خوار گی کا تجھ کو آیا تھا خیال !!
(۳) دشمنی اپنی تھی، میری دوستداری ہائے ہائے

مطلب :۔ مجھے افسوس ہے کہ تیرے دل میں میری محبت کیوں پیدا ہوگئی؛ مجھ سے محبت کر کے تو نے اپنے حق میں دشمنی کی یعنی میری وجہ سے تیری جان پر بن گئی۔

نوٹ :۔ واضح ہو کہ اس قسم کے آسان شعروں کا مطلب لکھنا، تحصیل حاصل کا مصداق ہوتا ہے، کیونکہ ان میں پیچیدگی تو ہے نہیں، وضاحت کس بات کی کی جائے۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا !
(۴) عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

مطلب :۔ یہ سچ ہے کہ تو نے میرے ساتھ عمر بھر وفا کرنے کا عہد کیا تھا مگر اس سے فائدہ کیا ہوا؛ عمر کو پائیداری کہاں ہے؟ دیکھ لے! تو آج دنیا سے جا رہا ہے۔

زہر لگتی ہے مجھے آب وہوائے زندگی !!
(۵) یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

مطلب :۔ چونکہ زندگی نے تیرے ساتھ موافقت نہیں کی اس لئے مجھے یہ زندگی زہر لگتی ہے یعنی میں بھی زندگی سے بیزار ہوں۔

گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا ! ! !
(۶) خاک پر ہوتی ہے تیری، لالہ کاری ہائے ہائے

مطلب :۔ ایک زمانہ وہ تھا جب تو خود دوسروں پر اپنے جلوے کے پھول برسایا کرتا تھا لیکن آج تیری قبر پہ پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
(۷) ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

مطلب:۔ تو رسوائی کے خیال سے قبر میں پوشیدہ ہو گیا! واقعی الفت کی پردہ داری تجھ پر ختم ہے۔ اب تجھ سا غیرت مند کہاں پیدا ہو گا!

خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی!
(۸) اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے

مطلب:۔ تیرے مرجانے سے پیمان محبت کی عزت خاک میں مل گئی، اور دنیا سے محبت کی رسم کا خاتمہ ہو گیا یعنی تجھ سا وفا شعار اب پیدا نہ ہو گا۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا!
(۹) دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

مطلب:۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ تو مجھ پر مشق ستم کرے اور میرے دل پر ایک کاری زخم لگائے مگر افسوس کہ میری آرزو پوری ہونے سے پہلے ہی تیری زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
(۱۰) ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

مطلب:۔ ہم کو تیرے انتظار میں تارے گن گن کر رات کاٹنے کی عادت پڑ چکی ہے اب تیرے مرنے کے بعد یہ اندھیری راتیں ہم سے کیسے کٹیں گی!

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال!
(۱۱) ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

مطلب:۔ اب میرے کان تیرے پیام سے اور میری آنکھیں تیرے جمال سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی ہیں، ہائے افسوس! ایک میرا دل اور اس پر مایوسی

اور نامرادی کا یہ بارِ گراں!

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ! ابھی وحشت کا رنگ
(۱۲) رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے

مطلب:۔ ابھی میرے اندر ذوقِ صحرا نوردی (جو تقاضائے وحشت ہے) پیدا ابھی نہ ہونے پایا تھا کہ محبوب دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس لئے میرے دل میں جو کچھ ذوق رسوائی پوشیدہ تھا، وہ ظاہر نہ ہو سکا۔ دل ہی دل میں رہ گیا۔

---

(۱۸۱)

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
(۱) تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

سرگشتگی بمعنی جنونِ الفت + عالمِ ہستی بمعنی زندگی + نوید بمعنی خوش خبری۔

مطلب:۔ ہمارا قلب مضطرب، طالبِ تسکین تھا، لیکن سرگشتگی کی وجہ سے اس نعمت سے محروم تھا۔ اب چونکہ اسی سرگشتگی کی بدولت ہمیں زندگی سے مایوسی ہو گئی ہے۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے دل کو تسکین نصیب ہو جائے گی۔ اس بات کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ ہماری طرف سے تسکین کو ہماری موت کی خوش خبری سنا دو! شعر کا لطف اسی طرزِ انداز بیان میں مضمر ہے۔

بنیادی تصور:۔ وجہ تسکین خاطر۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
(۲) اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

مطلب:۔ محبوب اس خیال سے میرے دل کی خبر نہیں لیتا یعنی پرسشِ حال دل نہیں کرتا کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ میرا دل میرے ہی پاس ہے

یعنی میرے قبضہ میں ہے۔ حالانکہ وہ تو مدت ہوئی میرے قبضہ سے نکل کر آوارۂ صحرا ہو چکا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تغافل شعاری محبوب۔

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک !
(۳) ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

مطلب:۔ غم الفت میں جو لذت محسوس ہو رہی ہے اس کا بیان بذریعۂ الفاظ کہاں تک کروں ؟ بس یہ سمجھو کہ اس تپ غم کا شکر ادا کرنے کے لئے میرا بال بال زبان بن گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ لذّتِ تپ غم۔

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
(۴) ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

مطلب:۔ دلِ حق شناس سے عاشق صادق کا دل مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ چونکہ میرا دل حق شناس ہے اس لئے وفا پرستی اس کا شعار زندگی ہے۔ ایسا دل جو وفا پرستی کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتا، اس کے پاس ہے لیکن افسوس کہ محبوب، غرورِ حسن کی وجہ سے اس کی صحبت سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔

بنیادی تصور:۔ فتنۂ غرورِ حُسن۔

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
(۵) اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

بلغمی مزاج کا اشارہ شاعر کی طرف ہے۔ شعراء شب مہتاب (چاندنی) کو سرد قرار دیتے ہیں۔

مطلب:۔ چونکہ چاندنی رات ٹھنڈی ہوتی ہے اور میرا مزاج بھی بلغمی (ٹھنڈا)

ہے۔ اس لئے اسے اعتدال پر لانے کے لئے جس قدر شراب مل سکے پینی چاہیے کیونکہ وہ گرم ہوتی ہے۔
بنیادی تصور:۔ جوازِ کثرتِ مے نوشی۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ!
(۶) مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مطلب:۔ مکان (جگہ) کی عزت اور رونق ہمیشہ مکیں (رہنے والے) کے دم سے ہوتی ہے۔ دیکھو! مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے۔
بنیادی تصور:۔ وجودِ مکین باعثِ رونقِ مکان

---

(۱۴۲)

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
(۱) خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حالِ دل کسی پر ظاہر نہیں ہوتا، تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے، کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" (یادگارِ غالب ص ۱۰۲)
غالب نے اس شعر میں اپنے معترضین پر طنز کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔
بنیادی تصور:۔ طنز بر معترضین۔

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ!
(۲) دل، فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

حسرتِ اظہار یعنی حسرتِ اظہارِ تمنا + فردِ جمع و خرچ یعنی وہ کاغذ جس میں

آمدنی اور خرچ کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ لال یعنی گونگی۔

مطلب :- ان ہونی یا محض دل خوش کن خیالی باتوں کو زبانی جمع و خرچ کہتے ہیں، لیکن گونگی زبانیں، زبانی جمع و خرچ سے بھی قاصر ہوتی ہیں۔ اس نکتہ کو مدنظر رکھنے کے بعد مطلب یہ ہوا کہ میرا دل جن باتوں یا تمناؤں کا اظہار چاہتا ہے (اگرچہ وہ باتیں محض زبانی جمع و خرچ ہوتیں) لیکن افسوس ہے کہ یہ حسرت بھی پوری نہ ہوئی (کہ اپنی آرزوؤں کا اظہار تو کر دیتا) بلکہ میرا دل، گونگوں کے زبانی جمع خرچ کا ایک دفتر ہے کہ وہ بیچارے زبانی جمع خرچ سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں سب دل کی دل ہی میں رہتی ہیں۔

بنیادی تصور :- حسرت یا دشواریٔ عرضِ مدعا۔

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا!

(۳) رحمت! کہ عذر خواہ، لب بے سوال ہے

مطلب :- اس شعر کی نثر یہ ہے کہ "اے خدا تو کس پردے میں آئینہ پرداز ہے؛ مجھ پر رحمت فرما کہ میرا لب بے سوال، عذر خواہ ہے"۔ یہی اس کا مطلب بھی ہے کہ اے خدا تو کس پردے میں پوشیدہ ہو کر اپنی آرائش جمال میں مصروف ہے؟ مجھ پر رحم کر! میں اگرچہ زبان سے طالب عفو نہیں ہوں مگر میری خاموشی ہی میری حالتِ قلبی پر شاہد ہے یعنی میں دل سے طالب عفو ہوں۔

بنیادی تصور :- طلب رحمت۔

ہے ہے! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی

(۴) اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے

مطلب :- اے شوقِ منفعل، یعنی اے میرے جذبۂ عشق کہ تو اپنی نارسائی (ناکامی) پر شرمندہ ہے، اور شاید اسی لئے تو یہ سمجھتا ہے کہ محبوب کو مجھ سے

دشمنی ہو گئی ہے! اسے شوق یہ تیری خام خیالی اور کوتاہ بینی ہے جو تو ایسا سمجھتا ہے۔ ارے نادان! یہ تجھے کیا خیال ہے! وہ محبوب حقیقی تو سراپا محبت ہے! بھلا وہ اپنے بندوں سے دشمنی کر سکتا ہے!

معرفت کا شعر ہے اور خدا نخواستہ کی ترکیب قابلِ داد ہے۔

بنیادی تصور:۔ تنزیہہ محبوب از صفت عناد۔

(۵) مشکیں لباسِ کعبہ، علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

نافِ زمین کنایہ ہے وسطِ زمین سے۔ یہ ترکیب نافِ غزال کی وجہ سے لائے ہیں۔

مطلب:۔ غلافِ کعبہ سے جو مشک کی سی خوشبو آ رہی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت علیؓ وہاں پیدا ہوئے تھے۔ ورنہ کعبہ تو نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال (جس میں مشک بھرا ہوتا ہے)

بنیادی تصور:۔ حسنِ تعلیل۔

(۶) وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

مطلب:۔ میری وحشت (دیوانگی) اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ اس کے لئے یہ دنیا بھی تنگ ہے۔ اس لئے زمین کو اپنی کم مائگی (اپنے چھوٹے ہونے) پر شرم کے مارے پسینہ آ گیا اور یہ سمندر وہ پسینہ ہی تو ہے!

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ وحشت

(۷) ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مطلب :۔ حقیقی ہستی صرف خدا کی ہے جو واجب الوجود (یعنی از خود موجود) ہے عالم کی ہستی، خدا کی ہستی کا پرتو ہے اس لیے عالم کا ہستی حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ اعتباری یا وہمی یا خیالی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھو مقدمۂ شرح)

بنیادی تصور :۔ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی!
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

۱۴۳

(۱) تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

مطلب :۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ اس بات کے دریافت کرنے پر اصرار مت کرو کہ مجھے تم سے کیا شکایت ہے؟ شکایت نہیں ہے بلکہ یہ سمجھو کہ تم نے جو ساری عمر مجھ پر ظلم و ستم کیے ہیں ان کی وجہ سے میرا دل آتش کدہ بن گیا ہے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ آگ اسی طرح دبی رہے۔ خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ بظاہر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے مگر دراصل سب کچھ کہہ دیا۔ "آگ دبی ہوئی ہے" اس جملہ میں شکووں کی دنیا چھپی ہوئی ہے۔

بنیادی تصور :۔ شکوۂ جفائے محبوب۔

(۲) دلا! یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

مطلب :۔ اے دلِ زار! تو اس درد و الم کو بھی غنیمت سمجھ؛ کیونکہ ایک دن وہ آئے گا جب یہ درد و الم ہمارا خاتمہ کردے گا نہ گریۂ سحری باقی رہے گا نہ آہ نیم شبی۔

بنیادی تصور:۔ نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

---

(۱۴۳)

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
(۱) ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں کہ غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف کسی کرنک وغیرہ سے بآسانی اڑ سکے (مٹ سکے) اور کاغذ پر اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں از راہ ظرافت لفظِ غلط بردار کے معنی اس کاغذ کے لئے ہیں جس پر سے غلط حرف، خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں حرفِ وفا صرف ایک جگہ لکھا تھا۔ سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیرے خط کا کاغذ غلط بردار ہے۔ یعنی جو بات صدقِ دل سے (خلوص کے ساتھ) اس پر نہیں لکھی جاتی۔ یعنی جو بات غلط ہوتی ہے۔ وہ خود بخود مٹ جاتی ہے''۔

بنیادی تصور:۔ توجیہہ ازالہ حرفِ وفا۔

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
(۲) ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتش بار ہے

مطلب:۔ ہم اپنے ذوقِ فنا کی تکمیل چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمارا نفس مسلسل آگ برسا رہا ہے لیکن افسوس کہ ہم جل تو رہے ہیں مگر جل نہیں چکتے۔ اندریں حالات ہمارا جی اپنے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر کیوں نہ جلے، خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

آگ سے، پانی میں بجھتے وقت، اٹھتی ہے صدا
(۳) ہر کوئی، درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

مطلب:۔ چونکہ جلنا آگ کا خاصہ ہے اس لئے جب اسے پانی سے بجھاتے ہیں یعنی اسے فنا کرتے ہیں تو اس میں سے آواز نکلتی ہے۔ یعنی وہ اپنی درماندگی کی وجہ سے نالہ و فریاد پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی شے اپنی فنا پر رضامند نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور:۔ ناگزیری نالہ بوقتِ درماندگی۔

ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ!
(۴) جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق۔ عذر خواہ بمعنی معافی چاہنے والا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود وہ دعویٰ، متضمن دلیل واقع ہوا ہے (یعنی دلیل خود دعویٰ میں پوشیدہ ہے) مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات (مخلوقات) جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں ان کی بدمستی اور غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات (معدوم ہونے کے باوجود) وجود کا دم بھرتے ہیں"
(یادگار غالب ص۱۲۹)

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کائنات کی ہر شئی پر ایک بدمستی کا عالم طاری ہے لیکن چونکہ اس کا باعث وہ خود ہے (نہ وہ حسین ہوتا نہ مخلوقات اس پر عاشق ہوتیں) اس لئے وہ کسی کو موردِ الزام نہیں بناتا بلکہ اس باب میں سب کو معذور سمجھتا ہے! (نہ وہ حسین ہوتا نہ ہم از خود رفتہ ہوتے)

بنیادی تصور:۔ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے!
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
(۵) زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

مطلب :- جب معشوق نے عاشق کی بے رخائی دیکھی تو اس سے کہا کر تم تو مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ مجھے اپنی زندگی کہا کرتے تھے، اب یہ بے رخائی کیسی! عاشق نے کہا کہ ہاں کسی زمانے میں مجھے اپنی زندگی بہت عزیز تھی، اسی لئے میں تمہیں اپنی زندگی کہا کرتا تھا۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ میرا جی زندگی سے بھی بیزار ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ اب تمہیں اپنی زندگی نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس میں تمہاری تحقیر کا پہلو نکل آئے گا۔

خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ عاشق اگرچہ اپنی زندگی سے بیزار ہے مگر محبوب سے بیزار نہیں ہے۔ اس کی الفت بدستور دل میں قائم ہے، بہت خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور :- اثبات و اقرارِ الفتِ محبوب۔

آنکھ کی تصویر سر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا!
(۶) تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

مطلب :- میں نے سر نامہ پہ آنکھ کی تصویر اس لئے کھینچی ہے کہ تجھ پہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس کو دیدار کی حسرت ہے۔ استاد ذوق مرحوم کہتے ہیں:-

یہ چاہتا ہے کہ شوق کہ قاصد! بجائے مہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی!

بنیادی تصور :- اظہار حسرتِ دیدار

---

(۱۴۵)

بیٹھیں میں گذرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مطلب :۔ ان کی بے اعتنائی اور کج ادائی کا یہ عالم ہے کہ اگر کبھی وہ پینس میں سوار ہو کر میرے کوچہ سے گزرتے ہیں تو انہیں اتنا توقف بھی گوارا نہیں ہے۔ کہ کہار کندھا ہی بدل لیں۔

بنیادی تصور :۔ شانِ بے اعتنائی محبوب۔

---

(۱۴۶)

(۱) مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

تمنا بمعنی شوق + حیرت آباد بمعنی حیرت کدہ۔

مطلب :۔ میری ہستی سراسر عالم حیرت ہے۔ عالم حیرت میں انسان مبہوت ہو جاتا ہے۔ نہ حرکت کر سکتا ہے نہ آواز نکل سکتی ہے۔ اندریں حالات نالہ و فریاد خارج از بحث ہے۔ اس بات کو انہوں نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ نالہ اس عالم کا عنقا ہے یعنی مثل عنقا معدوم ہے۔ مقصود صرف اتنا ہے کہ میرا وجود کمال شوق کی وجہ سے حیرت کدہ بن گیا ہے یعنی وہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں ہے (بالفاظِ دگر، فرطِ حیرت سے نالہ و فریاد سے معذور ہوں و نالہ، عنقا کی طرح ناپید ہے)

بنیادی تصور :۔ عدم صدورِ نالہ بوجہ حیرت یا مصوری عالم حیرت۔

(۲) خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

مطلب :۔ بہار ہو یا خزاں، کوئی موسم بھی ہو، ہماری حالت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ ہم تو ہمیشہ قفس میں بیٹھے ہوئے اپنی مجبوری (بے بال و پری) کا

ماتم کرتے رہتے ہیں۔ اس شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شاعر نے تین تین جملے ہر مصرع میں بڑی صفائی کے ساتھ نظم کر دیئے ہیں، بندش کی چستی اور زبان کی سلاست قابل داد ہے۔

بنیادی تصور۔ تصویر اسیری یا ماتم بے بال و پری۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم!
(۳) اثر، فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

مطلب:۔ معشوق اگر کبھی سے وفا کرتے ہیں تو یہ ایک امر اتفاقی ہے عاشقوں کی آہ میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسا ہوتا تو ہمارا معشوق بھی ہم سے وفا کرتا

بنیادی تصور:۔ عدم تاثیر آہ۔

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تاب رنج نومیدی
(۴) کفِ افسوس ملنا، عہد تجدیدِ تمنا ہے

شوخیٔ اندیشہ بمعنی محبوب کے خیال کو نہ بھلا سکنا۔ واضح ہو کہ خیال یار کے بار بار آنے کو غالب نے شوخیٔ اندیشہ سے تعبیر کیا ہے۔ عہد تجدید تمنا سے تجدید عہد تمنا مراد ہے۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ شوخیٔ اندیشہ سے کہدو کہ وہ تاب رنج نومیدی نہ لائے یعنی ترک تمنا نہ کرے۔ کیونکہ مایوسی، تمنا کو مٹا نہیں سکتی، بالفاظ دگر مایوس ہو کر بھی تمنا نہیں جاتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب ہم عالم مایوسی میں فرط غم سے کف افسوس ملتے ہیں (ہاتھ ملتے ہیں) تو یہ صورت گویا عہد تمنا کی تجدید کر دیتی ہے۔ شعر کی خوبی اس تاویل میں مضمر ہے کہ شاعر نے ہاتھ ملنے کو تجدید عہد تمنا سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کف افسوس ملنے کی تاویل یہ کی ہے کہ جب ہم ہاتھ ملتے ہیں تو گویا عہد تمنا کو از سر نو تازہ کر لیتے ہیں۔

بنیادی تصور: - کیفیتِ دوامِ آرزو۔

(۱۴۷)

(۱) رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا، دودِ چراغِ کشتہ ہے

بود بمعنی حقیقت یا ہستی + پہلے مصرع میں چراغ کشتہ کنایہ ہے بیمارِ وفا سے دودِ چراغ کشتہ یعنی بجھے ہوئے چراغ کا دھواں، نبض کو دود سے تشبیہ دی ہے۔ وجہ شبہ حرکت ہے، یعنی جس طرح چراغ کشتہ کا دھواں بتدریج ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بوقتِ مرگ، نبض بتدریج ساکن ہو جاتی ہے یعنی مریض ختم ہو جاتا ہے۔

مطلب:- کہتے ہیں کہ بیمارِ وفا کا آخری وقت ہے، اب تو اس پر رحم کر! اب اس میں رہا ہی کیا ہے؛ گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے، اگر تجھے شک ہو تو اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لے۔ دودِ چراغ کشتہ کی طرح بتدریج ختم ہو رہی ہے۔

بنیادی تصور:- التجائے رحم بوقتِ مرگ۔

(۲) دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں!
ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کشتہ ہے

مطلب:- اگر چراغ روشن نہ ہو، بے رونق رہے، تو اس میں اس کا فائدہ ہے، کیونکہ اس کا تیل ختم نہیں ہوگا۔ اس طرح اگر ہم اپنے دل میں عشق کی شمع روشن نہ کریں۔ (آرزو نہ کریں) تو ہمارا فائدہ ہے کہ بے چین نہ ہوں گے۔ مگر کیا کریں! دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ دل لگی کی آرزو ہمیں بے چین رکھتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ سبب بے چینی۔

---

(۱۴۸)

چشمِ خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
(۱) سرمہ، تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

نوا پرداز ہے یعنی باتیں کرتی ہے۔ تو کہوے بمعنی گویا یا بالفاظِ دگر، دودِ شعلۂ آواز۔ شاعر نے آواز کو شعلہ فرض کر کے اس کے لیے دھواں ثابت کیا ہے۔

مطلب:۔ حسینوں کی آنکھیں اگرچہ بے زبان ہیں اس کے باوجود اشاروں ہی اشاروں میں عاشقوں سے گفتگو کرتی ہیں (یہ وہ بات ہے جس کی تصدیق ہر عاشق کر سکتا ہے) ان کی آنکھوں میں جو سرمہ کی تحریر نظر آتی ہے یہ سرمہ نہیں ہے بلکہ آواز کے شعلے کا دھواں ہے۔ یہ شعر غالب کی قوتِ تخیل کی بہت عمدہ مثال ہے۔

بنیادی تصور:۔ نوا پردازیٔ چشمِ خوباں۔

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
(۲) نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

پیکرِ عشاق یعنی عاشقوں کا وجود یا جسمِ خاکی + ساز بمعنی باجا + طالع ناساز بمعنی منحوس سیارہ + سازِ طالع ناساز کنایہ ہے بدبختی سے۔

مطلب:۔ عاشقوں کا وجود مجسم بدبختی ہوتا ہے۔ یعنی وہ سراپا بدبخت ہوتے ہیں۔ اور جو نالہ وہ کرتے ہیں وہ ان کے طالع ناساز (بدبختی) کی آواز ہے۔

پہلے شعر کی طرح اس شعر میں بھی جو مضمون نظم کیا گیا ہے وہ پیش پاافتادہ ہے یعنی اس میں بذاتِ خود کوئی ندرت نہیں ہے۔ لیکن اسلوبِ بیان نے

شعر میں دلکشی پیدا کر دی ہے۔ علاوہ بریں الفاظ بہت مناسب جمع کر دیئے ہیں مثلاً عشاق کے دو معنی ہیں۔

(و) عاشقوں کی جمع ہے (ب) ایک راگنی کا نام بھی ہے۔ اس لیے اس لفظ کو ساز کے ساتھ مناسبت ہے۔ سازا ور ناساز میں صنعتِ لفظی ہے۔ نالہ، گویا اور آواز میں مناسبت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح طالع، سیارہ اور گردش میں بھی مناسبت ہے۔

بنیادی تصور:۔ ناسازیٔ طالع عشاق۔

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
(۳) یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے

دستگاہ بمعنی مہارت، قدرت، عزت، لیکن یہاں کمال مراد ہے اور یہ لفظ محض پا انداز کی رعایت سے لائے ہیں۔ ایک بیاباں کنایہ ہے کثرتِ گل سے۔

مطلب:۔ مجنوں کی خوننابہ فشانی کا کمال دیکھو کہ کثرتِ اشک ہائے خونیں سے سارا جنگل گلزار بن گیا ہے۔ گویا اس کا فرش پا انداز پھولوں سے بنایا گیا ہے

بنیادی تصور:۔ دستگاہِ دیدۂ خونبار۔

---

(۱۴۹)

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
(۱) میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

مطلب:۔ معشوق نے ازراہ طنز غالب سے کہا "تمہارا دعویٰ عشق بالکل غلط ہے میری رائے میں تو تمہیں وحشت ہے۔" اس پر انھوں نے کہا "عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی، لیکن میری وحشت بھی تمہارے حق میں مفید ہے کیونکہ

اس کی وجہ سے تمہیں شہرت تو حاصل ہو گئی ۔

بنیادی تصور :۔ جواب طنزِ محبوب ۔

(۲) قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ٭ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

مطلب :۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ آپ ہم سے تعلق قطع نہ کریں اگر محبت کرنی گوارا نہیں ہے تو عداوت ہی سہی ۔ ہم اس میں بھی راضی ہیں ۔

بنیادی تصور :۔ التجائے تعلق خاطر ۔

(۳) میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ٭ اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

مطلب :۔ اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں :۔

(ا) محبوب نے اپنی محفل میں غالب کو شریک نہیں کیا ۔ جب انہوں نے شکایت کی تو محبوب نے کہا کہ وہ کوئی عام مجلس نہیں تھی بلکہ تخلیہ کی صحبت تھی ۔ اس پر انہوں نے یہ جواب دیا کہ چلو مان لیا کہ وہ مجلس نہیں تھی بلکہ خلوت تھی مگر میرے ہونے سے تمہاری رسوائی کا تو کوئی اندیشہ نہ تھا ۔

(ب) دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب غالب نے محبوب سے پوچھا کہ تم نے اپنی مجلس میں مجھے کیوں نہیں بلایا تو اس نے کہا "مجھے اپنی رسوائی کا خوف تھا"۔ اس پر غالب نے کہا "اگر یہ خیال تھا تو کسی دن خلوت میں بلا لو۔"

بنیادی تصور :۔ آرزوئے باریابی ۔

(۴) ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ٭ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

مطلب :۔ اس شعر کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں :۔

(ا) محبوب نے غالب سے کہا کہ "رقیب کو مجھ سے واقعی محبت ہے"۔ غالب نے یہ سن کر کہا "مگر تمہیں رقیب کی محبت کا یقین ہو چکا ہے تو ہم بھی اپنے دشمن نہیں ہیں جو تم سے محبت کر کے مفت میں اپنی زندگی برباد کر دیں ۔"

(ب) محبوب نے غالب سے کہا "غیر مجھ سے محبت کرتا ہے۔" غالب نے یہ سن کر جواب دیا "چلو مان لیا کہ اسے تم سے محبت ہے مگر میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں کیونکہ تم سے محبت کرنا میری ذات (زندگی) کا تقاضا ہے۔ اور کوئی شخص اپنی ذات سے دشمنی نہیں کر سکتا۔

بنیادی تصور:- اثباتِ دعوئ محبت۔

نوٹ:- غالب اس شعر میں بقول حضرت اثر لکھنوی، "مومن سے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ معشوق سے ایسی چلی کٹی جس میں راز و نیاز کا پہلو نکلے، اس کے یہاں بہت ہے۔" (مطالعۂ غالب صہ ۲۵)

(۵) اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو ٭ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

مطلب:- اپنی ہستی سے آگاہی عین عرفان ہے۔ جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)

اگر کسی کو اپنی ہستی سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے تو اپنی ہستی سے غفلت اختیار کرے۔ یعنی اپنے آپ کو اس کی محبت میں فنا کر دے یا اس کی یاد میں اپنی ہستی کو بالکل بھلا دے۔ اس غفلت ورزی کا نتیجہ بھی معرفتِ باری ہی ہو گا۔ غرض یہ ہے کہ اپنی ہستی سے آگاہی بھی ذریعۂ معرفتِ الٰہی ہے اور غفلت بھی۔

بقول نظم طباطبائی "اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ مشایخ طریقت کے دیوان بھی اس شعر کی نظیر سے خالی ہیں۔" (شرح دیوانِ غالب صہ ۱۶۸)

بنیادی تصور:- تلقینِ اعتماد علی النفس۔

(۶) عمر ہر چند کہ ہے برق خرام ٭ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

مطلب :- یہ مانا کہ عمر بہت تیزی کے ساتھ گذرتی چلی جاتی ہے یا عمر بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ مدّتِ زندگی بہت قلیل ہے۔ مگر اتنی مہلت ضرور مل سکتی ہے کہ دل کو خون کر کے یعنی کسی کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر کے مقصدِ حیات حاصل کر لیا جائے۔

بنیادی تصور :- مشورۂ ورزیدنِ عشق۔

(۷) ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں ؎ نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

مطلب :- خواہ عشق میں کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ پڑیں ہم شیوۂ وفا ترک نہیں کریں گے۔

بنیادی تصور :- استواریٔ راہِ عشق۔

(۸) کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ؎ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

مطلب :- اے ظالم آسمان اگر تو اور کچھ نہیں دے سکتا تو کم از کم مجھے آہ و فریاد کی اجازت ہی دے دے۔ اس میں تو تیری گرہ سے کچھ نہیں جائے گا۔

بنیادی تصور :- طنز بر جورِ فلک۔

(۹) ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ؎ بے نیازی تری عادت ہی سہی

مطلب :- چونکہ تجھ میں شانِ بے نیازی کارفرما ہے اور ہمیں تجھ سے نباہ کرنا ہے۔ اس لیے ہم بدرجہ مجبوری اپنے اندر شیوۂ تسلیم و رضا پیدا کریں گے۔

بنیادی تصور :- تدبیرِ دوامِ ربط۔

(۱۰) یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ ؎ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

مطلب :- یہاں حسرت سے اظہارِ حسرتِ وصل مراد ہے تاکہ چھیڑ کا پہلو پیدا ہو سکے کہتے ہیں کہ اگر وہ وصل پر راضی نہیں ہیں تو ان سے حسرتِ وصل ہی کا اظہار کرتے رہو تاکہ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ تو قائم رہے۔ پہلے مصرع کی بندش بیتی

لطفِ زبان اور اندازِ بیان دونوں باتیں قابلِ داد ہیں۔

بنیادی تصور :۔ تدبیرِ لطفِ زیست۔

(۱۵۰)

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
(۱) صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

آرمیدگی بمعنی راحت طلبی + نکوہش بمعنی سرزنش + خندۂ صبح مشہور استعارہ ہے۔

مطلب :۔ آرام طلبی کی وجہ سے میں بلاشبہ ملامت کا مستحق ہوں۔ یہی وجہ ہے صبحِ وطن بھی ازراہِ طنز مجھ پر ہنس رہی ہے، کیونکہ مجھے تو پردیس میں ہونا چاہیے تھا۔

بنیادی تصور :۔ نکوہشِ صبحِ وطن۔

نوٹ :۔ غالب نے یہ شعر محض خندۂ دنداں نما کی خاطر کہا ہے ۱۲

ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
(۲) جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مطلب :۔ میرا دل ایسے مطرب کا نغمہ سننے کو چاہتا ہے جس کی آواز میں اس قدر سوز و گداز ہو کہ اس کی تاثیر سے فنا فی الذات ہو جاؤں۔

بنیادی تصور :۔ آرزوئے فنا۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
(۳) تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

مطلب :۔ میں اپنے محبوب کا تصور عالمِ ہستی میں اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کے تصور میں اس طرح مستغرق ہو جاؤں کہ پھر کبھی ہوش میں نہ آؤں۔

بنیادی تصور :۔ آرزوئے محویتِ کاملہ۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
(۴) آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

مطلب :۔ میں تو نکہتِ گل کو بے حجاب سمجھتا تھا اور اس لیے اس پر طعن کیا کرتا تھا لیکن جب سے باغ میں تیری بے حجابیوں کے مناظر دیکھے ہیں اس وقت سے بوئے گل سے سخت شرمندہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ تو نکہت گل سے بھی زیادہ بے حجاب نکلا۔

بنیادی تصور :۔ طنز بر بے حجابیٔ معشوق۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
(۵) شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مطلب :۔ چونکہ میں نے ان اشعار کا انتخاب کیا جن میں معاملاتِ عشق کا بیان تھا۔ اس لیے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں ضرور کسی پر عاشق ہوں۔

بنیادی تصور :۔ وجہ افشائے راز۔

---

(۱۵۱)

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
(۱) ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس شکل سے یعنی اس بری طرح سے۔

مطلب :۔ جب ہماری زندگی اس قدر غموں اور مصیبتوں میں کٹی کہ ساری عمر کوئی تمنا پوری نہ ہوئی تو پھر ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔ دوسرے مصرع کی بندش انتہائی دلکش اور قابلِ تحسین ہے۔ اس کی روانی سلاست اور

صفائی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کی نثر نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور:۔ گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

---

(۱۵۲)

(۱) اِس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

مطلب:۔ اس کی محفل میں بے حیا (بے غیرت) بنا ہوا بیٹھا رہا، اگرچہ رقیب مجھ پر فقرے بھی چست کرتے رہے اور آپس میں اشارے بھی کرتے رہے!

بنیادی تصور:۔ مجبوریٔ محبت۔

(۲) دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

مطلب:۔ بھلا میں اور تیرے در سے سوال کئے بغیر چلا جاتا! ہرگز نہیں! مگر کیا کروں؟ تیرے دربان نے مجھے بہت سرزنش کی اس لیے میں لب نہ ہلا سکا۔

بنیادی تصور:۔ عذرِ خاموشی۔

(۳) رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

مطلب:۔ چونکہ ایک مدت سے موسم بہار کی دعوت نہیں کی ہے (موسمِ بہار میں شراب نہیں پی ہے) اس لیے اس کوشش میں ہوں کہ کوئی میفروش خرقہ اور جانماز رہن رکھ کر چند بوتلیں شراب کی مجھے دیدے! لیکن افسوس کہ کوئی میفروش اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ گدڑی اور جانماز بغل میں

دبائے مارا مارا پھر رہا ہوں!

بنیادی تصور:۔ تضحیک خرقہ وسجادہ۔

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر
(۴) حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

مطلب:۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کو کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ ملے، وہ تعلقات دنیوی میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اپنی عمر کو بے کار دبے صرفہ ضائع کر دیتا ہے چنانچہ خضر بھی قیامت کے دن یہی کہیں گے کہ افسوس ہم نے اپنی عاقبت کے لیے کچھ کمائی نہیں کی۔

بنیادی تصور:۔ اضاعت عمر عزیز۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
(۵) تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے؟

"مقدور ہو تو" یعنی اگر خاک میں گویائی کی قوت ہوتی + لئیم بمعنی بخیل + گنجہائے گراں مایہ کنایہ ہے ان نامور افراد سے جو زیر زمین مدفون کئے گئے۔

مطلب:۔ اگر زمین میں سننے اور جواب دینے کی صلاحیت ہوتی تو میں اس سے دریافت کرتا کہ تو نے ان نامور افراد کو، جو تیرے اندر دفن کئے گئے کہاں غائب کر دیا؟ وہ سب کہاں چلے گئے؟

دراصل غالب نے یہ موثر انداز بیان اس حقیقت کے اظہار کیلئے اختیار کیا ہے کہ انسانی زندگی کا انجام فنا ہے۔ دارا ہو یا سکندر، اور رستم ہو یا سہراب سب خاک میں مل کر خاک ہو گئے۔ آج نام کے سوا اور کچھ باقی نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ بس نامور کہ زیر زمیں دفن کردہ اند
خاکش چناں بخورد کزو استخواں نماند

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے!

مطلب:- سر پہ آرے چلنا کنایہ ہے نزول مظالم و مصائب شدیدہ سے + اس شعر کے دونوں مصرعے بہت برجستہ اور زبان کے لحاظ سے بہت دلکش ہیں چونکہ ہر مصرع میں ایک محاورہ صرف ہوا ہے اس لیے مفہوم میں بڑی بلاغت پیدا ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دشمنوں نے ہر روز مجھ پر تہمتیں تراشیں اور رقیبوں نے مجھ پر نت نئے مظالم کئے۔

بنیادی تصور:- آفاتِ عاشقی۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
(۷) دینے لگا ہے بوسہ، بغیر التجا کئے

مطلب:- شعر کا مضمون بہت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں معشوق کی عادت یہ تھی کہ وہ گھنٹوں منت سماجت کے بعد ایک آدھ بوسہ دیا کرتا تھا مگر اب حالت یہ ہے کہ

ع "ہونٹ خود اس کے یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بُری عادت اسے رقیب کی صحبت میں رہنے سے پڑی۔ مزید تشریح خلافِ تہذیب ہے۔

بنیادی تصور:- مذمتِ صحبتِ رقیب۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
(۸) بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

مطلب:- معشوق کی فطرت بہت اچھی ہے، بس کوئی عیب ہے تو یہ کہ ضدی ہے چنانچہ بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے ہیں۔ اگر وہ بدفطرت

ہوتا تو بھولے سے بھی کوئی وعدہ وفا نہ کرتا۔

بنیادی تصور:۔ خوشخوئی محبوب۔

غالب تمہی کہو کہ ملے گا جواب کیا
(۹) مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سُنا کئے

مطلب:۔ ہم نے مانا کہ تم نے ان کے پاس جاکر حال دل سنایا اور انہوں نے سن لیا تو بھی اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اول تو وہ تمہاری بات کا کوئی جواب نہیں دیں گے اور اگر دیا بھی تو صاف انکار کر دیں گے، اس لیے جانا فضول ہے۔

بنیادی تصور:۔ کج ادائی محبوب۔

---

(۱۵۳)

رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے
(۱) اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مطلب:۔ انسان کی تمام عمر ایک اضطرابی کیفیت میں بسر ہو جاتی ہے۔ اس کی سرعتِ رفتار کا اندازہ مقصود ہو تو یوں سمجھو کہ عمر کا ایک سال گویا ایک چشمکِ برق کے برابر ہے۔ یعنی انسان کی عمر اگر سَو سال کی ہو جائے تو بھی مرتے وقت اس کو یہی محسوس ہوگا کہ میں سو لمحات یا چند ساعتوں سے زیادہ اس دُنیا میں نہیں رہا۔

بنیادی تصور:۔ گریز پائی عمر۔

مینائے مے ہے سرو، نشاطِ بہار سے
(۲) بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے

مطلب :۔ موسم بہار میں مستی کا یہ عالم ہے کہ میخواروں کو شراب، کی بوتل پر سرو کا دھوکا ہوتا ہے اور موج شراب، بال تدرو نظر آتی ہے۔ شراب کی بوتل کو سرو سے اور موج شراب کو چکور کے پر سے تشبیہ دی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ عالم سرخوشی۔

زخمی ہوا ہے پاشنہ، پائے ثبات کا
(۳) نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے،

پاشنہ بمعنی ایڑی۔ گوں بمعنی طاقت یا ہمت۔

مطلب :۔ راہِ عاشقی کی صعوبت کا بیان مقصود ہے کہ پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہو گئی ہے یعنی دامنِ صبر و استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ ع نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔

بنیادی تصور :۔ صعوبتِ راہ عاشقی۔

جاداد بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
(۴) غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

جاداد بمعنی جائیداد یا جاگیر + شش جہت کنایہ ہے گیتی (دنیا) سے۔ جاداد (جائیداد) کنایہ ہے سرمایہ یا وسیلۂ حصول مدعا سے + خراب بمعنی محلِ خرابی کنایہ ہے میخانہ سے جو تباہ کنِ عقل و خرد سمجھا جاتا ہے + رنداں کنایہ ہے اہل باطن سے۔

مطلب :۔ اس دنیا کو تباہ کنِ عقل و خرد سمجھنا نادانی ہے، یہ تو ہر جہت سے (ہر اعتبار سے) رندوں (اہل معرفت) کی شراب نوشی (حصول معرفت) کا ذریعہ ہے۔

بنیادی تصور:- دنیا، ذریعۂ حصولِ معرفت ہے۔

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
(۵)
جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

برقِ حسن کنایہ ہے ذاتِ باری سے + جوشِ بہار کنایہ ہے ظہورِ عالم سے۔

مطلب:- انسان کی آنکھ خدا کا دیدار نہیں کر سکتی کیونکہ یہ عالم، ذاتِ باری کے جلووں کے لیے بمنزلۂ نقاب ہے۔ جس طرح نقاب چہرے کو چھپا لیتی ہے اسی طرح مظاہرِ کائنات نے ذات کو نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا ہے۔ انسان جب دیکھے گا، مظاہر (اجسامِ مادی) ہی کو دیکھے گا۔

بنیادی تصور:- خفائے ذات در نقابِ کائنات۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
(۶)
مانا کہ تیرے رخ سے نگاہ کامیاب ہے

تسلی کو کیا کروں یعنی دل کی تسلی کے لیے کیا تدبیر کروں۔

مطلب:- یہ مانا کہ میری آنکھیں تجھے دیکھ رہی ہیں مگر محض دیدار سے، میرے دلِ ناشاد کو تسلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ تو ہم آغوشی کا طالب ہے۔

بنیادی تصور:- تمنائے ہم آغوشی۔

گذرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے
(۷)
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

مطلب:- مجھے پیغامِ یار سے کوئی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے قاصد کی خوش نصیبی پر رشک آرہا ہے کہ اسے محبوب سے گفتگو کا موقع مل گیا۔

بنیادی تصور:- رشکِ ہمکلامیٔ محبوب۔

(۱۵۴)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
(۱) میں اسے دیکھوں! بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

دیکھنا قسمت یعنی کس قدر بدقسمت ہوں + کب مجھ سے دیکھا جائے ہے یعنی میں گوارا نہیں کر سکتا۔

مطلب:۔ میری بدقسمتی کا کیا ٹھکانا ہے کہ جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے اپنے ہی اوپر رشک آگیا۔ چونکہ یہ بات مجھے گوارا نہ ہو سکی کہ میں اسے دیکھوں اس لیے میں دیدار سے محروم رہ گیا۔

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ رشک۔

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
(۲) آبگینہ، تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یعنی دل کی بربادی یقینی ہے + اندیشہ بمعنی بلندی خیال آبگینہ کنایہ ہے دل سے + تندی صہبا کنایہ ہے گرمیٔ اندیشہ سے۔ پگھلا جائے ہے یعنی فنا ہوا جاتا ہے۔

مطلب:۔ اگر میری گرمیٔ خیال کا یہی عالم رہا تو دل اسی طرح پانی ہو کر بہہ جائے گا جس طرح شراب کی تیزی سے مینائے شراب پگھل جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ تباہ کاریٔ گرمیٔ اندیشہ۔

غیر کو یارب وہ کیوں کر منع گستاخی کرے
(۳) گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "یہ شعر معاملہ کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گذرتا ہے، دوسرے مصرع میں بڑی شاعرانہ نزاکت پائی جاتی ہے۔ ظاہر

ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا در حقیقت ایک ہی چیز ہے پھر اس کے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے، بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور ہے، حیا اگر ایک بات سے پیدا ہے تو شرم دوسری بات سے پیدا ہوتی ہے یعنی حیا تو غزلی گستاخی سے آتی ہے اور شرم اس کے ساتھ تکرار کرنے سے آتی ہے۔ (اندریں حالات وہ اسے گستاخی سے منع نہیں کر سکتا)۔ (یادگار غالب صفحہ ۱۴۰)

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ شرم و حیا۔

(۴)
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائیے ہے

مطلب:۔ عشق کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں ہر دم یعنی ہر گھڑی نالہ کھینچوں لیکن دل کی حالت یہ ہے کہ بوجہ نقاہت اسے سانس لینی بھی دشوار ہے۔

بنیادی تصور:۔ عالم کشمکش باطنی۔

نوٹ:۔ جیسا کہ قبل ازیں واضح کر چکا ہوں غالب کو ایہام اور رعایتِ لفظی اور ضلع جگت کا استعمال بہت مرغوب ہے حتیٰ کہ وہ اس کی خاطر سنجیدگی کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ مثلاً پہلے مصرع میں ---ت کی جگہ لفظِ ضد لا سکتے تھے مگر انہوں نے لفظ "لت" محض "حالت" کی خاطر استعمال کیا ہے حالانکہ اس لفظ "لت" میں ذم کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ لت، بری عادت کو کہتے ہیں۔

(۵)
دورِ چشم بد، تری بزم طرب سے واہ وا
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائیے ہے

مطلب:۔ خدا تیری بزم طرب کو نظر بد سے محفوظ رکھے کیونکہ تیری بزم

میں مسرت وطرب کا یہ عالم ہے کہ اگر میرا نالہ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے تو نغمہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بظاہر محبوب کی بزم طرب کی مدح کی ہے مگر در پردہ اس کی سنگدلی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تو میرا نالہ سن کر خوش ہوتا ہے

بنیادی تصور:۔ طعن بر سنگ دلی محبوب۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
(۶) پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

کھوئے جاتے ہیں یعنی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں + وہ پا جائے ہے یعنی وہ ہمارے راز سے آگاہ ہو جاتا ہے + کھو جانا اور پا جانا دونوں محاورے ہیں اور ان میں صنعتِ تضاد پائی جاتی ہے۔

مطلب:۔ اگرچہ ہم اپنا رازِ عشق چھپانے کی خاطر اس کی محفل میں بیگانہ وشی اختیار کرتے ہیں مگر اس کو دیکھ کر ہم ایسے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ ہمارا راز اس پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مومن نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

شب بزمِ غیر میں جو وہ آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

بنیادی تصور:۔ عدمِ استطاعتِ اخفاءِ رازِ عشق۔

اس کی بزم آرائیاں سن کر، دلِ رنجور، یاں
(۷) مثلِ نقشِ مدعائے غیر، بیٹھا جائے ہے

بیٹھا جائے ہے میں ایہام ہے (ا) دل بیٹھا جائے ہے کنایہ ہے شدتِ ضعف اور مایوسی سے۔ (ب) نقش بیٹھا جائے ہے یعنی دل اثر پذیر ہو رہا ہے۔

مطلب:۔ اس کی بزمِ ناز میں رقیبوں کی باریابی اور ان کی عزت افزائی کا حال سن کر میرا دل اس طرح بیٹھا جاتا ہے جس طرح غیر کے مدعا کا

نقش اس کافر کے دل پر ثبت ہو گیا ہے (دل میں بیٹھ گیا ہے)
بنیادی تصور :- دل شکستگیٔ عاشقِ نامراد۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
(۸) رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نازک بن گیا یعنی حسین اور دلکش ہو گیا + رنگ کھلتا جائے ہے یعنی رنگ نکھرتا جاتا ہے۔ جتنا کہ اڑتا جائے ہے یعنی جتنا فق ہوتا جائے ہے (جس قدر زردی چھاتی جائے ہے) رنگ کھلنا اور رنگ اڑنا دونوں محاورے ہیں۔ اور قصداً لائے گئے ہیں (انہی کی خاطر یہ شعر کہا گیا ہے)۔

مطلب :- وہ پری رُخ عاشق ہو کر اور بھی دلکش اور حسین ہو گیا جس قدر اس کے چہرے پر زردی چھاتی جائے ہے اسی قدر اس کا رنگ نکھرتا جاتا ہے۔
بنیادی تصور :- عشقِ محبوب، خلافِ عادت، موجبِ افزائشِ حسن بن گیا۔

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
(۹) کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہے

نقش بمعنی تصویر + کھینچتا ہے یعنی اس کی تصویر کھینچتا ہے کھینچتا جائے ہے یعنی اس سے دور ہوتا جائے ہے۔

مطلب :- چونکہ محبوب خود سراپا ناز ہے۔ اس لئے یہ صفت اس کی تصویر میں بھی موجود ہے چنانچہ مصور جس قدر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہے اس قدر وہ اس سے دور ہوتی (کھنچتی) چلی جاتی ہے یعنی وہ کھینچنا چاہتا ہے لیکن وہ انکار کرتی ہے!

یہ شعر بھی کھینچنے اور کھنچنے کی خاطر موزوں کیا ہے۔
بنیادی تصور :- ناز آفرینیٔ نقش محبوب۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ!

(۱۰) پاس مجھ آتش بجاں کے، کس سے ٹھہرا جائے ہے

مطلب:۔ چونکہ میں آتش بجاں ہوں یعنی عشق کی آگ میں از سرتا پا جل رہا ہوں اس لئے کوئی انسان تو میری رفاقت کیا کرے گا، میرا سایہ بھی مجھ سے اس طرح گریزاں ہے جس طرح دھواں۔ آتش کی رعایت سے دھوئیں کی تشبیہ بہت برمحل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت غیر در کنار، انسان کا سایہ بھی اس سے جدا ہو جاتا ہے

بنیادی تصور:۔ شدّتِ آتشِ عشق۔

---

(۱۵۵)

گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے

(۱) تب اماں ہجر میں دی، بردِ لیالی نے مجھے

گرمِ فریاد رکھا یعنی میں ساری رات نالہ و فریاد کرتا رہا۔ شکلِ نہالی بمعنی وہ تصویر جو بستر یا قالین پر بنی ہوتی ہے، بردِ لیالی بمعنی راتوں کی ٹھنڈک، برد بمعنی برودت یا خنکی اور لیالی جمع ہے لیل کی اور لیل بمعنی رات۔

مطلب:۔ جب میں رات کے وقت سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو پلنگ کی چادر پر جو تصویر (کسی عورت کی) بنی ہوئی تھی اس کو دیکھ کر مجھے اپنی محبوبہ یاد آگئی اور میں نے کہا ہائے افسوس! یہ تصویر تو پہلو میں ہو اور وہ نہ ہو بس اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا اور میں ساری رات سرگرم آہ و فریاد رہا۔ اب آہ و فریاد کی بدولت میرے جسم ناتواں میں اس قدر گرمی پیدا ہو گئی کہ میں رات کی ٹھنڈک سے محفوظ رہا ورنہ ٹھنڈ کھا کے مر جاتا۔

حضرت نیاز فتحپوری فرماتے ہیں "تعبیر اور طرزِ بیان دونوں لغو ہیں"

("نگار" اپریل ۵۸ء ص ۲۷)

بنیادی تصور:۔ منتِ شکل نہاں بر گردن عاشق۔

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم!
(۱۲) لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

نسیہ بمعنی ادھار، دو عالم یعنی دنیا اور عقبیٰ (آخرت) نسیہ سے آخرت اور نقد سے دُنیا مراد ہے، حقیقت معلوم یعنی کوئی حقیقت یا قدر و قیمت نہیں ہے۔

مطلب:۔ چونکہ دُنیا اور عقبیٰ میں کوئی بھی مجد و شرف ذاتی کا خریدار نہیں ہے اس لیئے میری ہمت عالی نے میری شخصیت کی توہین گوارا نہ کی کہ دُنیا یا عقبیٰ مجھ جیسے گوہرِ بے بہا کو سستے داموں خرید لیتی، یہی وجہ ہے کہ میری ہمت عالی نے مجھ سے مجھے خود خرید لیا اور کسی ناقدرے کے ہاتھ میں پڑ جانے سے بچا لیا۔ اگرچہ مصرعِ ثانی کی ترکیب قدرے غیر مانوس ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اندازِ بیان نے مضمون کی بلندی کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ میری ذات دنیا اور عقبیٰ دونوں سے بلند تر اور بالاتر ہے (انسان کا رتبہ دونوں عالم سے ارفع ہے)

بنیادی تصور:۔ اثباتِ مجد و شرفِ انسانی۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
(۱۳) کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے!

کثرت آرائی وحدت بمعنی اہلِ وحدت کا کثرتِ موہوم کے طلسم میں گرفتار ہو جانا، یعنی ایک موحد کے لیئے کثرت کا تصور دراصل خیالی باتوں کی پرستش ہے با لفاظِ دگر، ماسوی اللہ (کثرت) کا تصور، مسلکِ توحید خالص کی رو سے کفر ہے۔

مطلب:۔ کثرت کو موجود سمجھنا گویا وہم کی پرستش کرنا ہے، ہر وہ شئی جسے ہم موجود سمجھتے ہیں، ایک صنم ہے جو تراشیدۂ خیال ہے اس لیئے اشیائے کائنات

دراصل اصنامِ خیالی ہیں، چونکہ شرک فی الوجود، بمضمونِ تعلیم صوفیہ، کفر ہے، اس لئے جو شخص اشیائے کائنات (کثرت) کو موجود سمجھتا ہے وہ کافر ہے۔

بنیادی تصور:۔ اثباتِ توحید حقیقی۔

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
(۴) عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

مطلب:۔ جبتک پر و بال سلامت تھے، پھولوں سے لطف اندوز ہونے کی آرزو ہر وقت مجھے بے چین رکھتی تھی لیکن جب صیاد نے محروم پر و بال کر کے قفس میں بند کر دیا تو "ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا" اس لئے میں اپنی حالت اسیری کو دعا دیتا ہوں کہ اس نے مجھے تمام آرزوؤں اور پریشانیوں سے نجات دے دی،

بنیادی تصور:۔ وجہ تسکین خاطر۔

غالبؔ نے اسی مضمون کو ایک جگہ یوں ادا کیا ہے۔

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

---

(۱۵۶)

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
(۱) برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے

مطلب:۔ غالبؔ لکھتے ہیں "داغ بساماں تسلی انجمن انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو۔ موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھیے کہ پھول، درخت یا غلہ جو کچھ پیدا

جاتا ہے دہقاں کو جوتنے، بونے اور پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و غبار ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو دست دکار میں گرم ہوا ہے وہی لالے کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ ماحصلِ کلام این کہ حاصلِ موجودیت داغ اور داغ، تکلف راحت اور صورتِ رنج ،،

بنیادی تصور۔ داغ سامانیٔ وجود بالزدم غم ہستی۔

غنچہ تا شگفتن ہا، برگ عافیت معلوم

(۲) باوجودِ دلجمعی، خواب گل پریشاں ہے

مطلب:۔ غالب کہتے ہیں،، کلی جب نئی نکلے، بصورتِ قلب صنوبری نظر آئے، اور جب تک پھول بنے، برگِ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی آرام۔ ملاحظہ ہو:۔

ع برگ عیشے بگورِ خویش فرست

برگ اور سرو برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خواب گل باعتبار خموشی و ماندگی پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہونا۔ بصورتِ دل جمع ہے، باوصفِ جمعیتِ دل، گل کو خواب پریشاں نصیب ہے یعنی جس طرح غنچے کا انجام پریشانی ہے اسی طرح ہر شخص بتلائے رنج و غم ہے۔

بنیادی تصور:۔ ہمہ گیریٔ غم۔

ہم سے رنج بے تابی کس طرح اٹھایا جائے!

(۳) داغ پشت دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

مطلب:۔ غالب لکھتے ہیں،، پشتِ دست، صورتِ عجز ہے اور خس بدنداں وکاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشتِ

دست زیں پر رکھدی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو!

قبلہ! ابتدائے فکر سخن میں بیدل، اسیر اور شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا:۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں! قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان میں رہنے دئے۔"

(منقول از خطوط غالب حصہ دوم ص ۲۸۴، ص ۲۸۵)

بنیادی تصور:۔ دشواریٔ تحملِ شدائدِ دنیوی۔

---

(۱۵۷)

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
(۱) ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

مطلب:۔ جوشِ وحشت میں غالب گھر سے نکل کر بیاباں میں چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں گھر ویران ہو گیا اور ہر طرف سبزہ نمودار ہو گیا۔ اس سبزے کو انھوں نے طنزاً بہار سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ بدقسمتی تو دیکھو ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔ شعر کی ساری دلکشی اسی طنز میں پوشیدہ ہے ویرانی کو بہار سے تعبیر کرنا بلاشبہ غالب کی جدتِ فکر کی بڑی دلکش مثال ہے۔

بنیادی تصور:۔ طنز بر ویرانیٔ مسکنِ خویش۔

(۱۵۸)

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے
(۱) بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

مطلب:۔ اس کے بھولے پن کی ادا پر اپنی جان قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے مگر دشواری یہ ہے کہ جب اس بات کا ارادہ کرتا ہوں کہ اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں تو وہ خود میرے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ "پھر" سے ظاہر ہوتا ہے کہ عاشق کو اس کارِ خیر میں کئی مرتبہ ناکامی ہو چکی ہے۔ اس لئے مایوس ہو کر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کی سادگی پر سر مٹنے کو جی چاہتا ہے مگر افسوس کہ بس نہیں چلتا۔

بنیادی تصوّر:۔ حسرتِ نذرِ جانِ ناتواں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا !!
(۲) میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "کسی کے حُسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔"
(یادگارِ غالب ص۱۱۳)

یعنی سننے والا بے اختیار یہ کہہ اٹھے کہ ع
چھین لی گویا میرے منہ کی بات

بنیادی تصوّر:۔ حسنِ تقریرِ محبوب۔

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
(۳) ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

مطلب :۔ شعر بالکل صاف ہے خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ کیسے دلکش انداز سے اپنے ذکر کو اپنی ذات سے بہتر ثابت کیا ہے کہ شعر پڑھ کر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ اس انداز بیان ہی کی بدولت یہ شعر ضرب المثل ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور :۔ ترجیح ذکرِ خویش بر ذاتِ خویش

بس ہجوم نا امیدی! خاک میں مل جائے گی
(۴) یہ جو اک لذت ہماری سعئ بے حاصل میں ہے

مطلب :۔ چونکہ نا امیدی کا لازمی نتیجہ ترک سعئ ہوتا ہے اور عاشق کو سعئ وصال میں اگرچہ وہ بے حاصل ہی کیوں نہ ہو۔ یقیناً ایک لذت محسوس ہوتی ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ اے جذبۂ یاس! مجھ سے دور ہو جا! کیونکہ اگر تو میرے دل پر غالب آگیا تو میں وصال کی کوشش سے باز آجاؤں گا (ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں گا) اور لذتِ سعی سے (اگرچہ وہ بے حاصل ہے) محروم ہو جاؤنگا بہت عمدہ شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور :۔ تلقین سعئ پیہم۔

رنج رہ کیوں کھینچئے، واماندگی کو عشق ہے
(۵) اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم، منزل میں ہے

حضرت اثر لکھنوی لکھتے ہیں :۔ عشق ہے "یہ اردو کا ایک متروک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں آفریں یا مرحبا۔ چنانچہ میر کہتے ہیں :۔

اک دم میں تو نے پھونک دیا دو جہاں کے تئیں
اے عشق! تیرے آگ لگانے کو عشق ہے

عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن!!
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

بریں تقدیر شعر کی نثر یوں ہوگی:۔

"ہم رنج راہ کیوں کھینچیں؟ واماندگی کو آفریں ہے۔ اسی لئے ہمارا جو قدم اٹھ نہیں سکتا (وہ درحقیقت) منزل میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ واماندگی کو آفریں ہے کہ اس نے زحمتِ رہ نوردی سے بچا لیا۔ لہٰذا اس طرح مجبور اور شل ہو کر جب منزل سے دور بیٹھ گئے تو ہمارا جو قدم اٹھ نہیں سکتا وہ درحقیقت منزل میں ہے کیونکہ منزل کی طرف گامزن نہ ہونے کی وجہ پست ہمتی نہیں بلکہ واماندگی ہے۔ شوقِ منزل بدستور ہے مگر کیا کریں پاؤں جواب دے گئے اس لئے منزل تک رسائی کی طاقت نہ رہی۔ اسی مضمون کو غالب نے یوں بیان کیا ہے:۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

(مطالعہ کلام غالب ص۵۵)

بنیادی تصور:۔ تحسین واماندگی۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی!
(۶) فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

مطلب:۔ محبوب نے غالب کو طعنہ دیا کہ ایسے دل کی میری نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جو "جلوہ زارِ آتشِ دوزخ" بنا ہوا ہے؛ غالب نے ترکی بترکی جواب دیا کہ چلو مان لیا کہ ہمارا دل آتشِ دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ فتنۂ شورِ قیامت سے کس کا خمیر تیار ہوا ہے؟ میرا یا تمہارا! مقصود یہ ہے کہ اگر میرا دل نمونہ آتشِ دوزخ ہے تو تم بھی تو فتنۂ شورِ قیامت سے کم نہیں ہو!

بنیادی تصور :۔ معارضہ با محبوب نکتہ چیں۔

نوٹ :۔ محبوب سے کٹا چھنی اور نوک جھوک، غالبؔ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ اس رنگ میں فارسی کا ایک شعر درج کرتا ہوں جو اردو کے شعر سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے:۔

بے خود بوقت ذبح تپیدن، گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہِ کیست

ہے دل شوریدۂ غالبؔ، طلسم پیچ و تاب
(۷) رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

مطلب :۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ میرا دل شوریدہ، طلسم پیچ و تاب ہے یعنی اس میں پیچ و تاب بھرا ہوا ہے اور تیری تمنا اس میں پھنسی ہوئی ہے۔ مجھ پہ تجھے رحم نہیں آتا تو کم از کم اپنی تمنا پر تو رحم کر یعنی اسے اس پیچ و تاب سے رہائی عطا کر! خوبی اس شعر کی اس کے اسلوب بیان میں پوشیدہ ہے کہ اپنی تمنا کو محبوب کی تمنا قرار دیا ہے تاکہ اسے رحم کی ترغیب دے سکیں۔ جب وہ اپنی تمنا کو پیچ و تاب سے نکالے گا تو در اصل غالب کی تمنا بر آئے گی۔

بنیادی تصور :۔ بیانِ قدر و قیمت مدعا۔

---

(۱۵۹)

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
(۱) دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

رضامند کر گئی یعنی دونوں کی آرزو پوری کر دی (دونوں زخمی ہو گئے)

مطلب :۔ بات صرف اتنی ہے کہ دل اور جگر دونوں زخمی ہونے کے آرزومند

تھے۔ خدا بھلا کرے تیرے تیر نگاہ کا کہ اس نے بیک وقت دونوں کو تڑپا دیا یعنی تو نے ایک نگاہ ناز سے دونوں کو اپنا فریفتہ بنا لیا۔ شعر کی دلکشی اس کے انداز بیان میں مضمر ہے کہ دل و جگر کے زخمی ہو جانے کو رضامند ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تحسین ناوکِ نگاہ۔

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراق
(۲) تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

مطلب:۔ اس شعر کا لطف بھی اس کے اندازِ بیان ہی میں پوشیدہ ہے، کمالِ فن یہی تو ہے کہ معمولی بات کو بھی اس انداز سے بیان کیا جائے کہ شعر سن کر وجد طاری ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ اس کی نگاہِ ناز نے جگر کو زخمی کر دیا تھا اور مجھے اس زخم کو پوشیدہ رکھنے میں بڑی زحمت کا سامنا تھا لیکن شدتِ فراق سے میرا سینہ شق ہو گیا اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے پردہ داری کی زحمت سے نجات مل گئی۔

بنیادی تصور:۔ تحسین لذتِ فراق۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
(۳) اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی۔

بادۂ شبانہ کی سرمستی کنایہ ہے عہدِ جوانی یا دورِ شباب سے۔ لذتِ خوابِ سحر کنایہ ہے زمانۂ عیش و عشرت سے۔ اٹھیے کنایہ ہے خوابِ غفلت سے بیدار ہو جانے سے۔

مطلب:۔ غالب اپنے نفس سے خطاب کرتے ہیں کہ وہ عہدِ جوانی جب تم رات بھر مے نوشی کیا کرتے تھے اور دادِ عیش دیا کرتے تھے ختم ہو گیا۔ اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ!

بنیادی تصور:۔ تبدیۂ نفس۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری، کوئے یار میں
(۴) بارے اب اے ہوا، ہوس وبال و پر گئی

مطلب:۔ جب تک زندہ رہا مجھے یہ آرزو ستاتی رہی کہ کسی طرح پَر لگ جائیں تو اڑ کر کوئے یار میں پہنچ جاؤں۔ لیکن مرنے کے بعد ہوا نے میری خاک کو اڑا کر کوئے یار تک پہنچا دیا۔ لہٰذا ہوا کا ممنونِ احسان ہوں کہ اس نے میری یہ آرزو پوری کر دی۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ جذبۂ امتنان۔

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
(۵) موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

گل کترنا محاورہ ہے بمعنی شگوفہ چھوڑنا یعنی ایسی بات کرنا جس سے فتنہ و فساد رونما ہو جائے اور خود گل کترنے والا اس سے بے تعلق رہے ہے۔ موجِ خرامِ یار کی ترکیب بغایت دلکش ہے۔ خرام کو موج سے تشبیہ دی ہے اور وجہ شبہ حرکت ہے۔

مطلب:۔ معشوق کے خرامِ ناز نے اچھا شگوفہ چھوڑا! یعنی اس کے پاؤں کے نقوش میں اس درجہ دلفریبی کی شان پیدا کر دی (یہی گل کترنا ہے) کہ جب عشاق نے وہ نقوشِ قدم دیکھے تو آپس میں سر پھٹول ہو گئی وہ اس طرح کہ ہر عاشق دوسروں سے یہ کہتا تھا کہ میرے سوا اور کوئی اس نقشِ پا کو آنکھوں سے نہیں لگا سکتا۔

بنیادی تصور:۔ دلفریبیٔ نقشِ پائے محبوب۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
(۶) اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مطلب :۔ یہ شعر اپنی دلکشی کی وجہ سے ضرب المثل ہو گیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ چونکہ آج کل ہر شخص حسن پرست بن گیا ہے اس لئے سچے عاشقوں کی (جو اہلِ نظر ہیں) قدر و منزلت باقی نہیں رہی۔

بنیادی تصور :۔ مذمتِ اربابِ ہوس۔

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
(۷) مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

مطلب :۔ یہ شعر اپنی طرفگیٔ ادا اور ندرتِ مضمون کے لحاظ سے بیت الغزل ہے کہتے ہیں کہ جب بڑی منت و سماجت کے بعد محبوب نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھائی تو ہوا یہ کہ ہر شخص کی نگاہ اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کر مست و بیخود ہو گئی یعنی چہرے پر جم کر رہ گئی نتیجہ اس کا یہ ہو کر نگاہیں نقابِ رُخ بن گئیں یعنی نقاب اٹھ جانے کے بعد بھی کوئی اسے نہ دیکھ سکا۔ خلاصۂ کلام ایں کہ عشاق تجھے دیکھ کر ایسے بیخود ہوئے کہ لذتِ دیدار سے محروم رہ گئے۔

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ حسنِ محبوب

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
(۸) کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

فردا بمعنی آنے والا دن۔ دی بمعنی گذرا ہوا دن۔

مطلب :۔ حالی لکھتے ہیں تمہارے جاتے ہی ، خودرفتگی اور خود فراموشی کے سبب سے ہماری یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی ، اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی اور مستقبل دونوں زمانۂ حال میں مبدل ہو جائیں گے۔ بس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ واضح ہو کہ قیامت گذر گئی کے دو معنی ہیں (۱) نہایت سختی کا زمانہ گذرنا (۲) خود قیامت

کا آجانا، اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں"۔ (یادگار غالب صہ ۱۴۱)

بنیادی تصور:۔ اظہارِ اذیتِ فراق۔

(۹)
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں؟ وہ جوانی کدھر گئی؟

مطلب:۔ اگرچہ اس شعر میں غالب نے آپ بیتی نظم کی ہے مگر یہ مضمون کم و بیش ہر شخص کی زندگی پر صادق آسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ زمانے کا وار ہر شخص پر چل جاتا ہے یعنی عالم پیری میں نہ جوانی باقی رہتی ہے نہ جوانی کے ولولے

بنیادی تصور:۔ تباہ کاریٔ دہر۔

---

(۱۶۰)

(۱)
تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تیری صورت مگر ملے

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ یہ تو ہے کہ جنت میں تیرے بغیر ہمیں تسکین قلب نصیب نہیں ہو سکتی، لیکن اگر وہاں ہمارے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان مہیا ہو سکے تو شاید ہم تسکینِ قلب سے محرومی پر صبر کر سکیں یعنی اتنا تو ہو کہ حورانِ خلد تیری ہم شکل ہوں مگر افسوس ہے کہ سیرت در کنار صورت کے اعتبار سے بھی کوئی حور تیری ہمسر نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ بیان عدیم المثالیٔ محبوب۔

(۲)
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعد قتل!
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

مطلب:۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ قتل کرنے کے بعد مجھے اپنی گلی میں دفن

مت کہیو۔ کیونکہ میں اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ میری قبر کی وجہ سے لوگوں کو تیرے گھر کا پتہ معلوم ہو جائے اور وہ باسانی تجھ تک پہنچ سکیں۔ خوبی اس شعر کی یہ ہے کہ غالب نے رشک کے مضمون میں جدت طرازی کی ہے یعنی مرنے کے بعد بھی جذبۂ رشک برقرار ہے

بنیادی تصور :۔ بیانِ شدتِ رشک۔

نوٹ :۔ اس قافیہ میں مومن اور آباد نے بھی قابل داد شعر نکالے ہیں۔ مومن کہتے ہیں :۔

رہنے دے اے تصور جاناں، نہ کر خیال
ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے دشمن کے گھر لے

آباد کہتے ہیں :۔

آباد مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گیا!
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر لے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم!
(۳) ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

مطلب :۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ تھوڑی بہت شراب تو ہم ہر شب کو اپنے گھر بھی پی لیا کرتے ہیں۔ آج تم ساقی ہو اس لئے اگر ہماری خاطر منظور نہیں ہے تو کچھ اپنی ساقی گری ہی کی لاج رکھو۔ اگر ناپ تول کے پلاؤ گے تو ہم رنداں بلانوش تمہیں کیا یاد کریں گے۔

بنیادی تصور :۔ ترغیب عطائے بے حساب۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
(۴) میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

مطلب :۔ اس شعر کا مطلب غالبؔ نے یہ بیان کیا ہے کہ "یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے یعنی عاشق کو ایک قاصد کی ضرورت ہو گئی۔ مگر کھٹکا یہ ہے کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے۔ بہر حال اس عاشق کا ایک دوست ایک شخص کو لایا اور عاشق سے کہا کہ یہ شخص دمعدار اور معتمد علیہ (قابل اعتماد) ہے۔ میں ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہیں کرے گا، کہ تمہارے معشوق پر خود عاشق ہو جائے۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا مگر عاشق کا گمان سچ نکلا، قاصد معشوق کو دیکھ کر وآلہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، اور کیسا جواب، دیوانہ پن، کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہی ہے اس لئے اے ندیم! تجھ سے تو کچھ شکایت نہیں لیکن اگر وہ قاصد تجھے کہیں مل جائے تو اس کو میرا اسلام کہیو کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر کے گئے تھے۔ اور انجام کار کیا ہوا!"

بنیادی تصور:۔ صحتِ گمانِ عاشق۔

تجھ کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
(۵) فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

مطلب :۔ اگر ہمیں غمِ پنہاں کی کشمکش سے فرصت نصیب ہو جائے تو ہم بھی وہ سب کام کر کے دکھا سکتے ہیں جو مجنوں نے لیلیٰ کی محبت میں کئے مثلاً صحرا نوردی محویت آہ شعلہ بار، منت قاصد، ترکِ خواب و خورش، دار فتگی، سر گشتگی وغیرہ۔

بنیادی تصور:۔ ادعائے ہمسریٔ مجنوں۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
(۶) مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

مطلب:- ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خضر ایک بزرگ آدمی ہیں جو حسن اتفاق سے ہمارے ہم سفر ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان کو اپنا رہنما یا پیشوا مان لیں۔ ہمارا رتبہ ان سے کم تو نہیں ہے۔

بنیادی تصور:- ادعائے ہمسری خضر۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا
(۷) تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

مطلب:- شاعر، کوچۂ معشوق میں رہنے والوں سے کہتا ہے کہ اگر تمہیں، غالبِ آشفتہ سر کہیں مل جائے تو اس کا خیال رکھنا یا اس سے اظہارِ ہمدردی کرنا۔

بنیادی تصور:- ماتمِ بدنصیبیٔ عاشق۔

---

(۱۶۱)

(۱) کوئی دن گر زندگانی اور ہے ٭ ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

مطلب:- غالب لکھتے ہیں کہ "اس شعر میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا؟ مبہم انداز میں کہتا ہے کہ کچھ کروں گا۔ خدا جانے نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔" (خطوطِ غالب جلد دوم صـ ۲۷۵)

بنیادی تصور:- عزم بالجزم عاشق۔

(۲) آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ٭ سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

مطلب:- جو گرمی، غمِ عشق کی سوزش میں ہے وہ آتشِ دوزخ میں بھی نہیں

بنیادی تصور:- شدتِ سوزِ غم۔

(۳) بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں ٭ پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

مطلب :- یوں تو وہ بارہا ہم سے ناراض ہو چکے ہیں مگر اس مرتبہ بہت زیادہ کشیدہ خاطر معلوم ہوتے ہیں۔

بنیادی تصور :- وفورِ بدگمانی۔

(۴) دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر ٭ کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

مطلب :- شعر میں محاکات کا لطف پایا جاتا ہے۔ قاصد نے خط تو دے دیا ہے مگر خاموش کھڑا منہ دیکھ رہا ہے کہ یہ زبانی پیغام سناؤں یا نہ سناؤں! اور اگر سناؤں تو کن لفظوں میں!

بنیادی تصور :- حالتِ تذبذبِ قاصد۔

(۵) قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم ٭ وہ بلائے آسمانی اور ہے

قاطعِ اعمار یعنی عمروں کے قطع یا ختم کرنے والے۔ اعمار جمع ہے عمر کی۔ بلائے آسمانی کنایہ ہے معشوق سے۔

مطلب :- اگرچہ اکثر ستارے بھی بہت منحوس ہوتے ہیں کہ جب وہ انسانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں تو ان کی عمروں کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ مگر میرا محبوب ان تباہ کن ستاروں سے بھی زیادہ تباہ و برباد کرنے والا اور جان لیوا ہے۔

بنیادی تصور :- ہلاکت آفرینیٔ محبوب۔

(۶) ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ٭ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مطلب :- اے غالبؔ! ہماری تقدیر میں جس قدر بلائیں لکھی ہوئی تھیں وہ تو سب ہم پر وارد ہو چکی ہیں (ساری عمر مصیبتوں میں بسر ہوئی ہے) بس اک مرگِ ناگہانی اور رہ گئی ہے۔ واضح ہو کہ مرگِ ناگہانی موت کی سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت ہے کیونکہ اس میں انسان نہ اپنی کہہ سکتا ہے نہ دوسرے کی سن سکتا ہے۔

بنیادی تصور :- تسلسلِ اذیتِ ہستی۔

---

(۱) کوئی امید بر نہیں آتی ٭ کوئی صورت نظر نہیں آتی

مطلب :۔ عاشقانہ زندگی کا نقشہ کھینچا ہے کہ نہ تو عاشقوں کی کوئی آرزو پوری ہوتی ہے اور نہ آرزو پوری ہونے کی کوئی صورت نظر آتی ہے یعنی عشق میں ناکامی ہی ناکامی ہے۔

بنیادی تصور :۔ بیان مایوسیٔ عشق۔

(۲) موت کا ایک دن معین ہے ٭ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مطلب :۔ موت تو اس لیے نہیں آئی کہ وقت سے پہلے آ نہیں سکتی لیکن نیند کا تو موت کی طرح، کوئی وقت مقرر اور معین نہیں ہے پھر وہ کیوں نہیں آتی؟

بنیادی تصور :۔ شکایت بے خوابی۔

(۳) آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ٭ اب کسی بات پر نہیں آتی

مطلب :۔ حسن بندش، حسن ادا اور معنویت (جذبہ اور تخیل کی آمیزش) کے اعتبار سے بے مثل شعر کہا ہے بقول نظم طباطبائی "یہ وہ شعر ہے کہ میر کو بھی جس پر رشک کرنا چاہیے"۔

کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے تک میں اپنے حال زار پر ہنس لیا کرتا تھا یعنی متاسف ہو جایا کرتا تھا لیکن اب میری افسردگی اور مایوسی اور شکستگیٔ خاطر کا یہ عالم ہے کہ اپنے حالِ زار پر ہنسی کیا معنی؟ دنیا کی کسی بات پر ہنسی نہیں آتی۔

بنیادی تصور :۔ غایت افسردگیٔ خاطر۔

(۴) جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ٭ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مطلب :۔ اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں :۔

پہلا یہ کہ میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ طاعت اور زہد پر اجر عظیم ملے گا لیکن میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں یعنی اجر کے حصول کی نیت سے عبادت کرنا

نہیں چاہتا۔ میری رائے میں اس نیت سے عبادت کرنا خود طاعت و زہد کی توہین ہے
بنیادی تصور:۔ تلقین خلوص نیت۔

دوسرا مطلب:۔ میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ طاعت و زہد پر ثواب عظیم مرتب ہوگا، لیکن کیا کروں؟ اپنی افتادِ طبیعت سے مجبور ہوں یعنی طاعت و زہد (یا پارسائی) کی طرف طبیعت ہی مائل نہیں ہوتی۔ میرے اندر طاعت کا مادہ ہی نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ ع ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو

(۵) ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ؛ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟

مطلب:۔ غالب نے قصداً ابہام رکھا ہے اور اسی میں شعر کا لطف مضمر ہے کہتے ہیں کہ میں اس خیال سے خاموش ہوں کہ اگر شکایتوں کا طومار کھل گیا تو تم شرمندہ ہو جاؤ گے یا تمہاری بدنامی اور رسوائی کے خیال سے چپ ہوں ورنہ میرے منہ میں بھی زبان ہے۔

بنیادی تصور:۔ پاسِ خاطرِ محبوب۔

(۶) کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں ؛ میری آواز گر نہیں آتی!

مطلب:۔ چونکہ انہیں میری آہ وزاری میں لطف آتا ہے اس لیے میں برابر فریاد کرتا رہتا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ بیان سنگدلیٔ محبوب۔

(۷) داغِ دل گر نظر نہیں آتا ؛ بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی۔

مطلب:۔ اے چارہ گر! اگر تجھے داغِ دل نظر نہیں آتا تو کیا جلے ہوئے گوشت کی بو بھی نہیں آتی؟

بنیادی تصور:۔ تشنیع و نافہمیٔ چارہ گر۔

(۸) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ؛ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مطلب :- اندازِ بیان کی خوبی قابلِ تحسین ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم پر ایک شدید عالم بے خودی طاری ہے۔ مگر کہتے یہ ہیں کہ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔

بنیادی تصور :- بیانِ عالمِ بے خودی۔

(۹) مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ؛ موت آتی ہے پر نہیں آتی

مرتے ہیں یعنی بے حد مشتاق ہیں + موت آتی ہے یعنی شدتِ آرزو سے دل پر موت کی سی اذیت گزر جاتی ہے + پر نہیں آتی یعنی دم نہیں نکلتا لفظی خوبی شاعر نے یہ پیدا کی ہے کہ "مرتے" اور "موت" کو مجازی اور حقیقی دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) "مرتے ہیں" مجازی معنی مقصود ہیں (۲) مرنے کی آرزو میں" یہاں لفظ مرتے کو حقیقی معنی میں استعمال کیا ہے۔ (۳) " موت آتی ہے" یہاں موت کو مجازی معنی میں استعمال کیا ہے۔ (۴) " پر موت نہیں آتی" یہاں حقیقی معنی مراد لئے ہیں

مطلب :- اس وضاحت کے بعد مطلب بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں موت کی بے حد آرزو ہے اور اس شدتِ آرزو سے ہم پر اکثر اوقات وہی اذیت طاری ہو جاتی ہے جو بوقت مرگ طاری ہوتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ موت آتی ہے مگر مر نہیں چکتے۔

بنیادی تصور :- شدتِ آرزوئے مرگ۔

(۱۰) کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب ؛ شرم تم کو مگر نہیں آتی

مگر معنی شاید۔

مطلب :- اے غالب! تمہاری ساری عمر تو شراب نوشی اور شاہد پرستی میں

گذر گئی۔ اب کیا منہ لے کر کعبہ جاؤ گے؛ شاید تم شرم و حیا سے عاری ہو چکے ہو!

بنیادی تصور:۔ اعترافِ معصیت۔

---

(۱۶۳)

(۱) دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے ؛ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مطلب:۔ اس شعر میں استفہام سے استفسار یعنی حال دریافت کرنا یا سوال کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے یعنی شاعر، دلِ ناداں کی حالت سے پورے طور پر واقف ہے اسی لیے استفہام کے پردے میں اسے ملامت کر رہا ہے۔ بالفاظِ دگر، استفہام سے سرزنش اور ملامت مقصود ہے نہ کہ سوال جب تک یہ نکتہ ذہن نشین نہ ہوگا شعر کا حقیقی مفہوم واضح نہیں ہو سکتا۔ یہ نکتہ "دلِ ناداں" کی ترکیب سے مستنبط ہے۔ عاشق اپنے دل سے کہتا ہے کہ تو بڑا ناداں ہے اور ثبوت تیری نادانی کا یہ ہے کہ تو اس بے وفا، ظالم، سفاک اور بے رحم سے امیدِ وفا رکھتا ہے جو لفظِ وفا سے سراسر ناآشنا ہے۔ تیرے درد کی دوا اس دنیا میں تو کہیں مل نہیں سکتی!

تجھ کو اس سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتا وفا کیا ہے؟

میرا خیال ہے کہ اب شعر کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا تاہم دوبارہ لکھتا ہوں کہ عاشق اپنے دل کو ملامت کرتا ہے کہ تو کس خبط میں مبتلا ہے؛ تیری آرزو کبھی پوری نہیں ہو گی۔ یاد رکھ! جس درد میں تو گرفتار ہے اس کی دوا کہیں نہیں ہے۔ اگر اپنی زندگی چاہتا ہے تو اس خیالِ خام (آرزوئے وصل) سے باز آجا۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ ترکِ عاشقی۔

(۲) ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ؛ یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

مطلب:۔ حالیؔ مرحوم نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں، ان سے ناواقف ہے۔ اس لیے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔" (یادگارِ غالب ص۱۴۱)

بنیادی تصور:۔ استعجاب بر نازِ معشوقانہ۔

(۳) میں بھی منہ میں زباں رکھتا ہوں ؛ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

مطلب:۔ "بھی" کے لفظ سے مطلب نکلا کہ عاشق، محبوب سے کہتا ہے کہ آپ غیروں سے میرا حال دریافت کر رہے ہیں! میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں، مجھے بھی قدرت نے طاقتِ گویائی عطا کی ہے۔ کاش کسی دن آپ خود مجھ سے میرا مدعا دریافت کریں۔

بنیادی تصور:۔ طنز برائے اغماضِ معشوق۔

(۴) جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ؛ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

(۵) یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؛ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

(۶) شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ؛ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

(۷) سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ؛ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

مطلب:۔ یہ ہنگامہ جو کائنات میں نظر آتا ہے اس امر کا متقاضی ہے، کہ اشیائے مختلفہ کے وجود کو تسلیم کیا جائے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی شئے دراصل موجود نہیں ہے۔ اس لیے غالب نے اپنے استعجاب کو استفہام کے پیرائے میں پیش کیا ہے یعنی استفہام سے ان کا مطلب استخبار نہیں ہے بلکہ تعجب کا اظہار ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا۔ کہ اس اظہارِ استعجاب سے ان کا مدعا کیا ہے یعنی دراصل وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا کی وحدانیت یا یکتائی ایسی نہیں ہے جیسے وحدانیت کے عام اصولوں پر پرکھا جا سکے۔ استعجاب کے پردے میں وہ اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ خدا کی وحدانیت، بذاتِ خود عدیم المثال، اس لیے حیرت انگیز ہے کیوں؟ اس لیے کہ اس کی وحدت نہ جنسی ہے نہ نوعی۔ نہ عددی ہے نہ اعتباری یعنی اس کی وحدت بھی اس کی ذات کی طرح فہم انسانی سے بالاتر ہے۔

بنیادی تصور:۔ بے نظیریٔ وحدتِ ایزدی۔

(۸) ہم کو ان سے وفا کی ہے امید ؎ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

مطلب:۔ کہتا ہے کہ ہماری سادہ لوحی تو دیکھو! ہم اس شخص سے وفا کی امید رکھتے ہیں جو وفا کے نام سے بھی آشنا نہیں۔

بنیادی تصور:۔ گلۂ بے وفائیٔ معشوق۔

(۹) ہاں بھلا کر! ترا بھلا ہوگا ؎ اور درویش کی صدا کیا ہے

مطلب:۔ ناصحانہ رنگ میں معشوق سے لطف و کرم کی التجا کی ہے کہ اے محبوب! اگر تو ہم فقیروں پر نگاہِ کرم کرے گا تو خالقِ کائنات تجھ پر کرم کرے گا۔

بنیادی تصور:۔ التجائے کرم۔

(۱۰) جان تم پر نثار کرتا ہوں ؎ میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے

مطلب:۔ میں دوسروں کی طرح محض دعا دینا کافی نہیں سمجھتا اس لیے اپنی جان تم پر نثار کرتا ہوں یعنی اپنی محبت کا عملی ثبوت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ جذبۂ فدویت۔

(۱۱) میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب ؎ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

مطلب :- ہم نے مانا کہ آپ کی نگاہ میں غالب کی کوئی قیمت نہیں ہے، لیکن اگر مفت میں ایک آرام آپ کو ملتا ہو تو اس میں کیا برائی ہے!

بنیادی تصور :- اظہارِ نیاز مندی۔

---

(۱۶۴)

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
(۱) اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

بُتِ غالیہ مو بمعنی وہ محبوب جس کی زلفیں خوشبودار ہوں۔ غالیہ بمعنی بوئے خوش۔

مطلب :- غالب اپنے دوستوں سے کہتے ہیں کہ یہ مانا کہ تم سب اس بُتِ غالیہ مُو کے آنے کی دعائیں مانگ رہے ہو، لیکن اس سے مجھے تسکین نہیں ہو سکتی دراصل تسکین اس وقت ہوگی جب تم بے اختیار ہو کر یہ کہو گے کہ لو! وہ آ گئے!

بنیادی تصور :- شدتِ انتظارِ محبوب۔

ہو کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
(۲) کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

مطلب :- کاش! عالمِ نزع میں میرا جذبۂ محبت یہ اثر دکھا دے کہ وہ میری عیادت کے لیے آ جائے، خواہ میں اس سے گفتگو نہ کر سکوں لیکن دمِ آخر اسے دیکھ تو لوں گا۔

بنیادی تصور :- آرزوئے دیدِ بدمِ واپسیں۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
(۳) آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

مطلب :۔ اگرچہ وہ میرے پاس آئے لیکن ان کا آنا میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا یعنی میری نگاہ میں ان کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہیں کیونکہ سیماب کی طرح انہیں بھی قرار نہ تھا اور بجلی یا شعلہ کی طرح بس ایک جھلک دکھا کر چلے گئے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان دنیا میں آتا ہے تو سیماب کی طرح بے قرار رہتا ہے۔ ایک گھڑی کو بھی قرار یا سکون نصیب نہیں ہوتا اور بہت جلد واپس چلا جاتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ (۱) قلتِ مدتِ قیامِ محبوب (۲) قلتِ مدتِ عمرِ انسانی۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
(۴) ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

مطلب :۔ حالی لکھتے ہیں "بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی۔ ازراہ شوخی کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی تدبیر اس کے سوا کوئی نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین اس کی بو سے متنفر ہو کر سوال و جواب کئے بغیر واپس چلے جائیں۔" (یادگارِ غالب صہ ۱۴۱)

بنیادی تصور :۔ استہزا بر نکیرین۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
(۵) ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

مطلب :۔ چونکہ ہم ہر شئے میں اسی کو جلوہ گر دیکھتے ہیں اس لیے نہ جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہیں۔ جلاد کے بھیس میں بھی وہی ہے اور واعظ کے لباس میں بھی وہی ہے یعنی بقول حالی "ہم خدا کے سوا کسی کو فاعل حقیقی نہیں جانتے۔ ہمیں ہر شئے میں اور ہر واقعہ میں وہی کارفرما نظر آتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ اثباتِ وحدت الشہود یا اقرارِ توحیدِ افعالی۔

ہاں اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت
(۶) دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

مطلب :- دراصل غالب نے اس شعر میں تصوف کا بہت بڑا نکتہ بیان کیا ہے یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب انسان اپنی خودی (ذات) کو مٹا دیتا ہے تو خدا ملتا ہے۔ بالفاظِ دگر، جب اپنے کو کھوتا ہے تو اسے پاتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو تمام اربابِ تصوف کے نزدیک مسلم ہے۔ چنانچہ غالب نے اس شعر میں اسی صداقت کو باندازِ دگر بیان کیا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اور بات ہے یعنی یہی کہ جیسے خدا مل جاتا ہے وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

ع آں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

وجہ اس کی یہ ہے کہ جب سالک کو خدا مل جاتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ "میں" کے پردے میں "وہ" پوشیدہ تھا۔

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی ⁂ کہ او پیدا است، تو زیرِ نقابی
تلاش او کنی، جز خود نہ بینی ⁂ تلاشِ خود کنی، جز او نیابی (اقبال)

لیکن غالب نے اس نکتہ کو بیان اس انداز سے کیا ہے جس میں شوخی کا رنگ پایا جاتا ہے یعنی ہم اسے تلاش کرنے چلے لیکن وہ ہمیں نہ ملا۔ چونکہ ہمیں اہلِ طلب کا یہ طعنہ گوارا نہ تھا کہ غالب، خدا کو نہ پا سکا اس لیے ہم نے اپنے آپ کو کھو دیا۔ نہ ہم ہوں گے نہ کسی کو طعنہ دینے کا موقع ملے گا!

اربابِ فہم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ جب قطرہ دریا سے مل جاتا ہے تو خود دریا بن جاتا ہے۔ غالب خود کہتے ہیں :-

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں!

بنیادی تصور:۔ تلقین وحدت الوجود۔

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
(۷) اس در پہ نہیں بار، تو کعبہ ہی کو ہو آئے

مطلب:۔ اندازِ بیان کی شوخی قابل داد ہے۔ کہنا تو یہ چاہتے ہیں کہ کعبہ کا رتبہ دربار سے فروتر ہے مگر اس بات کو کہتے اس طرح ہیں کہ چونکہ ہمیں نچلے بیٹھنے کی عادت نہیں ہے، ہرزہ گردی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے، اس لیے جب ہم نے دیکھا کہ درِ جاناں تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی تو کعبہ ہی کو ہو آوے۔

بنیادی تصور:۔ تحقیر کعبہ۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
(۸) اچھے رہے آپ اس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

واضح ہو کہ پہلے مصرع میں "اثر گریہ میں تقریر کی" محاورے کے خلاف ہے۔ غالب کا مطلب یہ ہے کہ اثرِ گریہ میں کلام کیا یعنی گریہ کی تاثیر سے منکر ہو گئے۔

مطلب:۔ جب غالب کے دوستوں نے محبوب سے یہ کہا کہ وہ رات دن آپ کے فراق میں روتا رہتا ہے۔ یقیناً اس کی یہ گریہ وزاری ایک نہ ایک دن اپنا اثر دکھائے گی۔ تو اس نے یہ جواب دیا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اگر اس کی گریہ وزاری میں کوئی اثر ہوتا تو میں اس طرح بے اعتنائی نہ کرتا۔ یہ جواب سن کر وہ لوگ محبوب کے ہم نوا ہو گئے اور واپس آکر غالب سے کہا کہ تمہارے محبوب نے تو ہمیں قائل کر دیا۔ اس پر غالب نے یہ شعر موزوں کیا کہ میرے احباب اس کی دلیل سُن کر گریہ کی تاثیر سے منکر ہو گئے یعنی اس کی رائے سے متفق ہو گئے (جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس میں کلام

ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا، اس طرح انہوں نے خود تو اس کی خوشنودی حاصل کر لی۔ مگر مجھ کو اس کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔ اس جانے سے تو نہ جانا ہی بہتر تھا۔

بنیادی تصور :۔ شکوۂ عدمِ تدبر احباب۔

نوٹ :۔ مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں "اثر گریہ میں تقریر کی" کا مفہوم یہ ہے کہ "اثر گریہ میں کلام کیا" (یعنی اثر سے انکار کیا) اس کے لیے یہ کہنا غلط ہے کہ "اثر گریہ میں تقریر کی" غالب کے الفاظ سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہم نفسوں نے اثرِ گریہ کو بیان کیا لیکن یہ کہنا ان کا مقصود نہیں ہے"
(بانداک تغیر لفظی، نقد و نظر صد ۱۳)

نظم طبا طبائی نے بھی یہی اعتراض کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"محاورہ یہ ہے کہ ہم کو اس امر میں کلام ہے یعنی ہم اس بات کو نہیں مانتے لیکن مصنف نے یہ تصرف کیا کہ کلام کی جگہ لفظِ تقریر کہا (غالب نے تقریر کو کلام کے مفہوم میں استعمال کیا) اور محاورہ میں تصرف کرنے سے وہ معنی باقی نہیں رہتے" (شرح دیوان غالب صد ۱۹۹)

(۹)
اُس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں :۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ غالب کے دوستوں نے کہا کہ ہم اس کی بزم ناز میں گئے تھے اور اس سے تیری حالت زار بیان کی مگر وہ سنگدل ٹس سے مس نہ ہوا۔

دوسرا مطلب :۔ یہ ہے کہ ہم اس کی محفل میں شریک ہوئے تھے لیکن تجھے وہاں نہ پا کر تیری بدقسمتی پر بہت افسوس ہوا۔

بنیادی تصور: (۱) بیانِ سنگدلیٔ محبوب (۲) بیانِ بدنصیبیٔ عاشق۔

(۱۶۵)

(۱) پھر کچھ اِک دل کو بیقراری ہے ٭ سینہ جویائے زخم کاری ہے

مطلب: میرا دل پھر بے قرار ہو رہا ہے اور میرا سینہ پھر کسی کی نگاہِ ناز سے زخمی ہونے کا آرزومند ہے۔

بنیادی تصور: تمنائے معاشقہ۔

(۲) پھر جگر کھودنے لگا، ناخن ٭ آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پہلے مصرع میں تعقید ہے، اس کی نثر یوں ہوگی "ناخن پھر جگر کھودنے" ناخن سے جگر کھودنا، خلافِ محاورہ ہے، کریدنا بولتے ہیں۔

مطلب: چونکہ موسم بہار آرہا ہے اس لیے میرا ناخنِ غم پھر جگر کریدنے میں مصروف ہے یعنی میرا جوشِ جنوں اپنے عروج پر ہے۔

بنیادی تصور: کیفیتِ جوشِ جنوں۔

(۳) قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز ٭ پھر وہی پردۂ عماری ہے

قبلہ بمعنی مرکزِ توجہ نگاہِ نیاز کنایہ ہے نگاہِ عاشق سے، پردۂ عماری یعنی محمل کا پردہ، نثر یوں ہوگی: پھر وہی پردۂ عماری، قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز ہے۔

مطلب:- ہم پھر کسی کی آمد کے منتظر ہیں یعنی سرِ راہ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ محبوب کی سواری نکلے تو کم از کم اس کے پردۂ محمل ہی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیں۔

بنیادی تصور: انتظارِ آمدِ یار۔

(۴) چشم، دلالِ جنسِ رسوائی ٭ دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے

(۵) وہی صد رنگ نالہ فرسائی ٭ وہی صد گونہ اشکباری ہے

مطلب :- میری آنکھ پھر رسوائی کا سامان خرید رہی ہے یعنی سو سو طرح سے آنسو بہا رہی ہے اور میرا دل پھر ذلت و خواری کا طلبگار ہے یعنی سو سو طرح سے آہ و زاری اور فریاد کر رہا ہے۔

بنیادی تصور :- ذوقِ رسوائی و خواری

(۶) دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر ❊ محشرستانِ بیقراری ہے

مطلب :- میرا دل، محبوب کے خرامِ ناز کی آرزو میں پھر محشرستانِ بیقراری بنا ہوا ہے یعنی میں پھر اس کی حشر برپا کرنے والی چال سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔

بنیادی تصور :- آرزوئے لطفِ خرامِ ناز۔

(۷) جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے ❊ روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

جلوہ سے جلوۂ محبوب مراد ہے۔ عرضِ ناز یعنی نمائشِ ناز۔ روزِ بازار یعنی گرمیٔ بازار۔

مطلب :- محبوب پھر اپنے حسن کی نمائش کر رہا ہے اور جاں سپاری کا بازار گرم ہے یعنی عشاق اس کے حسن کو دیکھ کر اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔

بنیادی تصور :- جاں سپاریٔ عشاق۔

(۸) پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں ❊ پھر وہی زندگی ہماری ہے

مطلب :- اس شعر میں غالب نے پہلے سات شعروں کا خلاصہ بیان کر دیا ہے یعنی اس کی بے وفائی سے تنگ آکر اس سے قطع تعلق کر لیا تھا مگر اس پر قائم نہ رہ سکے یعنی پھر اسی بے وفا پہ مرنے لگے اور ہماری زندگی پھر وہی ہو گئی جو پہلے تھی یعنی جس مصیبت میں پہلے گرفتار تھے پھر اسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔

بنیادی تصور :- تجدیدِ عہدِ عاشقی

(۹) پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ❊ گرم، بازارِ فوجداری ہے

(۱۰) ہو رہا ہے جہان میں اندھیر ٭ زلف کی پھر سر شتہ داری ہے
(۱۱) پھر دیا پارۂ جگر نے سوال ٭ ایک فریاد و آہ زاری ہے
(۱۲) پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب ٭ اشکباری کا حکم جاری ہے
(۱۳) دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا ٭ آج پھر اس کی روبکاری ہے

یہ پانچوں اشعار قطعہ بند ہیں۔ غالب نے ان اشعار میں عدالتی اصطلاحیں جمع کر دی ہیں۔ مثلاً عدالت، فوجداری، سر شتہ داری، سوال، فریاد، گواہ، حکم، مقدمہ اور روبکاری۔ یہ سچ ہے کہ ان الفاظ سے اس قطعہ میں رعایت لفظی کی صنعت نمایاں ہو گئی لیکن یہ الفاظ غزل کی زبان سے مناسبت نہیں رکھتے۔ تیسرے شعر میں لفظ "ایک" سے فریاد و آہ و زاری کی کثرت و شدت مراد ہے۔

مطلب :- معشوق نے پھر اپنے ناز و انداز کی نمائش شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عاشقوں میں فوجداری یعنی جنگ و جدل کا بازار گرم ہو گیا۔

دوسرے شعر میں زلف کی رعایت سے "اندھیرا" لائے ہیں۔ زلف عموماً سیاہ ہوتی ہے اور اندھیرا بھی سیاہ (تاریک) ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس کی زلفیں آج کل دنیا کی منتظم (سر شتہ دار) ہیں اس لیے ساری دنیا میں ظلم و ستم (اندھیرا) ہو رہا ہے۔ یہ شعر مضمون آفرینی کی عمدہ مثال ہے۔

جگر نے عدالتِ حسن میں سوال دیا ہے یعنی دعویٰ دائر کیا ہے اور مدعی بڑے زور و شور سے فریاد اور آہ و زاری کر رہا ہے۔

عشق کے گواہ عدالت میں طلب کئے گئے ہیں آنسوؤں کو گواہی کے لیے بلایا گیا ہے۔ عاشق کے دل اور معشوق کی مژگاں کے درمیان جو مقدمہ چل رہا ہے آج پھر اس کی پیشی ہے۔

بنیادی تصور :- کیفیتِ نزاعِ حسن و عشق۔

(۱۴) بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ ؛ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مطلب :- اے غالب! تمہارے اوپر جو یہ بیخودی کا عالم طاری ہے، ضرور تم نے رازِ عشق کو چھپانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ دوسرے مصرع کی بندش قابلِ داد ہے

بنیادی تصور :- اخفائے رازِ عشق۔

---

(۱۶۶)

(۱) جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

مطلب :- اگر ہم نے اس دنیا میں چند روز کے لیے شادمانی حاصل کرلی یعنی چند روز خوشی میں گذار لیے تو عشق کو ہم پر حصولِ تسکین کا الزام عائد کرنا زیبا نہیں ہے کیونکہ چند روزہ لذتِ زندگانی، دراصل لذت نہیں ہے بلکہ وہ تو ہمارے زخمِ دل پر اور نمک پاشی کرتی ہے۔ کیونکہ زوالِ لذت کے بعد رنج والم کا احساس زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا ہے

بنیادی تصور :- نمک پاشیٔ عیشِ چند روزہ۔

(۲) کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی

دوسرے مصرع کی نثر یوں ہوگی :- روانی کی فرصت، موجِ آب کے حق میں زنجیر ہوگئی۔

مطلب :- مطلب بالکل صاف ہے کہ ہستی کی کشاکش سے آزادی کی کوشش بالکل بے سود ہے۔ یعنی جیتے جی کسی کو آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر موج کو دیکھ لو! وہ روانی میں آزاد ہے (فرصت یعنی آزادی) لیکن یہی روانی

اس کے حق میں زنجیر بن جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ روانیٔ موج سے زنجیر کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مشاہدہ سے شاعر نے یہ مضمون پیدا کیا کہ موج بظاہر آزاد ہے مگر دراصل پابہ زنجیر ہے یعنی دنیا میں کوئی بھی آزاد نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ کشمکشِ حیات سے رہائی ناممکن ہے۔

پس از مردن بھی، دیوانہ زیارتگاہِ طفلاں ہے
(۳) شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی!

مطلب:۔ شرارِ سنگ کو پھول سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی لڑکے میری قبر پر آ کر پھول چڑھاتے ہیں وہ اس طرح کہ وہ میری قبر پہ پتھر پھینکتے ہیں اور ان پتھروں سے جو شرارے نکلتے ہیں وہ میری نظروں میں پھول بن جاتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ دوامِ شانِ دیوانگی۔

---

(۱۶۷)

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

نکوہش بمعنی سرزنش یا ملامت + خندۂ دنداں نما ہو یعنی میری ہنسی اڑائے۔

مطلب:۔ چونکہ معشوق کے ظلم و ستم پر فریاد کرنا آئینِ عشق کی رُو سے لائق ملامت ہے اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ جب میں خدا سے اس کے ظلم و ستم کی فریاد کروں گا، تو کہیں صبحِ صادق مجھ پر خندہ زن نہ ہو جائے۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ اجتناب از فریاد۔

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
(۲) اگر بو دے بجائے دانہ، دہقاں، نوک نشتر کی

ریشگی یعنی خلش زخم۔
مطلب :۔ مشہور ہے کہ لیلیٰ نے فصد کھلوائی تو مجنوں کی رگ، ست سے بھی خون جاری ہو گیا۔ اس روایت کو مدنظر رکھ کر غالب کہتے ہیں کہ عشق، عاشق و معشوق میں اس درجہ یگانگت پیدا کر دیتا ہے کہ اگر دہقان، دشت مجنوں میں نشتر کی نوک بو دے، (چبھو دے) تو محض اس بنا پر کہ اس صحرا کو مجنوں سے نسبت ہے رگِ لیلیٰ زخمی ہو جائے گی یعنی لیلیٰ اس نوک کی خلش محسوس کرے گی۔
بنیادی تصور :۔ گیرائی اثرِ عشق۔

(۳) پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کشتیٔ مے یعنی وہ سینی جس میں شراب کے پیالے رکھ کر میخواروں کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن کشتی کے دوسرے معنی وہ کشتی بھی ہیں جو پانی میں چلتی ہے۔ اس کی رعایت سے بادبان کا لفظ لائے ہیں۔
مطلب :۔ مجلس میں شمع ضرور ہوتی ہے اور شمع پر پروانے بھی منڈلاتے ہوتے ہیں۔ غالب نے پروانے کے پر کو کشتیٔ مے کا بادبان قرار دیا اور چونکہ پروانے کے سوز سے محفل میں گرمی پیدا ہوئی اور گرمیٔ محفل سے ساغر کا دور شروع ہوا اس لیے پرِ پروانہ گویا کشتیٔ مے کے حق میں بادبان بن گیا۔
غالب نے اس شعر میں جدت تخیل کا ثبوت تو بے شک دیا ہے مگر افسوس کہ اس تخیل میں کوئی لطف پیدا نہ کر سکے۔ بقول حضرت نیاز فتحپوری "نہایت دور از کار اور بے لطف تخیل ہے" (نگار بابت ماہ اپریل ۱۹۵۰ء)
بنیادی تصور :۔ کرشمۂ سوزِ دلِ پروانہ۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

پرفشانی بمعنی پرواز + شہپر بمعنی سب سے بڑا پر جس کی مدد سے پرندے اڑتے ہیں۔

مطلب :۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اس ظلم کا بیان کرسکوں جو ذوقِ پرواز نے مجھ پر کیا ہے۔ میں اڑنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے اڑنا چاہا تو معلوم ہوا کہ شہپر بے کار ہو چکا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اگر ذوقِ پرواز نہ ہوتا تو یہ اذیت کاہے کو ہوتی؟

بنیادی تصور :۔ بیدادِ ذوقِ پرواز۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے، قیامت ہے
(۵) مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی!

مطلب :۔ چونکہ محبوب کی بارگاہ میں رسائی ناممکن ہے اس لیے اس کے خیمے کے پیچھے بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔ اگر محبوب خیمے کے بجائے کسی پختہ مکان میں ہوتا تو میں سنگِ دیوار سے اپنا سر پھوڑ کر اس مصیبت سے رہائی حاصل کرلیتا۔

بنیادی تصور :۔ بیانِ عالمِ مجبوری۔

---

(۱۶۸)

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
(۱) جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے!

سبک بمعنی ذلیل و خوار + جتنے زیادہ ہو گئے یعنی حدِ اعتدال سے جس قدر زیادہ بڑھ گئے۔ اتنے اتنے ہی کم ہوئے اسی قدر ذلیل ہوئے۔

مطلب :۔ حدِ اعتدال سے تجاوز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم سب لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو گئے۔ اسی بات کو دوسرے مصرع میں شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جس قدر ہم اپنی حد سے بڑھے (زیادہ ہوئے) اسی قدر لوگوں کی نظروں میں گھٹ

گئے۔ (کم ہو گئے)

بنیادی تصور:۔ پاداش تجاوز از حدِ اعتدال۔

نوٹ:۔ غالب نے اس شعر میں وہ نکتہ بیان کیا ہے جو فلسفۂ اخلاق اور مذہب دونوں میں مسلّم ہے۔ نیکی نام ہے حدِ اعتدال میں رہ کر زندگی بسر کرنے کا، جو شخص افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

(۲)
پنہاں تھا دام، سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سخت قریب بمعنی بہت قریب۔ فارسی محاورے میں سخت بمعنی بسیار مستعمل ہے مثلاً ع بیا کہ قصرِ امل، سخت سست بنیاد است

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں کہ "جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

بنیادی تصور:۔ تصویرِ زندگی۔

(۳)
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے!
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

دلیل بمعنی رہنما۔

مطلب:۔ غالب نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے! قد اس کا کتنا لانبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم اجسام و جسمانیات میں سے نہیں بلکہ ایک اعتبار محض ہے وجود اس کا صرف تعقل میں ہے۔ بس اس کا وجود سیمرغ کا سا ہے یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم اپنی آپ قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں

ہمارا ہونا دراصل نہ ہونے (فنا ہونے) کی دلیل ہے" (خطوط غالب جلد اول صہ ۲۵۴)

بنیادی تصور:۔ اثباتِ نفیٔ خویش۔

سختیِ کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
(۴) وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

مطلب:۔ اے محبوب! اب ایک عرصۂ دراز کے بعد تو اپنے عاشقوں کا حال کیا پوچھتا ہے! بس یہ سمجھ لے کہ وہ لوگ رنج والم سہتے سہتے سراپا الم ہو گئے یعنی فنا ہو گئے۔

بنیادی تصور:۔ نتیجۂ بے اعتنائی محبوب۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
(۵) تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

مطلب:۔ اے محبوب! تو ہم سے وفا کر کے اپنے ظلم و ستم کی تلافی تو کر سکتا ہے مگر تیری محبت میں دنیا اور دنیا والوں نے جو ظلم و ستم ہم پر کیے ہیں، ان کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟

بنیادی تصور:۔ بیانِ ستم ہائے گوناگوں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
(۶) ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

قلم ہوئے یعنی کاٹے گئے + "لکھتے رہے" کی رعایت سے "قلم ہوئے" کی ترکیب نے بہت لطف پیدا کر دیا ہے۔

مطلب:۔ اگرچہ داستانِ عشق لکھنے کے جرم میں محبوب نے ہمارے ہاتھ قلم کرا دیے مگر ہم پھر بھی اپنے عشق کی حکایاتِ خونچکاں لکھنے سے باز نہیں آئے۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ تحریرِ حکایاتِ جنوں۔

اللہ رے تیری تندیٔ خو! جس کے بیم سے
(۷) اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

ہم بمعنی رنج وغم + رزقِ ہم کی ترکیب غیر مانوس ہے۔
مطلب :- چونکہ میں محبوب کی تند خوئی کے خوف سے نالہ نہ کر سکا اس لیے وہ اندر ہی گھٹ کر رہ گیا یعنی لقمۂ غم بن گیا۔
بنیادی تصور :- نتیجۂ تند خوائے محبوب۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
(۸) جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے عَلَم ہوئے

نبرد بمعنی جنگ + ترکِ نبردِ عشق بمعنی میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہونا۔
علم بمعنی جھنڈا۔ پاؤں اٹھ گئے یعنی بھاگ کھڑے ہوئے۔
غالبؔ، بیدلؔ کے طلسم سے نکل کر ناسخؔ کے طلسم میں پھنس گئے اور ایسے پھنسے کہ ساری عمر نہ نکل سکے۔ چنانچہ یہ شعر بالکل ناسخؔ کے رنگ میں لکھا ہے اور اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ شعر کی بنیاد کسی جذبے یا خیال پر نہیں ہے بلکہ صرف لفظ "اٹھ گئے" پر ہے۔
مطلب :- پاؤں اٹھ جانے کو عَلَمِ فتح بلند ہونے سے تعبیر کیا ہے اور اسی ایہام سے یہ بات پیدا کی ہے کہ میدانِ عشق سے بھاگ جانا ہی اہلِ ہوس کی فتح ہے پہلے مصرع میں دعویٰ کیا ہے، دوسرے مصرع میں اس کی دلیل دی ہے کہ اُن کے پاؤں کیا اٹھے گویا فتح کے جھنڈے بلند ہو گئے! بہت ادنیٰ درجہ کا شعر ہے۔
بنیادی تصور :- تذلیلِ اہلِ ہوس۔

نالے عدم میں چند، ہمارے سپرد تھے
(۹) جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں کے دم ہوئے

مطلب :۔ شعر کی خوبی اس کے اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی نالہ و فریاد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہمارا ہر نفس گویا ایک نالہ ہے لیکن اس بات کو کہا اس طرح ہے کہ خدا نے عدم میں ہمیں نالہ کشی پر مامور کر دیا تھا۔ چونکہ عدم میں مقررہ تعداد پوری نہ ہو سکی اس لیے دنیا میں آ کر یہی نالے سانس کی صورت میں ظاہر ہو گئے۔

بنیادی تصور :۔ ع زندگی میری سراپا نالہ و فریاد ہے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
(۱۰) سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

مطلب :۔ اے اسدؔ! ہم نے گدائی میں بھی مسلکِ عاشقی ترک نہیں کیا۔ چنانچہ گدائی سے پہلے ہم اربابِ حسن کے عاشق تھے۔ اب اہلِ کرم کے دلدادہ ہیں۔

بنیادی تصور :۔ دوامِ خوئے عاشقی۔

---

(۱۶۹)

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
(۱) تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

داغِ دل کو اشرفی (نقد) سے تشبیہ دی ہے اور شعلۂ عشق کو اس کا نگہبان قرار دیا ہے۔ کمیں بمعنی گھات۔

مطلب :۔ اگر شعلۂ عشق میرے داغِ دل کی نگہبانی (پرورش) نہ کرے تو جذبۂ عشق (داغ) افسردہ ہو جائے گا۔ ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

حضرت نیازؔ فتحپوری لکھتے ہیں "کہ یہ شعر بھی حسنِ تعبیر سے معرا ہے۔ نقد کا فسردگی سے اور شعلہ کی پاسبانی کا نقدِ داغِ دل سے کوئی تعلق نہیں ہے علاوہ اس کے بے زبانی

بھی تعقد داغ دل سے کوئی تعلق نہیں رکھتی" (نگار اپریل ۱۹۵۷ء صہ ۲۱)
بنیادی تصور:- اہمیت شعلۂ عشق۔

مجھے اس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی؟
(۲) کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

مطلب:- جب اس نے بچپن کے زمانہ میں، جب کہ حسن مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچا میری طرف التفات نہیں کیا تو اب بھلا عالم جوانی میں جب کہ غرور حسن کی وجہ سے اس کا دماغ آسمان پر ہے، وہ میری طرف کب مائل ہوگا؟ اب اس سے کیا توقع
بنیادی تصور:- اظہارِ تکبرِ محبوب۔

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
(۳) کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

مطلب:- اگر میں بلاوجہ مردم آزاری کو اچھا سمجھتا یعنی اگر میرے مذہب میں دوسروں کو دکھ دینا جائز ہوتا تو میں خدا سے ضرور دعا کرتا کہ وہ میری زندگی میرے دشمن (رقیب) کو دیدے۔ کیسے دلکش انداز سے اپنی دکھ بھری زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔!
بنیادی تصور:- بیانِ حالتِ زارِ خویش۔

---

(۱۷۰)

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
(۱) اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

مطلب:- غالب نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے:-
دوسرا مصرع "اک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے" یہ خبر ہے اور پہلا مصرع مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا۔ ظلمت غلیظ، سحر ناپید، گویا

خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں دلیل، صبح کی بو د پر ہے، بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شئی کو دلیل صبح ٹھہرایا وہ خود اک سبب ہے منجملۂ اسباب تاریکی کے پس دیکھا چاہیئے کہ جس گھر میں علامتِ صبح، موید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔" (خطوط غالب جلد دوم صہ ۲۸۲)

بنیادی تصور:۔

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
(۲) مُدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مطلب:۔ چونکہ ایک مدّت سے یہ عالم ہے کہ نہ کانوں نے وصال کا مژدہ سُنا ہے اور نہ آنکھوں نے محبوب کا جمال دیکھا ہے اس لیے دونوں میں صلح ہے ورنہ قبل ازیں جب کان مژدۂ وصال سنتے تھے تو آنکھیں رشک کرتی تھیں کہ پہلے ہمیں دیدار کا موقع کیوں نہ ملا اور اگر آنکھوں کو یہ موقع نصیب ہو جاتا تھا تو کان رشک کرتے تھے کہ پہلے ہمیں مژدۂ وصال سننے کی مسرت حاصل کیوں نہ ہوئی؟

بنیادی تصور:۔ آشتیِ چشم و گوش (محرومیِ کامل)

مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے نقاب
(۳) اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

مطلب:۔ چونکہ معشوق شراب پی کر بے حجاب ہوگیا ہے اس لیے اے شوق (ذاتِ عاشق مراد ہے) تو بھی شرم و حیا (ہوش و حواس) کو بالائے طاق رکھ دے اور اپنے ارمان نکال لے۔

بنیادی تصور:۔ اجازتِ تسلیمِ ہوش (رخصت بے باکی)

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
(۴) کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

عِقد بمعنی گلو بند یا مالائے مروارید + اوج کنایہ ہے خوش قسمتی سے +
مطلب :- غالب نے گوہر فروش پر رشک کیا ہے کہ وہ کتنا خوش قسمت ہے کہ
وہ نہیں تو اس کے ہاتھوں کا بنایا ہوا ہار ہی معشوق کی گردن تک پہنچ گیا۔
بنیادی تصور :-

دیدار بادہ ، حوصلہ ساقی ، نگاہ مست
(۵) بزمِ خیال ، میکدۂ بے خروش ہے

مطلب :- کہتے ہیں کہ عالم تصور (بزم خیال) ایسا میکدہ ہے جس میں مطلق شور و غل نہیں ہوتا۔ ہم تصور میں اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ یہی دیدار خیالی ہماری شراب ہے۔ اور ہماری نگاہ یہ شراب پیتی رہتی ہے اور ہمارا حوصلہ اسے پلاتا رہتا ہے یعنی ہم اپنے حوصلے کے مطابق تصور میں دیدار سے لذت اندوز ہوتے رہتے ہیں۔
بنیادی تصور :- کیفیت عالم تصور -

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل
(۶) زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نادنوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے
(۷) میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ ، دشمنِ ایمان و آگہی!
مطرب بنغمہ ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

مطلب :- یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔ ان میں غالب نے ان لوگوں کی جو عاشقانہ زندگی میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں متنبہ کیا ہے کہ خبردار! موسیقی اور شراب کی محفلوں میں شمولیت اختیار مت کرنا۔ کیونکہ اس طرز زندگی کا انجام ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ اگر تمہیں شک ہو تو میری حالت زار کا معائنہ کرو اگر تم میں صداقت کو تسلیم کرنے

کی صلاحیت ہے (اگر تمہارے کان نصیحت سن سکتے ہیں) تو میری بات غور سے سنو! ساقی اپنا جلوہ دکھا کر تمہیں ایمان اور عقل دونوں سے محروم کر دے گا اور مطرب اپنا گانا سنا کر تمہیں خودداری اور عاقبت بینی سے بیگانہ بنا دے گا۔ یعنی شاہدان بازاری سے دل لگانا گویا اپنی زندگی تباہ کرنا ہے۔

بنیادی تصور: ع من بحرم شما حذر بکنید

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
(۹) دامان باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
(۱۰) یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
(۱۱) نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
(۱۲) اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مطلب:- یا تو رات کے وقت یہ کیفیت تھی کہ محفل کا ہر گوشہ پھولوں سے معمور تھا یعنی ہر طرف عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا۔ ساقی (معشوق) کا خرامِ ناز تو جنتِ نگاہ تھا اور صدائے چنگ و رباب، فردوس گوش تھی۔ یا دوسرے دن اسی محفل میں یہ انقلاب برپا ہو گیا کہ نہ تو کہیں وہ چہل پہل تھی نہ وہ دل لگی اور نہ وہ دورِ شراب تھا۔ نہ صدائے چنگ و رباب تھی، صرف ایک شمع اس محفل عیش و طرب کی یادگار رہ گئی ہے مگر وہ بھی بجھ چکی ہے (خاموش ہے)

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
(۱۳) غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

مطلب :۔ اے غالب! یہ دلکش مضامین عالم بالا (غیب) سے میرے خیال (تصور) میں آتے ہیں اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ لکھتے وقت جو آواز میرے قلم سے پیدا ہوتی ہے وہ دراصل اس فرشتے کی آواز ہے جو یہ مضامین عالیہ میرے دل پر القاء کرتا رہتا ہے۔

بنیادی تصور بہ رنگ تعلی شاعرانہ۔

نوٹ :۔ اس غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس میں سے دوسرا تیسرا اور چوتھا شعر خارج کر دیا جائے تو یہ غزل زوال سلطنت مغلیہ کا مرثیہ بن جائے گی۔ بلاشبہ اس غزل میں غالب کی رمزیہ شاعری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے۔ علاوہ بریں یہ غزل، جدتِ ادا کی بھی بہترین مثال ہے ارباب فن کا خیال ہے کہ جدتِ ادا، مضمون آفرینی ہی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ غالب نے ان اشعار کو خود "نوائے سروش" سے تعبیر کیا ہے اور نوائے سروش کنایہ ہے معنی یا مضمون آفرینی سے۔ اور غالب نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ شاعری مضمون آفرینی کا نام ہے نہ کہ قافیہ پیمائی کا۔ یعنی شاعری (مضمون آفرینی) معمولی باتوں کو دلکش انداز میں بیان کرنے کا دوسرا نام ہے۔

---

(۱۷۱)

(۱) نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

مطلب :۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ عموماً قاعدہ یہ ہے کہ جب عاشق اپنی جان معشوق پر قربان کر دیتا ہے تو اسے اس عاشق نامراد کی محبت کا یقین ہو جاتا ہے یعنی

عاشق جان دے کر اپنی سچی محبت کا ثبوت دیا کرتا ہے لیکن تجھے میرے مرنے سے بھی میری محبت کا یقین نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تیری نگاہ میں اس سے بلند تر امتحان باقی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

بنیادی تصور:۔ اثباتِ خلوص۔

خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
(۲) شوق، گُل چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

خار خارِ الم بمعنی مبتلائے رنج+ گُل چینِ گلستانِ تسلی بمعنی لطف اندوزِ تسلی+

مطلب:۔ اگر میرا شوق، اس کے دیدار کی لذت سے لطف اندوز نہیں ہے تو نہ سہی۔ وہ مبتلائے رنج حسرتِ دیدار تو ہے۔ اور اس کی تسلی کے لیے یہ الم حسرت ہی بہت کافی ہے۔

بنیادی تصور:۔ قیمتِ لذتِ حسرتِ دیدار۔

مے پرستاں! خُم مے منہ سے لگائے ہی بنے
(۳) ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

مطلب:۔ اے مے پرستو! اگر آج بزم میں ساقی نہیں ہے تو نہ سہی۔ تم جام مے کے بجائے خم مے منہ سے لگا کر پی جاؤ۔ مطلب تو پینے سے ہے اور یہ مطلب یوں بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ مے نوشی۔

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
(۴) گر نہیں شمعِ سیاہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

سیہ خانہ بمعنی خیمہ۔

مطلب:۔ اگر قیس، خیمۂ لیلیٰ کی شمع نہ بن سکا یعنی اس کی خدمت میں بار نہ پا سکا

تو نہ سہی۔ وہ چشم و چراغِ صحرا تو ہے یعنی اس کے دم سے صحرا کی رونق تو ہے۔

بنیادی تصور:۔ شانِ استغنائے عشق۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

(۵) نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ ہمیں تو ہنگامہ مطلوب ہے کیونکہ دنیا (گھر) کی رونق ہنگامہ پر موقوف ہے۔ سکون و جمود خلافِ فطرت ہے۔ اس لیے اگر نغمۂ شادی نہیں ہے تو نوحۂ غم ہی سہی۔

بنیادی تصور:۔ عکاسیٔ فطرتِ انسانی۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا

(۶) گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مطلب:۔ چونکہ نہ مجھے مدح کی آرزو ہے نہ صلہ کی پروا ہے اس لئے اگر میرے اشعار بے معنی ہیں تو یونہی سہی۔ دراصل اس شعر کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو مرزا کے کلام کو مہمل کہا کرتے تھے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ شانِ بے نیازی۔

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو

(۷) نہ ہوئی غالب! اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

مطلب:۔ اے غالب! اگر تمھیں عمرِ طویل نصیب نہ ہوئی تو نہ سہی۔ کچھ عرصہ کے لیے جو تمھیں حسینوں کی صحبت نصیب ہوگئی ہے اس کو غنیمت سمجھو۔ عیش و عشرت کی قلیل مدت اسے لطفی کی طویل زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔

بنیادی تصور:۔ قدر و قیمتِ عشرتِ چند روز کا۔

---

(۱۷۲)

(۱) آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے ؛ طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

مطلب :- اے محبوب جلد آ کیونکہ میں تیری فرقت میں بے قرار ہوں اور مجھ میں انتظار کی تکلیف برداشت کرنے کی طاقت بالکل نہیں ہے۔

بنیادی تصور :- ترغیب ملاقات یا اظہار بیتابی۔

(۲) دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے ؛ نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

نشہ کنایہ ہے نعمائے جنت سے۔ خمار کنایہ ہے مصائب زندگی دنیوی سے۔

مطلب :- اگرچہ کارکنانِ قضا و قدر نے مجھے مصائب دنیوی کے بدلے میں جنت دینے کا وعدہ کیا ہے مگر یہ معاوضہ ان مصائب کے مقابلہ میں بہت کم ہے (اس لیے قابل قبول نہیں ہے)۔ اندازِ بیان کی شوخی قابلِ داد ہے۔

بنیادی تصور :- تحقیر نعمائے اخروی یا عدم تلافی مصائب دنیوی۔

(۳) گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو ؛ ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

مطلب :- تم میری گریہ وزاری کی وجہ سے مجھے اپنی بزم سے نکال رہے ہو لیکن دراصل میں بے قصور ہوں کیونکہ ضبطِ گریہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ محبوب کے بجائے گریہ کو موردِ الزام قرار دیا ہے۔

بنیادی تصور :- عذرِ بے گناہی۔

(۴) ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر ؛ خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

رنجش خاطر بمعنی غبار خاطر یا کدورت باطنی + خاک بمعنی طینت یا طبیعت + غبار کے دو معنی ہیں (۱) گرد و غبار (۲) رنجش یا کدورتِ خاطر + غالب کا اندازِ بیان اور انتخاب الفاظ دونوں قابل داد ہیں کس خوبی سے خاک جیسی چیز کو، جو سراپا غبار ہوتی ہے ، بے غبار ثابت کیا ہے!

مطلب :- محبوب سے کہتے ہیں کہ تمہاری یہ بدگمانی کو میرے دل میں تمہاری طرف سے غبار (رنجش) ہے، سراسر عبث ہے کیونکہ عاشقوں کی طبیعت (خاک) میں معشوق کی طرف سے کبھی کدورت یا رنجش نہیں ہوتی (غبار نہیں ہوتا)

بنیادی تصور :- رفعِ بدگمانیٔ معشوق۔

(۵) دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی ٭ غیرِ گل، آئینہ بہار نہیں ہے

مطلب :- غالب نے دل کو گل سے اور جلوہ ہائے معانی کو بہار سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح گل وہ آئینہ ہے جس میں بہار کا جلوہ نظر آتا ہے اسی طرح دل وہ آئینہ ہے جس میں معانی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ لہذا اے مخاطب! تو جلوہ ہائے معانی کی بہار اپنے دل کے آئینہ میں دیکھ اور لطف اندوز ہو۔ یعنی اگر تجھے عالمِ معنی کی سیر مطلوب ہے تو اپنے آئینہ دل کو صیقل کر کیونکہ ادراکِ معنی کی صلاحیت صرف دل میں ہے۔ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے!

بنیادی تصور :- تلقینِ تصفیۂ قلب۔

(۶) قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے ٭ وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

مطلب :- معشوق نے میرے قتل کا عہد تو کیا ہے لیکن اگر وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہا تو مجھے بہت افسوس ہوگا کیونکہ شہادت کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔

بنیادی تصور :- شوقِ شہادت۔

(۷) تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب ٭ تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

مطلب :- اے غالب اگرچہ تو نے شراب پینے کی قسم کھائی ہے مگر ہمیں تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی تو کئی مرتبہ قسم کھا چکا ہے۔

بنیادی تصور :- ذوقِ بادہ نوشی۔

---

(۱۷۳)

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
(۱) کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

مطلب:۔ شدتِ غم سے میرا سر اس قدر جھک گیا ہے کہ دامن سے جا لگا ہے اس لیے دامن کے تار اور نظر کے تار میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ شدتِ غم۔

(۲) رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

مطلب:۔ میں اپنا زخم محض اس لیے سلوا رہا ہوں کہ سوئی چبھنے کی لذت حاصل ہو سکے ورنہ دردِ عشق کی قدر و قیمت میرے دل میں بدستور موجود ہے

اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت، زخمِ سوزن میں نہیں

بنیادی تصور:۔ لذتِ زخمِ سوزن۔

وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
(۳) چٹکنا غنچۂ گُل کا، صدائے خندۂ دل ہے

غنچۂ گل یعنی گلاب کی کلی جو باعتبار صورت و رنگ دل سے مشابہ ہوتی ہے غالب نے غنچہ کے چٹکنے کو خندۂ دل سے تعبیر کیا ہے۔

مطلب:۔ وہ محبوب جس باغ میں جا کر اپنا جلوہ دکھاتا ہے وہاں ہر غنچہ اُسے دیکھ کر چٹکنے لگتا ہے اور اس کے چٹکنے کی آواز گویا اس کا خندۂ دل ہے یعنی ہر غنچہ پھول بن کر اپنی مسرت قلبی کا اظہار کرتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ اثرِ جلوہ فرمائی محبوب۔

---

(۱۷۴)

پابدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
(۱) خارِ پا ہیں، جوہر آئینۂ زانو مجھے

پابدامن ہو رہا ہوں یعنی ایک جگہ بیٹھ گیا ہوں۔ بسکہ بمعنی چونکہ + جوہر آئینہ بمعنی صیقلِ آئینہ۔ جوہر آئینہ کی وضاحت قبل ازیں کر چکا ہوں۔ آئینۂ فولادی میں صیقل کرنے سے نیلگوں دھاریاں پڑ جاتی ہیں، ان دھاریوں کو خار سے تشبیہ دی ہے۔ آئینۂ زانو بمعنی زانو۔ شعراء زانو کو آئینہ سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ زانو کی ہڈی آئینہ کی طرح ہوتی ہے
مطلب: صحرا نوردی سے تھک کر اب جو پاؤں دامن میں سمیٹ کر بیٹھ گیا ہوں تو میرے کانٹوں بھرے پاؤں، زانو کے ساتھ مل کر، آئینہ میں جوہر کی سی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئینہ زانو کے جوہر مجھے پاؤں کے کانٹے معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بقول نظم طباطبائی، تشبیہ کے سوا معانی میں کچھ لطف نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ بیان درماندگی یا یاد صحرا نوردی۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کیوقت
(۲) ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مو، مجھے

مطلب :۔ غالب نے اس شعر میں بوقت ہم آغوشی، عاشق کی نفسیانی کیفیت بیان کی ہے کہتے ہیں کہ اس حالتِ خاص میں مجھے تیرے جسم کا ایک ایک بال، نگاہ آشنا معلوم ہوتا ہے یعنی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مجھ میں اور تجھ میں کسی قسم کی غیریت باقی نہیں رہی ہے۔

بنیادی تصور :- کیفیت طالب و مطلوب بوقت ہم آغوشی۔

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
(۳) ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

چھیڑے کے دو معنی ہیں (۱) ساز بجانا (۲) کسی پر طنز کرنا۔

مطلب ۱:- اے محبوب! میرا دل تیری شکایتوں سے لبریز ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ تو اپنی محفل میں مجھ کو ہرگز نہ چھیڑے ورنہ میں شکایتوں کا دفتر کھول دوں گا اور تو شرمندہ ہو جائے گا۔

بنیادی تصور :- پاسِ خاطرِ محبوب۔

---

(۱۷۵)

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
(۱) جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

"گفتار میں آوے" فارسی محاورے کا اردو ترجمہ ہے یعنی گفتگو کرے + کالبد بمعنی جسم + صورتِ دیوار بمعنی وہ تصویر جو دیوار پر بنی ہوتی ہے +

مطلب :- اے محبوب! تیرے لبوں میں وہ اعجازِ مسیحائی ہے کہ اگر تو کسی محفل میں بولے تو جتنی تصویریں کہ دیوار پر بنی ہوں سب تصویریں زندہ ہو جائیں۔

بنیادی تصور :- اعجازِ تکلمِ محبوب۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
(۲) تو اس قدرِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

سایہ کی طرح یعنی ہر وقت + شعراء عموماً معشوق کے قد کو سرو سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔

مطلب :- اے محبوب! اگر تو باغ میں چلا جائے تو سرو و صنوبر، تیرے دلکش

قد پر عاشق ہو جائیں اور ہر وقت تیرے ساتھ رہیں تاکہ تیرے قد کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

بنیادی تصور:۔ دلکشیٔ قامتِ محبوب۔

تب نازِ گراں مائیگیٔ اشک بجا ہے
(۳) جب لختِ جگر، دیدۂ خونبار میں آوے

مطلب:۔ ایک عاشق اس وقت اپنے آنسوؤں کے قیمتی ہونے پر ناز کر سکتا ہے جب ان کے ساتھ جگر کے ٹکڑے بھی آنکھوں کی راہ سے باہر آجائیں۔

بنیادی تصور:۔ معیارِ گراں مائیگیٔ اشک۔

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
(۴) کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

مطلب:۔ اے ستمگر! مجھے شکایت کی اجازت دے تاکہ جب میں تجھ سے تیرے ظلم و ستم کی شکایت کروں تو تجھے غصہ آئے اور اس حالت میں تو اور زیادہ ظلم کرے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ تجھے خوب لطف حاصل ہوگا۔ دراصل غالب خود حریص لذتِ آزار ہیں لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے محبوب کو ستم سے لطف اندوز ہونے کا طریقہ سمجھایا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تمنائے شدتِ ظلم و ستم۔

نوٹ:۔ نظم طباطبائی اور بیخود نے اس شعر کو حاصل زمین قرار دیا ہے ۱۲

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
(۵) طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

چشم کو فسوں گر اس لیے کہا کہ ایک تو شعراء عموماً معشوق کی آنکھوں کو فسوں گر باندھا کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ جادوگر اپنے جادو کے زور سے ناممکن بات کو ممکن

کر دکھاتا ہے اور آئینہ کا باتیں کرنا ناممکن ہے۔ اشارہ پائے کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ اگر آنکھ، آئینہ کو حکم دے دوسرے یہ کہ اشارہ عموماً آنکھوں ہی کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ شاعر نے دوسرے معنی مراد لیے ہیں۔

مطلب:۔ محبوب کی آنکھ میں وہ جادو ہے کہ اگر وہ آئینہ کو اشارہ کر دے تو آئینہ بھی طوطی کی طرح باتیں کرنے لگے۔ طوطی اور آئینہ کی مناسبت، باہمی مشہور ہے۔

بنیادی تصور:۔ اعجاز چشم فسوں گر

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
(۶) اِک آبلہ پا، وادیٔ پُرخار میں آوے

مطلب:۔ جنگل میں کانٹے مدتوں سے پیاسے ہیں۔ خدا کرے کوئی عاشق آبلہ پا یہاں آنکلے تاکہ اس کے آبلوں کے پانی سے تمام کانٹے سیراب ہوجائیں۔

بنیادی تصور:۔ آرزوئے دشت نوردی۔

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک
(۷) آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

مطلب:۔ میں اس رشک کو گوارا نہیں کر سکتا کہ میری موجودگی میں حلقۂ زنار اس کے جسم نازک کو اپنی آغوش میں لے۔

بنیادی تصور:۔ وفورِ جذبۂ رشک۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
(۸) کیوں شاہدِ گل، باغ سے بازار میں آوے

غالب نے اس شعر کا مضمون زرِ گل سے پیدا کیا ہے۔ گلاب کے پھول میں جو زرد رنگ کا زیرہ ہوتا ہے اُسے زرِ گل کہتے ہیں۔ غارتگرِ ناموس بمعنی عزت کو برباد کرنے والا۔ بازار کی رعایت سے گل کو "شاہد" قرار دیا ہے۔ شاہد بازاری بمعنی

زمیکہ ناموس خویش رامی فروشد۔
مطلب:۔ پہلے مصرع میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہوسِ زر، غارتگرِ ناموس ہے دوسرے مصرع میں اس کا ثبوت دیا ہے کہ دیکھو! اگر پھول میں ہوس زر نہ ہوتی تو وہ سربازار رسوائے خرید و فروخت نہ ہوتا۔ بالفاظِ دگر، ہوسِ زر پھول کی فطرت میں داخل ہے (اشارہ ہے زیرۂ گل کی طرف) اسی کی وجہ سے وہ بازار میں رسوا ہوتا ہے۔
بنیادی تصور:۔ مذمتِ حرص و ہوس۔

(۹)
تب چاک گریباں کا مزہ ہے، دل نالاں
جب اک نفس الجھا ہوا، ہر تار میں آوے

مطلب:۔ گریبان چاک کرنے کا لطف اس وقت ہے جب شدتِ جنوں اس نقطہ پر پہنچ جائے کہ تارِ گریباں کے ساتھ تارِ نفس بھی الجھا ہوا یا لپٹا ہوا چلا آئے یعنی گریباں چاک کے ساتھ ساتھ دم بھی نکل جائے۔
بنیادی تصور:۔ انتہائے جوشِ جنوں۔

(۱۰)
آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

مطلب:۔ میرا سینہ سوزِ عشق (رازِ نہاں) کی وجہ سے آتش کدہ بن گیا ہے اگر سوزِ دروں، آشکار ہو جائے تو یقیناً ساری دنیا جل کر خاک ہو جائے گی۔
بنیادی تصور:۔ شدتِ سوزِ دروں۔

(۱۱)
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

مطلب:۔ اے مخاطب! میں نے اپنے اشعار میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں،

اگر تو غور سے دیکھے گا تو تجھے ان لفظوں میں معانی کی ایک دنیا آباد نظر آئے گی۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کا کلام ان کے اس دعویٰ پر شاہد عادل ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ مفاخرت۔

---

(۱۷۶)

حُسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے
(۱) اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں کہ "دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے۔ یعنی معشوق کو "مہِ خورشید جمال" قرار دیا ہے اور یہ اس لیے تاکہ اس کو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی معقول وجہ پیدا ہو جائے کیونکہ خورشید بلحاظ تابش، ماہ کامل سے بلاشبہ برتر ہے" یعنی اگرچہ ماہِ کامل بھی حسین ہے مگر میرا چاند اس سے بھی زیادہ حسین ہے کیونکہ وہ خورشید جمال ہے۔

بنیادی تصور:۔ فضیلتِ محبوب بر ماہِ کامل۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
(۲) جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

مطلب:۔ شاعروں کے یہاں دل کی قیمت عموماً ایک بوسہ ہوتی ہے۔ اس فرسودہ مضمون کو مدِنظر رکھ کر کہتے ہیں کہ ہمارا محبوب اس قدر عیار ہے کہ وہ بوسہ دئے بغیر ہی ہمارا دل ہتھیانا چاہتا ہے!

بنیادی تصور:۔ اظہارِ عیاریٔ محبوب۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
(۳) ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

مطلب :۔ حالی لکھتے ہیں کہ "جامِ جم پر جام سفال کو اس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی، اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گذرا۔"

بنیادی تصور :۔ برتریٔ جام سفال بر ساغر جم۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
(۴) وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال، اچھا ہے

مطلب :۔ اگر وہ ہم کو بے مانگے کوئی چیز (مثلاً بوسہ) دیں تو اس میں بہت زیادہ لطف ہے کیونکہ وہی فقیر قابل ستائش ہے جسے مانگنے کی عادت نہ ہو۔

بنیادی تصور :۔ مذمتِ خوئے سوال۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
(۵) وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

مطلب :۔ حالیؔ لکھتے ہیں کہ "اسی کے قریب قریب سعدیؒ کا بھی ایک شعر ہے

گفتہ بودم، چو بیائی، غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

ماحصل دونوں کا یہ ہے کہ ہم اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر کسی طرح ظاہر نہیں کر سکتے۔"

بنیادی تصور :۔ دشواریٔ اظہارِ حالِ دل۔

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
(۶) اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

مطلب :۔ حالیؔ لکھتے ہیں "عاشق گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ایک جوتشی (برہمن یا پنڈت) نے جو یہ بتایا کہ یہ سال اچھا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ

شاید اس سال معشوق، عاشقوں پر مہربان ہو جائیں۔ نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا یا وبا نہیں آئے گی یا لڑائیاں نہیں ہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

(یادگار غالب ص۱۴۲)

بنیادی تصور :۔ شدتِ آرزوئے وصال۔

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
(۷) جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

نظم طباطبائی لکھتے ہیں کہ پہلے مصرع میں گنجلک ہے اور دوسرے میں تنافر[1] ہے۔ (تین کاف یعنی "کا کہ کسی" متصل آگئے ہیں) اور مضمون بھی کچھ نہیں ہے۔"

(شرح دیوان غالب ص۲۰۹)

مطلب :۔ اگرچہ فرہاد ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اور شیریں بادشاہ کی بیوی تھی مگر چونکہ وہ اپنے فن میں کامل تھا اس لیے اُسے شیریں سے ہمکلامی کا موقع حاصل ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایک معمولی درجہ کا انسان بھی کمالِ فن کی بدولت دنیا میں عزت حاصل کر سکتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ بیانِ فضیلتِ کمال۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
(۸) کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے

مآل بمعنی انجام

مطلب :۔ قطرہ بذاتِ خود بہت حقیر شی ہے لیکن جب وہ دریا میں مل

---

[1] اگر دوسرے مصرع کو یوں پڑھا جائے "جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے" تو تنافر کا عیب دور ہو جائے گا ۱۲

جاتا ہے تو دریا ہو جاتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ ہر وہ فعل، قابل تحسین ہے جس کا انجام اچھا ہو۔ پس انسان کو لازم ہے کہ خدا سے ملنے کی کوشش کرے۔

بنیادی تصور:۔ معیار حُسن و قبح۔

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
(۹) شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال، اچھا ہے

خضر سلطان، بہادر شاہ ثانی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور فن شاعری میں غالب کا شاگرد تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں میجر ہڈسن نے اسے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ چونکہ خضر کے معنی شاخ درخت سبز بھی ہیں اس لیے غالب نے "سرسبز" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ خالق اکبر میں یہ خوبی ہے کہ خضر سلطان کے دادا کا نام اکبر شاہ تھا ورنہ غالب "خالق عالم" بھی کہہ سکتے تھے۔ خضر کی رعایت سے سرسبز، باغ اور نہال کے الفاظ لائے ہیں۔ باغ کنایہ ہے خاندان سے۔ نہالِ تازہ کنایہ ہے فرزندِ اصغر سے۔ مطلب واضح ہے۔

بنیادی تصور:۔ دعائے خوش نصیبیٔ شاہزادہ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
(۱۰) دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مطلب:۔ ہم جانتے ہیں کہ دراصل جنت کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال بہت اچھا ہے کہ دنیا میں جس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کا نعم البدل جنت میں مل جائے گا۔ بالفاظِ دگر، بانیانِ مذاہب نے سادہ لوحوں کو سبز باغ دکھایا ہے۔

بنیادی تصور:۔ انکارِ جنتِ مادی۔

(۱۷۷)

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
(۱) کہ اپنے سایہ سے سر پانؤ سے ہے دو قدم آگے

مطلب:- مرزا نے شعر کا مضمون اس بات سے پیدا کیا ہے کہ جب آدمی چلتا ہے تو قدرتی طور پر سر کا سایہ اس کے قدموں سے دو قدم آگے پڑتا ہے۔ غالب نے اس بات کی توجیہہ شاعرانہ انداز سے کی ہے کہ شوقِ قتل میں ہمارا سر، ہمارے پاؤں سے دو قدم آگے چل رہا ہے۔

بنیادی تصور:- اظہارِ شوقِ قتل۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
(۲) فقط خراب لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

خراب بمعنی (۱) مست و بیخود (۲) تباہ و برباد + غالب نے پہلے مصرع میں پہلا مفہوم اور دوسرے مصرع میں دوسرا مفہوم مراد لیا ہے اور اس ایہام ہی کی بدولت شعر میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔

مطلب:- کارکنانِ قضا و قدر نے جب میری تقدیر لکھنی چاہی تو قلم کو حکم دیا کہ غالب کی تقدیر یہ لکھ کہ یہ شخص الفت کی شراب پی کر اپنی زندگی مستی کے عالم میں بسر کرے گا یعنی ہمیشہ مست و بیخود رہے گا لیکن ابھی قلم نے صرف لفظ "خراب" ہی لکھا تھا کہ خود اس پر مستی کا عالم طاری ہو گیا اس لیے وہ آگے نہ چل سکا نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ میں خراب (تباہ و برباد) ہو کر رہ گیا۔

بنیادی تصور:- گلۂ شومئ تقدیر۔

غمِ زمانہ نے جھاڑی، نشاطِ عشق کی مستی
(۳) وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

مطلب:۔ ہم بھی کسی زمانے میں (غمِ روزگار میں گرفتار ہونے سے پہلے) غمِ عشق سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر حوادثِ زمانہ نے عاشقی کا سارا نشہ ہرن کر دیا یعنی زمانے نے ہم پر وہ مصائب نازل کئے کہ ہم عشق کرنا بھول گئے۔
بنیادی تصور:۔ کثرتِ غمِ روزگار۔

خدا کے واسطے داد اس جنوں شوق کی دینا
(۴) کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

مطلب:۔ اے ہمدم! خدا کے واسطے ہمارے جذبۂ عشق کی داد دینا کہ ہم اپنے خط کا جواب لینے کے لیے نامہ بر سے بھی پہلے درِ جاناں پر پہنچ گئے! اگر ہمیں جنوں نہ ہوتا تو ایسی حماقت کاہے کو کرتے!
بنیادی تصور:۔ اظہارِ جنونِ عشق۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
(۵) تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

مطلب:۔ اے معشوق کی زلفو! خدا کرے وہ سب پریشانیاں جو ہم نے فراق میں اٹھائی ہیں، تمہارے آگے آئیں یعنی تم بھی میری طرح ساری عمر پریشان رہو!
خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ شعرا ہمیشہ زلفِ محبوب کو پریشان باندھا کرتے ہیں لیکن غالب نے اپنے معشوق کی زلف پریشان ہونے کی دعا دی ہے۔ یہ طرزِ بیان قابلِ داد ہے کہ بظاہر بددعا دی ہے مگر اس میں دعا کا پہلو پوشیدہ ہے۔
بنیادی تصور:۔ دعائے دوامِ دلکشیٔ زلفِ محبوب۔

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
(۶) ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

پر افشاں بمعنی مضطرب یا جوش زن + موجۂ خوں یعنی خون کی موج، زعم بمعنی

گمان یا خیال۔

مطلب :۔ ہم اپنے گمان میں جسے سانس سمجھے ہوئے تھے وہ دراصل سانس نہیں ہے بلکہ موجِ خون ہے جو ہمارے سینے میں جوش زن اور بیقرار ہے۔ یعنی میری حالت یہ ہے کہ سانس کے ساتھ خون بھی لپٹا ہوا چلا آ رہا ہے۔

بنیادی تصور :۔ وفورِ غمِ عشق۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
(۷) ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

مطلب :۔ یا تو انہیں مجھ سے اس قدر محبت تھی کہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے یا اب ان کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ میرے جنازے میں بھی شریک ہونے سے انکار کر رہے ہیں!

بنیادی تصور :۔ اظہارِ بے وفائی و کج ادائی محبوب۔

---

(۱۷۸)

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
(۱) یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

مطلب :۔ محبوب اس قدر بددماغ اور تنگ مزاج ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کر "وہ شکوے کے نام سے خفا ہوتا ہے" تو اس اظہارِ حقیقت کو بھی وہ گلہ (شکوہ) ہی سمجھتا ہے اور خفا ہونے لگتا ہے۔ اس بات سے اندازہ کر لو کہ اگر کوئی شخص فی الواقع اس سے اس کی بے مہری کا شکوہ کر دے تو وہ کیا قیامت برپا کرے گا!

بنیادی تصور :۔ اظہارِ زود رنجی و نازک مزاجی محبوب۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
(۲) اِک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے، کیا ہوتا ہے

شعر کی عمارت "چھیڑنے" کے لفظ پر قائم کی ہے ۔ چھیڑنے کے دو معنی ہیں۔
(۱) کسی کو تنگ کرنا یا کسی پر طنز کرنا (۲) ساز بجانا۔
مطلب :- جس طرح باجے میں بہت سے راگ (نغمے) پوشیدہ ہوتے ہیں اسی طرح میرے دل میں بہت سے شکوے پوشیدہ ہیں ۔ کوئی مجھے چھیڑ کر دیکھے، شکایتوں کے پل باندھ دوں گا۔ بہت خوب شعر کہا ہے ۔
بنیادی تصور :- وفورِ گلۂ جفائے محبوب ۔

گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو
(۳) شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

مطلب :- اگرچہ وہ کمسنی کی وجہ سے میرے شکوۂ جور و جفا کا مطلب نہیں سمجھتا مگر میری خوش نصیبی ہے کہ وہ میری زبان سے شکوہ سن کر، وہی کرتا ہے جو میں چاہتا ہوں یعنی اور سرگرم جفا ہوتا ہے ۔ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے :-

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

بنیادی تصور :- طلبِ ستمِ مزید ۔

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
(۴) سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

چرخِ مکوکب یعنی ستاروں والا آسمان + ستاروں کو آبلوں سے تشبیہ دی ہے
مطلب :- مقصودِ شاعر یہ ہے کہ عشق کی راہ بہت کٹھن ہے ۔ اس کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اس راہ کی دشواری کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ چرخ مکوکب بھی جو بڑا تیز رفتار ہے اور جس کی گردش کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، اس شخص کی طرح سست رفتار ہے جس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ عشق کی

راہ بہت پر خطر ہے۔

بنیادی تصور :۔ سختیٔ راہِ عشق۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
(۵) آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

مطلب :۔ اگر اس کا تیر کسی وجہ سے خطا ہو جاتا ہے تو ہم خود اٹھا کر لے آتے ہیں اور اسے دے کر کہتے ہیں کہ پھر ہم پر چلاؤ۔ اندریں حالات جب ہمارے ذوقِ ستم کا یہ عالم ہو تو پھر وہ ہمیں تختۂ مشقِ ستم کیوں نہ بنائے؟ اور تیر پر تیر کیوں نہ چلائے؟

بنیادی تصور :۔ تیر کھانے کا شوق۔

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
(۶) کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

مطلب :۔ چونکہ ہمیشہ ہماری آرزو کے خلاف ہی ظہور میں آتا ہے اس لیے اگر ہم اپنا بھلا چاہنے کے بجائے اپنا برا چاہتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ یعنی یقیناً ہمارا بھلا ہوتا۔

اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے :۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

بنیادی تصور :۔ اظہارِ سوئی قسمت۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
(۷) لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

مطلب :۔ ابتدائے عشق میں، مجھ میں اس قدر طاقت تھی کہ میرا نالہ عرش سے بھی پرے جاتا تھا مگر اب ضعف کا یہ عالم ہے کہ اگر بہت رسا ہوا تو لب تک آجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اب میں نالہ بھی نہیں کر سکتا۔

بنیادی تصور:۔ اظہار ضعف و ناتوانی۔

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزم سخن
(۸) شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شاہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علَم
(۹) تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
(۱۰) تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
(۱۱) آستاں پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں
(۱۲) یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

باربد۔ خسرو پرویز کا درباری مطرب جو فنِ موسیقی میں ایران کا تان سین تھا۔ نعل بہا وہ خراج جو کمزور بادشاہ، طاقتور بادشاہ کو ادا کیا کرتا تھا۔ ناصیہ سا بمعنی پیشانی گھسنے والا۔

مطلب:۔ یہ پانچ شعر، غالب نے بہادر شاہ ظفر مرحوم کی مدح میں لکھے ہیں:۔ کہتے ہیں کہ میرا قلم جو کہ مطرب بزم سخن ہے، بادشاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرائی کرتا ہے کہ اے شاہنشاہ تیری فوج ستاروں کی طرح بے شمار ہے اور تیرا جنگی علَم آفتاب کی مانند درخشاں اور اونچا ہے۔ کوئی شخص تیری مہربانیوں کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص ساتوں ولایتوں (ساری دنیا) کی آمدنی ایک جگہ جمع کرے تو وہ رقم صرف تیرے لشکر کے خرچ کے لیے کافی ہو سکتی ہے [1]

[1] جب ہم اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھیں کہ ممدوح کے پاس (باقی صفحہ ۷۳۸، پر دیکھو)

ماہِ کامل (بدر) جو ہر ماہ ہلال بن جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن رات تیرے آستان پر پیشانی گھستا رہتا ہے اور میں جو غزل کہتے کہتے اس میں قصیدے کا رنگ پیدا کر دیتا ہوں (غزل کے قانون کو توڑ دیتا ہوں) اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تیرا کرم مجھے گاہ و بیگاہ مدح سرائی پر مجبور کرتا رہتا ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
(۱۳) آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

مطلب:- اے ہمدم! میری تلخ نوائی سے کبیدہ خاطر مت ہونا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آج میرے دل میں معمول سے زیادہ درد ہے اس لیے میرے کلام میں درد (تلخی) کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

بنیادی تصور:- عذر تلخ نوائی۔

---

(۱۷۹)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
(۱) تمہی کہو، کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

"تو کیا ہے" یہ استفہام تحقیر کے لیے ہے یعنی میری نگاہ میں تیری کوئی عزت یا وقعت نہیں ہے۔

مطلب:- تم میری ہر بات پر یہ کہتے ہو کہ میرے سامنے تیری کیا حقیقت ہے! یعنی تو بہت ذلیل ہے! تم خود ہی انصاف کرو کہ یہ اندازِ گفتگو تہذیب سے کس قدر

بقیہ حاشیہ:- سرے سے فوج ہی نہیں تھی تو اس مبالغہ کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔ ۱۲۰

گرا ہوا ہے!

بنیادی تصور :- بیانِ نخوت محبوب ۔

(۲)
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا ہے
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

مطلب :- اگر اسے تند خوئی کے اعتبار سے شعلہ سے تشبیہ دی جائے تو شعلہ میں یہ دلکشی کہاں؟ اور اگر شوخی کے لحاظ سے اسے برق قرار دیا جائے تو برق میں یہ ناز و ادا کہاں؟ اس لیے حیران ہوں کہ اسے کس سے تشبیہ دوں!

بنیادی تصور :- بیان عدیم المثالی محبوب ۔

(۳)
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

مطلب :- اگر میں تم کو ملاقاتِ رقیب سے منع کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے یہ خوف ہے کہ وہ تمہیں میری طرف سے بدگمان کر دے گا یہی بد آموزیٔ عدو ہے، بلکہ اس لیے کہ مجھے اس بات پر رشک آتا ہے (یعنی یہ بات گوارا نہیں ہے) کہ وہ تم سے ہمکلام ہونے کی عزت حاصل کرے۔

بنیادی تصور :- رشک ہم کلامیٔ عدو ۔

(۴)
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

مطلب :- چونکہ ہمارا بدن لہولہان ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے پیراہن، بدن سے چپک گیا ہے۔ اس لیے اب ہمیں گریبان کو سینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ حالتِ دیوانگی ۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
(۵) کریدتے ہو جواب راکھ، جستجو کیا ہے

مطلب:۔ آتش فراق سے میرا سارا بدن جل کر خاک ہو چکا ہے اس لیے دل بھی اس کے ساتھ جل گیا ہوگا۔ لہٰذا تم جواب راکھ کرید رہے ہو، تو تمہیں کیا ہاتھ آسکتا ہے۔ اگر تمہیں میرا دل ایسا ہی عزیز تھا تو جلنے سے پہلے اسے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔

نظم طبا طبائی نے کریدنے کے لفظ پر اعتراض کیا ہے کہ محبوب کیا مرغی ہے جو راکھ کریدتی ہے؛ لیکن ان کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ کریدنے کا لفظ مرغی اور آدمی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ میری رائے میں تو یہ شعر بیت الغزل ہے بلکہ غالب کے نشتروں میں سے ہے۔ اس میں جو سوز و گداز مخفی ہے اس کا بیان لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
(۶) جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مطلب:۔ شعر کی خوبی اس کے انداز بیان میں مضمر ہے اور یہ انداز بیان ہی کلام غالب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عاشقی کی معراج یہ ہے کہ عاشق کے دل میں سوز و گداز کی ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ اس کا خون آنسو بن کر آنکھوں کی راہ سے بہہ جائے۔ لیکن اس بات کو اس انداز سے کہا ہے کہ اس خون کی ہماری نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں جو محض رگوں میں دوڑتا پھرے کیونکہ اس صورت میں انسان اور حیوان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ بات تو جب ہے کہ وہ خون آنکھوں سے ٹپکے۔

بنیادی تصور:۔ کمال غم دوستی۔

نوٹ :- جوش ملسیانی لکھتے ہیں کہ "یہ شعر نہیں ہے سحرِ حلال ہے۔ لہو کا قافیہ اس زمین میں اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ یہ شعر بیت الغزل ہے اس کی داد کون دے سکتا ہے" (شرح دیوانِ غالب صہ ۲۱۹)

(۷)
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہے بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے

مطلب :- ہمیں جنت محض اس لیے عزیز ہے کہ وہاں نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشبودار شراب ملے گی۔

بنیادی تصور :- اظہارِ ذوقِ مے نوشی۔

(۸)
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

مطلب :- شراب پینے کا لطف جب ہے کہ کم از کم دو چار پیپے (کنستر) تو سامنے رکھے ہوں۔ شیشے سے پیالہ میں انڈیل کر پینے میں تو کوئی مزہ نہیں ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ ذوقِ بلانوشی۔

(۹)
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

مطلب :- اول تو اب ہمارے اندر اظہار آرزو کی طاقت ہی باقی نہیں رہی ہے لیکن اگر طاقت حاصل ہو بھی جائے تو ہمیں امید نہیں کہ محبوب ہماری آرزو پوری کر دے گا۔ اس لیے خاموشی ہی مناسب ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ عالمِ مایوسی۔

(۱۰)
ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

مطلب :- شعر کا مطلب تو واضح ہے مگر لطفِ زبان اور اندازِ بیان جس میں طنز کا رنگ جھلکتا ہے، دونوں باتیں قابلِ داد ہیں۔ کہتے ہیں کہ دراصل غالب کی شہر میں کوئی عزت نہیں ہے مگر جب سے وہ بادشاہ کا مصاحب بنا ہے اس وقت سے اتراتا پھرتا ہے یعنی اس کو جو کچھ عزت حاصل ہے وہ بربنائے مصاحبت ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ خاکساری۔

---

(۱۸۰)

(۱) میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں ❊ چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

"چل نکلتے" محاورہ ہے بمعنی آمادۂ فساد ہو جاتے یا مجھ سے لڑنے لگتے۔

مطلب :- میرے چھیڑنے پر جو وہ خاموش رہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت وہ نشے کی حالت میں نہیں تھے۔ اگر پیے ہوتے تو بلا شبہ آفت برپا کر دیتے۔

بنیادی تصور :- بیان خودداریٔ محبوب۔

(۲) قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو ❊ کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

مطلب :- عاشقانہ رنگ میں بہت خوب شعر کہا ہے۔ ہر عاشق کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ معشوق اس پر جتنا چاہے ظلم کرے مگر غیر کی طرف ملتفت نہ ہو۔ اسے سب کچھ گوارا ہے مگر رقیب کا وجود گوارا نہیں ہو سکتا۔

بنیادی تصور :- اظہارِ تمنائے دلی۔

(۳) میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ❊ دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

مطلب :- شعر کا لطف اندازِ بیان میں مضمر ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ غمِ عشق اس قدر فراواں ہے کہ اس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے لیکن کہتے یہ ہیں کہ اے خدا اگر میری قسمت میں اتنا غم لکھا تھا تو پھر دل بھی کئی دیے ہوتے

ایک انسان تو اتنا غم برداشت نہیں کر سکتا۔ مضمون کی ندرت قابلِ داد ہے۔
بنیادی تصور :- بیانِ فراوانیٔ غم۔
(۴) آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ ✲ کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
راہ پر آجانا یعنی مہربان ہو جانا یا کسی کا کہنا مان لینا۔
مطلب :- اے غالبؔ! افسوس ہے کہ تم صدمۂ فراق کی تاب نہ لا سکے اور دنیا سے نامراد رخصت ہو گئے۔ اگر تم کچھ دنوں اور جیتے رہتے تو ممکن تھا کہ وہ تمہاری بات مان لیتا۔
بنیادی تصور :- ماتمِ بدبختیٔ عاشقِ نامراد۔

---

(۱۸۱)

(۱) غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ✲ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
مطلب :- افسوس! رقیب تو اس کی محفل میں شراب نوشی کا لطف اٹھائیں اور ہم شریکِ محفل بھی نہ ہو سکیں۔
بنیادی تصور :- اظہارِ بدقسمتی۔
(۲) خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ✲ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
مطلب :- میں تم سے اپنی بربادی کا شکوہ نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری تباہی کا باعث یہ نیلا آسمان ہے۔ ہتھکنڈے یعنی چالیں یا عیاریاں۔
بنیادی تصور :- ماتمِ بدبختی۔
(۳) خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ✲ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
مطلب :- خواہ خط لکھنے سے کوئی نتیجہ برآمد ہو یا نہ ہو مگر ہم تمہیں مسلسل خط لکھتے رہیں گے کیونکہ ہم تو تمہارے نام کے عاشق ہیں، یعنی اس بہانے سے ہمیں تمہارا نام

لکھنے کا موقع تو ملتا رہے گا،" گرچہ مطلب کچھ نہ ہو" اس سے تین مفہوم پیدا ہوتے ہیں :- (۱) کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ (۲) خط میں مضمون ہو یا نہ ہو (۳) جواب آئے یا نہ آئے۔

بنیادی تصور :- عظمت والفت نامِ محبوب۔

(۴) رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم ؛ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

مطلب :- ہم خانہ کعبہ میں بھی شراب نوشی سے باز نہیں آئے وہ اس طرح کہ رات کو شراب پی اور صبح کو آبِ زمزم سے اپنا احرام پاک کر کے طواف میں شریک ہو گئے۔ احرام۔ حاجیوں کا رسمی لباس + زمزم۔ صحن کعبہ میں ایک کنواں ہے جس کا پانی بہت متبرک ہے۔

بنیادی تصور :- شوخیٔ رندانہ۔

(۵) دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر ؛ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

لفظ "کیا" یہاں تحسین کے لیے ہے۔

مطلب :- ہمارے دل کو ہماری آنکھوں نے تمہاری محبت کے جال میں کیا خوب پھنسا دیا۔ شاید ہماری آنکھیں بھی تمہارے جال کے حلقے ہیں۔ آنکھوں کو حلقۂ دام سے تشبیہ دی ہے۔

بنیادی تصور :- وجہِ گرفتاریٔ دل۔

(۶) شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر ؛ دیکھیے، کب دن پھریں حمام کے

"کب دن پھریں" محاورہ ہے یعنی کب اسے عزت حاصل ہو۔

مطلب :- آج کل یہ خبر گرم ہے کہ بادشاہ غسل صحت کرنے والے ہیں۔ اللہ وہ دن جلد لائے کہ بادشاہ حمام میں تشریف لے جائیں اور اس کی عزت بڑھ جائیں۔

بنیادی تصور :- دعائے صحت۔

(۷) عشق نے غالب نکما کر دیا ؎ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
نکما کر دیا یعنی کسی کام کا نہ رکھا۔ کام کے آدمی تھے یعنی بہت خوبیوں کے مالک تھے۔
مطلب:- اے غالب! ہمیں عشق نے بے کار کر دیا یعنی ہماری زندگی تباہ کر دی ورنہ اس سے پہلے ہمارے اندر بہت سی خوبیاں تھیں۔ لطفِ زبان قابلِ داد ہے شرح میں وہ لطف باقی نہیں رہ سکتا۔
بنیادی تصور:- نتیجۂ عاشقی۔

---

(۱۸۲)

(۱) پھر اس انداز سے بہار آئی ؎ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
(۲) دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک ؎ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
(۳) کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر ؎ روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
(۴) سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی ؎ بن گیا روئے آب پر کائی
(۵) سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے ؎ چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
(۶) ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ؎ بادہ نوشی ہے بادپیمائی
(۷) کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب ؎ شاہِ دیندار نے شفا پائی

مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے یہ نظم، بادشاہ کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں لکھی تھی۔
مطلب:- کہتے ہیں کہ پھر اس انداز سے بہار آئی ہے کہ انسان درکنار، سورج اور چاند بھی (حالانکہ وہ خود بہت خوبصورت ہیں) اس کی دلکشی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اے زمین کے باشندو! ذرا غور سے دیکھو! اسے کہتے ہیں آرائش و آرائشِ عالم کہ زمین، سبزے کے لحاظ سے چرخِ نیلگوں کی مدِمقابل بن گئی ہے۔ یعنی

ہر طرف سبزہ اُگا ہوا ہے۔ بلکہ جب سبزے کو روئے زمین پر کہیں جگہ نہ مل سکی تو وہ کائی بن کر سطح آب پر نمودار ہوگیا یعنی جسے تم کائی کہتے ہو یہ دراصل سبزہ ہے جس نے اپنی شکل وصورت تبدیل کرلی ہے۔

خدا نے چشم نرگس کو بینائی اسی لیے عطا کی ہے کہ وہ سبزے کا نظارہ کر سکے۔

حالی لکھتے ہیں "یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ باد پیمائی کے دو معنی ہیں۔ باد پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں، پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے لہذا بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی ایک فضول کام ہے۔ اس صورت میں، بادہ نوشی، مبتدا اور باد پیمائی، خبر ہوگی۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور باد پیمائی کے معنی 'ہوا کھانے کے لیے جائیں۔ اس صورت میں مطلب یہ نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے" (یادگار غالب صفحہ ۱۲۰)

مقطع میں "دیندار" کا لفظ اگرچہ "دنیا" کی رعایت سے لایا گیا ہے لیکن اگر اسے حقیقت پر محمول کیا جائے تو بھی درست ہے کیونکہ مرحوم بہادر شاہ ظفر واقعی بہت دیندار تھے۔

بنیادی تصور:۔ قطعہ تہنیت بتقریب صحت ممدوح۔

---

(۱۸۳)

(۱) تغافل دوست ہوں، میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

بقول جناب نیاز فتحپوری "غالب کا یہ شعر بہت الجھا ہوا ہے اور مشکل سے

کھینچ تان کر اس میں کوئی مفہوم پیدا کیا جا سکتا ہے" یہی وجہ ہے کہ تمام شارحین نے اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔ میں جو کچھ سمجھتا ہوں اسے ذیل میں درج کرتا ہوں :۔

واضح ہو کہ غالب نے اپنی عادتِ ایہام گوئی کے مطابق، اس شعر کی بنیاد، لفظ "پہلو تہی کرنے" پر رکھی ہے۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) محاورے میں پہلو تہی کرنا کسی سے بے رخی یا بے اعتنائی کرنے کو کہتے ہیں۔ (۲) لفظی معنیٰ جگہ خالی کرنا۔ غالب نے اس محاورے کے لفظی معنیٰ سے فائدہ اٹھا کر مصرعِ ثانی کا مضمون پیدا کر لیا، اور جو دعویٰ مصرعِ ثانی میں کیا ہے اس کا ثبوت پہلے میں بہم پہنچایا ہے۔

مطلب :۔ غالب، معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر آپ میری طرف ملتفت ہوں گے تو میں آپ کے پاس بیٹھوں گا لیکن اگر آپ مجھ سے بے رخائی کا برتاؤ کریں گے (پہلو تہی کریں گے) تو پھر آپ میری جگہ بھی خالی پائیں گے یعنی میں آپ کے پہلو سے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ یہ دعویٰ کرنے کے بعد بطور دفعِ دخلِ مقدر کہتے ہیں کہ میرے اس غیر متوقع طرزِ عمل کا سبب یہ ہے کہ ایک تو میں تغافل دوست ہوں یعنی مجھے آپ کی بے اعتنائی کی ادا بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ میرا ایاغِ عجز بہت خالی ہے یعنی میں بہت عالی ظرف اور خود دار ہوں۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ خودداری و غیر تمندی۔

رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے\
(۳) بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

بقولِ جناب نیاز فتحپوری "بڑا پاکیزہ شعر ہے اور اس میں نہایت نازک اور لطیف تخیل سے کام لیا گیا ہے" (نگار بابت ماہ مئی ۵۷ء ص ۵۳)

حالی مرحوم لکھتے ہیں "یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو مگر تمثیل نے

اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے، اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی۔ یہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانہ میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل ہمت معدوم ہیں۔ (یادگارِ غالب ص۱۱۳)

بنیادی تصور:۔ فقدانِ اہلِ ہمت۔

---

(۱۸۴)

(۱) کب وہ سنتا ہے کہانی میری ٭ اور پھر وہ بھی زبانی میری

مطلب:۔ اول تو وہ میری داستانِ غم سننا ہی نہیں چاہتا، اور پھر وہ بھی میری زبان سے!

بنیادی تصور:۔ اظہارِ بے اعتنائیِ محبوب۔

(۲) خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ ٭ دیکھ خوننابہ فشانی میری

مطلب:۔ تو مجھ سے اپنے غمزۂ خونریز کی خلش کا حال کیا پوچھتا ہے؟ میری خوننابہ فشانی ایک نظر دیکھ لے، تجھے خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔

بنیادی تصور:۔ صورت بہ بیں حالم مپرس۔

(۳) کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار ٭ مگر آشفتہ بیانی میری

مطلب:۔ پہلے مصرع میں سوال کیا ہے کہ میرے احباب میرے مرنے کے بعد میرا کون سا وصف بیان کر کے روئیں گے؟ مجھ میں تو کوئی خوبی ہی نہیں ہے۔ پھر دوسرے مصرع میں خود ہی جواب دیتے ہیں کہ شاید وہ میری آشفتہ بیانی (بے ربط

گفتگو) یاد کر کے روئیں! نکتہ اس میں یہ ہے کہ عاشق چونکہ سودائی ہوتا ہے اسلئے اس کی گفتگو عموماً غیر مربوط ہوتی ہے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید وہ میری بے سروپا شاعری کو یاد کر کے روئیں۔ اپنی عاشقانہ شاعری کو ازراہِ انکسار آشفتہ بیانی سے تعبیر کیا ہے۔

بنیادی تصور:- اشارہ سوئے آشفتہ بیانیٔ خویش۔

(۴) ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال ÷ بھول جاتا ہے نشانی میری

بیدا بمعنی صحرا۔

مطلب:- چونکہ میں خیال کے صحرا میں گم ہو چکا ہوں (از خود رفتہ) اس لیے مجھے بھول جانا ہی مجھے یاد رکھنا ہے۔ نزاکت خیال قابل تحسین ہے۔

بنیادی تصور:- تصویر از خود رفتگی۔

(۵) متقابل ہے مقابل میرا ÷ رک گیا، دیکھ روانی میری

مطلب:- غالب نے اس کا مطلب خود بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا، مثلاً نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم۔ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اور دوست، از روئے عادت، ضد ہمدگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا" (خطوط غالب جلد ۲ صـ ۲۸۲)

غالب کی یہ شرح خود تشریح طلب ہے اس لیے اس کا مطلب بیان کرتا ہوں متقابل بمعنی ضد۔ مثلاً نور اور ظلمت باہم متقابل ہیں یعنی ایک دوسرے کی ضد کی ہیں۔ مقابل سے معشوق مراد ہے۔ مصرع کی نثر یوں ہو گی "میرا مقابل، میرا متقابل ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ چونکہ میرا معشوق میری ضد واقع ہوا ہے اسلئے میری روانی

دیکھ کر رک گیا۔ واضح ہو کہ روانی اور رکنا ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس شعر سے غالب کا مقصد انہی کا تقابل تھا، اس لیے انھوں نے روانی اور رکنے کا مفہوم متعین نہیں کیا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ روانی سے ان کی مراد روانیٔ طبع یا حاضر جوابی ہے۔ اور رک جانے سے خفا ہو جانا مراد ہے۔ بریں تقدیر مطلب یہ ہوگا کہ وہ میری حاضر جوابی سے کبیدہ خاطر ہو گیا اس لیے مجھ سے راہ و رسم ترک کر دی۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ اختلافِ طبیعت۔

(۶) قدر سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں ÷ سخت ارزاں ہے گرانی میری

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی ہیں۔ کہتا ہے کہ میری قدر و قیمت اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گذرے۔ یعنی ہوں تو گرانقدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں جو سرِ راہ پڑا ہو۔ پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے" (یادگارِ غالب ص۱۴۳)

یہ شعر بھی غالب نے محض اس لیے لکھا کہ انھیں لفظ گرانی بطور قافیہ مل گیا جس میں ایہام پایا جاتا ہے اس کے علاوہ کوئی خاص نکتہ نہ اس شعر میں ہے نہ اس سے پہلے شعر میں۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ بے قدریٔ خویش۔

(۷) گردبادِ رہِ بیتابی ہوں ÷ صرصرِ شوق ہے بانی میری

گردباد۔ بمعنی بگولا۔ صرصر بمعنی آندھی۔ بانی بمعنی باعث۔

مطلب:۔ میں بیتابی کی راہ کا بگولا ہوں یعنی بگولے کی طرح اڑتا پھرتا ہوں، اور جذبۂ شوق اس کیفیت کا سبب ہے۔ اس شعر کا قافیہ (بانی) غیر فصیح اور غیر مانوس ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ جذبۂ شوق۔

(۸) دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا + کھل گئی ہیچمدانی میری

کھل گئی : یعنی ظاہر ہو گئی + ہیچمدان : یعنی بہت نادان یا جاہل۔

مطلب:۔ شعراء معشوق کے دہن کو معدوم (غیر معلوم) باندھا کرتے ہیں یہیں سے غالب نے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے کہ چونکہ میں اس کے دہن کی کیفیت معلوم نہ کر سکا (معدوم کا علم محال ہے) اس لیے نادانی، جہالت یا بے علمی ثابت ہو گئی اس شعر میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ نادانی خویش۔

(۹) کر دیا ضعف نے عاجز غالب + ننگِ پیری ہے جوانی میری

مطلب:۔ چونکہ مجھے ضعف نے بہت عاجز اور ناتواں کر دیا ہے اس لیے میری جوانی، بڑھاپے کے لیے بھی باعث شرم ہے یعنی میں جوانی میں بوڑھوں سے زیادہ نحیف ہوں۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ ناتوانی خویش۔

نوٹ:۔ مطلع کے علاوہ تمام اشعار کاوش ذہنی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں جو بیساختگی اور روانی مطلع میں ہے، کسی شعر میں نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قافیہ ذہن میں آیا۔ اسے دوسرے مصرع میں کھپایا۔ پھر کاوش بلیغ کے بعد پہلا مصرع بہم پہنچایا، تب کہیں شعر معرض وجود میں آیا۔

---

(۱۸۵)

(۱) نقشِ نازِ بتِ طناز، بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس، پئے خامۂ مانی مانگے

نقش بمعنی تصویر۔ پائے طاؤس بمعنی مور کا پاؤں، جو بہت بد صورت ہوتا ہے پے خامۂ مانی بمعنی مصور کے ہاتھ میں بطور قلم کام دینے کے لیے + مانی۔ ایران کے ایک مشہور مصور کا نام ہے۔

مطلب :۔ محبوب رقیب کی آغوش میں ہے۔ یہ منظر اس قدر کریہہ ہے کہ مصور کو اس کی تصویر مو قلم کے بجائے پائے طاؤس سے کھینچنی چاہیے۔ پائے طاؤس اس لیے لائے ہیں کہ رقیب بھی اسی کی طرح بدصورت ہے۔ تصنع ناروا اور تکلف بے جا کے سوا اس شعر میں اور کچھ نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ بد صورتیٔ رقیب۔

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے
(۲) غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

تماشا جانے یعنی پسند کرے۔

مطلب :۔ تو اس قدر بدمزاج ہے کہ تحیر (خاموشی) کو پسند کرتا ہے۔ یعنی تو یہ چاہتا ہے کہ میں تیرے سامنے بالکل خاموش بیٹھا رہوں اور میری حالت یہ ہے کہ میں داستانِ غم تجھے سنانی چاہتا ہوں، جس میں خوش بیانی کے بجائے، آشفتہ بیانی کا رنگ پیدا ہونا لازمی ہے اس لیے میں سخت پریشان ہوں کہ کیا کروں؟

بنیادی تصور :۔ تصویرِ کشمکش ذہنی۔

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
(۳) شعلہ تا نبضِ جگر، ریشہ دوانی مانگے

شعلہ سے مراد شعلۂ عشق ہے + نبضِ جگر سے جگر مراد ہے اور جگر سے سینہ مراد ہے۔ ریشہ دوانی سے تاثیر مراد ہے۔ لفظ ریشہ دوانی قصداً لائے ہیں کیونکہ پہلے

مصرع میں لفظ شمع موجود ہے اور شمع میں ریشہ ہوتا ہے۔ محاورہ میں ریشہ دوانی سے مراد ہے کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کرنا۔ مگر غالب نے اس کو تاثیر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

مطلب:۔ میں اس تپ عشق کا آرزومند ہوں جس کا شعلہ جگر کی گہرائی میں سرایت کر جائے یعنی مجھے اس طرح جلا کر خاک کر دے جس طرح ریشہ شمع کو جلا دیتا ہے

بنیادی تصور:۔ تمنائے شعلۂ جگر سوز۔

---

(۱۸۶)

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
(۱) ہر غنچہ کا گل ہونا، آغوش کشائی ہے

مطلب:۔ چونکہ باغ میں ہر پودے کو تیری صحبت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے اس لیے غنچے تجھ سے ہم آغوش ہونے کے لیے شگفتہ ہوتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ حسن تعلیل۔

واں کنگرِ استغناء ہر دم ہے بلندی پر
(۲) یاں نالہ کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

کنگر، غالب نے اس لفظ کو کنگرہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اگر "کنگرہ" لاتے تو مصرع بحر سے خارج ہو جاتا۔ کنگرہ بمعنی کنگورہ یا چوٹی یا ہر شئی کی بلندی

مطلب:۔ محبوب کے استغناء کا کنگورہ تو ہر دم اونچا ہوتا جاتا ہے یعنی اس کی شان بے نیازی تو ہر لحظہ عروج پر ہے اور ہمارا نالہ رسائی کا مدعی ہے یعنی اس کی بے رخائی تو ہر لحظہ زیادہ ہو رہی ہے اور ہم اسے اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ بیان سعیٔ لاحاصل۔

(۳) ازبسکہ سکھاتا ہے غم، ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا، اک چشم نمائی ہے

چشم نمائی بمعنی زجر و توبیخ۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔ گھر کی دینا۔ تنبیہ کرنا۔ داغ کو چشم سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ اسی لیے چشم نمائی میں ایہام کی صنعت پیدا ہو گئی۔
مطلب:۔ غم میرا استاد ہے وہ مجھے ضبط کی تعلیم دے رہا ہے۔ اس لیے جو داغ نمودار ہوتا ہے، میں اسے استاد کی چشم نمائی (تنبیہ) سمجھتا ہوں، کہ دیکھنا! دامن ضبط ہاتھ سے نہ چھٹ جائے۔
بنیادی تصور:۔ تعلیم ضبطِ آہ۔

---

(۱۸۷)

(۱) جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی!
لکھ دیجیو یارب! اُسے قسمت میں عدو کی

مطلب:۔ اے خدا! جو زخم اچھا ہو سکے، اسے رقیب کی قسمت میں لکھ دے۔ میں تو ایسے زخم کا آرزو مند ہوں جو کبھی اچھا نہ ہو سکے۔
بنیادی تصور:۔ تمنائے خلش دائمی۔

(۲) اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں" دوسرے مصرع میں لفظ "تو" نے یہ معنی پیدا کر دئے کہ آنکھوں سے لہو روتے روتے دل میں ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا اسلئے محبوب کی انگلی کی حنائی پور کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں

لہو کی ایک بوند نظر آتی ہے۔" (یادگار غالب ص۱۴۴)

غالب نے اس شعر میں معشوق کی انگلی کی پور کو، جو مہندی سے لال ہو گئی ہے، لہو کی بوند سے تشبیہ دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل نئی تشبیہ ہے۔

بنیادی تصور:۔ تحسینِ تصورِ سرِ انگشت حنائی۔

(۳)
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یاں سے دنیا مراد ہے۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ستم سے تنگ آکر حاکم یا خدا سے تیری فریاد کریں گے؛ اگر ہم ایسا کریں بھی تو بے سود ہے کیونکہ اس دنیا کا دستور یہ ہے کہ یہاں کوئی کسی کی فریاد نہیں سنتا، کوئی کسی کا ہمدرد یا غمگسار نہیں ہے۔" (یادگار غالب ص۱۴۴)

بنیادی تصور:۔ بیان فقدانِ ہمدردی۔

(۴)
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی
دشنہ نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

دوسرے شعر میں غالب نے دونوں محاورے بہت برمحل صرف کیے ہیں:۔

(ا) منہ لگانا یعنی التفات کرنا۔ (ب) بات پوچھنا یعنی توجہ کرنا۔

خوبی ان محاوروں میں یہ ہے کہ جب چھری چھبوتے ہیں تو اس کی نوک یعنی اس کا منہ جگر کو مس کرتا ہے اور آدمی ہمیشہ گلے ہی کے ذریعہ سے بات کرتا ہے۔

مطلب:۔ اس عاشق ناکام کی حالت پر ہزار افسوس، جو ساری عمر اس آرزو میں

رہا کہ اس کا ظالم اور سفاک محبوب کبھی اپنی چھری اس کے جگر میں چبھو کر یا کبھی اپنے خنجر سے اس کا گلا کاٹ کر اس کی آرزو پوری کرے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ حسرتِ عاشقِ ناکام۔

---

(۱۸۸)

سیماب، پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے، ہم
(۱) حیراں کئے ہوئے ہیں، دلِ بے قرار کے

سیماب ہمیشہ بے قرار (متحرک) رہتا ہے۔ پشت گرمی بمعنی امداد یا اعانت + شعراء آئینہ کو حیران باندھا کرتے ہیں + اس شعر میں غالب نے دلِ بے قرار کو سیماب سے اور اپنی حیرانی کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب:۔ سیماب کی قلعی سے شیشہ، آئینہ بن جاتا ہے اور آئینہ حیران ہوتا ہے اس لیے سیماب حیرانی کا باعث ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح سیماب آئینہ کی حیرانی کا سبب ہے اسی طرح دل بے قرار (سیماب) نے مجھے حیراں (محوِ حیرت) بنا دیا ہے۔ شعر کا مضمون تکلف سے خالی نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ وجہِ حیرانی۔

آغوشِ گل، کشودہ برائے وداع ہے
(۲) اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

مطلب:۔ غنچوں کا پھول بن جانا علامت ہے اس بات کی کہ بہار کا موسم ختم ہونے والا ہے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ بہار کو وداع (رخصت) کرنے کے لیے گلوں نے اپنی آغوش وا کر دی ہے۔ اے عندلیب! تو بھی باغ سے رخصت ہو جا کیونکہ بہار چند روز کی مہمان ہے۔

بنیادی تصور:۔ علامتِ رخصتِ بہار۔

---

(۱۸۹)

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
(۱) معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے

مطلب:۔ اگر وصال کے موقع پر معشوق اظہارِ تمکین و سنجیدگی کرے اور عاشق اظہارِ ضبط و تحمل کرے۔ تو وصل ہجر بن جائے گا یعنی وصل اور ہجر میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ایسے موقع پر معشوق کی طرف سے شوخی اور بے حجابی کا اور عاشق کی جانب سے بیباکی اور گستاخی کا اظہار ہونا چاہیئے۔

بنیادی تصور:۔ شرطِ لذتِ وصل۔

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں
(۲) شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

مطلب:۔ بوسۂ لبِ جاناں کے لیے شوق بے حد اور جرأتِ رندانہ درکار ہے

بنیادی تصور:۔ شرطِ حصولِ بوسہ۔

---

(۱۹۰)

(۱) چاہیئے اچھوں کو، جتنا چاہیئے ٭ یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

مطلب:۔ اگر محبت کرنی چاہتے ہو تو حسینوں سے محبت کرو۔ کیونکہ اگر وہ بھی تمہیں چاہنے لگیں تو پھر تمہیں دنیا میں کسی اور نعمت یا لذت کی حاجت نہیں رہیگی۔

بنیادی تصور:۔ ترغیب

(۲) صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر ٭ جائے مے، اپنے کو کھینچا چاہیئے

غالب نے یہ شعر محض ایہام گوئی کی خاطر موزوں کیا ہے۔ کھینچنے کے لفظ کے دو معنی ہیں۔ (ا) دور رہنا یا حذر کرنا (ب) شراب کھینچنا بمعنی شراب پینا مے کشیدن کا اردو ترجمہ ہے)۔

مطلب:- مے نوشوں کی صحبت سے دور رہنا چاہیئے یعنی شراب پینے کے بجائے اپنے آپ کو شراب سے دور رکھنا چاہیئے۔ بالفاظ دگر، میکشی کے بجائے مے سے کنارہ کشی کرو۔

بنیادی تصور:- تلقین اجتناب از میخواری۔

(۳) چاہنے کو تیرے، کیا سمجھا تھا دل ؛ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

یہاں بھی "سمجھنے" میں ایہام ہے (ا) سمجھنا بمعنی بات سمجھنا (ب) سمجھنا محاورے میں باز پرس کرنے کو کہتے ہیں۔

مطلب:- میرا دل تجھے چاہنے کو ہنسی کھیل سمجھتا تھا، اسی لیے اس نے میری بات نہیں مانی۔ لیکن اب سخت مصیبت میں گرفتار ہے لہذا میں اس سے باز پرس کروں گا اور اس حماقت کی سزا دوں گا۔

بنیادی تصور:- دشواریٔ راہ عشق۔

(۴) چاک مت کر جیب بے ایام گل ؛ کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

مطلب:- حالی کہتے ہیں "پھول کے کھلنے کو چاک گریباں سے تشبیہ دی جاتی ہے کہتا ہے کہ ہر کام نیچر (فطرت) کی ہدایت سے کرنا چاہیئے۔ پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے (شگفتہ نہ ہو) اس وقت تک تو بھی اپنا گریباں چاک نہ کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشش جنوں زیادہ ہوتا ہے۔" (یادگار غالب ص۱۴۲)

بنیادی تصور:- تلقینِ اتباعِ فطرت۔

(۵) دوستی کا پردہ ہے بیگانگی ؎ منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے
مطلب :۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ تم تو مجھ سے اس لیے منہ چھپاتے ہو (پردہ کرتے ہو) کہ دوسروں کو یہ یقین ہو جائے کہ تم مجھ کو بیگانہ سمجھتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمہارے اس طرزِ عمل سے لگاوٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے تم جس طرح اوروں کے سامنے آتے ہو اسی طرح میرے سامنے بھی آیا کرو۔ یہ شعر مومنؔ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔
بنیادی تصور :۔ ترغیبِ ترکِ حجاب۔
(۶) دشمنی نے میری کھویا غیر کو ؎ کس قدر دشمن ہے ادیکھا چاہیئے
مطلب :۔ غور کرو! محبوب کو تجھ سے اس درجہ دشمنی ہے کہ غیر (رقیب) نے اس کے سامنے میری برائی کی تو وہ اس سے بھی ناراض ہو گیا کہ تو نے میرے سامنے اس کا نام ہی کیوں لیا؟ یہ شعر بھی مومن کے رنگ کا ہے۔
(۷) اپنی، رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی ؎ یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے
"اپنی" کا تعلق رسوائی سے نہیں ہے بلکہ سعی سے ہے۔
مطلب :۔ ہم لاکھ رسوائی کی کوشش کریں کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں محبوب اگر اپنا جلوہ دکھاتا رہے تو ہم مست و بیخود ہو جائیں گے اور یہ حالت یقیناً رسوائی کا موجب ہو جائے گی۔
بنیادی تصور :۔ ثمرۂ ہنگامہ آرائی محبوب۔
(۸) منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ؎ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے
مطلب :۔ حالی لکھتے ہیں "ناامیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔" (یادگارِ غالب صہ ۱۱۳)
یعنی وہ شخص کتنا ناامید ہو گا جس کی سب سے بڑی امید (آرزو) یہ ہو کہ اسے

موت آجائے تو تمام غموں سے رہائی حاصل ہو جائے۔
دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص بھی کتنا بدنصیب ہے جس کی آرزو کا حصول، موت پر منحصر ہو ظاہر ہے جب انسان مر گیا، پھر آرزو بر آئی تو کیا حاصل؟ اس میں شک نہیں کہ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔
بنیادی تصور :۔ غایت نامرادی و مایوسی۔
(۹) غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے ؛ چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے
مطلب :۔ مطلب بالکل واضح ہے کہ حسینانِ جہاں عموماً خوش شکل عاشقوں کی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ بدصورتوں کی طرف کون ملتفت ہوتا ہے۔ بقول داغ :۔

داغ کی شکل دیکھ کر بولے
ایسی صورت کو پیار کون کرے

بنیادی تصور :۔ حکمرانیٔ قانونِ فطرت۔
(۱۰) چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ ؛ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے
مطلب :۔ اپنے اوپر طنز کیا ہے کہ اسدؔ بھی حسینوں کو چاہتے ہیں! ذرا ان کی صورت تو دیکھو! دوسرے مصرع کی برجستگی اور سلاست قابل داد ہے۔ محاورہ کتنا برمحل صرف ہوا ہے۔ صورت کے دونوں معنی چسپاں ہو سکتے ہیں صورت (۱) لفظی معنی شکل و صورت (۲) سادہ لوحی یا حماقت مآبی۔
بنیادی تصور :۔ طنز بر جسارتِ خویش۔
نوٹ :۔ تمام مطبوعہ نسخوں میں مقطع آخر میں درج ہے لیکن نظمؔ طباطبائی نے آخری شعر مقطع کے بعد درج کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ ترتیب معکوس، تفہیم کلام کے لیے بہت مفید ہے۔ بریں تقدیر مطلب یہ ہوگا :۔

"اسد خوبرویوں کو چاہتے ہیں۔ ذرا آپ کی صورت تو دیکھو! اس کے بعد خود ہی اپنے آپ کو متنبہ کرتے ہیں کہ اے غافل ان طلعتوں کو چاہنے والا خود بھی حسین اور مہ طلعت ہی ہونا چاہیئے۔"

---

(۱۹۱)

(۱)
ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

مطلب:۔ بات تو معمولی ہے مگر کہنے کا انداز دلکش ہے۔ کہتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ مسافر کا ہر قدم اس کی منزل کو نزدیک کر دیتا ہے مگر میری بدقسمتی دیکھو کہ جس قدر آگے بڑھتا ہوں منزل اسی قدر دور ہوتی جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ بیان دوریٔ منزل۔

(۲)
درس عنوان تماشا، بتغافل خوشتر
ہے نگہ، رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

درس عنوان تماشا یعنی تماشا۔ تماشا معنی دیدارِ محبوب۔ بتغافل خوشتر یعنی دیدار کا حقیقی لطف اس میں مضمر ہے کہ محبوب کو خبر نہ ہو۔ نگاہ کو رشتۂ شیرازہ مژگاں قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ میری نگاہ بھی رشتۂ شیرازۂ مژگاں کی طرح غیر محسوس ہے۔ مجھ سے یعنی میرا۔

مطلب:۔ صرف اس قدر ہے کہ محبوب کو دیکھنے کا لطف اسی بات میں مضمر ہے کہ اسے اس انداز سے دیکھا جائے کہ اسے علم نہ ہو کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ نظارۂ پنہاں۔

(۳)
وحشت آتش دل سے، شب تنہائی میں
صورت دود رہا، سایہ گریزاں مجھ سے

مطلب :۔ صرف اتنا ہے کہ شب فراق میں بوجہ وحشتِ دل میرا سایہ بھی مجھ سے اسی طرح گریزاں رہا جس طرح دھواں آگ سے گریزاں رہتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ وحشتِ دل یا کیفیت شب تنہائی۔

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بُتاں
(۴) کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

غمِ عشاق یعنی غمِ وفاتِ عشاق۔ سادگی آموز یعنی ترک آرائش کا سبب۔ خانۂ آئینہ یعنی آئینہ۔ مجھ سے یعنی میری وفات کی وجہ سے۔

مطلب :۔ میری وفات کی وجہ سے آئینہ ویران ہو گیا۔ یعنی محبوب نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے محبوب کی تقلید میں تمام حسینانِ جہاں اپنے عاشقوں کے غم میں آرائش ترک کر دیں۔

اگر غمِ عشاق کو منادی قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے غمِ عشاق! خدا کے لیے حسینوں کو ترکِ آرائش پر راغب مت کر! دیکھ! میرے محبوب نے میرے غم میں آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا۔

بنیادی تصور :۔ یاسِ آرائش محبوب۔

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
(۵) صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

اس شعر میں آبلہ کو گوہر سے اور جادۂ صحرا کو رشتۂ گوہر سے تشبیہ دی ہے مجھ سے یعنی میرے آبلوں کی وجہ سے۔

مطلب :۔ صرف اس قدر ہے کہ جب میرے پاؤں کے چھالے کانٹے لگنے سے پھوٹ گئے تو خون کے قطروں کی وجہ سے جادۂ صحرا میں چراغاں کا سامان پیدا ہو گیا یعنی سینکڑوں چراغ روشن ہو گئے۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ صحرا نوردی۔

(۶) بیخودی ، بسترِ تمہید فراغت ہو جو
پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

چونکہ تمہید کے لفظی معنی ہیں بچھانا۔ اسی لیے بستر کا لفظ لائے ہیں۔ لیکن یہاں تمہید کو اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے یعنی تہیّہ کار یا فراہم آوردن ۔ ہو جیو یا ہو جیو کلمۂ دعائیہ ہے۔ یعنی خدا کرے ایسا ہو۔

مطلب :۔ خدا کرے میری بیخودی ، میری فراغت (راحت) کا سبب بنی رہے کیونکہ اس کی وجہ سے میرا گھر مجھ سے اسی طرح معمور ہے جس طرح سایہ کا گھر ، سایہ سے معمور ہوتا ہے۔ یا بالفاظِ دگر ، خدا میری بیخودی کا بھلا کرے جس کی بدولت میں اپنے گھر میں آرام سے لیٹا ہوا ہوں۔

بنیادی تصور :۔ اعترافِ احسان بیخودی۔

(۷) شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ ، مثلِ گلِ شمع ، پریشاں مجھ سے

مجھے گردن مارے یعنی مجھے قتل کرے ، اگر شمع کا گل کترا جائے تو دھواں پھیل کر منتشر (پریشان) ہو جاتا ہے ۔ اور شمع کی روشنی بڑھ جاتی ہے یعنی دونوں باتیں یہاں مراد ہیں۔

مطلب :۔ اے محبوب ! اگر تو شوقِ دیدار میں مجھے قتل کر دے تو شمع کے گل کی طرح میری نگاہ تجھے دیکھنے کے لیے چاروں طرف پھیل جائے گی یا اور زیادہ روشن ہو جائے گی۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ شوقِ دیدار۔

(۸) بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

مطلب :۔ شب ہجر کی وحشت کا یہ عالم ہے کہ میرا سایہ بھی خوف زدہ ہو کر مجھ سے دور ہو گیا اور خورشید قیامت میں پوشیدہ ہو گیا۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ وحشتِ شب فراق۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگین تجھ سے
(۹) آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

جلوۂ رنگیں یعنی جلوۂ حسن رنگیں۔ جلوۂ رنگیں کو ساغر اس لیے قرار دیا کہ اس کو دیکھ کر لوگ بیخود ہو رہے ہیں۔ یعنی تیرا جلوہ ہوشربا ہے۔

مطلب :۔ اگر جلوۂ حسن کا تعلق تجھ سے ہے تو حیرانیٔ عشق کا تعلق مجھ سے ہے یعنی اگر تیرا کام جلوہ دکھا کر مست و بیخود بنانا ہے تو میرا کام آئینہ کی طرح محو حیرت ہو جانا ہے بالفاظِ دگر تیرے حسن کا تقاضا یہ ہے کہ تو جلوہ دکھائے۔ میرے عشق کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے حیران بنائے۔

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ حسن و عشق۔

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
(۱۰) ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

مطلب :۔ چونکہ دل کی گرمی آنکھوں میں اتر آئی ہے اس لیے نگاہ میں اس قدر گرمی پیدا ہو گئی کہ گلستاں کا خس و خاشاک بھی جل اٹھا۔ گویا گلستاں میں چراغاں ہو رہا ہے۔

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ نگاہِ گرم

---

(۱۹۲)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
(۱) کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

نکتہ چیں بمعنی معترض - دوسرے مصرع میں دو محاورے باندھے ہیں :-
(۱) بات بن گئی یعنی مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی - (۲) بات بنانا یعنی کسی کو مطمئن کرنا یا کسی کے اعتراض کا جواب دینا +

مطلب :- چونکہ محبوب کو بات بات پر اعتراض کرنے کی عادت ہے - اس لیے میں اپنا غمِ دل اس کو نہیں سنا سکتا - سچ ہے - جہاں بات بنائے نہ بن سکے وہاں بات کیسے بن سکتی ہے! یعنی چونکہ میں اسے مطمئن نہیں کر سکتا اس لیے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی -

بنیادی تصور :- دشواریٔ حصولِ مقصد -

(۲)
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کسی پر بن جانا محاورہ ہے اس کا مطلب ہے کسی مصیبت میں مبتلا ہو جانا یا کسی وجہ سے مجبور ہو جانا -

مطلب :- میں اسے بلا تو رہا ہوں مگر مجھے امید نہیں کہ وہ آجائے گا - اس لیے اے جذبۂ دل تو اپنی تاثیر دکھا یعنی اسے مجبور کر دے کہ وہ بے اختیار کھنچا چلا آئے -

بنیادی تصور :- امتحانِ جذبِ دل -

(۳)
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

مطلب :- محبوب نے میرے ستانے کو کھیل سمجھ لیا ہے اس لیے میں ڈرتا ہوں مبادا وہ اس شغل سے باز آجائے چونکہ مجھے اس میں بڑی لذت محسوس ہوتی ہے - اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ اسے میرے ستانے میں ایسا لطف آنے لگے وہ مجھے ہمیشہ ستاتا رہے میرے ستائے بغیر اسے چین نہ پڑ سکے -

بنیادی تصور:۔ تمنائے دوامِ لذتِ آزار۔

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
(۴) کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے؛ تو چھپائے نہ بنے

مطلب:۔ اے محبوب! رقیب تیرے خط کو یوں لیے پھرتا ہے کہ اگر کوئی اس سے پوچھ بیٹھے کہ یہ کس کا خط ہے تو وہ مجبوراً تیرا نام لے گا۔ اور اس طرح تجھے رسوا کر دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آئندہ اسے خط مت لکھنا۔

بنیادی تصور:۔ پاسِ ناموسِ محبوب۔

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
(۵) ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

مطلب:۔ محبوب کی نزاکت ہمارے حق میں بہت مضر ہے کیونکہ اگر وہ ہمیں مل بھی جائیں تو ہم ان کی نزاکت کے ڈر سے انہیں چھو بھی نہیں سکتے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ نزاکتِ محبوب۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
(۶) پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

یہ شعر بیت الغزل ہے۔ اول تو مضمون ہی سراپا نور ہے۔ اس پر اندازِ بیان گویا نورٌ علیٰ نور ہے۔

پردہ چھوڑنے کے دو معنی ہیں اور یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں (۱) پردہ چھوڑنا استعارہ ہے کائنات سے۔ کیونکہ یہ کائنات "حجابِ رُخِ یار" ہے۔ وہ اسی پردے میں تو پوشیدہ ہے۔

حجابِ رُخِ یار تھے، آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا (درد)

(۳) پردہ چھوڑنے کے لفظی معنی ہیں کسی شئی کو پردے میں پوشیدہ کر دینا۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اس نے اپنی ذات کو کائنات کے پردے میں پوشیدہ کر دیا ہے۔ یہ پردہ اٹھ جائے تو وہی وہ باقی رہ جائے۔

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا (سودا)

پردۂ ہستیٔ موہوم اٹھا دو پہلے!
پھر جہاں چاہو وہاں یار کو دیکھا کرنا (بیدم)

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اس میں تو شک نہیں کہ یہ کائنات بذاتِ خود کچھ نہیں ہے محض اس کی جلوہ گری ہے۔ مگر چونکہ وہ خود اس پردے میں پوشیدہ ہو گیا ہے اور عوام الناس اس پردے کو اٹھا نہیں سکتے اس لیے وہ عرفانِ حقیقت سے محروم ہیں یعنی بالیقین نہیں کہہ سکتے کہ یہ اسی کی جلوہ گری ہے۔

ہاں جو لوگ اہلِ معرفت ہیں وہ جانتے ہیں کہ بلاشبہ یہ کائنات اسی کی جلوہ گری ہے یعنی ان مظاہر سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا (دردؔ)

اقبال نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:۔

ما ترا جوئیم و تو از دیدہ دور ٭ نے غلط، ما کور و تو اندر حضور (جاوید نامہ)

بنیادی تصور:۔ تلقینِ وحدت الوجود۔

موت کی راہ نہ دیکھوں؛ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؛ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے (۷)

مطلب :- غالب نے اس کا مطلب اپنے دوست منشی نبی بخش حقیر کو یہ لکھ کر بھیجا تھا :-

"بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا ! قصہ یہ ہے کہ اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعریض ، معشوق سے کیے گئے ہیں ۔ "موت کی راہ نہ دیکھوں ؟ کیوں نہ دیکھوں ! میں تو دیکھوں ہی گا کہ بن آئے نہ رہے کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے کہ ایک دن آئے ہی گی ، انتظار ضائع نہ جائے گا ۔" تم کو چاہوں" کیا خوب ! کیوں چاہوں ! کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تمہیں بلا سکے ۔ گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں ، اس میں یہ خوبی ہے کہ بن بلائے ، بغیر آئے نہیں رہتی ۔

بات یہ ہے کہ پڑھنے میں یہ جملہ "تم کو چاہوں کہ نہ آؤ" ملا ہوا سمجھ میں آتا ہے اس لیے آدمی حیران ہو جاتا ہے ۔ "تم کو چاہوں" الگ ہے یہ "کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے" یہ جملہ الگ ہے تم نے غور نہ کی ورنہ اس تعریض و استفہام کی کیفیت خود بخود حاصل ہو جاتی ۔"

بنیادی تصور :- طنز و تعریض بر معشوق ۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
(۸)
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

مطلب :- دونوں مصرعوں کا مضمون یکساں ہے یعنی میں اس سنگدل سے محبت کر کے سخت مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں ۔ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔

بنیادی تصور :- دشواریٔ وصالِ محبوب ۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
(۹) کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مطلب:۔ عشق پر کسی کا زور نہیں چل سکتا۔ کیونکہ یہ وہ آگ ہے کہ ہم اگر کسی کے دل میں لگانا چاہیں تو لگا نہیں سکتے۔ اور اگر کسی کی آگ بجھانا چاہیں تو بجھا نہیں سکتے یعنی کوئی شخص نہ کسی کو اختیارِ عشق پر راغب کر سکتا ہے نہ ترک پر۔

بنیادی تصور:۔ بالادستیٔ جذبۂ عشق۔

نوٹ:۔ غالب نے اپنے ایک خط میں یہ غزل حقیر کو بدیں تمہید لکھ کر بھیجی تھی۔

"آج دوپہر کو میں نے ایک غزل لکھی ہے۔ کل یا پرسوں (قلعہ میں) جا کر پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں داد دینا کہ اگر ریختہ (اردو شاعری) پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل؟"

(نادراتِ غالب ص ۱۲)

---

(۱۹۳)

چاک کی خواہش اگر وحشت، بہ عریانی کرے
(۱) صبح کے مانند زخم دل، گریبانی کرے

بہ عریانی بمعنی بحالتِ عریانی "صبح کے مانند" اس لیے کہا کہ شعرا عموماً صبح کو گریباں چاک باندھا کرتے ہیں مثلاً

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغ ہجراں کا
طلوعِ صبح محشر، چاک ہے میرے گریباں کا

"گریبانی کرے" یہ فارسی محاورے "گریباں کردن" کا ترجمہ ہے یعنی چاک کرے۔

مطلب :- میں تو جوشِ جنوں میں پہلے ہی کپڑے پھاڑ کر عریاں ہو چکا ہوں اس کے باوجود اگر میری وحشتِ دل، گریباں چاک کرنے کی خواہش کرے تو میرا زخمِ دل، صبح کی مانند، خود چاک ہو کر اس کی تمنا پوری کر دے گا۔

بنیادی تصور :- بیانِ شدتِ وحشت۔

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
(۲) دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

مطلب :- تیرا جلوہ اس قدر دلکش ہے کہ دیکھنا در کنار، محض اس کے تصور سے عاشق کا دل، یعنی عاشق سراپا حیرت بن جاتا ہے۔

بنیادی تصور :- دلکشیٔ جلوۂ محبوب۔

ہے شکستن سے بھی دل مایوس یارب کب تلک
(۳) آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

آبگینہ کنایہ ہے دل سے اور کوہ کنایہ ہے محبوب سے جس کا دل پتھر (کوہ) کی طرح سخت ہے۔ عرضِ گراں جانی یعنی اظہارِ پریشانی و دل تنگی۔

مطلب :- پہلے تو میں یہ چاہتا تھا کہ معشوق مجھ پر مہربانی کرے لیکن جب مایوسی ہو گئی تو میں نے یہ چاہا کہ وہ میرے دل کو شکستہ ہی کر دے یعنی مجھ پر ظلم و ستم کرے مگر اس کی سنگدلی کا یہ عالم ہے کہ وہ مجھ پر ظلم و ستم بھی نہیں کرتا اس لیے اب میں شکستگیٔ دل سے بھی مایوس ہو چکا ہوں۔ اے خدا! میں کب تک اس سنگدل کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کرتا رہوں گا!

بنیادی تصور :- بیانِ تغافل شعاریٔ محبوب۔

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست
(۴) موئے شیشہ، دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

پہلے مصرع میں شکستِ میکدہ سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگر چشم یار کی شراب کا نشہ، میکدے کی شراب کے نشہ سے بڑھ جائے تو میکدہ یقیناً چشم یار کے مقابلہ میں شکست پا جائے گا۔ موئے شیشہ سے مراد وہ بال ہے جو شیشے کے ٹوٹ جانے کے بعد اس میں پڑ جاتا ہے۔ مژگانی کرے یعنی مژگاں کا کام دے + اگر یہ سوال ہو کہ دیدۂ ساغر میں بال کہاں سے پڑ گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے شیشے میں جو لکیر پڑ جاتی ہے اسے محاورے میں بال کہتے ہیں۔ غالب نے اپنی مطلب برآری کے لیے اس بال کو اس کے لفظی معنی میں استعمال کر لیا اور ساغر کے لیے دیدۂ فرض کر کے اس بال کو پلک بنا دیا۔ اگر یہ سوال ہو کہ ساغر میں یہ بال کیسے یا کیونکر پڑا تو جواب یہ ہے کہ غالب نے لفظ شکست کو جو پہلے مصرع میں ہے، لفظی معنی میں بھی استعمال کیا ہے یعنی شکست پانے کے دو معنی ہیں (۱) مغلوب ہو جانا۔ یہ معنی پہلے مصرع میں مراد لئے ہیں (۲) ٹوٹ جانا۔ یہ معنی مراد لے کر ساغر کو توڑ دیا اور جب وہ ٹوٹ گیا تو لکیر پڑ گئی۔ اس لکیر کو محاورے میں بال کہتے ہیں۔ اس لیے ساغر میں بال پڑ گیا۔

میں نے یہ وضاحت اس لیے کی ہے کہ ناظرین کو اس بات کا کچھ اندازہ ہو جائے کہ غالب نے کس قدر دور از کار اور بعید از عقل و قیاس مفروضات پر اس شعر کی عمارت قائم کی ہے۔ اسی لیے اس شعر کا مفہوم متعین کرنا بہت دشوار ہے چنانچہ نظم طباطبائی لکھتے ہیں کہ

"اس قدر تصنع اور مضمون کچھ نہیں۔" (شرح دیوان غالب صفحہ ۲۳)

جوش ملسیانی لکھتے ہیں "اس کا مطلب کھینچا تانی سے لکھنا پڑتا ہے ورنہ اس شعر میں لفظ ہی لفظ ہیں اور وہ بھی بہت بے ربط۔ غور کیجیے! کس تکلف سے بال پیدا کئے ہیں اور کہاں جا کر ان کی پلکیں بنائی ہیں! اس کے باوجود یہ عقدہ حل نہیں

ہوتا کہ اس تکلف کا مقصد کیا ہے۔"

مطلب:- اس شعر کا مطلب جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر محبوب کی ناز آفریں مست نگاہوں کے مقابلہ میں میکدہ شکست پا جائے یعنی ٹوٹ جائے تو چونکہ یہ فعل اس کی آنکھوں نے کیا ہے اس لیے ساغر کے ٹوٹنے سے جو بال اس میں پڑے گا، وہ بھی چشم ساغر کی پلک بن جائے گا یعنی بہت دلکش معلوم ہوگا۔ یعنی محبوب کی چشم مست حسین ہی نہیں ہے بلکہ حسن آفریں بھی ہے جس شئے پر پڑ جاتی ہے اُسے بھی حسین بنا دیتی ہے!

بنیادی تصور:- حُسن آفرینیِ چشم محبوب۔

نوٹ:- جناب نیاز فتحپوری نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "چشم یار سے جو مستی اور بیخودی پیدا ہوتی ہے وہ خم کا خم پی جانے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ بات میکدے کے لیے اتنی باعثِ شرم ہے کہ ساغر بھی اس کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔

یہ شعر دور از کار مفروضات سے قطع نظر، اصل خیال کے لحاظ سے قابل داد ہے۔" (نگار بابت ماہ جون ۱۹۵۷ء صفحہ ۴۰)

(۵)
خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

یک قلم یعنی سراسر یا ہر طرح + خط، عارض، زلف اور قلم میں رعایت لفظی ہے قلم میں ایہام ہے۔ خط یا عہد نامہ قلم سے لکھتے ہیں اور رخساروں پر بھی قلمیں ہوتی ہیں + زلف اور پریشانی میں بھی رعایتِ لفظی ہے۔

مطلب:- محبوب کے رخسار پر جو خط نمایاں ہوا ہے یہ دراصل وہ عہد نامہ ہے جو میری الفت نے زلف کو لکھ کر دیا ہے کہ وہ مجھے جس قدر پریشانی دے

مجھے منظور ہے۔ یہ شعر بھی تصنع سے خالی نہیں ہے، محض رعایت لفظی کی خاطر موزوں کیا گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ دوامِ رابطۂ قلبی۔

---

(۱۹۴)

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
(۱) دے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے

مطلب:۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں سو جاؤں تو محبوب، خواب میں آ کر مجھے تسکین دے گا، مگر دشواری تو یہ ہے کہ تپشِ دل کی وجہ سے مجھے کسی طرح نیند ہی نہیں آتی۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ کیفیتِ بےخوابی۔

کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا
(۲) تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

آب کے دو معنی ہیں (۱) پانی اور آنسو بھی پانی ہی ہوتا ہے (۲) آب و تاب یا دھار کی تیزی۔ آب کی وجہ سے تیغِ نگاہ کی ترکیب استعمال کی ہے۔

مطلب:۔ جب تو لگاوٹ میں آبدیدہ ہو جاتا ہے تو تیری آنکھیں اس قدر حسین ہو جاتی ہیں کہ میں تو قتل ہو جاتا ہوں (جان قربان کرنے کو جی چاہتا ہے) سچ تو یہ ہے کہ کوئی معشوق تیری طرح تیغِ نگاہ کو آب نہیں دے سکتا۔ یعنی آنسو کسی کی آنکھ میں اس قدر دلکش معلوم نہیں ہوتا۔

بنیادی تصور:۔ تحسینِ چشمِ پرآب۔

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو!
(۳) نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

مطلب :۔ اگر تو بوسہ دینا نہیں چاہتا تو انکار ہی کر دے۔ ہم چونکہ صدمۂ انکار کی تاب نہیں لا سکتے اس لیے ہمارا قصہ تمام ہو جائے گا اور اس طرح ہم غم کے ہاتھوں سے چھوٹ جائیں گے۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ شدتِ تلخیٔ حیات۔

پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے،
(۴) پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

مطلب :۔ اگر تو ہم سے متنفر ہے اور اس لیے اپنے پیالہ میں پلانا نہیں چاہتا تو ہم اوک سے پی لیں گے۔ غرض تو پینے سے ہے، پیالے سے نہ سہی اوک سے سہی۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ آرزوئے مینوشی۔

اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
(۵) کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

مطلب :۔ جب اس نے مجھ سے کہا کہ ذرا میرے پاؤں تو دبا" تو خوشی کے مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ اس کے پاؤں کو مس کرنے کی مسرت حاصل نہ ہو سکی۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ بدبختیٔ تو لیش۔

---

(۱۹۵)

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
(۱) مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

مطلب :۔ چونکہ تپشِ فراق کی وجہ سے میرا سر تکیے کے حق میں اور میرا تن بستر کے حق میں موجبِ زحمت ہے اس لیے میرے بستر کا ہر تار ایک عجیب کشمکش میں

مبتلا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہار شدتِ تپش۔

سرشکِ سر بصحرا دادہ، نور العین دامن ہے

(۲) دل بے دست و پا افتادہ، برخوردار بستر ہے

نور العین (آنکھ کا نور) اور برخوردار یہ دونوں لفظ فرزند کے لیے مستعمل ہیں مطلب یہ ہے کہ دامن کو آنسو سے اور بستر کو دل سے وہی انس پیدا ہو گیا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتا ہے۔

مطلب:۔ میرا دامن ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتا ہے اور میں ہمیشہ بستر پر پڑا رہتا ہوں۔ اس شعر میں بھی الفاظ کی بازی گری کے علاوہ اور کوئی خوبی نہیں ہے

بنیادی تصور:۔ اظہارِ حالتِ زار۔

خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو

(۳) فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدار بستر ہے

مطلب:۔ میری علالت میرے حق میں کس قدر مبارک ہے کہ تم مجھے دیکھنے آئے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں فروغِ شمع کو اپنا طالعِ بیدار سمجھتا ہوں یعنی مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمع روشن نہیں ہے بلکہ میرا نصیب چمک رہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ مسرتِ آمدِ محبوب۔

بطوفان گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

(۴) شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے

مطلب:۔ شبِ تنہائی (فراق) کے جوشِ اضطراب کے طوفان گاہ میں یعنی شبِ فراق میں تاریکی کا یہ عالم ہے کہ تارِ بستر بھی شعاعِ آفتابِ محشر کی طرح چمک رہا ہے۔

بنیادی تصور: مبالغۂ تاریکیٔ شبِ تنہائی۔

نوٹ: جناب نیاز فتحپوری فرماتے ہیں کہ پہلے مصرع میں طوفان گاہ اور جوش کا آفتاب صبح محشر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دونوں لفظ محض مصرع پورا کرنے کے لیے لائے گئے ہیں۔

ابھی آتی ہے بو، بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
(۵) ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

بو یعنی خوشبو+ بالش بمعنی تکیہ+ پہلے مصرع میں بو اور بالش ان دو لفظوں کا اجتماع ذوق سلیم پر گراں محسوس ہوتا ہے۔ اگر بالش کی جگہ تکیہ ہوتا تو تنافر کا یہ عیب دور ہو جاتا مگر اس صورت میں غالبیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ "اس کی زلف مشکیں کی" یہ ترکیب بھی غیر فصیح ہے۔

مطلب: صرف اس قدر ہے کہ ہمیں زلیخا کی طرح اپنے محبوب کو صرف خواب میں دیکھ کر تسکین حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہمارا محبوب تو ہمارے پاس آتا ہے چنانچہ کل شب آیا تھا اور آج تک اس کی زلفوں کی خوشبو ہمارے تکیے سے آ رہی ہے۔

بنیادی تصور: اظہارِ تفوق بر زلیخا۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
(۶) کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر، خارِ بستر ہے

مطلب: ہجر یار میں بیتابیٔ دل کی یہ حالت ہے کہ بستر کا ہر تار کانٹے کی طرح جسم میں چبھ رہا ہے۔

بنیادی تصور: اظہارِ اذیتِ ہجرِ یار۔

خطر ہے رشتۂ الفت، رگ گردن نہ ہو جائے
(۱) غرورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جائے

رگِ گردن کے دو معنی ہیں (۱) گردن کی رگ یا رگ جاں (۲) نخوت و غرور۔ رگ گردن نہ ہو جائے یعنی رگ گردن کی طرح منقطع نہ ہو جائے۔
مطلب :۔ یہ شعر غالب کے پیچیدہ اور معلق اشعار میں سے ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے تیری دوستی پر غرور ہے۔ چونکہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے اس لیے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں تو میرا دشمن نہ ہو جائے اور دشمن ہو کر رشتۂ الفت نہ کاٹ دے اشارہ یہ ہے کہ میں تیری دشمنی سے خائف ہوں، اس لیے نہیں کہ تو رگِ گردن کاٹ دے گا بلکہ اس لیے کہ رشتۂ الفت منقطع کر دے گا۔ شاعر نے رشتۂ الفت کو اپنی رگ گردن پر ترجیح دی ہے۔ یہی اس شعر کی خوبی ہے۔
بنیادی تصور :۔ آرزوئے دوامِ تعلق۔

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالب
(۲) اگر گل، سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

مطلب :۔ اگر فصل بہار میں پھولوں کی اس قدر کثرت نہ ہو کہ سرو ان میں پوشیدہ ہو جائے تو یقیناً یہ بات فصل بہار کی کوتاہی پر دلالت کرتی ہے یعنی بہار کا مزہ تو جب ہے کہ کثرتِ گل سے سرو جیسی نمایاں شئی بھی پوشیدہ ہو جائے۔
بنیادی تصور :۔ مبالغۂ موسم بہار۔

---

(۱۹۷)

(۱) فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے ؛ نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
مطلب :۔ فریاد کرنے کے لیے کسی خاص دھن کی ضرورت نہیں ہے اور نالہ

کرتے کے لیے کسی بانسری کی حاجت نہیں ہے۔ یعنی نالہ وفریاد کی خوبی اس کی تاثیر پر موقوف ہے۔ اس کے لیے تصنع درکار نہیں ہے، بہت خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ع بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

(۲) کیوں الٹے ہیں باغباں تونبے ٭ گر باغ گدائے مے نہیں ہے

تونبے سے فقیروں کا کشکول اور شراب کا کدو بنایا جاتا ہے۔

مطلب:۔ چونکہ باغبان تونبے بوتے ہیں اس لیے ثابت ہوا کہ باغ بھی شراب کا آرزومند ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ ہر دلعزیزئ شراب۔

(۳) ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے ٭ پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

مطلب:۔ اے خدا! اگرچہ ہر شے میں تیری ہی جلوہ گری ہے، یعنی ہر شے سے تو ہی ظاہر ہو رہا ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی شے تیری مثل (مانند) نہیں ہے یعنی کسی شے کو خدا نہیں کہہ سکتے۔

بنیادی تصور:۔ لیس کمثلہٖ شیٔ (قرآن ۴۲-۱۱)

(۴) ہاں! کھائیو مت، فریبِ ہستی ٭ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مطلب:۔ خبردار! کائنات کو فی الحقیقت موجود مت سمجھ لینا! ہر چند لوگ تجھ سے یہ کہیں کہ یہ کائنات فی الحقیقت موجود ہے مگر تو کسی کے کہنے میں مت آجانا۔ حق یہ ہے کہ یہ کائنات دراصل موجود نہیں ہے یعنی اس کی ہستی حقیقی نہیں ہے محض اعتباری ہے۔

بنیادی تصور:۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(۵) شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے ٭ اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

اردی، موسم بہار کا اور دے، خزاں کا مہینہ ہے۔

مطلب :- اگر تو غم سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ خوشی کا احساس دل سے نکال دے۔ غم دراصل خوشی کے زوال کا دوسرا نام ہے۔ اگر تو خوشی سے قطع تعلق کرے گا تو تجھے کبھی غم نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر موسم بہار نہ آئے تو خزاں بھی نہیں آسکتی۔

بنیادی تصور :- تدبیر دفع غم۔

(۶) کیوں رد قدح کرے ہے زاہد ✤ مے ہے یہ، مگس کی قے نہیں ہے

رد قدح بمعنی شراب کے پیالے کو بغیر پیئے واپس کر دینا یا شراب نوشی سے انکار کرنا۔

مطلب :- اے زاہد! تو شراب پینے سے کیوں انکار کرتا ہے۔ یہ شراب ہے یعنی بہت قیمتی شے ہے، مگس کی قے (شہد) نہیں ہے۔ شہد کو مگس (مکھی) کی قے سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ زاہد اس سے متنفر ہو جائے۔ اشارہ یہ ہے کہ قابلِ نفرت چیز شہد ہے نہ کہ شراب۔

بنیادی تصور :- ترجیح شراب بر شہد۔

(۷) ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب ✤ آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

مطلب :- چونکہ اس غزل کی ردیف میں "نہیں ہے" بار بار آیا ہے، اس لیے غالب نے اپنا نام ہی "نہیں ہے" رکھ لیا ہے اور اب اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ جب تو ہستی اور عدم دونوں کا منکر ہے تو مجھے یہ بتاؤ آخر تو ہے کیا؟

بنیادی تصور :- عدم استطاعتِ انکشافِ رازِ ہستی۔

---

(۱۹۸)

(۱) نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس، جزوِ اعظم ہے

مطلب: واضح ہو کہ ریزۂ الماس زخم کو بڑھا دیتا ہے اور عاشق صادق ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کا زخم دل، اچھا ہو جائے۔ اس لیے غالب کہتے ہیں کہ تو مجھ سے جراحت دل کے مرہم کا نسخہ کیا پوچھتا ہے، بس یہ سمجھ لے کہ ریزۂ الماس اس مرہم کا جزوِ اعظم ہے، اسی پر دوسرے اجزا کو بھی قیاس کر لے۔ یعنی عاشق سراسر اذیت ہے۔

بنیادی تصور:- ایذا دوستیٔ عاشقِ صادق۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
(۲) وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے!

اس شعر کا اندازِ بیان بلاشبہ قابلِ تحسین ہے۔ "کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے" یعنی محض ایک اچٹتی ہوئی نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہوتی ہے یعنی اسے پوری نگاہ نہیں کہہ سکتے مگر دراصل پوری نگاہ سے بھی زیادہ دلکش اور مؤثر اور دلنشین ہوتی ہے کیونکہ اس طرح دیکھنے (دزدیدہ نگاہی) میں رنگ التفات مخفی ہوتا ہے۔

مطلب: محبوب پہلے تغافل بر بنائے بیگانگی کیا کرتا تھا۔ لیکن ہماری پیہم نیازمندی کی بدولت اس میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اب وہ دانستہ تغافل کرنے لگا ہے یعنی وہ ہم پر کبھی کبھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیتا ہے۔ یہ نگاہ بظاہر تو پوری نگاہ نہیں ہے۔ مگر باعتبار دلکشی پوری نگاہ سے بڑھ کر ہے یعنی پہلے نادانستہ تغافل تھا، اب دانستہ ہے اسی لیے ہمیں اپنی کامیابی کی کچھ کچھ امید بندھ چلی ہے۔ غالب نے اسی مضمون کو ایک جگہ یوں باندھا ہے:-

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

بنیادی تصور:- اظہارِ مسرت بر تغافلِ دانستہ۔

(۱۹۹)

(۱) ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں و لے اُن کی تمنا نہیں کرتے

مطلب:۔ رشک کے مضامین میں ندرت پیدا کرنا غالب کا حصہ ہے۔ دوسرے مصرع میں "مرتے ہیں" کے ٹکڑے نے اندازِ بیان کی خوبی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) ہم اُن پر مرتے ہیں یعنی ان سے محبت کرتے ہیں یا ان کی تمنا کرتے ہیں (۲) سیکڑوں مصیبتیں اٹھاتے ہیں۔

ہم سیکڑوں تکلیفیں برداشت کرتے ہیں مگر ان کی تمنا (ان سے محبت) نہیں کرتے۔ کیونکہ اس صورت میں ہمیں اپنے اوپر رشک آنے لگے گا اور اسے ہم گوارا نہیں کر سکتے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ رشک۔

(۲) در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

در پردہ بمعنی بباطن یا دراصل + ربطِ نہانی بمعنی تعلقِ قلبی یا تعلقِ مخفی + ظاہر کا پردہ یعنی کسی بات کو مخفی رکھنے کا طریقہ + پردہ نہیں کرتے یعنی حجاب نہیں کرتے یا سامنے آتے ہیں۔

مطلب:۔ محبوب، غالب سے کہتا ہے کہ غیر سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس سے پردہ نہیں کرتا یعنی غیروں کی طرح ملتا ہوں۔ اگر کچھ لگاؤ ہوتا تو بے محابا اس کے سامنے نہ آتا۔ غالب کہتے ہیں کہ محبوب نے یہ

بات غلط کہی ہے وہ اس لیے پردہ نہیں کرتے کہ حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کا پردہ نہ کرنا گویا وہ پردہ ہے جو "ربطِ نہانی" پر پڑا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں رقیب سے ایک باطنی تعلق ہے۔

بنیادی تصور:۔ ربطِ نہانی با رقیب۔

یہ باعث نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے
(۳) غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مطلب:۔ جب اربابِ ہوس (رقیب) یہ دیکھیں گے کہ تم مجھے یعنی اپنے عاشق صادق کو بُرا کہہ رہے ہو تو وہ سب تم سے ناامید ہو کر کنارہ کش ہو جائیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری محفل سونی ہو جائے گی۔ اس شعر میں مومن کا رنگ پایا جاتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ترغیبِ حسنِ سلوک۔

---

(۲۰۰)

گرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
(۱) خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

بادہ کو گلچیں سے، خطِ پیالہ کو نگاہِ گلچیں سے اور لبِ معشوق کو ورقِ گل سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ شراب میں جو رنگینی اور مستی پائی جاتی ہے ۔ یہ سب خوبیاں اس میں اس لیے پیدا ہوئیں کہ اس کی رسائی تیرے ہونٹوں تک ہو گئی یعنی شراب میں جو رنگ اور سرور پایا جاتا ہے وہ تیرے ہونٹوں کی بدولت ہے۔

بنیادی تصور:۔ صفتِ لبِ معشوق۔

کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے!
(۲) کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

سرِ شوریدہ لفظی معنی ایسا سر جس میں آشفتگی اور دیوانگی بھری ہوئی ہو۔
مطلب :۔ اے محبوب! کبھی تو میرے سرِ شوریدہ کی حالت پر نگاہِ کرم کر! اسے ایک مدت سے تکیہ کی آرزو ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ میں نے ایک مدت سے تکیے پر اپنا سر نہیں رکھا ہے۔
بنیادی تصور :۔ ترغیب لطف و کرم۔

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
(۳)
کہ گوشِ گل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

گل کو گوش سے اور نمِ شبنم کو پنبہ (روئی) سے تشبیہ دی ہے۔ نمِ شبنم کنایہ ہے شادابی اور مسرت سے، اور اسی کنایہ میں شعر کا لطف پوشیدہ ہے۔ کیونکہ جو شخص عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے وہ قدرتی طور کسی بیکس کی فریاد کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔
مطلب :۔ چونکہ پھول کے کانوں میں شبنم کی روئی رکھی ہوئی ہے (پھول فارغ البال ہے) اس لیے اگر وہ بلبل کے نالہ و فریاد کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو بالکل بجا ہے۔
بنیادی تصور :۔ توجیہہِ عدمِ التفاتِ گل۔

اسدؔ ہے نزع میں، چل بیوفا، برائے خدا
(۴)
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

مطلب :۔ اے بیوفا! تیرا عاشق زار اس وقت نزع کی حالت میں ہے، خدا کے لیے اسے اپنی شکل دکھا دے یہ وقت ایسا ہے کہ تجھے حجاب اور تمکین (تمام موانع) کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے۔
بنیادی تصور :۔ التجائے یک نگاہِ التفات۔

(۲۰۱)

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو

(۱) یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

بیمار کنایہ ہے چشمِ بتاں سے کیونکہ شعرا عموماً چشمِ محبوب کو بیمار باندھا کرتے ہیں۔

مطلب:۔ اگر معشوق کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے (اپنے عاشقوں کی طرف سے غافل رہتے ہیں) تو بالکل بجا ہے (وہ لائقِ الزام نہیں ہیں) کیونکہ ان کی آنکھیں بیمار ہیں اور جب آنکھ علیل ہو تو اطبا نظارے سے پرہیز کی تلقین کیا کرتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ توجیہِ تغافلِ بتاں۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی

(۲) وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

مطلب:۔ چونکہ اس کافر کا خنجر بہت تیز ہے، فی الفور جگر کے پار ہو جائے گا اس لیے بوقتِ قتل اسے جی بھر کے دیکھ لینے کی آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ بدنصیبیٔ خویش۔

عارضِ گل دیکھ، روئے یار یاد آیا اسدؔ

(۳) جوششِ فصلِ بہاری، اشتیاق انگیز ہے

مطلب:۔ فصلِ بہار کی وجہ سے میرے دل میں محبوب کو دیکھنے کا اشتیاق بہت بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ اس موسم میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں اور جب میں کسی پھول کو دیکھتا ہوں تو معاً مجھے اپنے محبوب کے رخسار یاد آجاتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ تحسینِ عارضِ جاناں۔

(۲۰۳)

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے
(۱) ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے

مطلب :- اگر نامہ بر میرے محبوب پر عاشق ہو گیا تو وہ قابلِ ملامت نہیں ہے کیونکہ وہ بھی میری طرح بشر ہے۔ علاوہ بریں وہ میرا نامہ بر ہے اس لیے بھی اُسے کچھ کہنا (سرزنش) مناسب نہیں ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ دلفریبیٔ محبوب۔

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
(۲) قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے

مطلب :- موت ایک نہ ایک دن تو ضرور آئے گی لیکن ہم یہ چاہتے تھے کہ اگر آج آجاتی تو ہم اذیتِ فراق سے رہائی حاصل کر لیتے۔ چونکہ اُسے ہم سے ضد ہے اس لیے آج نہیں آئی۔ اندریں حالات ہمیں اس سے جس قدر شکایت ہے اسے بذریعہ الفاظ ظاہر نہیں کر سکتے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ شدتِ اذیتِ فراق۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
(۳) کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے، کیا کہیے

مطلب :- کہتے ہیں کہ محبوب کے کرشمہ و ناز و انداز نے ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ تجھے اپنا حالِ دل ان سے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انہیں تیرے کہے بغیر ہی تیرا حال سب کچھ معلوم ہے۔ اس وجہ سے اب ہم اپنا حال ان سے نہیں کہتے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ ہمارے حال سے بے خبر ہیں۔

بنیادی تصور :- فریب کاریٔ کرشمۂ محبوب۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
(۴) کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے، کیا کہیے

مطلب:۔ محبوب اگر راہ چلتے میرا حال پوچھ لیتا ہے تو اس میں مصلحت یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ غالب بہت خوددار ہے اس لیے وہ اس کے جواب میں یہ کہہ دے گا کہ سرِ بازار اپنا حال آپ کو کیا سناؤں؛ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ پرسشِ احوال "مفت کرم داشتن" کا مصداق ہو جائے گی۔ نہ میں حال دل کہوں گا نہ انھیں میری دلداری کرنے کی نوبت آئے گی۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ ستم ظریفیٔ محبوب۔

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
(۵) ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا، کہیے

مطلب:۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ تمہیں اس کی خبر نہیں ہے کہ سرِ رشتۂ وفا ہمارے ہاتھ میں ہے (ہماری مٹھی میں بند ہے) اچھا ہم تم سے پوچھتے ہیں بتاؤ ہماری مٹھی میں کیا ہے؟

شعر کی بندش اور اس کے مضمون، دونوں باتوں میں جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ بندش کی خوبی یہ ہے کہ جو چیز مٹھی میں بند ہے اس کا نام پہلے مصرع میں خود بتا دیا ہے اور مضمون کی خوبی یہ ہے کہ وفا کو ایک محسوس شئے قرار دیا ہے جو مٹھی میں بند ہے۔

بنیادی تصور:۔ اثباتِ وفا شعاریٔ خویش۔

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیئے
(۶) ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے

زعم بمعنی گمان + قطعِ نظر بمعنی نا امیدی۔

مطلب :۔ جب میں ان سے کوئی سوال کرتا ہوں تو وہ اپنے زعمِ باطل (گمانِ غلط) کی بنا پر مجھے مجنوں سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ بالفاظِ دگر، چونکہ وہ اپنے زعم میں مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں تو میں ان سے کیا لڑوں؟ (یعنی کیا قیل وقال کروں؟) اور چونکہ میں جواب سے ناامید ہوں اس لیے اب ان سے کیا کہوں؟ اس شعر کی خوبی اس کی صنعتِ تقابل پر موقوف ہے۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ بے اعتنائی محبوب۔

(۷)
حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہئے

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو شخص سخنوری میں کمال حاصل کرتا ہے، دنیا والے اس کی تحسین کے بجائے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور جو شخص صاحبِ ہنر ہو جاتا ہے (کسی فن میں مہارت حاصل کر لیتا ہے) دنیا والے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں (اس پر ظلم وستم روا رکھتے ہیں)

"کیا کیجے" اور "کیا کہئے" سے اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی شخص ان مصائب کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ شعر کی بندش قابلِ داد ہے۔ دونوں مصرعے ہم پلہ ہیں۔

بنیادی تصور :۔ شکوۂ ناقدریٔ اربابِ ہنر۔

(۸)
کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہئے

مطلب :۔ بیشک غالب بہت برا ہے مگر اس کے سوا اس میں اور کوئی برائی نہیں ہے کہ وہ آشفتہ سر (دیوانہ) ہے، اور دیوانے کو ہر شخص معذور سمجھتا ہے۔

خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ در پردہ اپنی تحسین کا پہلو نمایاں کر دیا۔ کیونکہ دیوانگی عاشق کے حق میں قابلِ فخر و مباہات ہے نہ کہ موجبِ تحقیر و ملامت۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ علوِ مرتبۂ خویش۔

---

(۲۰۳)

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
(۱) کر گئی وابستۂ تن، میری عریانی مجھے

گرم دامن افشانی یعنی علائقِ دنیوی سے اجتناب کا آرزو مند۔

مطلب:۔ میں چونکہ علائق دنیوی سے اجتناب کا آرزو مند تھا۔ اس لیے میں نے قیدِ لباس سے آزادی حاصل کر لی یعنی عریانی اختیار کر لی، مگر افسوس کہ میری عریانی نے مجھے وابستۂ جسم کر دیا۔ یعنی میں یہ سمجھا تھا کہ ترکِ لباس سے ترکِ علائق کا مقام حاصل ہو جائے گا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ جسم اور جسمانیات سے تو بدستور تعلق باقی رہا۔ مدعا یہ ہے کہ انسان، انتہائی کوشش کے باوجود حقیقی معنوں میں ترک دنیا نہیں کر سکتا۔ وہ ہر شئی سے قطع تعلق کر سکتا ہے مگر اپنے جسم سے قطع تعلق ناممکن ہے اور جب تک انسان جسم کی قید میں ہے وہ جسمانی ضروریات سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اسی مضمون کو اکبر الٰہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:۔

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا!
غور جب ہم نے کیا، سانس کو دنیا پایا

بنیادی تصور:۔ ناگزیری علائقِ جسمانی۔

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
(۲) مرحبا میں، کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

سنگِ فساں، وہ پتھر جس پر تلوار تیز کرتے ہیں۔ گراں جانی بمعنی سخت جانی۔ چونکہ پتھر بھی گراں (وزنی) ہوتا ہے، اس لیے شاعر نے اشتراک معنوی سے فائدہ اٹھا کر اپنی

گراں جانی کو سنگِ فساں قرار دے دیا اور اس رعایت لفظی پر شعر کی عمارت قائم کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ شعر میں کوئی خوبی پیدا نہ ہو سکی۔

مطلب:۔ میں اتنا سخت جان ہوں کہ محبوب اپنی تیغ نگاہ کے وار کیے جا رہا ہے مگر میں ابھی تک زندہ ہوں۔ گویا میری گراں جانی، تیغ نگاہِ یار کے حق میں سنگِ فساں کا کام دے رہی ہے۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ گرانجانیٔ خویش۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی؛ اس کی خاطر جمع ہے
(۳) جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

اس کی خاطر جمع ہے یعنی وہ مطمئن ہے۔ پرسش ہائے پنہانی کی ترکیب ایضاحِ مفہوم کے لیے ناکافی ہے۔ مطلب اس سے محبوب کی وہ پرسش ہے جو وہ پوشیدہ طور پر (مثلاً تصور یا خواب میں آکر) کرتا ہے۔

مطلب:۔ چونکہ محبوب مطمئن ہے کہ غالب میرے تصور ہی میں مگن رہتا ہے اس لیے وہ بظاہر پرسشِ احوال نہیں کرتا یعنی میری طرف التفات نہیں کرتا۔

بنیادی تصور:۔ توجیہہ عدم التفاتِ محبوب۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
(۴) لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

مطلب:۔ جب میرے گھر کی تقدیر لکھے جانے کا وقت آیا تو کاتبِ تقدیر نے یہ لکھ دیا کہ یہ گھر ہمیشہ ویران رہے گا۔ اور اس کی ویرانی کا سبب خود اس گھر کا مکیں (غالب) ہی ہو گا۔

بنیادی تصور:۔ اظہار بدبختیٔ خویش۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاش کے
(۵) اس قدر شوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

مطلب:۔ مجھے بلبل (مرغ بستانی) کے نالے سننے کا شوق ہے محض اس لیے کہ وہ بھی میری طرح ایک بے وفا کی محبت میں گرفتار ہے مگر میرا محبوب یہ سمجھتا ہے کہ شاید مجھے اس بلبل سے محبت ہوگئی ہے ۔اس بناء پر وہ مجھ سے بدگمان ہوگیا ہے کاش مجھے یہ شوق نہ ہوتا۔ مدعا یہ ہے کہ محبوب کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں غیر کی طرف کیوں متوجہ ہوں؟

بنیادی تصور:۔ اظہار بدگمانیٔ محبوب ۔

وائے! واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا
(۶) لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

مطلب:۔ میں نے قبر میں قیام کرنا اس لیے پسند کیا تھا (قبر میں بود و باش اس لیے اختیار کی تھی) کہ وہاں مجھے ہر طرح کا اطمینان اور سکون حاصل ہوگا (راحت جسمانی حاصل ہوگی) مگر افسوس کہ وہاں شور محشر نے مجھے کچھ دنوں آرام سے نہ رہنے دیا۔ (شور محشر نے میرے آرام میں خلل ڈال دیا)

بنیادی تصور:۔ مذمت تن آسانی۔

استاد ذوق مرحوم نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے اور حق یہ ہے کہ مضمون کا حق ادا کر دیا ہے:۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

وعدہ آنے کا وفا کیجیے، یہ کیا انداز ہے؟
(۷) تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

مطلب:۔ چونکہ تمہارے آنے کے انتظار میں ہر وقت دروازے پر بیٹھا رہتا ہوں اس لیے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر کی دربانی کر رہا ہوں۔

مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ" وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے" بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔" (یادگار غالب صفحہ ۱۴۵)

بنیادی تصور :۔ ترغیبِ ایفائے عہد۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا

(۸) پھر ہوا ہے تازہ، سودائے غزلخوانی مجھے

مطلب :۔ فصل بہار کی آمد کی ایسی خوشی ہے کہ ذوقِ غزل سرائی از سرِ نو تازہ ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور :۔ مسرتِ آمدِ بہار۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی !

(۹) میرزا یوسف ہے غالب! یوسفِ ثانی مجھے

مطلب :۔ یوسفِ ثانی کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ میرا بھائی حسن و جمال کے اعتبار سے یوسفِ ثانی (دوسرا یوسف) ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ چونکہ اسے از سرِ نو زندگی ملی ہے اس لیے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرا یوسف مجھے دوبارہ مل گیا۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ الفتِ برادرانہ۔

---

(۲۰۴)

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

(۱) سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

"یارب" میں ایہام ہے (۱) زبان سے یارب یارب کہنا یعنی ذکرِ خدا کرنا (۲) نالہ و فریاد کرنا۔ کیونکہ فارسی محاورے میں یارب سے خدا کی دہائی دینا مراد ہے۔ سبحہ یعنی تسبیح

مطلب :- چونکہ میری حالت یہ ہے کہ خوشی میں بھی نالہ و فریاد کرتا رہتا ہوں (خدا کی دہائی دیتا ہوں) اس لیے جب میں زاہد کو تسبیح پر ذکر خدا کرتے (یا رب کہتے) دیکھتا ہوں تو زیر لب مسکرانے لگتا ہوں۔

بنیادی تصور :- اظہارِ الم دوستی۔

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن

(۲) تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

کشادِ خاطرِ وابستہ یعنی پریشانیٔ خاطر کا ازالہ + دررہنِ سخن یعنی فکرِ سخن کا مرہون ہے۔ بالفاظ دگر کشادِ خاطر ناشاد، شعر گوئی (فکرِ سخن) پر موقوف ہے۔

مطلب :- جس طرح قفل ابجد کی کشاد (یہاں کشاد سے لفظی معنی مراد ہیں یعنی کھل جانا) مناسب حروف کے مل جانے پر موقوف ہے اسی طرح میری خاطرِ وابستہ کی کشادہ (یہاں کشاد سے مجازی معنی مراد ہیں یعنی احساسِ مسرت) شعر گوئی پر موقوف ہے۔ یعنی شعر گوئی موجب انبساطِ خاطر ہے۔

بنیادی تصور :- تدبیرِ کشادہ خاطرِ وابستہ۔

یارب! اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے

(۳) رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

مطلب :- اے خدا! میری آشفتہ مزاجی کا یہ عالم ہے یعنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ پہلے زنداں میں کلفت محسوس ہوتی تھی اس لیے صحرا نوردی اختیار کی لیکن اب صحرا نوردی میں اس قدر اذیت محسوس ہوتی ہے کہ قیدیوں کی زندگی پر رشک آتا ہے کہ میرے مقابلہ میں انہیں بہت راحت حاصل ہے!۔

بنیادی تصور :- اظہار آشفتگیٔ خاطر۔

(۴) طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں

آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

حسرت سے یہاں یاس و حرماں مراد ہے + مطلب سے یہاں مطلوب مراد ہے
یعنی مجھے شکست آرزو مطلوب ہے۔
مطلب :- چونکہ میں دلدادۂ یاس و حرماں ہوں۔ لہذا آرزو اس لیے کرتا ہوں
کہ جب وہ پوری نہ ہوگی (عاشق کی آرزو کبھی پوری نہیں ہوتی) تو مجھے یاس و حرماں
(شکستِ آرزو) سے لذت اندوز ہونے کا موقع مل سکے گا۔
بنیادی تصور :- اظہارِ حسرت دوستی۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
(۵) عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

مطلب :- اپنے آپ کو اپنا غیر فرض کر کے کہتے ہیں کہ میرزا صاحب یعنی
غالب پہلے مجھے عشق کرنے سے منع کرتے تھے لیکن جب دل لگا بیٹھے تو میری
طرح خود بھی تباہ حال ہو گئے۔
بنیادی تصور :- طنز بر حالتِ خویش۔

---

(۲۰۵)

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
(۱) چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

مطلب :- دربارِ شاہی کو چمن سے اور اہلِ سخن کو خوش نوایانِ چمن سے تشبیہ
دی ہے۔ مطلب واضح ہے کہ بادشاہ سلامت بہ نفسِ نفیس شریکِ محفل ہیں اور
چونکہ وہ خود بہت بڑے سخن سنج ہیں اس لیے آج ہر شاعر کا امتحان ہو جائے
گا کہ کون کیسا کہتا ہے۔
بنیادی تصور :- اعترافِ سخن سنجیٔ ممدوح۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
(۲) جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

مطلب :- قیس و کوہکن کی آزمائش محبوب کے قد اور گیسو پر فریفتگی تک محدود رہی یعنی صرف یہ دیکھا گیا کہ قیس کو قامت لیلیٰ اور کوہکن کو زلفِ شیریں سے کس قدر محبت ہے مگر ہم عشق کی اس منزل میں ہیں جہاں عاشق کو سر بکف ہونا پڑتا ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ تفوق بر قیس و کوہکن۔

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحان آخر
(۳) ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

مطلب :- فی الحال فرہاد کی جسمانی طاقت کا امتحان ہو رہا ہے کہ پہاڑ کھود کر نہر نکال سکتا ہے یا نہیں جب وہ اس مہم میں کامیاب ہو جائے گا۔ تو پھر اس کے حوصلے کا امتحان ہوگا کہ مرگِ شیریں کا صدمہ برداشت کر سکتا ہے یا نہیں۔

بنیادی تصور :- طعن بر کم حوصلگی فرہاد۔

نوٹ :- دوسرے مصرع کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرگِ شیریں کی خبر سن کر اپنی جان دے سکتا ہے یا نہیں۔ اس صورت میں بنیادی تصور بدل جائے گا۔ یعنی بیان عاشق نامراد۔

نسیم مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
(۴) اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

مطلب :- اگر نسیم مصر یوسف کے پیراہن کی خوشبو حضرت یعقوب تک لائی تو اس لیے نہیں کہ اُسے ان سے ہمدردی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس خوشبو میں کس قدر تاثیر ہے۔

شعر میں تلمیح ہے اس واقعہ کی طرف کہ جب یعقوب کو پیراہن یوسف کی خوشبو

آئی تو ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

بنیادی تصور:۔ تاثیرِ پیراہنِ یوسف۔

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل ہے
(۵) شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

مطلب:۔ عشاق کو خبردار کرتے ہیں کہ دیکھو وہ بزم میں آرہا ہے! سنبھل جاؤ! اپنے اپنے حواس مجتمع کر لو! پھر نہ کہنا کہ ہم غافل تھے۔ اس لیے صبر و شکیب کھو بیٹھے۔ شعر کا مضمون تو پیش پا افتادہ ہے مگر اندازِ بیان نے اس میں جان ڈال دی۔

بنیادی تصور:۔ فتنہ سامانیٔ جلوۂ محبوب۔

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
(۶) غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

مطلب:۔ مجھے اس بتِ ناوک فگن کے کمالِ فن کی آزمائش مطلوب ہے۔ اگر اس کا تیر میرے دل میں پیوست ہو جائے تو اچھا ہے لیکن اگر جگر کے پار ہو جائے تو بہتر ہے۔

بنیادی تصور:۔ آزمائش ناوک فگنیٔ محبوب۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
(۷) وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

مطلب:۔ تسبیح زنار میں بذاتِ خود کوئی دلکشی نہیں ہے۔ بلکہ ان سے صرف یہ دیکھنا مطلوب ہے کہ شیخ و برہمن اپنی اپنی وضع پر قائم رہتے ہیں یا نہیں (گیرائی بمعنی دلکشی یا کشش یا قوتِ گرفت)

بنیادی تصور:۔ امتحانِ وفاداریٔ شیخ و برہمن۔

پڑا رہ اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل
(۸) مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

مطلب :- اے دل! تو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اس کی زلف کے پھندے سے نکلنے کی کوشش کر چکا ہے مگر ہر مرتبہ ناکام رہا ہے۔ اس لیے اب بیتابی فضول ہے۔ کیا تو پھر سعیٔ ناکام کرنا چاہتا ہے؟

بنیادی تصور :- تحسین تابِ زلفِ یار۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
(۹) ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

مطلب :- ابھی تو مصائب عشق کی ابتدا ہے۔ ابھی تو صرف کام و دہن زہرِ غم سے متاثر ہوئے ہیں۔ خدا معلوم جب یہ مصائب اپنی انتہا کو پہنچیں گے تو میرا کیا حال ہو گا!

بنیادی تصور :- تباہ کاریٔ زہرِ غم۔

وہ آئیں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ
(۱۰) نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

مطلب :- اے غالب! وہ ہرگز تیرے گھر نہیں آئیں گے۔ ان کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ اب تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کے فراق میں یہ چرخ کہن ہمیں کن کن نئی آفتوں میں مبتلا کرتا ہے۔

بنیادی تصور :- ہولِ اذیتِ فراق۔

---

(۲۰۶)

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
(۱) جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

مطلب :- اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرتے سے

اس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے۔ (یادگارِ غالب ص۱۴۵)

بنیادی تصور:۔ اظہار شوخیِ تقدیر۔

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
(۲) کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

کھینچتا ہوں یعنی اسے اپنی طرف مائل کرتا ہوں۔ کھنچتا جائے ہے یعنی دور ہوتا جائے ہے۔

مطلب:۔ اے خدا! شاید میرے جذب کی تاثیر بالکل الٹی ہے۔ کہ میں جس قدر اسے اپنے قریب لانے کی کوشش کرتا ہوں اسی قدر وہ مجھ سے دور ہوتا جاتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

وہ بد خو اور میری داستانِ عشق طولانی
(۳) عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

عبارت مختصر بمعنی قصہ مختصر۔

مطلب:۔ میری داستانِ عشق بہت طویل ہے۔ اور محبت بہت بدخو اتنک مزاج ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ میں پریشان ہوں کہ جب قاصد بھی اس کو سنکر گھبرا گیا تو محبوب بھلا کب سننے لگا۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ کشمکشِ باطنی۔

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
(۴) نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

مطلب:۔ شعر کا لطف تقابل میں مضمر ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب مجھ سے بدگمان ہے یعنی مجھے دعوئ محبت میں جھوٹا سمجھتا ہے اس لیے پرشس احوال نہیں کرتا اور میں اس قدر ناتوان ہوں کہ اپنے دعوے کی صداقت میں زباں سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

یعنی بڑی کشمکش میں گرفتار ہوں۔

بنیادی تصور:۔ تصویرِ اضطرابِ ذہنی۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی، کیا قیامت ہے
(۵) کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مطلب:۔ شعر کا لطف اس کے اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس کے ملنے سے اس قدر ناامید ہو چکا ہوں کہ اب اس کا تصور بھی دل سے مٹتا جاتا ہے۔ اپنی مایوسی کی تصویر بڑے دلکش انداز سے کھینچی ہے۔

بنیادی تصور:۔ انتہائے عالمِ مایوسی۔

تکلف برطرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن
(۶) وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

نظارگی بمعنی ناظر، وہ دیکھا جائے یعنی لوگ اسے دیکھیں۔ یہ ظلم کب دیکھا جائے ہے یعنی یہ ظلم کب برداشت ہو سکتا ہے۔

مطلب:۔ سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ میں بھی دیکھنے والوں کے زمرے میں شامل ہوں مگر میں یہ بات کب گوارا کر سکتا ہوں کہ اور لوگ بھی اسے دیکھیں!

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ رشک۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
(۷) نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "اس شعر میں وجدانی کیفیات کی تمثیل، محسوسات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قویٰ جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کی قدرت تھی، ابتدائے عشق میں انہی کو صدمہ پہنچا۔ پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے اور نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔" (یادگارِ غالب ص ۱۴۵)

بنیادی تصور:۔ تمثیل کیفیات وجدانی۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
(۸) وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مطلب:۔ میں بوقتِ رخصت اس سے یہ کہنا بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ جاؤ سدھارو! تمہیں خدا کو سونپا، تو میں یہ بات کب برداشت کر سکتا ہوں کہ وہ رقیب کا ہم سفر ہو یعنی میں اسے رقیب کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ وفورِ جذبۂ رشک۔

---

(۲۰۷)

زبسکہ مشق تماشا، جنوں علامت ہے
(۱) کشاد و بست مژہ سیلیٔ ندامت ہے

زبسکہ بمعنی چونکہ۔ مشق تماشا یعنی حسن محبوب یا دنیا کی اشیاء کو بار بار دیکھنا جنوں علامت ہے یعنی علامتِ جنوں ہے۔ کشاد و بست مژہ بمعنی پلکوں کا بار بار کھلنا اور بند ہونا۔ سیلیٔ ندامت یعنی شرمندگی کا تھپڑ۔

مطلب:۔ چونکہ حسن فانی یا دنیا کی دلچسپیوں میں انہماک سراسر حماقت اور نادانی ہے۔ اس لیے میرا بار بار پلکوں کو اٹھانا اور بند کرنا ایسا ہے۔ جیسے ندامت میرے منہ پر تھپڑ مار رہی ہو۔ پلکوں کے بند ہونے کو تھپڑوں سے تشبیہ دی ہے۔

بنیادی تصور:۔ تلقین اجتناب از تماشائے حسن۔

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعن بدعہدی
(۲) تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

ورطہ بمعنی بھنور۔ کیونکہ بمعنی کیونکر۔ تجھے کہ یعنی تجھے تو۔

مطلب :- جب تو غیروں کے لیے آرائش کرتا ہے تو مجھ سے بد عہدی کرتا ہے اور اس بد عہدی کا داغ کسی طرح نہیں مٹ سکتا۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ جب تو آئینہ دیکھتا ہے تو تجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آئینہ بھی مجھے ملامت کر رہا ہے۔

جناب نیاز فتحپوری لکھتے ہیں کہ "تکلف اور آورد کے سوا اس شعر میں کچھ نہیں ہے"

بنیادی تصور :- اثباتِ احساسِ بد عہدی۔

(۳)

بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز، سرِ رشتۂ سلامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس اور سلکِ عافیت کے ساتھ "مت توڑ" ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہو۔ اگر "مت توڑ" کے بجائے "مشکن" رکھ دیں تو اچھا خاصا فارسی کا مصرع بن جائے گا۔ یہ ناہمواری ابتدائی دور کی خصوصیت ہے۔

مطلب :- بہت مختصر ہے یعنی اگر تو ہوس کرے گا تو عافیت (سکونِ قلب) سے محروم ہو جائے گا۔ سلامتی (عافیت) کا سرِ رشتہ تو نگاہِ عجز (ترکِ ہوس) کے ہاتھ میں ہے۔

بنیادی تصور :- تلقینِ ترکِ ہوس۔

(۴)

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

وفا مقابل یعنی معشوق آمادۂ وفا ہو۔ دعوائے عشق یعنی رقیب کا دعویٰ عشق، جنونِ ساختہ یعنی مصنوعی دیوانگی۔

مطلب :- اگر محبوب آمادۂ وفا ہو لیکن عاشق اپنے دعوے میں جھوٹا ہو تو یہ بات ایسی ہی قابلِ افسوس ہے۔ جیسے فصلِ بہار تو درحقیقت آئی ہو مگر دیوانگی بناوٹی ہو۔

بنیادی تصور :- طعن بر رقیب۔

(۲۰۸)

(۱) لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

مطلب :- میں اس قدر لاغر ہوں کہ اگر تو مجھے اپنی محفل میں بیٹھنے کی اجازت دیدے تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ کوئی شخص تجھے یہ نہ بتا سکے گا کہ غالب وہ بیٹھا ہے

بنیادی تصور :- مبالغۂ لاغری خویش۔

نوٹ :- اس قسم کا مبالغہ جو اغراق کی حد تک پہنچ جائے۔ ہمارے زمانے میں معیوب ہے، مگر غالب کے عہد میں مقبول تھا چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :-

بستر مرگ پہ پایا نہ قضا نے مجھ کو
لاغری سے ہوا معدوم، کمر کی صورت

خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ شاعر نے اپنے ساتھ اپنے معشوق کی کمر کو بھی معدوم کر دیا!

(۲) کیا تعجب ہے کہ اس کو، دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی :- "کیا تعجب ہے کہ مجھ کو دیکھ کر اسے رحم آ جائے"۔

مطلب :- مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے اس تک پہنچا دے تو میری حالتِ زار دیکھ کر اسے ضرور مجھ پر رحم آ جائے گا۔

بنیادی تصور :- اظہارِ حالتِ زارِ خویش۔

(۳) منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر باندازِ عتاب
کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

غالب نے یہ شعر محض "آنکھیں دکھانے" کی خاطر موزوں کیا ہے۔ کیونکہ اس نے

دو معنی ہیں اور سب جانتے ہیں کہ وہ صنعتِ ایہام کے دلدادہ ہیں (۱) آنکھیں دکھانا (۲) اظہارِ عتاب۔

مطلب:۔ اگر تو منہ دکھانا نہیں چاہتا تو نہ سہی۔ از راہِ خفگی آنکھیں ہی دکھا دے۔

بنیادی تصور:۔ شدتِ آرزوئے دید۔

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
(۴) زلف گر بن جاؤں تو شانہ میں الجھا دے مجھے

مطلب:۔ وہ میری گرفتاری سے اس درجہ خوش ہے کہ اگر میں اس کی زلف بن جاؤں تو وہ مجھے اپنی کنگھی میں الجھا دے۔ یعنی مجھے ایذا دینے کے لیے وہ اپنی زلف کا لحاظ بھی نہیں کرے گا۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ ایذارسانیٔ محبوب۔

---

(۲۰۹)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
(۱) ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مطلب:۔ میری نگاہ میں یا میرے نزدیک اس دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے محض بچوں کا کھیل ہے۔ اسی بات کو دوسرے مصرع میں باندازِ دگر بیان کیا ہے کہ جو حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں، میں انہیں ایک تماشا سمجھتا ہوں جس طرح بچے گھروندے بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں کون و فساد کا سلسلہ جاری ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ بے ثباتیٔ عالم۔

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
(۲) اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

فن شاعری کے اعتبار سے یہ شعر بیت الغزل ہے۔ دوسرے مصرع میں "اک بات ہے" کی ترکیب بہت پر لطف ہے کیونکہ اس کے دو معنی ہیں (۱) اعجاز مسیحا "بات" یا لفظ ہا میں مضمر تھا کیونکہ جب وہ زبان سے "قم باذن اللہ" کہتے تھے تو مردہ زندہ ہو جاتا تھا اور یہ کہنا واقعی بات ہی تو ہے (۲) اعجازِ مسیحا کی مری نگاہ میں کوئی وقعت یا قدر و قیمت نہیں ہے۔

مطلب:۔ حضرت سلیمان کے معجزے کی (کہ ان کا تخت ہوا میں اڑتا تھا) اور حضرت علیٰ کے معجزے کی (کہ وہ مردے زندہ کر دیتے تھے) میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ بہت معمولی باتیں ہیں۔

بنیادی تصور:۔ استخفافِ کمالِ اہلِ دنیا۔

(۲)
جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

منظور۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں۔ (۱) مشہود یا مرئی یا مبصر۔ غالب نے اس لفظ کو یہاں اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے یعنی عالم کی صورت مجھے نظر نہیں آتی (۲) بمعنی مُسلّم مثلاً یہ بات مجھے منظور نہیں ہے۔ اُردو زبان میں لفظ منظور دوسرے معنی میں مستعمل ہے۔ یہ لفظ اس سے پہلے اس شعر میں آچکا ہے:۔

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

لفظِ وہم کے کئی معنی ہیں:۔

(۱) اُردو زبان میں وہم بمعنی مراق، شک و شبہ، غلط خیال، گمان فاسد، فرضی یا خیالی بات مستعمل ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ تمہیں تو وہم ہو گیا ہے یا وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔

(ب) منطق کی اصطلاح میں وہم اس حسِ باطنی کو کہتے ہیں جس کا کام معانی جزئیہ

کا ادراک کرنا ہے۔ منطق کی کتابوں میں وہم کو تصورِ خارج کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے
اور اس کی منطقی تعریف یہ ہے:۔

مرجوحیت کے ساتھ نسبت خبریہ کا ادراک علی وجہ الحکایۃ۔

(ج) فلسفۂ تصوف میں یہ لفظ دو معنی میں مستعمل ہے:۔

(۱) وہمی اختراعی یعنی ایک بے سروپا یا من گھڑت بات جس کا منشا خارج میں موجود نہ ہو مثلاً گدھے کے سینگ یا گھوڑے کے پر یا چڑیل کے دانت۔

واضح ہو کہ کوئی صوفی کائنات کو اس معنی میں وہمی نہیں کہتا۔ ہاں سوفسطائی کائنات کو اسی معنی میں وہمی کہتے ہیں۔

(۲) وہمی واقعی یعنی وہ شئی جس کا وجود اگرچہ خارج میں مستقل یا بالذات نہ ہو مگر اس کا منشا خارج میں واقعی موجود ہو جس سے اس کے وجود کو منتزع کیا جا سکے مثلاً فوقیتِ آسمان یا تحتیتِ زمین کہ ان کا منشا (آسمان اور زمین) خارج میں موجود ہے یا حلقۂ آتشیں کہ اس کا منشا یعنی شعلۂ جوالہ خارج میں موجود ہے۔

صوفیہ جب کائنات کو وہمی کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد وہمی واقعی ہوتی ہے یعنی اگرچہ کائنات کا بذاتِ خود کوئی مستقل وجود نہیں ہے مگر اس کا منشا (یعنی ذاتِ حق) درحقیقت خارج میں موجود ہے۔ چنانچہ علامہ محمود شبستری فرماتے ہیں:۔

همه از وہم تست ایں صورت غیر
کہ نقطہ، دائرہ ست از سرعت سیر

یعنی اگرچہ دائرہ کا وجود وہمی ہے مگر وہمی واقعی ہے کیونکہ وہ نقطہ خارج میں موجود ہے۔ جس سے اس دائرہ کا وجود منتزع ہے۔ بالفاظِ دگر، اگرچہ دائرہ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے (وہ تو سرعتِ گردشِ نقطہ کا نتیجہ ہے) مگر خارج میں نظر ضرور آتا ہے۔

مطلب :- اس شعر میں غالب نے وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کو مقدمہ میں بالوضاحت بیان کر دیا ہے اس لیے یہاں تفصیل غیر ضروری ہے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہستیٔ حق کے سوا کسی شئے کی ہستی حقیقی نہیں ہے۔ کائنات کی ہستی وہمی ہے یعنی اگرچہ موجود ہے مگر اس کا وجود، مرتبۂ وہم سے آگے نہیں ہے بالفاظِ دگر، اس کا وجود حقیقی نہیں ہے۔

بنیادی تصور :- تلقینِ وحدت الوجود۔

(۴)
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا، مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ، دریا، مرے آگے

مطلب :- دونوں مصرعوں میں دو باتیں بطورِ مبالغہ بیان کی ہیں۔ یعنی جب مجھ پر دیوانگی کا عالم طاری ہوتا ہے اور میں صحرا میں جا کر خاک اڑاتا ہوں (خاک اڑانا علامتِ جنوں ہے) تو خود صحرا، اس گرد میں چھپ جاتا ہے! اور جب میں رونے پہ آتا ہوں تو دریا میرے سامنے سربسجدہ ہو کر یہ عرض کرتا ہے کہ خدا کے لیے اشکوں کو روکو ورنہ میری خیر نہیں ہے یعنی سیلابِ اشک مجھے بھی بہا کرلے جائے گا!

بنیادی تصور :- مبالغہ صحرا نوردی و اشک افشانی۔

(۵)
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

رنگ بمعنی طرزِ عمل۔ اگرچہ یہاں "پیچھے" محض "آگے" کی رعایت سے لائے ہیں۔ لیکن پیچھے میں ایہام کی وجہ سے بڑا لطف پیدا ہو گیا ہے کیونکہ "ترے پیچھے" کے دو معنی ہیں (۱) تیری غیر موجودگی میں یا تیری جدائی میں (۲) تیری وجہ سے یا تیرے عشق میں

مطلب :- اے محبوب تو مجھ سے یہ مت پوچھ کہ تیری جدائی میں میری حالت کیا ہوتی ہے، بلکہ تو یہ دیکھ کہ میرے آگے (سامنے) تیرا کیا رنگ ہے یعنی کیا طرزِ عمل

ہے ؛ یعنی جب تو میرے سامنے مجھ سے اس قدر بدسلوکی روا رکھتا ہے جس کی وجہ سے ہی تیرے سامنے ہونے کے باوجود یا تیری موجودگی میں اس قدر رنجیدہ ہوں تو خود سمجھ لے کہ تیری جدائی میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا! میرا حال مت پوچھ تو اپنا رنگ (طرزِ عمل) دیکھ اب تجھے خود اندازہ ہو جائے گا کہ تیرے پیچھے میرا حال کیا ہوگا۔ بلاشبہ خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ شکوہ جور وجفائے محبوب۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں
(۶) بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

مطلب:۔ محبوب نے غالب کو خود بینی اور خود آرائی کا طعنہ دیا۔ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم آئینہ سیما ہو (تمہاری پیشانی بمنزلہ آئینہ ہے) اور تم میرے سامنے ہو یعنی آئینہ میرے سامنے ہے اور آئینہ کے سامنے ہر شخص قدرتی طور پر خود بین و خود آرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر میں ایسا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یقیناً مجھے خود بین ہونا چاہیئے۔

بنیادی تصور:۔ تحسین مسیحائے (جبیں) محبوب۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
(۷) رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

مطلب:۔ اگر میری گفتگو کی گل افشانی کا انداز دیکھنا ہو تو شیشہ و پیمانہ میرے سامنے رکھ دو یعنی شراب پینے کے بعد میری جولانیٔ طبع قابل دید ہوتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ ذہن افروزیٔ بادۂ ناب۔

نفرت کا گمان گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
(۸) کیونکر کہوں، لو نام نہ ان کا مرے آگے

رشک سے گذرا یعنی میں ایسے رشک سے باز آیا یا رشک کے ہاتھوں بڑی مشکل میں ہوں۔

مطلب:۔ جذبۂ رشک کی وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ ان کا نام بھی کسی کی زبان پر آئے لیکن میں کسی شخص سے یہ کہہ بھی نہیں سکتا کہ ان کا نام میرے سامنے مت لو۔ کیونکہ اس صورت میں لوگوں کو یہ گمان ہوگا (جو غلط ہے) کہ غالب ان سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ ان کے نام سے بیزار ہے اس لیے میں اپنے جذبۂ رشک کے ہاتھوں بہت عاجز آگیا ہوں یعنی "گویم و گرنہ گویم مشکل" والا مضمون ہو گیا ہے۔ بلا شبہ خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ مبالغۂ جذبۂ رشک۔

(۹) ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

"پیچھے ہے" کے دو معنی ہیں (۱) آگے کی ضد (۲) میری منت سماجت کرتا ہے یعنی مجھے روکتا ہے۔

مطلب:۔ شعر کا مطلب تو واضح ہے کہ ایمان (کعبہ) مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اور کفر (کلیسا) اپنی طرف بلا رہا ہے لیکن قابل تحسین نکتہ یہ ہے کہ غالب نے اس شعر میں انسان کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر بڑے دلکش شاعرانہ انداز میں کھینچی ہے۔ دوسرے مصرع کی بندش بلاشبہ قابل داد ہے۔

بنیادی تصور:۔ تصویر کشمکش باطنی۔

(۱۰) عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

مطلب:۔ اگرچہ میں عاشق ہوں مگر مجھے معشوقوں کو فریب دینا بھی خوب آتا

ہے چنانچہ میں نے لیلیٰ کے سامنے اس طرح اظہار عشق کیا کہ وہ مجھے مجنوں کے مقابلہ پر فوقیت دینے پر مجبور ہو گئی۔

بنیادی تصور:۔ تفوق بر مجنوں۔

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
(۱۱) آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

مطلب:۔ ہم شبِ ہجر میں مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ ہمیں وصلِ یار نصیب ہو گیا، چونکہ یہ بات غیر متوقع تھی اس لیے فرطِ مسرت سے ہم جان بحق ہو گئے۔

دوسرے مصرع میں اس مرگ ناگہانی کی شاعرانہ توجیہہ کرتے ہیں کہ ہو نہ ہو میری وہ دعا قبول ہو گئی جو میں شب ہجر میں مانگا کرتا تھا!

نظم طباطبائی کی رائے میں یہ شعر بیت الغزل ہے۔ محاورے اور زبان نے مرنے کے مضمون کو زندہ کر دیا۔" (شرح دیوانِ غالب ص ۲۵۲)

بنیادی تصور:۔ توجیہہ مرگِ خویش۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
(۱۲) آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

مطلب:۔ فراقِ یار میں خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ بلکہ یوں سمجھو کہ آنکھوں سے خون کے دریا بہہ رہے ہیں۔ کاش یہی خونابہ فشانی میری مصیبتوں کی انتہا ہو جائے! اگر میں بہت بد قسمت ہوں دیکھیے! ابھی اور کیا کیا مصائب جھیلنے پڑتے ہیں!

بنیادی تصور:۔ اظہارِ شدتِ مصائب۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
(۱۳) رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مطلب :- پہلے مصرع کی بندش سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بوقتِ نزع یہ کہہ رہا ہے کہ اگرچہ اب مجھ میں جام شراب منہ سے لگانے کی سکت نہیں ہے مگر آنکھوں میں ان محبوب چیزوں کو دیکھنے کی طاقت ابھی تک باقی ہے اس لیے ع رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے۔

بنیادی تصور :- اظہار ذوقِ مے نوشی۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
(۱۴) غالب کو برا کیوں کہو؟ اچھا مرے آگے

لفظ "اچھا" بعض اوقات آغازِ گفتگو کے لیے آتا ہے مثلاً "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم کب تک ظلم کرتے رہو گے؟ یا اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟" اس کے علاوہ لفظ "اچھا" "برے" کی ضد بھی ہے یہاں تنبیہ کے لیے ہے۔

مطلب :- محبوب غالب کو نہیں پہچانتا اس لیے اس نے ان کے سامنے غالب کو برا بھلا کہا۔ اس پر غالب کہتے ہیں کہ وہ تو میرا ہم پیشہ اور ہم مشرب اور ہمراز ہے۔ اس قدر خوبیوں پر اگر تم اسے اچھا نہیں کہتے تو برا بھی کیوں کہتے ہو؟

بنیادی تصور :- شکوۂ عتاب بے سبب۔

---

(۲۱۰)

کہوں جو حال، تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
(۱) تمہی کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے

مطلب :- محبوب سے کہتے ہیں کہ جب میں تم سے اپنا حال دل بیان کرتا ہوں تو میرے مطلب سے آگاہ ہونے کے باوجود مجھ سے کہتے ہو کہ اس گفتگو سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ اب تم خود انصاف کرو کہ جب تمہارے تجاہلِ عارفانہ کا یہ

عالم ہے تو میں تم سے کیا کہوں!

بنیادی تصور :۔ شکوۂ تجاہلِ عارفانہ۔

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
(۲) مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو ''بجا'' کہیے

مطلب :۔ محبوب نے غالب سے طنزاً کہا کہ جی ہاں ہم تو بڑے ستمگر ہیں۔ غالب نے یہ سنکر کہا بیشک بجا ارشاد ہوا۔ محبوب یہ سُن کر بہت ناراض ہوا اس پر غالب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے کہا کہ حضور! مجھے تو اس کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ کہ آپ جو کچھ کہیں، میں اس کے جواب میں یہ کہو کہ بجا ارشاد ہوا اس لیے آپ آئندہ از راہِ طعن یہ نہ کہیں کہ میں ستمگر ہوں۔

بنیادی تصور :۔ ترغیب ترکِ شیوۂ طعن۔

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جاوے
(۳) نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے!

مطلب :۔ ''دل میں اتر جانا'' محاورہ ہے یعنی دل نشین ہو جانا اور دل نشین وہی چیز ہوتی ہے جو دل پسند ہوتی ہے۔ اس محاورے سے غالب نے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے کہتے ہیں کہ یہ مانا اس کی نگاہِ ناز نشتر ہے اور نشتر کسی کا آشنا نہیں ہوتا مگر جب وہ ہمارے دل میں اتر گئی، تو پھر اُسے نشتر کے بجائے آشنا (دل نشین) کہنا چاہیئے۔

بنیادی تصور :۔ تحسین نگاہِ ناز۔

نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں
(۴) وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

جس طرح پہلے شعر میں ''اتر جانے'' سے مضمون پیدا کیا ہے اسی طرح اس شعر کی عمارت لفظ ''دل کشا'' پر قائم کی ہے۔ دل کشا کے دو معنی ہیں (۱) لفظی معنی دل کو

کھولنے یعنی شق کرنے والا اور یہی مفہوم مراد لیا ہے (۲) محاورے میں دلکشا، دلخوش کن یا باعثِ راحت کے معنی میں آتا ہے اور اسی ایہام میں شعر کا لطف پوشیدہ ہے
مطلب :- عاشقِ صادق کو زخمِ پیکاں سے لذت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ وہ جسم میں پیوست ہو جاتا ہے لیکن تلوار کا زخم چونکہ گہرا بھی ہوتا ہے اور دل کو شق بھی کر دیتا ہے اس لیے ہم اسے دل کشا (محبوب) کہہ سکتے ہیں۔
بنیادی تصور :- ترجیح زخمِ تیغ۔

جو مدعی بنے، اس کے نہ مدعی بنئے
(۵) جو ناسزا کہے، اس کو نہ ناسزا کہیئے

مدعی بمعنی دشمن۔
مطلب :- جو تمہارے ساتھ دشمنی کرے تم اس کے ساتھ دشمنی مت کرو اور جو تمہیں برا کہے تم اسے برا مت کہو۔
بنیادی تصور :- تلقین حسنِ سلوک۔

کہیں حقیقتِ جانکاہیٔ مرض لکھیئے
(۶) کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیئے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے
(۷) کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیئے

مطلب :- ہماری زندگی آج کل اس طرح گذر رہی ہے کہ ہم کسی جگہ جا کر اپنے مرض کی جانکاہی کا حال بیان کرتے ہیں اور کسی جگہ جا کر دوا کی ناموافقت کا رونا روتے ہیں کبھی ہم دوستوں سے رنجِ گراں نشین کی شکایت کرتے ہیں اور کبھی اپنی ناصبوری کا حال بیان کرتے ہیں۔
بنیادی تصور :- تصویرِ زندگیٔ عاشقِ نامراد۔

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
(۸) کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے

مطلب:۔ ایسا برا زمانہ آگیا ہے کہ انصاف کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ بلکہ اب یہ حالت ہے کہ اگر کوئی قتل کر دے تو قاتل سے انتقام لینے کے بجائے الٹا خون بہا دینا پڑتا ہے اور اگر کوئی زبان کاٹ دے تو دادرسی کے بجائے اس کی تحسین کرنی پڑتی ہے!

بنیادی تصور:۔ شکوۂ جورِ زمانہ۔

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے
(۹) روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

مطلب:۔ اگر معشوق کو تم سے الفت نہیں ہے نہ سہی تم اس کی برائی مت کرو کیونکہ بہر حال وہ تمہارا محبوب ہے بلکہ اس کی رفتار کی روانی اور اس کی اداؤں کی دلفریبی کا ذکر کرو۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ اجتناب از مذمتِ محبوب۔

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
(۱۰) طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

مطلب:۔ اگر بہار کو قیام (استقلال) نہیں ہے تو نہ سہی۔ بہر حال بہار قابلِ تحسین ہے۔ اس لیے تم شادابیٔ چمن اور خوبیٔ آب و ہوا کا بیان کرو۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ اجتناب از مذمتِ بہار۔

نوٹ:۔ دونوں شعروں کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں میں عیوب تلاش کرنے کے بجائے ان کی خوبیوں کو دیکھو اور ان کی تحسین کرو۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
(۱۱) خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

راحت اور جراحت کی طرح خدا اور ناخدا میں تجنیس ہے۔

مطلب:۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔ کہتے ہیں کہ جب انسان مشکلات پر غالب آ جائے تو شیوۂ مردانگی یہ ہے کہ اس کا تذکرہ زبان پر نہ لائے۔ بالفاظِ دگر جب مصائب کا خاتمہ ہو جائے تو ان مشکلات کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے جو پیش آئی تھیں۔

بنیادی تصور:۔ تلقین چشم پوشی از عیوب دیگراں۔

---

(۲۱۱)

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
(۱) دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

دھوئے گئے (۱) یعنی بے حیا (بیباک) ہو گئے۔ (۲) آنسو بھی پانی ہوتا ہے اور پانی سے دھونے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ پاک ہو گئے (۱) بے گناہ ہو گئے (۲) آزاد یا شہدے ہو گئے۔

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں کہ "جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال دل سے جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں بیان کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے (بیباک ہو گئے) بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے" (یادگار غالب ص ۱۴۶)

بنیادی تصور:۔ نتیجہ گریہ و زاری۔

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
(۲) تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

حساب پاک ہوگیا یعنی حساب صاف ہوگیا۔ بہائے مے بمعنی قیمتِ شراب۔

مطلب :- ہمارے ذمے دو حساب تھے ایک یہ کہ شراب کیسے حاصل کریں! دوسرا یہ کہ آلاتِ میکشی کو سر پر اٹھائے کہاں کہاں پھریں؟ لہٰذا ہم نے یہ کیا کہ آلاتِ میکشی فروخت کر کے شراب پی لی۔ گویا شراب بھی مل گئی اور آلاتِ میکشی کے بارے بھی سبکدوش ہو گئے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ ذوقِ مے نوشی بطرزِ شوخی۔

(۳)
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو، چالاک ہو گئے

مطلب :- معشوق پر طعن کرتے ہیں کہ اگرچہ آوارگی (ہرجائی پن) اختیار کر کے تم زمانہ بھر میں رسوا ہو گئے۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ تمہارے اندر چالاکی اور عیاری خوب پیدا ہو گئی یعنی اب تم کسی کے بہکائے میں نہیں آ سکتے۔

بنیادی تصور :- طعن بر آوارگیٔ محبوب۔

(۴)
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

مطلب :- شعرا پھول کو جگر چاک باندھا کرتے ہیں۔ یہیں سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ نالۂ بلبل میں ضرور اثر ہوتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جتنے پھول باغ میں ہیں سب جگر چاک نظر آتے ہیں۔

بنیادی تصور :- حسنِ تعلیل (تو جیہہ شگفتگیٔ گل)

(۵)
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اہلِ شوق بمعنی عاشقانِ خدا۔

مطلب :- جس طرح خس وخاشاک آگ میں پڑ کر آگ (فنا فی النار) ہو جاتا ہے اس لیے نہ اسے معدوم کہہ سکتے ہیں نہ موجود۔ اسی طرح جو لوگ فنا فی اللہ ہو جاتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہو جاتا ہے۔ انھیں موجود اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اُن کی ہستی مٹ جاتی ہے۔ اور معدوم اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ وہ اللہ سے واصل ہو جاتے ہیں (اور اللہ موجود ہے)۔

بنیادی تصور :- بیان مقامِ فنا۔

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گِلہ
(۶) کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مطلب :- اس شعر کا مطلب خود غالب نے بیان کیا ہے "معشوق حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آ کر شکایت کی ٹھنی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے۔ مگر جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔" (خطوطِ غالب جلد دوم صد ۳۶۹)

بنیادی تصور :- عدم تحمل جلوۂ محبوب۔

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
(۷) دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

رنگ بمعنی انداز یا طریق۔ چونکہ غالب نے رنگ کی تعیین نہیں کی اس لیے ابہام پیدا ہو گیا۔ اور جیسا کہ ہم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں دانستہ ابہام پیدا کرنا ان کی طبیعت کی خصوصیت ہے اگر رنگ سے توہین مراد لی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ اس نے غالب کی نعش کی ایسی توہین (تشہیر) کی کہ اس تذلیل کو دیکھ کر دشمن (بدخواہ) بھی غمناک ہو گئے اگر رنگ سے توقیر مراد لی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ اُس نے غالب کی

نعش اس دھوم دھام سے اٹھائی اور اس درجہ توقیر کی (خود کاندھا دیا) کہ دشمن
و رقیب بھی بوجہ رشک و حسد غمناک ہو گئے۔
بنیادی تصور:- توہین یا توقیرِ نعشِ عاشق۔

---

(۲۱۲)

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
(۱) شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

صرف ردیف کی وجہ سے اس شعر کو اردو زبان کا شعر کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے
مصرع میں مینائے شراب کو "سروِ کنارِ جوئبارِ نغمہ" سے تشبیہ دی ہے اس میں جدت
ضرور ہے مگر جب تک کاوش نہ کی جائے پڑھنے والا اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا
اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر شعر پڑھ کر انسان مفہوم کی تلاش میں سرگرداں ہو جائے تو شعر
کا لطف آدھا رہ جاتا ہے۔
مطلب:- موسم بہار کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ شراب کے نشہ میں رنگینی اور
سرور ہے، ساز (آلاتِ موسیقی) وفورِ مسرت سے مست ہیں۔ یعنی شراب میں نغمہ
کی اور نغمہ میں شراب کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور شیشۂ مے کیا ہے؛ گویا ایک
سرو ہے جو نغمے کی ندی کے کنارے اگا ہوا ہے۔ یعنی اپنی بہار دکھا رہا ہے۔
بنیادی تصور:- تصویرِ موسمِ بہار۔

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
(۲) واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

دوسرے مصرع میں لفظِ اعتبار جس مفہوم میں استعمال کیا ہے وہ غزل کی زبان
سے مناسبت نہیں رکھتا۔

مطلب :- غالب نے بزمِ دوست میں بیٹھ کر نالہ سر زد کیا۔ ہم نشین نے اس کو سمجھایا کہ بزمِ عیش میں نالہ کشی مناسب نہیں ہے۔ اس پر غالب نے کہا کہ میرے نالہ سے بزمِ عیش برہم نہیں ہو گی۔ کیونکہ دوست تو بہت سنگدل ہے اس لیے وہ میرا نالہ سن کر خوش ہو گا۔ یعنی اس کی نگاہ میں میرا نالہ بھی نغمہ کا حکم رکھتا ہے۔

بنیادی تصور :- بیانِ سنگدلیٔ محبوب۔

---

(۲۱۳)

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں، برائے خندہ ہے
(۱) دعویٔ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

اس شعر میں "شوخیٔ دنداں" بھی ہے "جمعیتِ احباب" بھی ہے۔ مگر شعریت نہیں ہے۔ بقول نظم طباطبائی "اس شعر میں توانائی اضافات اور رکیک تکلفات بھرے ہوئے ہیں۔" عرض بمعنی اظہار۔ شوخیٔ دندان سے خوبیٔ دندان مراد ہے۔ شعراء عموماً محبوب کے دانتوں کو مجمعِ احباب سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ اور اسی تشبیہ سے غالب نے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

مطلب :- جب محبوب ہنستا ہے تو اس کے دانت ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دوستوں کا یکجا ہو جانا بھی ہنسنے ہی کا مقام ہے۔ کیونکہ انجام اس یکجائی کا تفریق ہوا کرتا ہے یعنی دنیا میں دوستوں کا مجمع ہمیشہ قائم نہیں رہتا لطفِ صحبتِ احباب ایک عارضی شے ہے۔

انشاء نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے :-

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

بنیادی تصور:۔ بے ثباتی جمعیت احباب۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
(۲)
یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے

یک جہاں زانو تامّل یعنی تامّل بسیار۔ خندۂ گل کنایہ ہے شگفتگیٔ گل سے۔ در قفائے خندہ سے خندہ یعنی شگفتگی کا انجام مراد ہے۔ قفا کے لفظی معنی ہیں گُدّی۔
مطلب:۔ غنچہ ابھی شگفتہ نہیں ہوا ہے لیکن وہ اس سوچ میں ہے کہ دوسرے پھولوں کی طرح میرا انجام بھی یہی ہونا ہے کہ میں پھول بنوں گا اس کے بعد مرجھا جاؤنگا۔
بقول جناب جوش ملسیانی "اس قسم کا شعر معمہ یا پہیلی کہا جا سکتا ہے۔"

بنیادی تصور:۔ انجامِ خندہ گل۔

کلفتِ افسردگی کو عیش بے تابی حرام
(۳)
ورنہ دنداں در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے

عیش بے تابی سے وہ عیش مراد ہے جو بیتابی سے حاصل ہو۔ دنداں در دلِ افشردن فارسی محاورہ ہے اس کے معنی ہیں مصیبت برداشت کرنا۔ لفظی معنی ہیں۔ دل کو دانتوں سے چبانا۔ اسی ایہام سے غالب نے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے۔
مطلب:۔ مذہب عاشقی کی رُو سے کلفت افسردگی کی حالت میں بیتابی کا اظہار کرنا حرام ہے۔ ورنہ اگر ہم دل کو چبا ڈالیں (یہ دنداں در دل افشردن کے لفظی معنی ہیں) تو دل کی افسردگی فوراً دور ہو جائے گی۔ اور جب افسردگی دور ہو گئی تو خندہ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔
جناب نیاز فتحپوری فرماتے ہیں کہ "اس شعر میں فارسی محاورہ "دنداں در دل افشردن" سے ایہام پیدا کر کے انتہائی دور از کار استعارے سے کام لیا گیا ہے" اور یہی وجہ ہے کہ شعریت اور معنویت دونوں کا خون ہو گیا۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ ضبط و تحمل بحالتِ افسردگی۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
(۴) دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

محیط بمعنی دریا۔

مطلب:۔ احباب میرے ضبط و تحمل کو دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ میں سوزشِ باطنی سے محروم ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میں بظاہر ہنس رہا ہوں لیکن میرا دل آنسوؤں کا دریا بہا رہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اثباتِ سوزشِ باطن۔

---

(۲۱۴)

حسن بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
(۱) آئینہ، زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

حسن بے پروا کنایہ ہے محبوب سے۔ خریدارِ متاعِ جلوہ یعنی جلوے کے اظہار کا آرزومند۔ شعرا عموماً زانو کو آئینہ باندھا کرتے ہیں کیونکہ بحالتِ تفکر انسان اکثر سر بزانو ہو جاتا ہے۔ فکرِ اختراعِ جلوہ یعنی نئے نئے جلوے دکھانے کے لیے غور و فکر کرنا۔

مطلب:۔ معشوق بظاہر بے پروا نظر آتا ہے مگر بباطن ہر وقت نئے جلوے دکھانے کا آرزومند رہتا ہے اسی لیے ہر وقت آئینہ دیکھا کرتا ہے کہ کس قسم کی آرائش کرے تاکہ نئے نئے جلوے دکھا سکے۔

بنیادی تصور:۔ ذوقِ اختراعِ جلوہ۔

تاکجا اے آگہی! رنگِ تماشا باختن!
(۲) چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

آگہی بمعنی عقل و خرد + رنگ باختن بمعنی رنگ بدلنا۔ رنگ تماشا باختن بمعنی دنیا کے تماشوں میں مصروف رہنا۔ چشم واگردیدہ بمعنی کھلی ہوئی آنکھ جو مصروف تماشائے عالم ہے۔ چشم واگر آغوش وداع سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب :۔ اے عقل و خردِ انسانی! تو کب تک اس دنیائے فانی کے جلووں کے تماشے میں مصروف رہے گی؛ حقیقتِ حال یہ ہے کہ انسان جب اس دنیا کے عارضی (چند روزہ) تماشوں کو دیکھنے کے لیے اپنی آنکھ کھولتا ہے تو وہ دراصل ان تماشوں کو رخصت کرنے کے لیے اپنی آغوش کھولتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ تلقینِ اجتناب از تماشائے عالم۔

---

(۲۱۵)

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
(۱) مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

مطلب :۔ غالب نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لیے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیے یعنی جب تک دل، تیغِ عشق سے زخمی نہ ہو (جب تک انسان خدا پر عاشق نہ ہو) یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

بنیادی تصور :۔ شرطِ ہمکلامیٔ محبوب۔

نوٹ :۔ یہ شعر غالب کے مخصوص اندازِ بیان کی بہت دلکش مثال ہے کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب تک انسان خدا سے محبت نہ کرے اس سے ہمکلام نہیں ہو سکتا مگر کہتے یہ ہیں کہ خدا سے ہمکلام ہونے کے لیے دہانِ ظاہری کے بجائے "دہانِ زخم" درکار ہے ۱۲

عالم، غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
(۲) کب تک خیالِ طرّہ لیلیٰ کرے کوئی

اس شعر کی خوبی بھی اس کے اندازِ بیان ہی میں مضمر ہے ۔ "غبارِ وحشتِ مجنوں" کنایہ ہے امرِ معدوم سے کیونکہ وحشت کا غبار ایک اعتباری چیز ہے جس کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے ۔ خیالِ طرّہ لیلیٰ کنایہ ہے خیالِ محبوب سے کیونکہ لیلیٰ کی زلفیں بہت دلکش تھیں ۔

مطلب :۔ یہ عالم دراصل فریبِ نظر ہے جس کا خارج میں حقیقی وجود نہیں ہے یعنی دیکھو تو نظر آتا ہے غور کرو تو کچھ نہیں جس طرح شعلۂ جوالہ کی گردش سے اگرچہ دائرہ نظر آتا ہے مگر دراصل اس کا کوئی وجود نہیں ہے ۔ لہٰذا اے نادان! تو کب تک اس امرِ معدوم (فریبِ نظر) کو اپنا محبوب اور مقصودِ حیات بناتا رہے گا ۔ اور کب تک اس دارِ فانی سے دل لگاتا رہے گا !

بنیادی تصور :۔ اثباتِ بے ثباتیٔ عالم ۔

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
(۳) ہاں دَرد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

افسردگی بمعنی مایوسی یا ترکِ جدوجہد ۔ التفات سے التفاتِ محبوب مراد ہے طرب انشائے التفات یعنی باعثِ التفاتِ یار یا محبوب کے التفات کی خوشی عطا کرنے والی ۔

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ افسردگی اور مایوسی سے کوئی عاشق اپنے معشوق کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا یعنی افسردگی سے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اگر کوئی عاشق سراپا درد بن جائے یعنی حصولِ معشوق کے لیے جدوجہد کرے (مصائبِ عاشقی برداشت کرے) تو بے شک وہ عاشق معشوق کے دل میں گھر بنا سکتا ہے ۔

بنیادی تصور :- بیانِ تاثیر دردِ عشق۔

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
(۴) آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

عقدۂ دل وا کرنا بمعنی اپنے دل کی گرہ کھولنا۔ اس سے مراد ہے اپنا دل ہلکا کرنا۔
مطلب :- اے ہم نشین! میری گریہ وزاری پر مجھے ملامت نہ کرنا اور کبھی بتائیں اپنا دل ہلکا کروں!

بنیادی تصور :- عذرِ شدتِ گریہ۔

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
(۵) کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

مطلب :- ہم نے اس کے فراق میں اپنا جگر تک چاک کر دیا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا تو گریباں چاک کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہو گا؟ گریباں تو بہر حال جگر کے مقابلہ میں بہت ادنیٰ درجہ کی چیز ہے!

بنیادی تصور :- بیان بے التفاتیٔ محبوب۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار، شاخِ گل
(۶) تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

مطلب :- اس کے فراق میں صحرا نوردی اختیار کی اور وہاں اس قدر رویا کہ جگر کے ٹکڑے آنسوؤں کے ساتھ مل کر نکل آئے، ان کے خون سے صحرا کے کانٹے سرخ ہو گئے یعنی صحرا میں چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آنے لگے۔ اے خدا! میں کب تک اس طرح صحرا کو باغ میں تبدیل کرتا رہوں گا؟ یعنی کب تک اس کے فراق میں خون کے آنسو روتا رہوں گا؟ اس شعر کا مضمون اس شعر سے ماخوذ ہے :-

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل ؛ قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

بنیادی تصور :۔ شدتِ خونتابہ فشانی۔

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
(۷) تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

تجھ کو تماشا کرے یعنی تجھ کو دیکھے۔

مطلب :۔ "تو" کا مخاطب محبوب مجازی بھی ہو سکتا ہے اور محبوب حقیقی بھی کہتے ہیں کہ کوئی شخص تجھے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ طور پر جو بجلی گری تھی وہ دراصل ہماری ہی نگاہ کی ناکامی تو تھی! اس شعر کا انداز بیان بہت خوب ہے۔

بنیادی تصور :۔ عدمِ استطاعتِ دیدار۔

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہر شکست
(۸) نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

اس شعر کی خوبی اس کے اندازِ بیان میں مضمر ہے۔ ورنہ مضمون بہت پیش پا افتادہ ہے۔

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شیوۂ عاشقی اختیار کرے۔ تو اس میں سراسر فائدہ ہی ہے کیونکہ جب وہ مجنوں ہو جائے گا اور لڑکے پتھر ماریں گے تو اس کے حق میں ہر پتھر وہ صدف بن جائے گا۔ جس سے شکستگی کا موتی نصیب ہوگا۔ یعنی اس کا جسم زخموں سے چور چور ہو جائے گا۔ اور یہی حالت عاشق کی معراج ہے عشق میں شکستگی ہی مطلوب ہے۔

بنیادی تصور :۔ قدر و قیمتِ جنونِ عاشقی۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزمائے عمر
(۹) فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

مطلب :۔ حالی لکھتے ہیں "ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے پورے ہونے کے انتظار

میں گذر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی؟ (یادگار غالب ص ۱۴۷)

نظم طباطبائی لکھتے ہیں "بہتر یہ تھا کہ یوں کہتے کہ حصول تمنا (ارمان نکالنے) کا موقع ہی نہ ملا مگر زمین شعر نے اس معنی کی طرف راہ نہ دی (شرح دیوان غالب ص ۲۵۹)

بنیادی تصور:۔ طول وعدۂ صبر آزما۔

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی (۱۰)

اس شعر کے پہلے مصرع میں معانیٔ کثیر کو چند لفظوں میں ادا کیا ہے اس لیے اجمال اور اس کی بناء پر اشکال پیدا ہو گیا ہے۔ "ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد" کی ترکیب چونکہ مجمل ہے اس لیے خود پڑھنے والے کی طبیعت میں ایک گونہ وحشت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے ایجاد پسند یا معنی آفرین طبائع کی وحشت کا نتیجہ۔ درد سے مضمون آفرینی مراد ہے۔

مطلب:۔ اگرچہ معنی آفرینی اور جدت طرازی کا نتیجہ ہمیشہ یاس انگیز ہوتا ہے یعنی اگرچہ اکثر شعراء معنی آفرینی کے میدان میں ناکام ہوتے ہیں مگر اس درد یعنی مضمون آفرینی میں اس قدر دلکشی ہے کہ ہر شاعر اس مرض میں مبتلا نظر آتا ہے یعنی ہر شاعر مضمون آفرینی کی کوشش کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر یہ درد ایسا ہے کہ ہر شاعر خود اپنے دل میں پیدا کرتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ دشواریٔ مضمون آفرینی۔

بے کاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی (۱۱)

محاورے کے اعتبار سے "کو" کے بجائے "میں" بہتر تھا۔ "ہاتھ ٹوٹ جائیں" یعنی جب آدمی بے کار ہو جائے۔ شعر کا لطف اسی محاورے کے استعمال میں مضمر

ہے۔ لفظی معنی پر نگاہ کی جائے تو پڑھنے والا حیران ہو جاتا ہے کہ جب ہاتھ ٹوٹ گئے تو سر پیٹنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ مگر غالب نے محاورے سے مضمون پیدا کیا ہے یعنی بے کار آدمی عموماً اپنا سر پیٹتا رہتا ہے۔ سر پیٹنے کے خود دو معنی ہیں (۱) واقعی سر پیٹنا (۲) اظہارِ افسوس کرنا۔

مطلب :- چونکہ سودائے عشق نے ہمیں بے کار کر دیا کسی کام کا نہ رکھا اس لیے اب ہم سر پیٹنے (اظہارِ افسوس) کے علاوہ اور کریں بھی کیا۔

بنیادی تصور :- نتیجۂ بیکاریٔ جنوں۔

حسن فروغ شمع سخن، دور ہے اسدؔ
(۱۲) پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

مطلب :- جب تک شاعر کے دل میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا نہ ہو اس کے کلام میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور :- شرطِ تاثیر کلام۔

---

(۲۱۶)

(۱) ابن مریم ہوا کرے کوئی ✿ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

مطلب :- اگر محبوب میرے دکھ کی دوا کر سکے تو میں اسے مسیحا تسلیم کر سکتا ہوں ورنہ نہیں۔

بنیادی تصور :- شرطِ مسیحائی۔

(۲) شرع و آئین پر مدار سہی ✿ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

مطلب :- میں نے مانا کہ شریعت اور قانون ملکی دونوں میں قاتل کے لیے سزا مقرر ہے مگر اس شخص کی گرفت کیسے ہو سکتی ہے جو بے تلوار کے قتل کرتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تحسین ناوکِ ناز۔

(۳) چال، جیسے کڑی کمان کا تیر ٭ دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

مطلب:۔ ایسے معشوق کے دل میں بھلا کون جگہ پیدا کر سکتا ہے جس کی چال کڑی کمان کے تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے۔ کڑی کمان کا تیر کنایہ ہے سرعتِ رفتار سے۔

بنیادی تصور:۔ تحسین رفتارِ معشوق۔

(۴) بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ٭ کچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی

مطلب:۔ "کچھ نہ سمجھے" کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کرے وہ میری بات سمجھ جائیں اور میرے حالِ زار پر نگاہِ کرم فرمائیں۔ دوسرے معنی یہ کہ خدا کرے کوئی شخص کچھ نہ سمجھ سکے تاکہ رازِ عشق فاش نہ ہو۔

بنیادی تصور:۔ (۱) ترغیب بذلِ التفات (۲) آرزوئے خفائے راز۔

(۵) بات پر واں زبان کٹتی ہے ٭ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

مطلب:۔ محبوب اس قدر نازک مزاج بلکہ تنک مزاج ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے زبان کھولے تو اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ برا بھلا کہتا رہے اور سب خاموشی کے ساتھ بیٹھے سنتے رہیں۔

بنیادی تصور:۔ تنک مزاجیٔ محبوب۔

(۶) نہ سنو گر برا کہے کوئی ٭ نہ کہو گر برا کرے کوئی

(۷) روک لو گر غلط چلے کوئی ٭ بخش دو گر خطا کرے کوئی

مطلب:۔ اگر کوئی شخص تمہیں برا بھلا کہے تو سنکر خاموش ہو جاؤ۔ اگر کوئی تمہارے ساتھ برائی کرے تو اسے برداشت کر لو۔ اگر کوئی شخص غلط راہ اختیار کرے تو اسے اس فعل سے باز رکھو اور اگر کوئی شخص تصور کرے تو اسے معاف کر دو۔

بنیادی تصور:۔ تلقین کسبِ محاسنِ اخلاق۔

(۸) کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند ؎ کس کی حاجت روا کرے کوئی

مطلب :۔ اس کے دو مطلب ہیں پہلا یہ کہ اس دنیا میں ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے اس لیے اگر کوئی شخص تمہاری حاجت، پوری نہ کرے تو شکایت مت کرو دوسرا یہ کہ اس دنیا میں ہر شخص حاجتمند ہے اس لیے انسان کس کس کی حاجت پوری کرے !

بنیادی تصور :۔ عموم حاجتمندی۔

(۹) کیا کیا خضر نے سکندر سے ؎ اب کسے رہنما کرے کوئی

مطلب :۔ اس شعر میں تلمیح ہے اِس داستان کی طرف کہ سکندر حضرت خضر کے ساتھ چشمۂ حیواں پر گیا تھا۔ مگر وہاں جا کر دیکھا کہ جن لوگوں نے یہ پانی پی لیا تھا وہ اگرچہ زندہ تھے مگر طولِ عمر کی وجہ سے اس قدر ضعیف ہو گئے تھے کہ بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر سکندر بغیر پانی پیئے وہاں سے واپس چلا آیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شئی تقدیر میں نہ ہو تو خضر کی رہنمائی بھی بے سود ہے یعنی وہ شئی ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ لہذا کسی کو رہنما بنانا بے فائدہ ہے۔

بنیادی تصور :۔ تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل

کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

(۱۰) جب توقع ہی اٹھ گئی غالب ؎ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

مطلب :۔ گلہ تو توقع پر مبنی ہے۔ جب کسی سے کوئی امید ہی باقی نہ رہے تو اس کا گلہ کرنا بے کار ہے۔

بنیادی تصور :۔ تلقین خودداری۔

نوٹ :۔ اس غزل کے آخری دونوں شعر اپنی معنوی خوبیوں کی بناء پر اردو ادب میں ضرب المثل ہو گئے ہیں ۱۲

(۲۱۷)

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کیا کم ہے
(۱) غلام ساقیٔ کوثر ہوں، مجھ کو کیا غم ہے

مطلب :- یہ مانا کہ میں نے اس دنیا کی زندگی میں بہت غم برداشت کئے ہیں۔ مگر تسلی کا پہلو یہ ہے کہ میں چونکہ ساقیٔ کوثر کا غلام ہوں اس لیے آخرت میں ابدالآباد تک شراب بھی تو پینے کو ملے گی۔ لہٰذا ان غموں کا نعم البدل مل جائے گا۔

بنیادی تصور :- پہلوئے تسکینِ قلبِ ناشاد۔

تمہاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم، کیا ہے
(۲) رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

مطلب :- پہلا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہاری روش سے بخوبی آگاہ ہیں یعنی تم ہر صورت سے ہمیں ستانے پر کمربستہ ہو۔ چنانچہ تم رقیب پر جو مہربانی کر رہے ہو یہ دراصل ہم پر ستم کر رہے ہو یعنی اس پر مہربانی ہمارے حق میں ستم ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہاری طرزِ زندگی سے خوب واقف ہیں یعنی ہم جانتے ہیں کہ تم ہرجائی ہو۔ اس لیے اگر آج کل تم رقیب پر مہربان ہو تو یہ ہمارے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے ساتھ بھی وہ سلوک کرو گے جو ہمارے ساتھ کر رہے ہو۔

بنیادی تصور :- طنز بر روشِ محبوب۔

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی!
(۳) یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

مطلب :- ہم بھی فنِ شاعری میں غالب کی آتش بیانی اور شعلہ فشانی کے معترف ہیں۔ مگر افسوس کہ عشق کے صدموں نے اسے بالکل رنجور کر دیا ہے۔ اب اس میں

وہ پہلا ساز نگ باقی نہیں ہے۔
بنیادی تصور:۔ نتیجہ مصائب عاشقی۔

---

(۲۱۸)

باغ پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
(۱) سایۂ شاخ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

مطلب:۔ قاعدہ ہے کہ خفقان یا مراق کی حالت میں انسان کی قوتِ واہمہ اور متخیلہ بہت بڑھ جاتی ہے اسی لیے مراقی آدمی کو رسی پر سانپ کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ چونکہ عشق میں بھی انسان پر خفقانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس لیے جب وہ گلاب کی ٹہنی کا سایہ زمین پر دیکھتا ہے تو وہ سایہ اسے سانپ نظر آتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تصویر کیفیتِ خفقان۔

جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم!
(۲) ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرِ آب اگاتا ہی مجھے

پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ سبزیٔ جوہرِ تیغ کی نمود زہر آب کے علاوہ کسی دوسرے سرچشمے سے نہیں ہو سکتی۔ بالفاظِ دگر جوہرِ تیغ کا سرچشمہ زہر آب ہے۔ جوہر تیغ سبزی مائل ہوتا ہے جو تلوار کو زہر آب میں بجھانے سے نمودار ہوتا ہے زہر آب کے دو معنی ہیں۔ اور اسی ابہام پر شعر کا مضمون مبنی ہے (۱) زہر آب بمعنی تیزاب (۲) زہر آب بمعنی رنج و غم۔

مطلب:۔ جس طرح جوہر تیغ کی سبزی زہر آب (تیزاب) پر موقوف ہے اسی طرح میری زندگی بھی زہر آب (غم و رنج) پر منحصر ہے۔ یا رنج و غم میری سرشت میں داخل ہے۔ بالفاظ دگر جس طرح تلوار کا جوہر زہر آب کی بدولت ظاہر ہوتا ہے، میری

فطرت غم و غصہ سے آسودہ ہوتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ الم دوستی۔

(۳)
مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

مطلب:۔ میرا مدعا یہی تھا کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور میں اپنے دل کی شکستگی کا تماشا دیکھتا رہوں۔ الحمد اللہ کہ یہ مدعا حاصل ہو گیا یعنی آئینۂ دل کے سو ٹکڑے ہو گئے۔ چونکہ آئینہ کے ہر ٹکڑے میں صورت نظر آتی ہے اس لیے اب مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی آئینہ خانہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ تماشائے شکستِ دل۔

(۴)
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

غالب نے یہ شعر محض آسمان پر بیضۂ قمری کی پھبتی کہنے کے لیے موزوں کیا ہے۔ قمری کا رنگ خاکی یا خاکستری ہوتا ہے۔ اور اس کا انڈا بھی خاکی رنگ کا ہوتا ہے۔ چنانچہ فارسی زبان میں قمری کو کفِ خاکستر باندھا کرتے ہیں غالب نے آسمان کو بیضۂ قمری اور عالم کو کفِ خاک قرار دیا ہے۔

مطلب:۔ اس عالم کا سرمایہ نالہ ہے یعنی دنیا نام ہی ہے نالہ و فریاد کا۔ اور یہ عالم کفِ خاک ہے۔ اس لیے آسمان بمنزلۂ بیضۂ قمری ہے جس میں کفِ خاک کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے بالفاظِ دگر، یہ عالم نالہ کشی (آہ و فریاد) کے لیے بنایا گیا ہے۔ اسی لیے مجھے آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے جو خاکی رنگ کا ہوتا ہے خوبی اس اندازِ بیان میں یہ ہے کہ قمری کو کفِ خاک سے اور اس کی آواز کو نالہ و فریاد سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

بنیادی تصور :- اظہارِ حقیقتِ عالم۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
(۵) دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

پہلے مصرع میں اٹھا دینے سے نکال دینا مراد ہے۔ دوسرے مصرع میں تجہیز و تکفین مراد ہے۔ شعر کا لطف اسی ابہام میں مضمر ہے۔

مطلب :- اس شعر کے دو معنی ہیں (۱) پہلے معنی یہ ہیں کہ جب میں زندہ تھا تو وہ مجھے اپنی محفل سے اٹھا دیا کرتے تھے۔ اب میں دیکھوں گا کہ میرے مرنے کے بعد مجھے وہاں سے کون اٹھائے گا یعنی میرے مر جانے کے بعد تو وہ مجھ سے یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ اٹھ جاؤ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ زندگی میں تو وہ اٹھا دیا کرتے تھے اب دیکھوں گا کہ میرے مرنے کے بعد میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

بنیادی تصور :- لطفِ ابہام۔

---

(۲۱۹)

روندی ہوئی ہے کوکبہ شہریار کی
(۱) اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی

کوکبہ بمعنی وہ سوار اور پیدل جو بادشاہوں کی اردلی میں رہتے ہیں۔

مطلب :- خاکِ رہگذر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کیونکہ اسے ممدوح کی اردلی کے سواروں نے پامال کیا ہے۔

بنیادی تصور :- اظہارِ علوِّ مرتبہ ممدوح۔

جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
(۲) لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

مطلب :۔ عوام کی نظروں میں اس باغ کی عزت (نمود) کیوں نہ ہو جسے دیکھنے کے لیے خود ممدوح (بادشاہ سلامت) تشریف لائیں !

بنیادی تصور :۔ بیانِ عظمتِ ممدوح۔

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم و لے
(۳) کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

مطلب :۔ ہمیں سیرِ باغ کی چنداں آرزو نہیں ہے مگر بہار کی ہوا اس قدر دلکش ہے کہ خواہ مخواہ اس سے لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ تحسینِ ہوائے بہار۔

---

(۲۲۰)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
(۱) بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مطلب :۔ حالی لکھتے ہیں "خواہش پر دم نکلنا یعنی اس کے پورے ہونے کے لیے جلدی کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو یعنی اس قدر جلدی کیوں ہے؟ پہلے مصرع میں بمقتضائے مقام "یہ الفاظ" کہ دل ہی باقی ہیں" مقدر ماننے چاہئیں۔ باقی مطلب صاف ہے۔"

بریں تقدیر مطلب یہ ہوگا کہ انسانی خواہشات بے حد ہیں۔ جس قدر پوری ہوتی ہیں اسی قدر بلکہ ان سے زیادہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہر انسان یہی کہتا رہتا ہے کہ اگرچہ میرے بہت سے ارمان پورے ہو گئے مگر پھر بھی بہت کم پورے ہوئے۔ دوسرے مصرع میں غالب نے ایک عالمگیر صداقت کا اظہار کیا ہے یعنی یہ شعر ہر شخص کے حسب حال ہے اسی لیے ضرب المثل ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تلقینِ ترکِ آرزو۔

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اس کی گردن پر
(۲) وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

مطلب:۔ غالب نے ظریفانہ انداز میں قاتل کی تسکین کا پہلو نکالا ہے کہتے ہیں کہ جس قدر خون میرے جسم میں تھا وہ تو سب آنکھوں کی راہ سے نکل گیا۔ لہٰذا وہ اس بات سے بالکل نہ ڈرے کہ میرا خون اس کی گردن پر رہے گا۔

بنیادی تصور:۔ پہلوئے تسکینِ قاتل۔

نوٹ:۔ داغ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

بخشدے اس بات سے کہ اے داورِ محشر
خون ہی مجھ میں نہ تھا۔ خون کا دعویٰ کیسا

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
(۳) بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مطلب:۔ لفظ "بہت" پر زور دیکر پڑھنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ ہم حضرت آدم سے بھی زیادہ بے آبروئی کے ساتھ کوچۂ محبوب سے نکالے گئے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ تذلیلِ خویش۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
(۴) اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

بھرم کھل جانا محاورہ ہے بمعنی ہوا اکھڑ جانا، بات بگڑ جانا، شہرت زائل ہو جانا۔

مطلب:۔ اگر تیری زلفیں کھل جائیں تو ان کی درازی تیری قامت کی درازی سے بڑھ جائے گی یعنی تیری سرو قامتی کا بھرم کھل جائے گا۔ اندازِ بیان کی خوبی قابلِ داد ہے۔

نوٹ :۔ مولینا احسن مارہروی مرحوم نے جو داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اپنے استاد کی زبان سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ "مرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ مرزا نوشہ غالب ؔ شاہ ظفر مرحوم کے حضور اپنی ایک غزل لے کر پہنچے جس کا مطلع یہ ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بادشاہ کو یہ زمین بہت پسند آئی۔ حکم ہوا کہ اس طرح میں مشاعرہ ہو۔ ہماری جوانی کا زمانہ تھا طبیعت پورے جوش پر تھی۔ ہم نے بھی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچے۔ جب یہ شعر پڑھا۔

ہوئے منرور وہ، جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

تو بادشاہ نے بہت داد دی اور اپنے پاس بلا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔
(بزم داغ ص۱۵)

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
(۵) ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مطلب :۔ مقصد یہ ہے کہ جب لوگ اسے ہم سے خط لکھوائیں گے تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کی خط و کتابت کن کن لوگوں سے ہے اور وہ اسے کیا لکھواتے ہیں۔
بنیادی تصور :۔ تفحص حالِ محبوب۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
(۶) پھر آیا وہ زمانہ جب جہاں میں جام جم نکلے

مطلب :۔ اس زمانہ میں مجھ سے بڑھ کر بادہ نوش کوئی نہیں ہے ۔ ک ہے اب میری

ذات سے جام جمشید کو شہرت حاصل ہو گی یعنی لوگ کہیں گے کہ غالب بھی اپنے وقت کا جمشید ہے۔

بنیادی تصور :۔ فخر بر شراب نوشی۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
(۷) وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

مطلب :۔ ہمیں جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ وہ ہماری خستہ حالی دیکھ کر ہم سے اظہارِ ہمدردی کریں گے ان سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ حال اور فلک کے ستائے ہوئے ہیں۔ خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور :۔ عمومِ خستہ حالی دورماندگی۔

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
(۸) اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

پہلے مصرع میں "مرنے اور جینے" سے لغظی معنی مراد ہیں۔ لیکن دوسرے مصرع میں "جیتے ہیں" سے مراد ہے خوش ہونا اور "دم نکلنے" سے مراد ہے محبت کرنا۔

مطلب :۔ جس کافر پہ ہمارا دم نکلتا ہے یعنی جس پر مرتے ہیں اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں یعنی راحت (زندگی) نصیب ہوتی ہے۔ تو پھر اس میں کیا شک ہے کہ محبت میں مرنا اور جینا ایک ہی بات ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بقولِ بیخود دہلوی یہ شعر حاصل زمین ہے۔

بنیادی تصور :۔ اعجازِ حضرتِ عشق۔

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا واعظ
(۹) کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

میری رائے میں یہ شعر بیت الغزل ہے بلکہ غالب کے بہترین اشعار میں سے ہے

اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مضمون مرزا کو سوجھا کیوں کر اور اس کو ایسی عمدگی کے ساتھ ادا کیسے کر دیا کہ اس کی معنویت بلاغت اور ندرت پر روح وجد کرتی ہے۔

غور کیجیے (الف) خدا ہی محلِ نظر ہے اور خدا ہی کا واسطہ دیتے ہیں۔ (ب) اس واسطہ میں کتنی شوخی اور دلکشی مضمر ہے۔ (ج) کعبہ سے پردہ اٹھانے کے دو معنی ہیں (۱) واقعی خانۂ کعبہ پر پردہ پڑا ہوا ہے یعنی پردہ اٹھا کر کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کر دینا۔ (۲) اسلام کی حقیقت واضح کرنا۔ (د) قبل فتح مکہ واقعی کعبہ میں اصنام موجود تھے۔ (ہ) صنم کی رعایت سے کافر لائے ہیں۔ اور کافر کے معنی کافر کے بھی ہیں اور محبوب کے بھی (و) خدا کے مقابلہ میں صنم اور واعظ کے مقابلہ میں کافر کا لفظ لائے ہیں

مطلب:۔ ظاہری مطلب یہ ہے کہ واعظ نے غالبؔ سے کہا کہ بت پرستی بری بات ہے اس لیے خدا پرستی اختیار کرو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں تو ان دیکھے خدا کی پرستش نہیں کر سکتا تم خدا کو دکھاؤ تو اس کی پرستش کر سکتا ہوں اس پر واعظ نے کہا اچھا آؤ میں تمہیں کعبہ سے پردہ اٹھا کر خدا دکھا دوں۔ یہ سنکر غالب نے کہا "خدا کے لیے پردہ نہ اٹھانا! کہیں ایسا نہ ہو اس کے اندر بھی میرا محبوب ہی چھپا بیٹھا ہو! ایسا ہوا تو تمہیں بہت شرمندگی ہوگی!

لیکن پردہ اٹھانے کے دوسرے معنی پر غور کرو تو یہ مطلب ہوگا کہ تم ظاہر پرستی میں مبتلا ہو۔ دراصل وہی ایک ذات ہے جسے تم خدا کہتے ہو میں اسے صنم کہتا ہوں تم مذہب کی حقیقت سے پردہ اٹھا دو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ معبود حقیقی سب ہی ہے وہی کعبہ میں ہے وہی بت خانہ میں ہے۔ اسماء کثیر ہیں مگر مسمٰی واحد ہے جسی لوگ اُسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ "کہیں ایسا نہ ہو" کا مطلب ہے یقیناً ایسا ہی ہے۔ اس ٹکڑے کی بلاغت اور معنویت تحسین سے بالاتر ہے یعنی عاشق کو

یہ یقین ہے کہ کعبہ اور بت خانہ دونوں میں وہی جلوہ گر ہے :-

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا است
از یک چراغ ، کعبہ و بتخانہ روشن است

بنیادی تصور :- ہمہ جائی محبوب حقیقی -

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
(۱۰) پر اتنا جانتے ہیں ، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

شوخی اور طنز کے اعتبار سے بہت بلند پایہ شعر ہے اس پر اندازِ بیان کی دلکشی گویا سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے -

مطلب :- واعظ کی پارسائی کی جس قدر دھوم ہے ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں مگر اتنا ضرور کہیں گے کہ کل جب ہم میخانے سے باہر نکل رہے تھے تو اتفاق سے دروازے میں ہماری اس کی ملاقات ہو گئی -

بنیادی تصور :- طنز بر واعظ -

---

(۲۲۱)

کوہ کے ہوں بار خاطر ، گر صدا ہو جایئے
(۱) بے تکلف ، اے شرارِ جستہ ! کیا ہو جایئے

مطلب :- کہتے ہیں کہ اگر میں صدا بن جاؤں (جس میں کوئی وزن نہیں ہوتا ، اس لیے وہ کسی پر بار نہیں ہو سکتی) تو بھی کوہ جیسی باوقار ہستی اسے رد کر دیتی ہے - ان حالات میں کیا کروں کہ کسی پر میری ہستی بار نہ ہو (کسی کو میرا وجود ناگوار نہ ہو) شرارِ جستہ کو مخاطب کرنے سے غرض یہ ہے کہ اپنی بے ثباتی کی طرف اشارہ ہو جائے - لہٰذا اس سے خطاب کرتے ہیں کہ اگرچہ میری ہستی بھی تیری طرح بے حقیقت اور بے آزار ہے

لیکن پھر بھی موجبِ آزار و گِراں ہوں۔ اس بات کو صدا کی مثال سے واضح کیا ہے کہ جب اس کی ہستی (جو محض ہوا کا تموج ہے) کوہ پر بار ہے تو پھر انسان لاکھ کوشش کرے کسی نہ کسی رنگ میں دوسروں کے لیے بار خاطر ہو جاتا ہے۔

بنیادی تصور: مذمتِ ہستی۔

بیضہ آسا، ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
(۲) از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

کنجِ قفس کنایہ ہے دنیا سے۔

مطلب: جب تک طائر کا بچہ (چوزہ) انڈے میں رہتا ہے اس وقت تک وہ پرواز نہیں کر سکتا۔ لیکن جب وہ انڈے (کے قفس) سے باہر نکل آتا ہے تو پرواز کر سکتا ہے۔ اگر وہ اسی میں رہے تو کبھی پرواز نہ کر سکے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب شعر کا مطلب واضح ہو گیا کہ اسی طرح دنیا انسان کے لیے بمنزلہ بیضہ ہے جب تک انسان اس دنیا کی قید میں گرفتار ہے وہ روحانی اعتبار سے پرواز نہیں کر سکتا اور جس طرح چوزے کو انڈے سے باہر نکلنے کے بعد حیاتِ نو حاصل ہوتی ہے اسی طرح جب انسان زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے تو اسے نئی زندگی نصیب ہوتی ہے اس لیے انسان کو چاہیئے کہ وہ ان قیود سے رہائی حاصل کرے تاکہ پرواز کر سکے بلاشبہ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور: شرطِ پرواز۔

---

(۲۲۲)

مستی، بذوقِ غفلتِ ساقی، ہلاک ہے
(۱) موجِ شراب، یک مژۂ خواب ناک ہے

عفلت بمعنی بیخودی + ہلاک ہے بمعنی مفتون یا فریفتہ ہے + دوسرے مصرع کی نثر یوں ہوگی ۔ اور مژہ خواب ناک گویا موج شراب ہے ۔ یہ شعر دو لختہ ہے یعنی ہر مصرع میں جدا گانہ مضمون نظم کیا ہے ۔

مطلب :۔ ساقی (محبوب) کی بیخودی اس قدر دلفریب ہے کہ خود مستی اس پر فریفتہ ہے (جان دیتی ہے) اور اس کی خمار آگیں آنکھیں اس درجہ مستی انگیز ہیں کہ ان کی پلکوں کا ہر بال گویا شراب کی ایک موج ہے ۔ پلکوں کو موج شراب سے تشبیہ دی ہے اور تشبیہ کی دلکشی اس بات میں مضمر ہے کہ وجہ شبہ حسی بھی ہے اور عقلی بھی ۔

بنیادی تصور :۔ فتنہ انگیزئ نگاہ ۔

جز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دِل میں آرزو !
(۲) جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

ناز سے یہاں تغافل اور کج ادائی مراد ہے + جیب سے مراد گریباں نہیں بلکہ کیسہ + "جز" حرفِ استثناء منقطع ہے ۔ اگر اسے متصل قرار دیا جائے تو شعر کا مطلب واضح نہیں ہو سکتا ۔ تفصیل اس نکتہ کی یہ ہے کہ استثناء کی دو قسمیں ہیں ۔ (۱) متصل (۲) منقطع ۔ متصل کی مثال یہ ہے "خراب انگوروں کے سوا باقی سب انگور زید کو دیدو" یہ استثناء متصل ہے کیونکہ خراب انگور بھی اچھے انگوروں میں شامل ہیں ۔ منقطع کی مثال یہ ہے ۔ "انگوروں کے سوا دوسرے تمام پھل زید کو دیدو"

مطلب :۔ ایک زمانہ میں میرا دل آرزوؤں سے معمور تھا ۔ مگر اب اس میں کوئی آرزو نہیں ہے صرف تیغ ناز کے زخم کا نشان باقی رہ گیا ہے ۔ دوسرے مصرع میں اس بات کو مثال سے واضح کیا ہے کہ کیسۂ خیال (قلب) تو چاک ہو گیا اس میں جو کچھ تھا نکل گیا صرف چاک کا نشان باقی ہے ۔

بنیادی تصور :۔ نشانِ زخمِ تیغِ ناز ۔

دوسرا مطلب :- اس کے علاوہ اب میری اور کوئی آرزو نہیں ہے کہ تیری تیغِ ناز میرے دل کو زخمی کردے۔ کسی آرزو کے نہ ہونے کی وجہ دوسرے مصرع میں بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ آرزو کا وجود تو خیال پر موقوف ہے (خیال سے آرزو پیدا ہوتی ہے) لیکن کیفیت یہ ہے کہ تیرے ہاتھوں میرے خیال کی جیب بھی چاک ہو چکی ہے یعنی خیال کی طاقت ہی سلب ہو گئی اور جب قوتِ خیال ہی ختم ہو گئی تو آرزو کا پیدا ہونا خارج از بحث ہے۔

بنیادی تصور :- آرزوئے زخمِ تیغِ ناز۔

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ

(۳) صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

"کچھ نظر نہیں آتا" اس کے دو معنی ہیں (۱) کسی شی کی کوئی ہستی یا حقیقت نہیں ہے۔ (۲) بصارت جاتی رہی ہے۔

"اک مشتِ خاک ہے۔ اس کے بھی دو معنی ہیں :- (۱) بہت حقیر شی ہے (اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے) (۲) مٹھی بھر خاک ہے ۔ اس لیے شعر کے مطلب بھی دو ہو گئے۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ جوشِ جنوں کی شدت کے آگے صحرا بھی (جو نہایت وسیع ہوتا ہے) ہماری نظر میں بہت حقیر اور مختصر معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جوشِ جنوں ہمیں صحرا میں لے گیا وہاں جا کر ہم نے اس قدر خاک اڑائی کہ عالم تیرہ و تار ہو گیا ۔ اس کو یوں ادا کیا ہے کہ صحرا نے ہماری آنکھوں میں خاک جھونک دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔

بنیادی تصور :- شدتِ جوشِ جنوں۔

---

(۲۲۳)

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارۂ جنبانی!
(۱) قیامت، کشتۂ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

گہوارۂ جنبانی کنایہ ہے گہری نیند سلانے سے۔ اور اسی ترکیب میں شعر کا لطف مضمر ہے+ گہوارے اور جنبش میں مناسبت ظاہر ہے۔ قیامت سے خواب کی شدت مراد ہے۔ لعل کنایہ ہے لب سے۔ لعل اور سنگین میں بھی مناسبت ہے۔

مطلب یہ ہے:۔ کشتۂ لب معشوق کی نیند اس قدر گہری ہوتی ہے کہ اگر حضرت عیسےٰؑ "قم باذنی" کہیں تو بھی وہ بیدار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اور زیادہ گہری نیند ہو جائے گا بالفاظِ دگر کشتۂ لب معشوق کو حضرت عیسیٰ بھی زندہ نہیں کر سکتے۔

بنیادی تصور:۔ صفتِ لعلِ بتاں

---

(۲۲۴)

آمدِ سیلاب، طوفان صدائے آب ہے
(۱) نقش پا، جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ ہر شئی کچھ اس طرح معرضِ ہلاکت میں ہے کہ نشانِ قدم تک کو اپنے جلد تباہ ہو جانے کا احساس ہے اور وہ بھی اپنے پیچھے طوفان کی آمد کی آواز سن رہا ہے اسی لیے ڈر کے مارے اس نے اپنے کان میں جادہ (پگڈنڈی) کی انگلی ٹھونس لی ہے۔ بیان کی خوبی یہ ہے کہ سیلاب جب آتا ہے تو نقش قدم یقیناً مٹ جاتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ بیان ناگزیرئ فنا۔

بزمِ مے، وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا
(۲) شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

یہ بھی غالب کے مشکل اشعار میں سے ہے، اور اشکال "نبضِ پری" سے پیدا ہوا ہے۔ واضح ہو کہ نبضِ پری یہاں مجازِ مرسل ہے یعنی اس سے خود پری مراد ہے اور اس ترکیب سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ موجِ بادہ سے نبضِ پری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے گویا شیشہ میں پری چھپی ہوئی ہے + لفظ "سے" حرفِ ربط نہیں ہے بلکہ کلمۂ تشبیہ ہے یعنی موجِ بادہ سے پری کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ نبضِ پری یہاں کنایہ ہے۔ سامانِ وحشت سے کیونکہ پریوں کا سایہ موجبِ وحشت ہوتا ہے اور پہلے مصرع میں بزم کو وحشت کدہ قرار دیا ہے۔

شعر کا مطلب سمجھنے کے لیے ان تمام جزئیات کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

مطلب :- کہتے ہیں کہ میخوروں کی محلس اس کی چشمِ مست کی بدولت ایک وحشت کدہ بن گئی ہے، جس کی فضا کچھ ایسی ہے کہ میخواروں پر شراب کے اثر کے بجائے کسی چشمِ مست کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ جس نے سب کو دیوانہ (وحشی) بنا رکھا ہے۔ بالفاظِ دگر، میخواروں کو شراب نے مست نہیں بنایا بلکہ کسی کی چشمِ مست نے مست بنایا ہے۔ اس بات کو یوں کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی موجوں میں نشہ کارفرما نہیں ہے بلکہ نبضِ پری پوشیدہ ہے یعنی بوتل میں کوئی پری چھپی ہوئی ہے جس کے سایے (اثر) سے ساری محفل وحشت کدہ بن گئی ہے۔ بات بہت پیش پا افتادہ ہے مگر اندازِ بیان نے اسے دلکش بنا دیا ہے۔

بنیادی تصور :- کرشمہ سازیٔ چشمِ محبوب۔

---

(۲۲۵)

ہوں میں بھی تماشائیٔ نیرنگِ تمنا!
(۱) مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

مطلب:- تمنا کرنے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میری وہ تمنا پوری بھی ہو جائے بلکہ میں تو تمنا (تمناؤں) کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھنا چاہتا ہوں یعنی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمنائیں، متمنی کو کس قدر پریشان کرتی ہیں اور جب وہ پوری نہیں ہوتیں تو انسان کس قدر تلخیوں اور مایوسیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ نیرنگِ طلسمِ تمنا یہی تو ہے کہ انسان جانتا ہے کہ تمنا پوری نہیں ہوتی اس کے باوجود اس کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا ہے غالب اس طلسم میں گرفتاری کے نتائج کی طرف ہماری توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

بنیادی تصور:- عکاسیٔ فطرتِ انسانی۔

---

(۲۲۶)

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر!

(۱) مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں پر

سب جانتے ہیں کہ غالب، تشبیہات کے بادشاہ ہیں۔ یہاں انہوں نے اپنی شبہائے ہجراں کی تصویر کو اس سیاہی سے تشبیہ دی ہے جو دمِ تحریر کاغذ پر گر جائے۔ ظاہر ہے کہ (۱) شب اور سیاہی میں رنگ کے اعتبار سے مناسبت ہے کہ دونوں کالی ہوتی ہیں (۲) روشنائی کا لفظ اس لیے نہیں لائے کہ اس میں روشنی کا تصور موجود ہے (۳) جس طرح سیاہی گر جانے سے کاغذ اور تصویر دونوں چیزیں برباد ہو جاتی ہیں، اسی طرح شبِ ہجر سے عاشق کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔

ان جزئیات کو مدِ نظر رکھا جائے تو تشبیہ کی ندرت اور موزونیت واضح ہو سکتی ہے

مطلب:- کہتے ہیں کہ کارکنانِ قضا و قدر نے میری تقدیر کے صفحے پر میری شبہائے ہجر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ایسی ہے جیسے کاغذ پر سیاہی کا داغ یا دھبا پڑ جائے۔

بنیادی تصور:- بیانِ تیرہ بختیٔ خویش۔

(۲۲۷)

ہجومِ نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے

(۱) خموشی، ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

یہ بھی مشکل اشعار میں سے ہے۔ اشکال کا سبب وہ آورد اور تصنع ہے جو اس شعر میں پایا جاتا ہے + ہجومِ نالہ مبتدا ہے۔ باقی مصرع اس کی خبر ہے۔ دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کے مفہوم کو ایک دلکش تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ بات بہت معمولی ہے مگر اندازِ بیان نے اسے دقیق بنا دیا ہے + خس بدنداں ہونے سے فارسی محاورے میں عاجزی کا اظہار مراد ہے +

مطلب: نالہ و فریاد کا ہجوم اس قدر حیرت فزا ہے کہ میں نالہ کرنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ بالفاظِ دگر، نالہ و فریاد کی فراوانی اس قدر حیران کن ہے کہ میں نالہ کرنے سے عاجز ہوں۔ دوسرے مصرع میں اسی بات کو اس تشبیہ سے دلنشین کیا ہے کہ اس کیفیت کی مثال ایسی ہے جیسے خاموشی نے اپنے دانتوں میں ایک تنکا نہیں بلکہ سینکڑوں لاکھ نیستانوں کے تنکے لے لیے ہوں (اظہارِ عاجزی کے لیے)

بنیادی تصور:- فراوانیٔ غمِ دل۔

تکلف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں

(۲) نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عریاں ہے

تکلف برطرف، یعنی سچی بات تو یہ ہے۔ غالب اس ترکیب کے بہت دلدادہ ہیں + بدخوباں سے معشوق مراد ہیں + چونکہ نگاہ کو تیغ قرار دیا ہے اس لیے اس کی بے حجابی کو تیغ کی عریانی سے تعبیر کیا ہے + نگاہِ بے حجاب کیا ہے؟ گویا ننگی تلوار ہے۔

مطلب: حسینوں کا لطف دراصل بڑا ہی جان لیوا ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب وہ عاشقوں سے بے تکلف ہو کر، ان کو پیار کی نظروں سے دیکھتے ہیں تو وہ نظریں، تیغِ عریاں کا کام کرتی

رہیں دوسرے مصرع میں جو تشبیہ ہے اس کی بدولت شعر میں بھی جان پڑ گئی اور معاملات عاشقی کی تصویر بھی سامنے آگئی۔

بنیادی تصور:۔ منظر کشی اختلاطِ عاشق و معشوق۔

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
(۳) کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

شعر میں "چاکِ گریباں" سے مضمون پیدا کیا ہے (۱) شعرا عموماً صبح کو چاکِ گریباں باندھا کرتے ہیں، مثلاً ع طلوعِ صبحِ محشر، چاک ہے میرے گریباں کا۔ (۲) چاکِ گریباں کنایہ ہے شدتِ رنج والم ہے۔

مطلب:۔ غم کی کثرت سے میرے دل میں خوشی کا احساس بھی باقی نہیں رہا، تلف ہوگیا یہی وجہ ہے کہ عید کی صبح، جو عموماً لوگوں کی نظر میں بہت خوش آئند معلوم ہوتی ہے، میری نگاہ میں چاکِ گریباں سے بھی بدتر ہے یعنی یوم عید بھی میرے لیے باعثِ رنج والم ہے۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ کثرتِ غم۔

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
(۴) کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دستِ گرداں ہے

متاع دستِ گرداں یعنی وہ شے جو بازار میں نقد فروخت ہو۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ ساقی تجھے جام شراب عنایت کرے (اگر تو اس سے عشق کرنا چاہتا ہے) تو تجھے اس کی قیمت فوراً ادا کرنی ہوگی یعنی پہلے اپنا دل اور اپنا دین اس کے حوالہ کرنا پڑے گا پھر وہ تجھے اپنی محبت کا جام عطا کرے گا۔ وجہ یہ ہے کہ بازارِ عشق میں قرض کا رواج نہیں ہے۔ ساغرِ عشق کو متاعِ دستِ گرداں قرار دینا بلاشبہ لائق ہزار تحسین و آفرین ہے۔ کیونکہ تشبیہ کی خوبی کے علاوہ اس میں واقعیت کا

پہلو بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ساغر ہمیشہ ہاتھوں میں گردش کرتا ہے۔
بنیادی تصور :۔ قدر و قیمت ساغرِ محبت۔

غم، آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
(۵) چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

غم سے غمِ عشق مراد ہے + پرورش سے تربیت مراد ہے مگر آغوش کی رعایت سے پرورش کا لفظ لائے ہیں۔ "پرورش دینا" خلافِ محاورہ ہے۔ اگر پہلا مصرع یوں ہوتا

ع غم، آغوشِ بلا میں پرورش کرتا ہے عاشق کی

تو بہتر ہوتا۔ "چراغِ روشن اپنا" یعنی عاشق کا چراغ روشن + مرجاں یعنی مونگا جو سرخی مائل ہوتا ہے اور سمندر (قلزم) میں پایا جاتا ہے۔ مرجاں کی رعایت سے قلزم لائے ہیں + قلزمِ صرصر یعنی بادِ صرصر۔ آغوشِ بلا کو قلزمِ صرصر اور چراغ کو مرجاں سے تعبیر کیا ہے (وجہِ شبہ رنگ ہے)

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ غمِ عشق، بلاؤں اور مصیبتوں میں بھی عاشق کی تربیت کرتا ہے۔ یوں سمجھو کہ عاشق کا چراغ یعنی جذبۂ عشق بمنزلہ چراغِ مرجاں ہے جو بادِ صرصر میں (حوادث میں) بھی روشن رہتا ہے۔ بالفاظِ دگر جس طرح بادِ صرصر، چراغِ مرجاں کو نہیں بجھا سکتی اسی طرح حوادثِ روزگار، چراغِ عاشق کو نہیں بجھا سکتے۔

بنیادی تصور :۔ فیضانِ غمِ عشق۔

---

(۲۲۸)

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
(۱) نگاہ دل سے تری سُرمہ سا نکلتی ہے

خموشیوں کا مطلب یہ ہے کہ تو بھی چپ ہے میں بھی چپ ہوں۔ خموشیوں میں

بمعنی چپکے چپکے: پہلے مصرع میں "نکلتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ہو جاتی ہے۔ دل سے نکلتی ہے یعنی دل کے پار ہو جاتی ہے۔ "سرمہ سا" دو مفہوم رکھتا ہے (۱) خاموش (۲) سرمہ لگی ہوئی یعنی تماشا ادا اور نظر افروز۔

مطلب:۔ تیری نگاہ چپکے ہی چپکے دل کے پار ہو جاتی ہے لیکن ادائے تماشا یعنی کمال نظر افروزی کے ساتھ، کیونکہ وہ سرمہ سا ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ سرمہ کھا لینے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اس لیے نگاہ کو خاموش کہا اور اس لحاظ سے کہ وہ سرمہ سا ہے اسے تماشا ادا قرار دیا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ نگاہ سرمہ سا جس کو تماشا ادا بھی کہہ سکتے ہیں اور خاموش بھی، چپکے ہی چپکے لیکن ادائے تماشا کے ساتھ دل کے پار ہو جاتی ہے۔

بنیادی تصور:۔ جگر دوزیٔ نگاہ۔

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
(۲) صبا، جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

فشار بمعنی دبانا یا بھینچنا۔ شعر کی نثر یوں ہوگی "صبا جب غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے تو فشارِ تنگیٔ خلوت سے شبنم بن جاتی ہے۔"

مطلب:۔ شعر کی نثر سے مطلب واضح ہو سکتا ہے یعنی غنچہ پر شبنم کے جو قطرے نظر آتے ہیں یہ دراصل صبا ہے جو اتفاقاً غنچہ کی خلوتِ تنگ میں جا نکلی تھی وہاں غنچہ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اس لیے شرم کے مارے پانی پانی ہو گئی۔

بنیادی تصور:۔ توجیہہ وجودِ شبنم۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ
(۲) کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

مطلب:۔ نظر کی تلوار سے سینۂ عاشق پر جو قیامت گذر گئی اس کا حال سینہ کیا بتا

سکتا ہے ۔ خود سمجھ لو کہ اگر دروازے میں بھی زخم (روزن) ہو جاتا ہے تو اس سے ہوا نکلنے لگتی ہے تو عاشق کے سینے سے، زخم ناز کھانے کے بعد، کیسی قیامت کی آہیں نکلتی ہوں گی! (آہ بھی تو ہوا ہی ہوتی ہے)

بنیادی تصور:۔ جگر افگاریٔ نگاہ۔

---

(۲۲۹)

جس جا نسیم، شانہ کشِ زلفِ یار ہے

(۱) نافہ، دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

مطلب:۔ نسیم، محبوب کی زلفوں کی خوشبو جس صحرا میں پھیلا دیتی ہے وہاں خوشبو کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ آہوئے دشتِ تاتار کا دماغ بھی نافہ بن جاتا ہے یعنی معطر ہو جاتا ہے +

بنیادی تصور:۔ تحسین بوئے زلفِ یار۔

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا

(۲) آئینہ فرشِ ششِ جہتِ انتظار ہے

دوسرے مصرع کی نثر یوں ہوگی "ششِ جہتِ انتظار، آئینہ فرش ہے" آئینہ فرش اسم فاعل ترکیبی ہے مثلاً یوسف جمال + مطلب ہے آئینہ کا فرش رکھنے والا انتظار کو عالم فرض کر کے اس کے لیے ششِ جہت ثابت کی ہیں +

مطلب:۔ میری حیرت کس کے جلوے کی تلاش میں ہے یعنی میں عالم حیرت میں کس کے جلوے کا منتظر ہوں کہ مجھے اس عالم انتظار میں چاروں طرف سامانِ حیرت ہی نظر آرہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ع عقل حیراں ہے کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے۔

ہے ذرہ ذرہ، تنگیٔ جا سے غبارِ شوق!
(۳) گر، دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی "غبارِ شوق، تنگیٔ جا (کی وجہ) سے ذرہ ذرہ ہے +
دوسرے مصرع میں غبارِ شوق کے ہر ذرے کو ایک دام قرار دیا ہے + وسعتِ صحرا شکار
ہے یعنی ہر ذرے میں صحرا سما گیا ہے + وسعتِ صحرا کنایہ ہے ساری کائنات سے۔
مطلب:۔ میرا غبارِ شوق یعنی شوق (سودائے عشق) اس قدر وسعت طلب ہے
کہ یہ کائنات اس پر تنگ ہوگئی۔ اس تنگی (کے فشار) کی وجہ سے میرا شوق ذرہ
ذرہ ہوگیا۔ اور ہر ذرہ وہ حال ہے جس میں صحرا سمایا ہوا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے شوق
کی وسعت کا جس کے ایک ذرے کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ کائنات اس میں سمائی
ہوئی ہے۔ اقبال نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

سما سکتا نہیں پہنائے عالم میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

بنیادی تصور:۔ اظہارِ وسعت و کبرائیٔ شوق۔

دِل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
(۴) نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

دیدہ بمعنی آنکھ + روبکار ہے بمعنی زیرِ سماعت ہے یا عدالت میں پیش ہے۔
مطلب:۔ دل نے آنکھ پر نالش کی ہے کہ نہ وہ معشوق کا نظارہ کرتی نہ میں
مصیبت میں گرفتار ہوتا۔ عشق کی عدالت میں آج اس مقدمہ کی دوسری پیشی ہے۔
بنیادی تصور:۔ سببِ گرفتاریٔ دل۔

چھڑکے ہے شبنم، آئینہ برگِ گل پہ آب
(۵) اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

مطلب :۔ ایران میں یہ رسم ہے کہ جب کسی کو بوقت سفر رخصت کرتے ہیں تو آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں۔ غالب نے پھول کی پتی کو آئینہ قرار دے کر عندلیب سے خطاب کیا ہے کہ شبنم نے آئینہ پر پانی چھڑکا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بہار کے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔

بنیادی تصور :۔ حسنِ تعلیل۔

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے!
(۶) وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

پیچ آپڑنا بمعنی کسی بات کا نباہنا۔

مطلب :۔ چونکہ اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے اور میں نے یہ کہہ دیا کہ اچھا میں تمہارا انتظار کروں گا اس لیے میں بہر حال اپنی بات پر قائم رہوں گا۔ مانا کہ اس کے وعدہ کا اعتبار نہیں ہے مگر مجھے اپنی بات کی پیچ ہے کیونکہ اگر میں نہ کروں تو ممکن ہے کہ وہ مجھ پر یہ اعتراض کرے کہ تو نے مجھے جھوٹا سمجھا جو میرا انتظار نہیں کیا۔

بنیادی تصور :۔ اظہارِ مستقل مزاجیٔ خویش۔

لے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گذر نہ کر
(۷) ہر ذرے کے نقاب میں دل بقیرار ہے

مطلب :۔ لیلیٰ سے خطاب کرتے ہیں کہ اپنا چہرہ کھول کر وادیٔ مجنوں میں جانا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس وادی کے ہر ذرے میں مجنوں کے دل کی بیتابی پوشیدہ ہے جب وہ تجھے دیکھیں گے تو وہ اور زیادہ بیتاب ہوجائیں گے (مجنوں اپنی قبر میں بے چین ہوجائے گا) دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تو ان کی بیتابی اور بے قراری سے متاثر ہوجائے گی (تو خود بے قرار ہوجائے گی۔

بنیادی تصور :۔ تاثیرِ عشقِ مجنوں۔

اے عندلیب! ایک کفِ خس بہر آشیاں
(۸) طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

مطلب :- بلبل کو مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے آشیانے کے لیے کچھ تنکے فراہم کرے ورنہ موسم بہار میں تجھے ایک تنکا بھی ڈھونڈے نہ ملے گا۔

بنیادی تصور :- کیفیت فصل بہار +

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
(۹) اے بے دماغ! آئینہ تمثال دار ہے

خبر کنایہ ہے معرفت یا عرفان ذات سے۔ سیر کنایہ ہے تصور ذات سے آئینہ کنایہ ہے قلب سے۔ تمثال دار بمعنی با تصویر۔

مطلب :- اے کم فہم! اپنے دل کو ضائع مت کر یہ بہت قابل قدر شے ہے اس کی بدولت محبوب کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے لیکن اگر عرفان حاصل نہ ہو تو بھی تیرا دل قابلِ قدر ہے کیونکہ اس میں محبوب کا تصور تو بہرحال جاگزیں ہوتا ہے۔

بنیادی تصور :- قدر و قیمتِ دل۔

غفلت کفیل عمر و اسدؔ ضامن نشاط
(۱۰) اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے

"غفلت کفیل عمر ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ غافل آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ "اسد ضامن نشاط ہے" یعنی شاعر (انسان) خیال کرتا ہے کہ دور عیش ہمیشہ قائم رہے گا + مرگِ ناگہاں کے دو معنی ہیں اور اسی ایہام سے غالب نے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے۔ (۱) کوئی شخص بھلا چنگا بیٹھا ہو اور ایک لخت مر جائے تو کہتے ہیں کہ وہ مرگ ناگہاں کا شکار ہو گیا۔ (۲) خلافِ توقع موت کا آجانا اور جو شخص غافل ہوتا ہی جب اسے موت آتی ہے تو اس کا آنا سر یکا اس کی توقع کے خلاف ہی ہوتا ہے۔

مطلب :۔ موت سے خطاب کرتے ہیں کہ میں تیرے آنے سے غافل ہوں یعنی یہ سمجھتا ہوں کہ تو کبھی نہیں آئے گی اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ عیش و عشرت کا دور ہمیشہ برقرار رہے گا۔ چونکہ تیرے آنے کے اسباب جمع ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب تجھے آنے میں کیا دیر ہے؟ اندریں حالات اگر تو آجائے تو میں یہی کہوں گا کہ مجھے ناگہانی موت آگئی۔

دراصل غالب نے اس شعر میں انسانی فطرت کی عکاسی کی ہے۔ موت ہمیشہ اپنے وقت پر آتی ہے۔ کوئی شخص مرگ ناگہاں کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ مگر جو موت سے غافل ہوتا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے موت آگئی۔ جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ موت اپنے وقت پر یقیناً آئے گی وہ مرگ کو کبھی ہرگز "ناگہاں" (غیر متوقع) نہیں کہہ سکتا۔

بنیادی تصور :۔ مذمتِ غفلت از مرگ۔

---

(۲۳۰)

آئینہ کیوں نہ دوں، کہ تماشا کہیں جسے
(۱) ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مطلب :۔ میں تجھ سا حسین کہاں سے لاؤں جسے دیکھ کر تو بھی تسلیم کر لے کہ یہ واقعی میری طرح حسین ہے۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے کہ میں تیرے ہاتھ میں آئینہ دیدوں اور تو اپنی شکل دیکھ کر ایسا حیران ہو جائے کہ لوگوں کی نظروں میں تماشا بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا مثل دنیا میں موجود نہیں ہے۔ بنیادی تصور :۔ عدیم المثالیٔ محبوب۔

نوٹ :۔ پہلے مصرع میں 'تماشا' کا 'آئینہ' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی :۔

"تیرے ہاتھ میں آئینہ کیوں نہ دوں کہ تو اپنی شکل دیکھ کر حیران ہو جائے اور تیری حیرانی لوگوں کے لیے تماشا بن جائے۔ یعنی تماشے کا تعلق حیرانی

سے ہے جو محذوف ہے۔

(۲) حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

تری بزمِ خیال کنایہ ہے اپنے دل سے کیونکہ اس میں معشوق کا تصور جلوہ گر ہے۔ حسرت سے مراد ہے نظارۂ جمالِ محبوب کی حسرت۔ سویدا سے وہ سیاہ نقطہ مراد ہے جو دل میں ہوتا ہے۔

مطلب :- میرے دل میں جو سویدا ہے وہ دراصل سویدا نہیں ہے بلکہ گلدستۂ نگاہ ہے یعنی میری حسرت آلود نگاہیں میرے دل میں ایک سیاہ نقطہ کی شکل میں جمع ہو گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حسرت دیدار نے دل میں ایک داغ پیدا کر دیا ہے۔ جسے عرفِ عام میں سویدائے دل کہتے ہیں۔ **بنیادی تصور**:- داغِ حسرتِ دیدار۔

(۳) پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

افسونِ انتظار سے تمنائے حصولِ معشوق مراد ہے + استفہام سے تعجب کا اظہار مقصود ہے۔

مطلب :- اے خدا! سمجھ میں نہیں آتا کہ محبت کے کان میں تمنائے محبوب کا افسوں کس نے پڑھ کر پھونک دیا ہے! یعنی یہ کیا ماجرا ہے کہ محبت ہوتے ہی وصل کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے! **بنیادی تصور**:- افسونِ تمنائے وصل۔

(۴) سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے!
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

"ہجومِ دردِ غریبی" سے انتہائی بے چارگی، عاجزی اور کس مپرسی کی حالت مراد ہے دوسرے مصرع کا اندازِ بیان قابلِ داد ہے۔ صحرا کو شدتِ جنوں کی وجہ سے مشتِ

خاک قرار دیا ہے اور مشت خاک سر پر ڈالنے سے صحرا نوردی مراد ہے کیونکہ عاشق جوشِ جنوں میں یہی حرکت کیا کرتا ہے یعنی صحرا میں جا کر اپنے سر پر خاک ڈالتا رہتا ہے۔
مطلب :- اپنی بے کسی اور کس مپرسی کا عالم دیکھ کر دل یہ چاہتا ہے کہ صحرا نوردی اختیار کر لوں۔
بنیادی تصور :- شدتِ دردِ غریبی (عالمِ بے کسی)

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
(۵) شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

شوقِ عناں گسیختہ کنایہ ہے وفورِ اشک (آنسوؤں کی کثرت) سے۔
مطلب :- حسرتِ دیدار کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا پوشیدہ ہے۔
بنیادی تصور :- سیلِ گریۂ بے پناہ۔
نوٹ :- نظم طبا طبائی لکھتے ہیں "اس شعر میں "عناں گسیختہ" لفظ نہیں ہے الماس جڑ دیا ہے۔

درکار ہے شگفتنِ گل ہائے عیش کو
(۶) صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

پنبۂ مینا کنایہ ہے شراب سے + صبح کی سفیدی کو پنبہ (روئی) سے تشبیہ دی ہے۔
مطلب :- پھول عموماً صبح کے وقت کھلتے ہیں لیکن عیش و عشرت کے پھولوں کے کھلنے کے لیے وہ صبح بہار لازم ہے جسے ہم پنبۂ مینا (شراب) سے تعبیر کر سکیں یعنی میخواروں کی مسرت صبح کی شراب پر موقوف ہے۔
بنیادی تصور :- شرطِ عیشِ میخواراں۔

غالب برا نہ مان، جو واعظ برا کہے
(۷) ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

مطلب :۔ اے غالب! واعظ کی ملامت کا برا مت مان۔ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے سب اچھا کہتے ہوں۔

بنیادی تصور :۔ وجہِ تسلیِ خاطر۔

---

(۲۳۱)

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
(۱) داغِ دلِ بیدرد، نظرگاہِ حیا ہے

چونکہ اس شعر میں غالب نے اپنے مفہوم کو ان الفاظ سے ادا کیا ہے جن سے وہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا اس لیے شعر مغلق ہو گیا۔ اور یہ اغلاق ہی "غالب ازم" یعنی ان کی خصوصیت ہے + "نہ خالی ز ادا ہے" یعنی گلِ لالہ پر شبنم بلاوجہ نہیں ہے یعنی اس کا ایک خاص مطلب ہے + "بے درد" سے ظاہر مراد نہیں ہے بلکہ وہ دل جس میں درد نہ ہو + داغ سے داغِ دلِ لالہ مراد ہے۔ "نظرگاہِ حیا" سے وہ جگہ مراد ہے جو باعثِ شرم و حیا ہو۔

مطلب :۔ جب گلِ لالہ نے اس بات پر غور کیا کہ میرے دل میں داغ تو ہے مگر درد نہیں ہے یعنی یہ داغ حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی ہے تو اسے شرم محسوس ہوئی جس کی وجہ سے وہ عرق عرق ہو گیا بالفاظِ دگر جسے لوگ شبنم سمجھتے ہیں وہ دراصل عرقِ خجالت کی بوندیں ہیں۔

بنیادی تصور :۔ توجیہہ قطرات بر گلِ لالہ

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
(۲) آئینہ، بدستِ بتِ مست، حنا ہے

یہ شعر بھی غالب کے مغلق ترین اشعار میں سے ہے اسی لیے شارحین نے اس کے مختلف النوع معانی بیان کئے ہیں۔ ذیل میں اردو ادب کے دو نہایت مشہور و معروف ناقدوں اور سخن سنجوں کے نتائجِ افکار درج کرتا ہوں جو سخن فہمی

کے علاوہ سخن گوئی میں بھی بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔
(ا) جناب اثر لکھنوی لکھتے ہیں :۔
"اس شعر میں بھی تعقید ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی :۔ حنا بدستِ بتِ بدمست آئینہ ہے (آئینہ بطور محاورہ صرف ہوا ہے یعنی عیاں کرتا ہے، دکھا ہے کا آئینہ ہے یعنی کس بات کو ظاہر کرتا ہے؟ یہ کہ) دل خوں شدہ حسرتِ دیدار ہے۔
مطلب :۔ معشوق کے ہاتھوں کا رنگ (سرخ)، اس پر میرے دل کا حال آئینہ (عیاں) کر رہا ہے کہ جس طرح اس کے ہاتھ مہندی ملنے سے سُرخ ہو گئے اسی طرح میرا دل کشمکش حسرتِ دیدار میں مبتلا ہے، پس رہا ہے، خون ہو رہا ہے تاہم وہ اپنے مہندی لگے ہاتھوں کے نظارے میں ایسا محو ہے۔ ایسا مست ہے کہ میرے حال سے بےخبر ہے"
(مطالعۂ غالب ص ۲۹، ۳۰)

(ب) جناب نیاز فتحپوری رقمطراز ہیں۔
"اس شعر کی ترکیب میں اگر پہلے مصرع کو مبتداء اور دوسرے مصرع کو خبر قرار دیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارا دل جو حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا ہے اس بدمستِ حنا کے ہاتھ کا آئینہ ہے یعنی جس طرح آئینہ میں حنا کی سُرخی نظر آتی ہے اسی طرح ہمارا خون شدہ دل نظر آتا ہے لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں مصرعے اپنا مفہوم جداگانہ رکھتے ہوں اور مدعا یہ کہنا ہو کہ ادھر تو یہ عالم ہے کہ دل حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا ہے اور ادھر یہ عالم ہے کہ ہر وقت اس بدمستِ حنا کے ہاتھ میں آئینہ رہتا ہے اور ہمارے حال کی اُسے خبر نہیں۔"
(نگار ستمبر ۱۹۵۷ء ص ۳۹)

جناب اثرؔ نے صرف ایک مطلب بیان کیا ہے کہ جس طرح اس کے ہاتھ مہندی سے سُرخ ہو گئے ہیں، ہمارا دل حسرت دیدار سے خون (سُرخ) ہو گیا ہے۔

جناب نیازؔ نے دو مطلب لکھے ہیں لیکن پہلے مطلب کو خود غلط قرار دیدیا اور دوسرے مطلب میں ظن کا پہلو نمایاں ہے۔ فی الجملہ اس انداز بیان سے اس شعر کی پیچیدگی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان تصریحات کے بعد اب جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ ذیل میں درج کرتا ہوں:-

(ا) اس شعر میں غالب نے اپنے دل کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ آئینہ کا ذکر کیا ہے

(ب) شعر کی نثر یوں ہوگی "آئینہ کہ دل خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار ہے، بتِ بدمست کے ہاتھ میں بمشابہ حنا ہے۔

(ج) آئینہ کو حنا سے مشابہت اس لیے دی ہے کہ وہ بھی مثل حنا "دل خوں شدہ" ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی "دل خوں شدگی" کشمکش حسرتِ دیدار کی وجہ سے ہے۔

(د) حسرتِ دیدار کی وجہ یہ ہے کہ وہ محبوب کے ہاتھ میں ہے مگر اسے دیکھ نہیں سکتا (ظاہر ہے کہ آئینہ بصارت سے محروم ہوتا ہے)

مطلب:- کہتے ہیں کہ بت بدمست کے ہاتھ میں جو آئینہ ہے، اسے آئینہ مت سمجھو بلکہ حنا سمجھو۔ یعنی آئینہ نہیں ہے بلکہ حنا ہے، کیونکہ حنا کی طرح اس کا دل بھی خون (سُرخ) ہو گیا ہے، اور وجہ دل کے خون ہو جانے کی یہ ہے کہ وہ کمال قرب کے باوجود لذتِ دیدار سے محروم ہے۔ بنیادی تصور:- بیان محرومیٔ آئینہ۔

(۳)
شعلہ سے نہ ہوتی، ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

مطلب:- دل کی افسردگی مٹانے کے لیے شعلۂ عشق درکار تھا مگر افسوس کہ وہ میسر نہ آسکا۔ اس محرومی کی وجہ سے دل ایسا جلا (اس قدر رنج ہوا) کہ اگر شعلہ نصیب ہو

جاتا تو اس سے بھی نہ جلتا۔ بنیادی تصور:۔ذوق سوز باطن۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
(۴) آئینہ باندازِ گل، آغوش کشا ہے

مطلب:۔تیرے عکس میں اس قدر دلکشی ہے کہ آئینہ اُسے آغوش میں لینے کے لیے بیتاب ہے۔ بنیادی تصور:۔ بیان دلکشی محبوب۔

قمری، کفِ خاکستر و بلبل، قفسِ رنگ
(۵) اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

مطلب:۔حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ اے کی جگہ "جز" پڑھو۔ معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ یعنی قمری جو ایک کفِ خاکستر اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں ہے، ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے "اے کا لفظ استعمال کیا ہے یہ انہی کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سنکر کہا کہ اگر وہ "اے" کی جگہ "جز" کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع یوں کہتے "اے نالہ! نشاں تیرے سوا عشق میں کیا ہے" تو مطلب صاف ہو جاتا۔ اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے بچتے تھے اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے، اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔ (یادگار غالب ص ۱۰۳)

خلاصۂ کلام ایں کہ نشانِ جگر سوختگی نہ رنگ ہے نہ رنگیں بیانی بلکہ نالہ۔

بنیادی تصور:۔ قدر و قیمتِ نالہ۔

خو نے تری، افسردہ کیا وحشتِ دل کو
(۶) معشوقی و بے حوصلگی، طرفہ بلا ہے

خو سے مراد خوئے بے اعتنائی (بے پروائی) ہے۔ جیسے دوسرے مصرع میں بے حوصلگی سے تعبیر کیا ہے۔ وحشتِ دل بمعنی ولولۂ عاشقی۔

مطلب:۔ چونکہ تو نے ہم سے بے اعتنائی کی اس لیے ہمارا جوش جنوں افسردہ ہو گیا دوسرے مصرع میں تبصرہ کیا ہے کہ واقعی معشوق کی بے اعتنائی عاشق کے حق میں سم قاتل ہوتی ہے۔ **بنیادی تصور**:۔ نتیجۂ بے اعتنائی معشوق۔

مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت

(۷) دستِ تہِ سنگ آمدہ، پیمان وفا ہے

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ جو شخص الفت کرنے پر مجبور ہو اسے دعوائے الفت زیب نہیں دیتا۔ ہم تو الفت کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ عاشقی ہماری سرشت میں شامل ہے لہذا ہمارا پیمان وفا باندھنا (الفت کرنا اور اس میں ثابت قدم رہنا) دستِ تہِ سنگ آمدہ کا مصداق ہے۔ ہمارا پیمان وفا ایسا ہی ہے جیسے کسی کا ہاتھ پتھر تلے دبا ہوا ہو یعنی ہم پیمان وفا باندھنے پر مجبور ہیں۔ **بنیادی تصور**:۔ بیان فطرت خویش۔

معلوم ہوا حال شہیدان گذشتہ

(۸) تیغِ ستم، آئینۂ تصویر نما ہے

مطلب:۔ تیری ستم رانی کو دیکھ کر ہمیں بآسانی معلوم ہو گیا کہ ہم سے پہلے تو ہزاروں بے گناہوں کا خون بہا چکا ہے۔ **بنیادی تصور**:۔ بیانِ فطرتِ معشوق

اے پرتوِ خورشید جہانتاب! ادھر بھی

(۹) سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

"ادھر بھی" سے مراد یہ ہے کہ ہم پر بھی ایک نگاہ کرم کر۔ "سایہ کی طرح" شعرا سایہ کو اس کی پامالی کی وجہ سے عاجز اور مجبور اور مصیبت زدہ کے معنی میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم بھی بہت مصیبت زدہ ہیں۔ عجب وقت پڑا ہے یہ مشہور

محاورہ ہے اس کے معنی ہیں ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ بقول نظم طباطبائی، غالب نے وقت پڑنے کا محاورہ جس محل پر صرف کیا ہے اس کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی۔ اس محاورے نے شعر کے مضمون کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان خوبیوں پر زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور دوسرے مصرع کی بے ساختگی بھی کچھ کم قابل داد نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سایہ کی طرح کیا وقت پڑا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ (۱) سایہ عاجز، بے حقیقت مجبور اور پامال ہے یہی حال ہمارا ہے۔ (۲) سایہ کا وجود مستقل نہیں ہے لیکن اُسے اپنے موجود ہونے کا دھوکہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح ہم بھی بے حقیقت ہیں مگر اس دھوکے میں گرفتار ہیں کہ ہم موجود ہیں۔ ان تمام تصریحات کو ذہن نشین کر لیا جائے تو شعر کی خوبی اور بلاغت عیاں ہو جائے گی۔

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس طرح سایہ دراصل موجود نہیں ہے مگر متہم بوجود ہے یعنی فی الحقیقت اس کی کچھ ہستی نہیں ہے اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ ہم موجود ہیں۔ اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنافی الشمس ہو جائیں کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔"

(یادگار غالب صـ۴۸)

بنیادی تصور:۔ بے حقیقتی ہستی۔

(۱۰)

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں "یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد

بھی ملنی چاہئے۔" (یادگارِ غالب ص۱۱۳)

بنیادی تصور:۔ اعترافِ ذوقِ معصیت باندازِ شوخیٔ رندانہ

بقول نظم طباطبائی "اس شعر کی داد کون دے سکتا ہے! میر تقی کو بھی حسرت ہوئی ہوگی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے لیے بچ رہا۔" (شرحِ دیوانِ غالب ص۲۷۰)

(۱۱) بیگانگیٔ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان، خدا ہے

مطلب:۔ اے غالب! دنیا والوں کی بے گانہ وشی اور سرد مہری سے آزردہ خاطر نہ ہو۔ اگر کوئی شخص تیرا ہمدرد نہیں ہے تو خدا تو ہے۔ خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ بیانِ رحمتِ ایزدی۔

---

(۲۳۲)

(۱) منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی!!
قسمت کھلی، ترے قد و رُخ سے ظہور کی

یہ شکل یعنی تیری شکل تیرے قد و رخ کی بدولتِ ظہورِ تجلیٔ ذات کی قسمت کھل گئی یعنی تیرا قد و رخ تجلیٔ ذات کے ظہور کے حق میں باعثِ عزت ہے۔ اس اندازِ بیان کی تحسین کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے۔

مطلب:۔ تجلیٔ نورِ ایزدی چاہتی تھی کہ یہی شکل معرضِ ظہور میں آئے جو تیرے قد و رُخ کی ہے۔ بالفاظِ دگر جلوۂ ذات یہ چاہتا تھا کہ تیری شکل میں متشکل ہو۔ چونکہ ایسا ہی ہوا یعنی نورِ ذات متجلی ہو کر تیرے قد و رخ میں ظاہر ہوا۔ اس لیے فی الواقع اس کی قسمت کھل گئی! بلا مبالغہ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔ اگر اسے نعتیہ شعر قرار دیا جائے تو یہ مضمون حقیقت پر مبنی ہو سکتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ تحسینِ قدرِ رُخِ محبوب۔

اِک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں
(۲) پڑتی ہے آنکھ، تیرے شہیدوں پہ حور کی

آنکھ پڑتی ہے یعنی حوریں بھی محبت کی نظروں سے دیکھتی ہیں۔

مطلب:۔ اے خدا! جو لوگ تیری راہ میں قتل ہوتے ہیں وہ خون آلود کفن میں اس قدر دلکش معلوم ہوتے ہیں کہ حوریں بھی ان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ حوروں کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ "قاصرات الطرف" ہیں یعنی وہ کسی کی طرف نہیں دیکھتیں۔

بقول نظم طباطبائی "یہ شعر بھی ایسا کہا ہے کہ کروروں میں ایک آدھ ایسا نکلتا ہے"

بنیادی تصور:۔ تحسینِ شہیدانِ راہِ خدا۔

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
(۳) کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

دوسرے مصرع میں جو طنز پوشیدہ ہے بلاشبہ اس کی کیا بات ہے۔ اس محاورے میں دو معنوی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ (۱) بظاہر شرابِ طہور کی تحسین ہے (۲) در پردہ اس کی تحقیر ہے اور یہاں یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔

مطلب:۔ کیا کہنے تمہاری شرابِ طہور کے! یعنی کس کام کی وہ شراب جسے نہ جیتے جی تم پی سکتے ہو نہ کسی اور کو پلا سکتے ہو! بنیادی تصور:۔ مذمت شرابِ طہور۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
(۴) گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صور کی!

مطلب:۔ دراصل محبوب کی تغافل شعاری کا اظہار مقصود ہے کہ صور پھونکا جا چکا لیکن وہ حشر میں مجھ سے اس بات پر لڑ رہا ہے کہ میں نے تو تجھے قتل کر دیا تھا تو

زندہ کیسے ہوگیا؟ اٹھ کیسے کھڑا ہوا؟ بنیادی تصور:۔ بیانِ تغافل شعاری قاتل۔

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
(۵) اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

اڑتی سی خبر یعنی غیر مصدقہ اطلاع یا ایسی خبر جس کا یقین نہ ہو۔ بہار، بلبل، نغمہ اڑتی (اڑنا) اور طیور یہ سب ضلع کے الفاظ ہیں۔ آمدِ بہار کو طیور کی زبانی اڑتی سی خبر سے تعبیر کرنا حسن ادا کا کمال ہے۔ علاوہ بریں اس میں شک بھی کیا ہے کہ بلبل کی نغمہ سنجی ہمیشہ آمد بہار کی خبر دیتی ہے اسی نغمہ سنجی کو طیور کی زبانی اڑتی سی خبر قرار دیا ہے۔ بقول نظم طباطبائی "انصاف یہ ہے کہ یہ تشبیہ نہایت بدیع ہے اور بالکل نئی ہے۔

مطلب:۔ بلبلوں کی نغمہ سنجی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہار آگئی۔

بنیادی تصور:۔ علامتِ آمدِ بہار۔

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
(۶) کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

مطلب:۔ مطلب تو واضح ہے کہ اگرچہ کعبے میں اب بت نہیں ہیں مگر ایک زمانے میں تو وہاں یقیناً رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے دور کی نسبت انھیں اب بھی حاصل ہے کہ کبھی تو وہاں تھے۔ لیکن جو نکتہ پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نسبت بعیدہ کو مدنظر رکھ کر انھیں بنظر حقارت نہیں دیکھنا چاہیئے۔

بنیادی تصور:۔ پہلوئے احترامِ اذہان۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
(۷) آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

مطلب:۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ دیدار الہٰی سے محروم ہے

اس لیے ہر شخص محروم رہے گا۔ لہٰذا آؤ کوہ طور پر قسمت آزمائی کے لیے چلیں۔
بنیادی تصور:۔ طنز بر محرومیٔ حضرت موسیٰ۔

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر!
(۸) کی جس سے بات، اس نے شکایت ضرور کی

مطلب:۔ محبوب سے کہتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ آپ بہت تندمزاج ہیں مگر ایسی بھی کیا تندی کہ آپ جس سے گفتگو کریں وہ آپ کی تندمزاجی کا شاکی ہو جائے۔
بنیادی تصور:۔ مذمتِ تندخوئیٔ محبوب۔

غالبؔ! اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
(۹) حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی!!

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "اس شعر سے مرزا کی کمال شوخیٔ طبع ظاہر ہوتی ہے یہ غزل اس زمانہ (۱۸۵۰ء) میں لکھی تھی جب کہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لیے منت مانتے ہیں۔ مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا۔ شوخی قابلِ داد ہے کہ ادھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری!" (یادگار غالب ص ۱۴۸)
بنیادی تصور:۔ استخفافِ ثوابِ حج۔

---

(۲۳۳)

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام بہت ہے
(۱) یہ رنج، کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

مطلب:۔ چونکہ میرا دلِ ناکام رنج و غم کی برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے لیے

یہ رنج بہت ہے کہ شراب کم ہے۔ **بنیادی تصور**:۔ حرصِ کثرتِ شراب۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
(۲) ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

مطلب:۔ حالی لکھتے ہیں کہ "قناعت کا تو یہ عالم ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لیے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل، کم ہمت اور قانع بر ہیچ نہ سمجھ لے، اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔" (یادگارِ غالب ص۱۴۹)

بنیادی تصور:۔ حرصِ شراب نوشی۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
(۳) گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

مطلب:۔ مطلب تو واضح ہے کہ قفس میں بڑے آرام سے گذر رہی ہے۔ نہ صیاد کا کھٹکا ہے نہ تیر کا اندیشہ ہے مگر بقول حالی نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ "جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اس کا کوئی دشمن یا بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت، اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔" (یادگارِ غالب ص۱۴۹)

بنیادی تصور:۔ پہلوئے تسکین بحالتِ اسیری۔

کیا زہد کو مانوں؟ کہ نہ ہو گرچہ ریائی
(۴) پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

مطلب:۔ جناب اثر لکھنوی لکھتے ہیں:۔

"شارحین نے "پاداش" کے معنی جزا کے لیے ہیں یعنی طلبِ اجر و ثواب حالانکہ لفظ پاداش، مکافات (بدلہ) کا مرادف ہے اور اس کا اطلاق جزا اور سزا دونوں پر ہوتا ہے۔ غالب نے پاداشِ عمل کی خواہ بامیدِ جزا ہو یا بخوفِ سزا، طمعِ خام کہا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ زہد ریائی

کی زبونی تو ظاہر ہے، لیکن وہ زہد بھی کسی کام کا نہیں جس میں پاداش
عمل یعنی جزا یا سزا کا خیال شامل ہو۔ کیونکہ جہاں یہ خیال گذرا، خلوص
رخصت ہوا۔ لہذا انسان کو چاہیئے کہ پاداش عمل سے یکسر بے تعلق ہو کر
اپنے نفس کی پاکی، صفائی، فروتنی اور خدمتِ خلق میں مشغول رہے۔ زاہدوں
میں یہی بات نہیں پائی جاتی۔" (مطالعۂ غالب صـ ۶۸)

بنیادی تصور:۔ تلقینِ اخلاصِ عمل۔

(۵)
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے!

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ جہلاء تو رسم و رہِ عام کے غلام ہیں ہی، لیکن جو لوگ اہلِ خرد ہیں، ان کا دامن بھی اس عیب (تقلید کورانہ) سے پاک نہیں ہے۔ لہذا وہ روشِ خاص پر چلنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ پابند رسوم ذہبوں وہ بھی ہیں۔

بنیادی تصور:۔ عموم تقلید کورانہ۔

(۶)
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بہ مئے، جامۂ احرام بہت ہے

مطلب:۔ حاجیوں سے خطاب کرتے ہیں کہ میرا احرام، شراب (گناہوں) سے اس درجہ آلودہ ہے کہ میری ساری عمر اُسے اب زمزم سے پاک کرنے ہی میں گذر جائے گی۔ اس لیے تم لوگ خانہ کعبہ کا طواف کرو، مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو! نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ طواف اسے زیبا ہے جس کی سیرت پاکیزہ ہو۔ جو شخص آلودۂ عصیاں ہو اسے لازم ہے کہ پہلے اپنے دل کو پاک کرے پھر خدا کے سامنے جائے (طواف کرے)

بنیادی تصور:۔ شرطِ طواف کعبہ۔

(۷)
ہے قہر، مگر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

بات نہ بنے کنایہ ہے وصل سے + ابرام بمعنی ضد یا اصرار۔

مطلب:۔ محبوب کو وصل سے انکار نہیں ہے اور مجھے اس کا بیحد اشتیاق ہے لہذا اب بھی اگر یہ نعمتِ عظمیٰ حاصل نہ ہو تو واقعی میری بدقسمتی میں کوئی شک نہیں ہے

بنیادی تصور:۔ عدمِ اعتماد بر اقرارِ محبوب۔

خوں ہو کے جگر، آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
(۸) رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

مطلب:۔ موت سے کہتے ہیں کہ تو قبل از وقت آگئی۔ ابھی میرا جگر، فراقِ یار میں خون ہو کے آنکھ سے نہیں ٹپک پایا ہے۔ اور جب تک یہ منزل طے نہ ہو، یعنی جب تک مجھے عاشقی کی معراج نصیب نہ ہو، مرنے کو جی نہیں چاہتا۔

بنیادی تصور:۔ آرزوئے حصولِ معراجِ عاشقی۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
(۹) شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مطلب:۔ چونکہ غالب بہت اچھا شاعر ہے اس لیے ہر شخص اسے جانتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ بدنام بہت ہے۔ شعر کی خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ تحسین کے پردے میں اپنی مذمت بھی کر دی یعنی یہ پہلو بھی نکل آیا کہ چونکہ وہ بہت بدنام ہے اس لیے ہر شخص اسے جانتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ ع بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

---

(۲۴۳)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
(۱) جوشِ قدح سے بزم، چراغاں کیے ہوئے

جوشِ قدح کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب:- اس صحبت کی یاد تازہ کی ہے جب محبوب کو گھر بلایا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پی تھی۔ ان پیالوں کو جن میں سرخ رنگ کی شراب بھر کر رکھی تھی، چراغاں سے تشبیہ دی ہے اور یہی اس شعر میں خوبی ہے۔ مطلب واضح ہے۔

بنیادی تصور:- یاد بادہ پیمائی باحبیب۔

(۲)
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

مطلب:- عرصہ ہوا محبوب کے تیر مژگان سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اب پھر انہیں جمع کر رہا ہوں تاکہ پھر اپنے جگر کو اس کے تیر مژگاں کا نشانہ بنا سکوں۔ خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:- آرزوئے خلشِ تیرِ مژگاں۔

(۳)
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

مطلب:- چونکہ مدتوں سے گریباں چاک نہیں کیا ہے اس لیے اس طرزِ احتیاط سے میرا دم الجھنے لگا ہے۔ یعنی پھر گریباں چاک کرنا چاہتا ہوں۔

بنیادی تصور:- آرزوئے چاکِ گریباں۔

(۴)
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

مطلب:- چونکہ سیرِ چراغاں کیے ہوئے مدت گذر چکی ہے اس لیے پھر نالہ ہائے شرر بار سرزد کر رہا ہوں تاکہ سیرِ چراغاں سے لطف اندوز ہو سکوں۔ بنیادی تصور:- شرر افشانیٔ نالہ۔

(۵)
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

مطلب :۔ مضمون تو پامال ہے مگر اندازِ بیان نے لطف دوبالا کر دیا ہے کہتے ہیں کہ عشق پھر میرے دل پر چرکے لگا رہا ہے۔ پھر میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے یعنی میرے دل میں آتشِ شوق پھر بھڑک اٹھی ہے۔

بنیادی تصور :۔ شدتِ آتشِ شوق۔

(۶)
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

مطلب :۔ میں پھر اپنی پلکوں کو اپنے دل کے خون میں ڈبو رہا ہوں تاکہ ان سے اپنے دامن میں گل کاریاں کر کے اسے رشکِ چمن بنا دوں۔

بنیادی تصور :۔ آرزوئے خونابہ فشانی۔

(۷)
باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

مطلب :۔ دل نے محبوب کے تصور کا اور آنکھوں نے اس کے دیدار کا پھر سامان کیا ہے۔ اس لیے ان دونوں میں رقابت کا بازار گرم ہو گیا ہے۔

بنیادی تصور :۔ آرزوئے خیال و دیدِ جاناں۔

(۸)
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پندار بمعنی خودداری، غرور، غیرت، پاسِ عزت۔ پندار کا صنم کدہ یعنی جذبۂ خودداری۔ کوئے ملامت سے کوچۂ محبوب مراد ہے۔ کیونکہ وہاں جا کر ذلت حاصل ہوتی ہے۔

مطلب :۔ چونکہ محبوب کے کوچے میں جا کر بہت ذلیل ہوا تھا اس لیے وہاں جانے کا عہد کر لیا تھا۔ مگر اب میں نے اپنی خودداری کو ملیامیٹ کر دیا اس لیے پھر وہاں جانا چاہتا ہوں۔ بنیادی تصور :۔ آرزوئے طوافِ کوچۂ جاناں۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
(۹)
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

مطلب:- میں پھر اپنی عقل و دل و جان کی پونجی کسی خریدار (معشوق) کے ہاتھ بیچنے پر آمادہ ہوں۔ یعنی پھر کسی پر عاشق ہونا چاہتا ہوں۔

بنیادی تصور:- آرزوئے معاشقہ۔

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
(۱۰)
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

گل و لالہ کنایہ ہے محبوبوں سے۔ صد گلستان نگاہ یعنی ایسی نگاہ جس میں بہت سے گلستان پوشیدہ ہوں۔

مطلب:- میرا خیال اپنی نگاہ میں صد ہا رنگینیاں جمع کر کے حسینوں کے دیدار کی تلاش میں ہے یعنی میں بڑے اشتیاق کے ساتھ حسینوں کے دیدار کا آرزومند ہوں۔

بنیادی تصور:- اشتیاق دیدار حسینانِ عالم۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
(۱۱)
جاں، نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

مطلب:- میں پھر معشوق کے خط کو بڑے اشتیاق سے کھولنا چاہتا ہوں۔ دوسرے مصرع میں اپنے اشتیاق کی تصریح کی ہے کہ عنوان خط کی دلکشی پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں۔ بنیادی تصور:- آرزوئے مراسلت یا محبوب

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
(۱۲)
زلفِ سیاہ، رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

مطلب:- میں پھر کسی ایسے معشوق کو دیکھنا چاہتا ہوں جو کوٹھے پہ اپنی زلفیں کھولے ہوئے بیٹھا ہو۔ بنیادی تصور:- آرزوئے دیدارِ جاناں۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
(۱۳) سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

مطلب :۔ میں پھر اس بات کا آرزو مند ہوں کہ کوئی معشوق میرے سامنے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگائے اس انداز سے بیٹھا ہو کہ اس کی پلکیں میرے جگر کے پار ہو جائیں۔
بنیادی تصور :۔ آرزوئے چشم سرمگیں۔

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
(۱۴) چہرہ، فروغِ مئے سے گلستاں کیے ہوئے

مطلب :۔ میں پھر کسی ایسے معشوق کو دیکھنا چاہتا ہوں جس کا چہرہ شراب سے سُرخ ہو رہا ہو۔ بنیادی تصور :۔ آرزوئے دیدارِ محبوب بادہ کش۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
(۱۵) سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

مطلب :۔ پھر جی چاہتا ہے کہ کسی معشوق کے دروازے پر پڑے رہیں اور دربان کی منت سماجت کریں کہ وہ ہمیں وہاں سے کبھی نہ اٹھائے۔
بنیادی تصور :۔ آرزوئے جبہ سائی بر در محبوب۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
(۱۶) بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

مطلب :۔ کاش ہمیں ایسی فرصت نصیب ہو جائے کہ رات دن تصورِ جاناں میں منہمک رہیں۔ بنیادی تصور :۔ آرزوئے استغراق در تصورِ جاناں۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
(۱۷) بیٹھے ہیں ہم، تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

مطلب :۔ اے غالب! ہمیں نہ چھیڑ کیوں کہ ہم طوفانِ اشک برپا کرنے کا تہیہ کر

چکے ہیں۔ یعنی رونے پر تلے بیٹھے ہیں۔ بنیادی تصور: تنبیہ طوفانِ اشک۔

---

(۲۳۵)

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست، جان کے لیے
(۱) رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

مطلب: معشوق نے ظلم و ستم کی جس قدر صورتیں ممکن ہو سکتی تھیں سب مجھ پر آزمالیں اس لیے آسمان کے لیے کوئی طرزِ ستم باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب جورِ فلک سے بے خوف ہو گیا ہوں۔ اس بات کو انہوں نے یوں ادا کیا ہے کہ بیدادِ دوست میری جان کے لیے نویدِ امن ہے۔ یہ مومن کا خاص رنگ ہے۔

بنیادی تصور: ستم پیشگیٔ دوست۔

بلا ہے، گر مژۂ یار، تشنۂ خوں ہے
(۲) رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لیے

مطلب: یہ سچ ہے کہ محبوب کی پلکیں میرے خون کی پیاسی (طالب) ہیں مگر میری پلکیں بھی تو خونبار ہیں اس لیے تھوڑا سا خون اُنکے لیے بھی بچا کر رکھنا ضروری ہے۔

بنیادی تصور: صفتِ خونچکانیٔ مژگاں۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
(۳) نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

مطلب: اے خضر! انصاف کی بات یہ ہے کہ زندگی کا لطف ہمیں حاصل ہے نہ کہ تمھیں۔ کیونکہ ہم دنیا میں سب لوگوں سے ملتے ہیں اور تمہاری حالت یہ ہے کہ اگرچہ تمھیں عمرِ جاوداں حاصل ہے مگر تم سب سے پوشیدہ رہتے ہو۔ مضمون آفرینی اور "چور بنے" کا ٹکڑا دونوں باتیں قابلِ داد ہیں۔ کیسی خوبی سے عمرِ فانی کو عمرِ جاودانی

پر ترجیح دی ہے۔ بنیادی تصور:۔ تفوقِ عمرِ فانی بر حیاتِ جاودانی۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
(۴) بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

پہلے مصرع میں لفظ "بھی" سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک تو اس کی ادا میرے لیے بلائے جان ہے یعنی میں اس کی ادا پر مٹا ہوا ہوں اور اس لیے سخت مصیبت میں مبتلا ہوں اس پر مستزاد یہ ہے کہ اس کی ادا میرے لیے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے بلائے جان بنی ہوئی ہے یعنی ساری دنیا اس پر مٹی ہوئی ہے اس لیے میں رشک کی آفت میں بھی مبتلا ہوں یعنی دوہری مصیبت میں مبتلا ہوں۔ بلاشبہ خوب شعر کہا ہے۔

بنیادی تصور:۔ اظہارِ جذبۂ رشک۔

فلک! نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
(۵) درازدستیٔ قاتل کے امتحاں کے لیے

شعر کا مضمون درازدستی سے پیدا کیا ہے۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) ظلم و ستم (۲) دور ہونا۔ اسی لیے پہلے مصرع میں لفظ "دور" لائے ہیں۔ درازدستیٔ قاتل بمعنی قاتل کا ظلم و ستم۔

مطلب:۔ اے فلک! یہ سچ ہے کہ قاتل کی درازدستی کا امتحان اسی وقت ہو سکتا ہے جب مظلوم یا کشتنی اس سے دور ہو مگر اس کے لیے تو نے مجھی کو کیوں منتخب کیا ہے، میرے علاوہ اور لوگ بھی تو دنیا میں ہیں اس لیے میرے بجائے کسی اور کو اس سے دور کر دے بنیادی تصور:۔ آرزوئے قربِ محبوب۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
(۶) کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

مطلب:۔ کوشش سے راحت حاصل کرنے کی کوشش مراد ہے۔ کہتے ہیں

کہ دنیا میں جو لوگ راحت حاصل کرنے کی کوشش (سعیٔ لاحاصل) کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مرغ اسیر قفس میں آشیانہ بنانے (راحت حاصل کرنے) کے لیے تنکے فراہم کرے جس طرح قفس میں راحت نصیب نہیں ہو سکتی اسی طرح کسی انسان کو دنیا میں راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیسی خوبی سے دنیا کو قفس ثابت کیا ہے بلاشبہ بہت بلند پایہ شعر کہا ہے۔ **بنیادی تصور:۔** عدم امکانِ حصولِ راحت۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
(۷) اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مطلب:۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں "اردو میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو چار ہی اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر مٹے ہوئے تھے۔ روزمرہ کی نشست الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے بیان کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں تعریف کے قابل ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ میں جب درِ محبوب پر جا کر بیٹھا تو پاسبان نے مجھے گدا سمجھا اس لیے کچھ نہ کہا لیکن میں نے یہ حماقت کی کہ تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر اس کے قدموں پر گر پڑا وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ سائل نہیں ہے بلکہ عاشق ہے اس لیے اس نے میری گردن ناپ دی۔ **بنیادی تصور:۔** بیانِ جفائے پاسباں۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
(۸) کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

مطلب:۔ واضح ہو کہ آئندہ چار اشعار نواب تجمل حسین خاں مرحوم والیٔ فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں۔ چونکہ غزل میں قصیدے کا پیوند لگانا چاہتے ہیں اس لیے بطور تمہید یہ بات کہی کہ ظرفِ غزل، بقدرِ شوق نہیں ہے اس لیے میں غزل میں وسعت پیدا کر رہا

ہوں یعنی غزل میں قصیدہ شامل کر رہا ہوں اسی بات کو مقطع میں "ادائے خاص" سے تعبیر کیا ہے۔ بنیادی تصور:۔ توسیع ظرفِ غزل۔

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
(۹) بنا ہے عیش، تجمل حسین خاں کے لیے

مطلب:۔ دراصل خدا نے عیش کو تجمل حسین خاں ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر دوسروں کو اس سے حصہ اس لیے دیا ہے کہ انھیں نظر نہ لگ جائے۔

نوٹ:۔ نواب تجمل حسین خاں مرحوم والیٔ ریاست فرخ آباد غالب کے قدر دانوں میں سے تھے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!
(۱۰) کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

مطلب:۔ ممدوح کے نام میں یہ شیرینی اور لذت ہے کہ جب اس کا نام میری زبان پر آیا تو میری قوتِ گویائی نے میری زبان چوم لی! یہ استفہام اظہارِ مسرت کے لیے ہے۔

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
(۱۱) بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے

مطلب:۔ ممدوح، مملکت اور دین کا معاون ہے اور قوم اور ملک کا مددگار ہے اس کی رفعت و عظمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آسمان اس کی آستاں بوسی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش!
(۱۲) بنائیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

مطلب:۔ اس کا عہد ایسا مبارک ہے کہ ساری کائنات محوِ آرائش ہے یعنی اپنے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے اس لیے آسمان کی آرائش کے لیے بھی اب نئے ستارے

بنائے جائیں گے کیونکہ یہ ستارے تو پرانے ہو چکے ہیں۔ بہت خوب شعر کہا ہے۔
مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ "ممدوح ہر چیز کو کامل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے اس لیے ہر شئی اپنے آپ کو کامل تر حالت میں اسے دکھانا چاہتی ہے اگر یہی حال رہا تو شاید آسمان کی زیبائش کے لیے اور ستارے پیدا کئے جائیں۔"

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
(۱۳) سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لیے

ورق بمعنی کاغذ۔ سفینہ بمعنی کشتی یہاں بیاض یا دیوان مراد ہے۔ بحر بیکراں کنایہ ہے مدح سے۔ سفینہ کا لفظ بحر کی رعایت سے لائے ہیں۔
مطلب:۔ کاغذ ختم ہو گیا مگر مدح ابھی باقی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ممدوح کی کماحقہٗ مدح کے لیے بہت بڑا دیوان درکار ہے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
(۱۴) صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

خاص اور عام میں صنعتِ تضاد ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس صنعت سے شعر میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے + ادائے خاص سے غزل میں قصیدے کا رنگ مراد ہے + صلائے عام بمعنی اطلاعِ عام + یارانِ نکتہ داں سے طبقۂ شعرا مراد ہے۔
مطلب:۔ کہتے ہیں کہ میں نے غزل میں قصیدہ گوئی کا رنگ شامل کر کے نئی طرزِ سخن ایجاد کی ہے۔ شعراء کو اس طرز کا تتبع کرنے کی دعوتِ عام دیتا ہوں۔

قصائد

تمہید:۔ اگرچہ غالب کے اردو دیوان میں صرف چار قصیدے ہیں۔ دو حضرت علیؓ کی منقبت میں اور دو بہادر شاہ مرحوم کی مدح میں۔ لیکن اکثر نقادانِ فن کا خیال ہے کہ یہ چار قصیدے بھی ان کی استادی اور قادر الکلامی کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

جو خوبیاں ان کی عام شاعری کا طغرائے امتیاز ہیں وہ ان قصائد میں بھی بوجہِ احسن موجود ہیں۔ مثلاً مضمون آفرینی، نازک خیالی، طرفگیٔ ادا، جدتِ طرازی استعاروں کی لطافت، تشبیہات کی دلکشی، شوخی ظرافت، تصوف کی چاشنی اور پامال یا فرسودہ خیالات سے اجتناب۔

جو قصیدے حضرت علی کی منقبت میں ہیں ان میں قدم قدم پر جوشِ عقیدت نظر آتا ہے مگر خیالات، اسلوب اور تراکیب میں بیدلؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔

جو قصیدے بہادر شاہ کی مدح میں ہیں ان میں اس قدر اشکال، پیچیدگی اور غرابت نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غالب خوب جانتے تھے کہ میرا ممدوح طرزِ بیدلؒ کے بجائے رنگِ ذوق پر مٹا ہوا ہے۔ اس لیے ان قصیدوں کی زبان بہت دلکش ہے۔

صاحب شعر الہند لکھتے ہیں "یہ قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے :-

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام ٭ جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اردو شاعری کے لیے سرمایۂ نازش ہے۔"

نظم طباطبائی نے لکھا ہے کہ "یہ قصیدہ، خصوصاً اس کی تشبیب ایک کارنامہ ہے مصنف کے کمال کا اور زیور ہے اردو شاعری کے لیے۔ اس زبان میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی ہے۔" (شرح دیوانِ غالب ص ۲۰۴)

قصیدۂ اوّل

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
(۱) سایۂ لالۂ بیداغ، سویدائے بہار

سازِ یک ذرہ بمعنی وجودِ یک ذرہ + بہار کی تاثیر دکھانے کے لیے لالہ کو بیداغ قرار دیا ہے + سویدائے بہار سے سویدائے دلِ بہار مراد ہے + سایہ کو سویدا قرار دیا ہے اور چونکہ سویدائے دل، دل کے لیے ضروری ہے اس لیے ثابت ہوا کہ سایۂ لالہ بھی بہار کے لیے ضروری ہے یعنی بیکار نہیں ہے۔

مطلب:۔ فیضِ چمن کی وجہ سے باغ کا ایک ذرہ بھی بے کار نہیں ہے حتیٰ کہ لالۂ بیداغ کا سایہ بھی (جو بظاہر بے کار نظر آتا ہے) بہار کے دل کا سویدا بنا ہوا ہے یعنی باغ کی دلکشی میں اضافہ کر رہا ہے۔ بنیادی تصور:۔ فیضِ بہار۔

مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
(۲) ریزۂ شیشۂ مئے، جوہرِ تیغِ کہسار

غالب نے بیدلؒ کے تتبع میں اس شعر کو عمداً مشکل بنا دیا ہے + بعرضِ سبزہ بمعنی اپنی سبزی کے اظہار میں یعنی اپنی سبزی کی وجہ سے + عرض کا لفظ محض جوہر کی رعایت سے لائے ہیں + دوسرے مصرع کی نثر یوں ہوگی "جوہرِ تیغِ کہسار، ریزۂ شیشۂ مئے نظر آتا ہے + ریزۂ شیشۂ مئے بمعنی شراب کی بوتل کی کرچیں + "جوہرِ تیغِ کہسار" کی ترکیب میں غالب نے بہت تصنع اور آورد اور دور از کار استعارے سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے یہ ترکیب مغلق ہو گئی ہے + "تیغ" فارسی زبان میں تلوار کو بھی کہتے ہیں اور پہاڑ کی چوٹی یا بلندی کو بھی۔ غالب نے تیغِ کہسار سے تو دوسرا مفہوم یعنی پہاڑ کی چوٹی مراد لی ہے اور جوہرِ تیغ سے پہلا مفہوم یعنی تلوار کا جوہر مراد لیا ہے جوہر کا لفظ محض اس لیے لائے ہیں کہ جوہرِ تیغ سبز ہوتا ہے اور پہاڑ کی چوٹی بادِ صبا کے اثر سے

سبز ہوگئی ہے۔

مطلب:۔ صرف اس قدر ہے کہ موسم بہار میں بادِ صبا ایسی مستی انگیز ہے کو تیغ کہسار کا جوہر، سبزے کے باعث شیشۂ مئے کا ریزہ معلوم ہوتا ہے۔ بالفاظِ دگر، فیض ہوا سے پہاڑ کی چوٹی بھی سبز ہوگئی ہے۔ ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

بنیادی تصور:۔ تاثیرِ مستیٔ بادِ صبا۔

(۳)
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح، داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت، روئے شرار

داغِ پلنگ۔ وہ سیاہ داغ جو چیتے کی کھال پر ہوتے ہیں +ریشۂ نارنج صفت بمعنی ریشۂ نارنج کی طرح + نارنگی کا ریشہ سرخی مائل ہوتا ہے اور چنگاری بھی سرخ ہوتی ہے۔

مطلب:۔ بہار کے فیض سے داغِ پلنگ، جامِ زمرد کی طرح سبز ہو گیا ہے اور شرارِ نارنگی کے ریشہ کی طرح تر و تازہ نظر آتا ہے۔

عرفی کہتا ہے:۔ ع اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل۔

بنیادی تصور:۔ فیض بہار۔

(۴)
مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

مطلب:۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ مستیٔ ابر نے دونوں جہان کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے مگر میری آغوش خالی ہے تو مجھے بڑی حسرت ہوتی ہے۔ لیکن مستیٔ ابر کی تاثیر میری حسرت کو بھی گلچینِ طرب بنا دیتی ہے یعنی میرا رنج بھی خوشی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

دوسرا مطلب:۔ چونکہ مستیٔ ابر ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے اس لیے میری حسرت بھی گلچینِ طرب بن گئی ہے یعنی مسرت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

بنیادی تصور :۔ تاثیر مستی ابر۔

کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل
(۵)
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

مطلب :۔ سبزہ کی کثرت کی وجہ سے پہاڑ اور جنگل بھی بلبلوں سے معمور ہیں اور پھولوں کی کثرت سے سنسان راہیں بھی آباد ہو گئی ہیں۔

بنیادی تصور :۔ کثرتِ گل۔

سونپے ہے فیض ہوا، صورتِ مژگانِ یتیم
(۶)
سرنوشتِ دوجہاں ابر، بیک سطرِ غبار

اس شعر میں تعقید ہے۔ اس کی نثر یہ ہوگی "فیض ہوا، یک سطر غبار کو، مژگانِ یتیم کی طرح سرنوشتِ دوجہاں ابر سونپتا ہے۔ سطرِ غبار کو مژگانِ یتیم سے اس لیے تشبیہ دی ہے کہ یتیم کی مژگان سے بھی برسوں آنسوؤں کا مینہ برستا رہتا ہے یک سطر غبار سے غبارِ قلیل مراد ہے۔ اور دوجہاں ابر سے ابرِ کثیر مراد ہے۔ سرنوشتِ دوجہاں ابر یعنی ابر کثیر کی خاصیت۔ چونکہ غبار ایک طرز تحریر بھی ہے اس لیے اس کی رعایت سے سطر کا لفظ لائے ہیں۔ مثلاً خطِ ریحان، خطِ گلزار، خطِ نسخ، خطِ نستعلیق وغیرہ۔ اسی طرح سطر کی مناسبت سے نوشت کا لفظ لائے ہیں۔

مطلب :۔ ہوا کا فیض غبار کو بھی خواہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو مژگانِ یتیم کی طرح ابر کثیر یعنی مدتوں تک برستے رہنے کی خاصیت عطا کرتا ہے یعنی غبار میں بھی ابر کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بنیادی تصور :۔ فیضِ ہوا۔

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو باندازِ ہلال
(۷)
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

مطلب :۔ اگر اس موسم میں کوئی شخص اپنا ناخن کاٹ کر پھینک دے تو قوتِ نامیہ

کی تاثیر سے وہ بھی ہلال کی طرح بڑھتے بڑھتے، بدرِ کامل بن جائے گا۔
بنیادی تصور:۔ تاثیر قوتِ نامیہ۔

(۸)
کفِ ہر خاک بگردوں شدہ، قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار

قمری کا لفظ کفِ خاک کی وجہ سے لائے ہیں کیونکہ شعرا قمری کو کفِ خاک باندھا کرتے ہیں۔ دام کا لفظ اس لیے لائے ہیں کہ جب کاغذ جل جاتا ہے تو اس میں جالی پڑ جاتی ہے۔ دام بمعنی جالی۔

مطلب:۔ فیضِ ہوائے بہار کا یہ عالم ہے کہ ہر شی زندہ ہو گئی ہے۔ مثلاً اگر مٹھی بھر خاک آسمان کی طرف پھینکو تو قمری کی طرح اڑنے لگتی ہے اور کاغذ کو جلاؤ تو اس کا جال طاؤس کو شکار کرتا ہے۔

(۹)
میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا یک قدح بادہ، بطاقِ گلزار

ش:۔ اگر تجھے میکدے میں گل چینی کی آرزو ہو تو اس کی ترکیب یہ ہے کہ تو باغ کے طاق میں شراب کا پیالہ رکھ کر بھول جا۔ یعنی کچھ دن وہیں رہنے دے۔ قوت نامیہ کی بدولت ایک پیالے سے ہزاروں پیالے پیدا ہو جائیں گے۔ گویا باغ میکدہ بن جائے گا اور تیری آرزو پوری ہو جائے گی۔ شراب بھی پیتا رہ اور پھول بھی توڑتا رہ۔

(۱۰)
موجِ گل ڈھونڈ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

مطلب:۔ اگر تو میخانہ میں اپنی پگڑی بھول جائے تو چند روز کے بعد فیضِ بہار سے میخانہ غنچۂ باغ بن جائے گا اور تیری پگڑی موجِ گل بن جائے گی یعنی اس کی خوشبو۔ مطلب یہ ہے کہ فیضِ بہار میں قلبِ ماہیت کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اس شعر کی

نازک خیالی بلا شبہ لائق صد تحسین ہے۔

کھینچے گر، مانیٔ اندیشہ چمن کی تصویر
(۱۱) سبز، مثلِ خطِ نوخیز ہو، خطِ پرکار

مانیٔ اندیشہ یعنی اندیشہ + مانی۔ ایران کا مشہور مصور + خطِ نوخیز بمعنی رخسار پر رواں، جو سبزی مائل ہوتا ہے۔

مطلب:۔ اگر اندیشہ (فکرِ انسانی) چمن کی تصویر کھینچے تو فیضِ بہار سے اندیشہ کا خطِ پرکار بھی سبزۂ نوخیز کی طرح سبز ہو جائے۔

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
(۱۲) طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

استعار ۱ تا ۱۱ تشبیب میں تھے۔ یہ شعر گریز کا ہے۔ چونکہ سبزۂ کہسار کو طوطی فرض کیا، اس لیے لعل کی بدولت اس کی سرخ چونچ پیدا کر دی۔

مطلب:۔ حضرت علیؑ کی تعریف کے لیے طوطیٔ سبزۂ کہسار نے لعل سے چونچ پیدا کی ہے۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا
(۱۳) چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

پہلے مصرع میں تعقید ہے + تشریح یوں ہوگی "جس کی سرائے کی تعمیر کے لیے"

مطلب:۔ حضرت علیؑ وہ شہنشاہ ہیں جن کے مکان کی تعمیر کے لیے جبریلؑ کی آنکھوں کے ڈھیلے اینٹوں کے قالب کا کام دیتے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ علوِ مرتبۂ سرائے ممدوح۔

فلک العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
(۱۴) رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار

لفظِ ہجوم سے کثرتِ خمیدگی کا اظہار مراد ہے + طنابِ معمار سے وہ ڈوری مراد ہے جس سے دیوار کا سیدھا پن معلوم کرتے ہیں۔ فلک العرش بمعنی آسمانِ نہم۔
مطلب :۔ ان کے مکان کی تعمیر میں فلکِ نہم، بطور مزدور کام کر رہا ہے اور فیضِ ازل کا رشتہ (تاگا) طنابِ معمار بنا ہوا ہے! بنیادی تصور: مبالغۂ علوِ مرتبۂ ممدوح۔

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
(۱۵) رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

نہ چمن سے نو آسمان مراد ہیں + دونوں مصرعوں میں حرفِ واؤ، مساوات کے لیے آیا ہے۔
مطلب :۔ نو آسمانوں کا سبزہ اور سبزۂ پشتِ لبِ بامِ ممدوح دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح سَو عارفوں کی ہمت کی بلندی اور یک اوجِ حصارِ ممدوح، دونوں برابر ہیں۔

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
(۱۶) وہ رہے مَروحۂ بالِ پری سے بیزار

مَروحہ بمعنی پنکھا + بالِ پری بمعنی پریوں کے پر۔
مطلب :۔ جسے اس مکان کے خاشاک کا ایک تنکا بھی نصیب ہو جائے وہ پریوں کے پروں کے پنکھے سے بیزار (متنفر) ہو جائے گا یعنی وہاں کا کوڑا کرکٹ بھی بالِ پری سے افضل ہے۔

خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عرفا
(۱۷) چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار

مطلب :۔ صحرائے نجف کی خاک، عارفوں کی سیرِ روحانی کا جوہر (خلاصہ) ہے۔ اور وہ لوگ وہاں کے نقوشِ قدم کی آنکھوں میں اپنے بختِ بیدار کی تصویر دیکھ لیتے ہیں۔

ذرہ اس گرد کا، خورشید کو آئینۂ ناز
(۱۸) گرد اس دشت کی، امید کو احرامِ بہار

مطلب:۔ اگر وہاں کی گرد کا ایک ذرہ بھی خورشید کو مل جائے تو وہ اسے اپنے حق میں باعثِ فخر خیال کرے گا اور اس صحرا کی گرد، دلِ امیدوار کے لیے بمنزلۂ احرامِ بہار ہے یعنی اس کے لیے موجبِ سعادت ہے۔

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز
(۱۹) عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ بہار

مطلب:۔ آفرینش وہاں سے مستیٔ ناز طلب کرتی ہے اور وہاں کی ہر موجِ غبار گویا ایجاد کے خمیازے کا اظہار ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ چونکہ صفتِ ایجاد کو اس خاک کے پیدا کرنے پر ناز ہے اس لیے صحرائے نجف کی ہر موجِ غبار گویا ایجاد کی انگڑائی ہے یعنی وہ پھر اسے پیدا کرنے کی آرزو مند ہے تاکہ پھر اپنے کمال پر ناز کر سکے خلاصۂ کلام ایں کہ خدا کی صفتِ ایجاد، اس صحرا کو بار بار پیدا کرنا چاہتی ہے۔
بنیادی تصور:۔ مبالغۂ عظمتِ صحرائے نجف۔

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
(۲۰) دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

مطلب:۔ اے شمعِ شبستانِ بہار (اے ممدوح) تیرے فیض سے پروانوں کے دل چراغاں اور بلبلوں کے پر (بازو) گلزار بن گئے ہیں۔ بنیادی تصور:۔ فیضِ ممدوح۔

شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
(۲۱) ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

مطلب :- تیرے جلوے کے شوق میں اور تیرے دیدار کی آرزو میں آئینہ خانہ طاؤس کی طرح پرواز پر آمادہ ہے۔

(۲۲) تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں، مہِ نو، مژہ گوہر بار

گوہر استعارہ ہے اشک سے۔ مہِ نو کو مژدہ سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب :- تیری اولاد کے غم سے ہلال سلکِ اختر میں موتی برسانے والا پلک نظر آتا ہے۔ یعنی ہلال بھی رو رہا ہے۔

(۲۳) ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم، مہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

ہم بمعنی بھی + مہرِ نماز بمعنی سجدہ گاہ + استظہار بمعنی مدد چاہنا۔

مطلب :- تیرا نقشِ قدم عبادت کے لیے مہرِ نماز ہے اور تیرا حوصلہ محرابِ ریاضت کے لیے باعثِ تقویت ہے۔

(۲۴) مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبیؐ
جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار

مطلب :- تیری مدح میں نعتِ نبیؐ پوشیدہ ہے۔ یعنی تیری مدح، نبیؐ کی مدح ہے اور تیری محبّت کا جام پی کر اسرارِ الٰہی عیاں ہو جاتے ہیں۔

(۲۵) جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو، غمِ خار

پہلے مصرع میں تعقید معنوی ہے۔ بقولِ نظم طباطبائی " جوہرِ دستِ دعا آئینہ کی ترکیب، اُردو تو کیا فارسی میں بھی غریب ہے " یہ جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی جوہرِ آئینہ، دستِ دعا + جوہرِ دستِ دعا یعنی دستِ دعا + جوہر محض آئینہ کی رعایت سے لائے ہیں

دست دعا کو آئینہ فرض کیا ہے۔ اور اس آئینہ کا جوہر تاثیر ہے + مژگانِ اشک آلود اور خار سے خارِ حسرت مراد ہے +

مطلب :۔ ممدوح کے دستِ دعا کے آئینے کے جوہر میں دو گونہ تاثیر ہے پہلی تاثیر یہ ہے کہ بوقتِ دعا جو آنسو ٹپکتے ہیں وہ مژگاں کے لیے باعثِ ناز ہیں دوسری یہ کہ جوہر تاثیر، خارِ حسرت کے لیے موجب الم ہے۔ کیونکہ جب دعا میں تاثیر ہو تو خارِ غم یا خارِ حسرت کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

بنیادی تصور :۔ تاثیر دستِ دعا۔

مردمک سے ہو عزاخانۂ اقبال، نگاہ
(۲۶) خاکِ در کی تری، جو چشم نہ ہو آئینہ دار

اس شعر میں تعقید لفظی ہے۔ نثر یوں ہوگی "جو چشم تری خاکِ در کی آئینہ دار نہ ہو۔ اس کی نگاہ، مردمک سے، عزاخانۂ اقبال ہو جائے" آئینہ دار بمعنی تابع فرمان + مردمک بمعنی پتلی۔ چونکہ پتلی سیاہ ہوتی ہے اس لیے اس سے سیاہ پوشی مراد ہے جو ماتم کی نشانی ہے۔

مطلب :۔ جو آنکھ تیرے دروازے کی خاک کی غلامی نہ کرے خدا کرے اس کی نگاہ ہمیشہ اقبال کے سوگ میں سیاہ پوش رہے یعنی وہ آنکھ والا ہمیشہ اقبال سے محروم رہے۔ بنیادی تصور :۔ دعائے بدبختِ مخالفین۔

دشمنِ آلِ نبیؐ کو بطرب خانۂ دہر
(۲۷) عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

خمیازۂ سیلاب سے موجِ سیلاب مراد ہے۔

مطلب :۔ خدا کرے دشمنِ آلِ نبیؐ کے حق میں، طرب خانۂ دہر کا ہر طاقِ دیوار موجِ سیلاب بن جائے یعنی اسے دنیا میں کبھی راحت (طرب) نصیب نہ ہو۔

دیدہ تا دل، اسد! آئینہ یک پرتوِ شوق
(۲۸) فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

مطلب:- اے اسد! میں آنکھ سے لے کر دل تک یعنی سراسر "پرتوِ شوق" کا آئینہ ہوں اور میرا ساغر فیضِ باطنی سے سرشار ہے۔ یعنی میں ممدوح پر عاشق ہوں اور ان کے عشق کی شراب سے سرشار ہوں۔ راقم محض خط کی رعایت سے لائے ہیں، ورنہ شاعر یہی کہہ سکتے تھے۔

قصیدۂ دوم

دہر، جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
(۱) ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مطلب:- جسے ہم کائنات کہتے ہیں یہ دراصل معشوقِ حقیقی کی ذات کا جلوہ ہے اگر اسے یعنی حسنِ مطلق کو، خود نمائی کا شوق نہ ہوتا تو ہم موجود نہ ہوتے یعنی یہ کائنات موجود نہ ہوتی۔ (تفصیل کے لیے مقدمۂ شرح کا مطالعہ کر لیا جائے)

بنیادی تصور:- ع عالم ہمہ یک جلوۂ ذاتِ احد است (بیدل)

نوٹ:- غالب نے پہلے یہ مطلع لکھا تھا:

توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں ☆ سجدۂ تمثال وہ آئینہ، کہیں حسن کو جبیں

مگر بعد ازاں اس کے بجائے موجودہ مطلع درج کر دیا۔

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
(۲) بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

تماشا سے تماشائے عالم مراد ہے۔ بیدلی سے عدم توجہ مراد ہے۔

مطلب:- چونکہ ہم نے دنیا کا تماشا بیدلی اور بے توجہی کے ساتھ کیا اس لیے

نہ ہمیں عبرت حاصل ہوئی نہ کچھ لطف آیا۔ اور چونکہ ہماری تمنا بھی بے مقصد تھی اس
لیے نہ ہمیں دنیا ملی نہ دین ملا۔ بنیادی تصور:۔ تأسف تضیع اوقات

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
(۳) لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں!

مطلب:۔ ہستی اور عدم میں امتیاز کرنے کی کوشش سراسر نادانی ہے۔ کیونکہ ذاتِ باری کے سوا کوئی شئے درحقیقت موجود ہی نہیں ہے۔ جسے ہم ہستی سمجھتے ہیں یہ بھی درحقیقت معدوم ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہستی اور عدم میں درحقیقت کوئی امتیاز نہیں ہے۔ نیز جنون اور تمکین (دیوانگی اور فرزانگی) میں فرق کرنا سراسر لغویت ہے۔ کیونکہ جسے ہم فرزانگی سمجھتے ہیں وہ بھی دراصل دیوانگی ہے ثبوت اس کا یہ ہے کہ جس طرح دیوانہ رازِ ہستی سے بیخبر ہے اسی طرح فرزانہ بھی اس کے انکشاف سے عاجز ہے، بقول عارف شیرازی

ع کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

بنیادی تصور:۔ لاموجود الا اللہ۔

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
(۴) سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

نقشِ معنی سے نقشِ اہلِ معنی اور نقش سے زندگی مراد ہے۔ خمیازۂ عرضِ صورت یعنی عرضِ صورت + خمیازہ محض پیمانہ کی رعایت سے لائے ہیں۔

مطلب: اہلِ معنی (اربابِ باطن) کی زندگی دراصل ظاہر پرستی ہے۔ کیونکہ معنی (حقیقت) تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ اور انکا سخنِ حق (کلامِ عارفانہ) محض ذوقِ تحسین کا پیمانہ ہے یعنی اس قسم کی گفتگو سے انکا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان کی تحسین کریں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ معرفتِ ذات کسی کو بھی حاصل

نہیں ہوسکتی۔ بنیادی تصور :۔ دشواری معرفتِ ذات۔

(۵) لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مطلب :۔ دانش یعنی معرفتِ ذات کا دعویٰ سراسر غلط ہے اور چونکہ ہم حصولِ ثواب کی خاطر عبادت کرتے ہیں اس لیے ایسی عبادت سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیادار (حکماء و عقلاء) اور دیندار، دونوں ہی ساغرِ غفلت کی تلچھٹ پی رہے ہیں یعنی دونوں ہی حقیقت سے بیگانہ ہیں۔

بنیادی تصور :۔ ہیچ مایگیٔ عقلِ انسانی۔

(۶) مثلِ مضمونِ وفا، باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بفرقِ تمکیں

"باد بدست" سے پشیمانی اور خاک بفرق سے ذلت مراد ہے۔

مطلب :۔ وفا کی طرح شیوۂ تسلیم سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور نقشِ پا کی طرح خودداری کا نتیجہ بھی ذلت و خواری ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یعنی دنیا میں ان صفاتِ حسنہ کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ بے توقیریٔ تسلیم و تمکین۔

(۷) عشق، بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رُخِ آئینۂ حسنِ یقیں!

مطلب :۔ اس زمانہ میں عشق، شیرازۂ حواس کے منتشر ہوجانے کا دوسرا نام ہے یعنی عشقِ حقیقی مفقود ہوچکا ہے۔ لوگوں نے بے حواسی کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ اسی طرح وصل، یقین کے آئینے کے زنگار کا دوسرا نام ہے۔ یعنی اس زمانے کے لوگ عشق کی طرح یقین سے بھی محروم ہیں۔ اگر انہیں در حقیقت

یقین حاصل ہوتا تو محبوب کا جلوہ خود اپنے اندر نظر آ سکتا تھا۔ یعنی اس زمانہ میں کوئی بھی حقیقی معنی میں واصل باللہ نہیں ہے۔

بنیادی تصور :۔ فقدانِ عشق ویقین۔

کوہکن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
(۸) بے ستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

مطلب :۔ لوگ کوہکن کو عاشقِ صادق سمجھتے ہیں۔ مگر در اصل ایسا نہیں ہے وہ تو خسرو کے محل (طرب گاہ) کا ایک مزدور تھا۔ اور کوہ بے ستوں در اصل شیریں کی تغافل شعاری اور بے اعتنائی کی ایک تصویر ہے۔ یعنی نہ فرہاد کو شیریں سے محبت تھی اور نہ شیریں کو فرہاد کی چاہت تھی۔

بنیادی تصور :۔ فقدانِ عشقِ حقیقی۔

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
(۹) کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں

مطلب :۔ اس زمانہ میں نہ کسی عاشق کی آہ میں تاثیر ہے اور نہ کسی عاشق کے نالوں میں کوئی اثر ہے یعنی اس زمانہ میں عاشقِ صادق کہیں نظر نہیں آتا۔

بنیادی تصور :۔ ع جس کو دیکھو ہوس کا بندہ ہے

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
(۱۰) نہ سر و برگ ستائش، نہ دماغِ نفریں

مطلب :۔ میں دنیا والوں کے بلند بانگ دعاوی سُن تو لیتا ہوں (کیونکہ دنیا میں رہتا ہوں) مگر مجھ پر انکا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لیے نہ ستائش کرتا ہوں نہ نفریں۔

بنیادی تصور :۔ عالمِ بے تعلقی۔

کسقدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
(۱۱) یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں

مطلب:- یہ شعر گریز کا ہے۔ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ! میں بھی کیسی بیہودہ گفتگو کر رہا ہوں! جو وقار و تمکین کے آداب سے بالکل خارج ہے۔

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
(۱۲) یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

مطلب:- اے میرے قلم! دفع ہذیان (بے ربط گفتگو یا تحریر) کے لیے لاحول کا نقش لکھ اور اے میری فطرت! تو دفع وسواس کے لیے "یا علی" کا ورد کر۔

مظہر فیض خدا، جان ودل ختم رسل ؐ
(۱۳) قبلۂ آل نبی ؐ، کعبۂ ایجاد یقیں

مطلب:- حضرت علی رضؓ مظہر فیض خدا ہیں، آنحضرت خاتم الرسل (صلے اللہ علیہ وسلم) کے محبوب ہیں، آل نبی ؐ کے قبلہ ہیں اور ایجاد یقین کا کعبہ ہیں۔

ہو وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں، گرم خرام
(۱۴) ہر کف خاک ہے واں، گرد ۂ تصویر زمیں

مطلب:- چونکہ وہ ایجاد (پیدائش) کا سرمایہ ہیں اس لیے جس جگہ وہ چلتے ہیں وہاں کی ہر کف خاک، ایک نئی زمین کا خاکہ بن جاتی ہے یعنی اُن کے ہر نقش قدم سے ایک نئی دنیا پیدا ہو جاتی ہے!

جلوہ پرواز ہو نقش قدم اس کا جس جا
(۱۵) وہ کف خاک ہے ناموس دو عالم کی امیں

مطلب:- جس جگہ ان کا نقش قدم، جلوہ پرواز ہوتا ہے۔ یعنی جہاں اُن کا نقش قدم پڑ جاتا ہے۔ وہاں کی کف خاک، دونوں جہان کی عزت کی امین بن جاتی ہے

نسبتِ نام سے اس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے
(۱۶) ابدًا پشتِ فلک، خم شدۂ نازِ زمیں

مطلب :- چونکہ زمین تراب (مٹی) سے بنی ہے اور ان کی کنیت "ابوتراب" ہے اس لیے زمین کو ان کے نام سے نسبت حاصل ہو گئی۔ بدیں وجہ یہ زمین، آسمان کی نگاہ میں اس قدر محترم ہو گئی ہے کہ وہ ابد تک اس کے سامنے اپنی پشت خم کیئے رہے گا۔

فیضِ خُلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
(۱۷) بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا، عطر آگیں!

مطلب :- چونکہ گل نے ان کے خُلق کا فیض حاصل کر لیا ہے اس لیے اس کی خوشبو سے بادِ صبا بھی معطر ہو گئی ہے۔

بُرّشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
(۱۸) قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

مطلب :- چونکہ دنیا میں اس کی تلوار کی کاٹ کا ہر طرف چرچا ہو رہا ہے اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایجاد (فعلِ آفرینش) ہی کا خاتمہ نہ ہو جائے (رشتۂ ایجاد ہی قطع نہ ہو جائے)

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
(۱۹) رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بت خانۂ چیں

پہلے مصرع میں تعقیدِ لفظی ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی "اس کا جلوہ وہ (ایسا) کفر سوز ہے"۔ رنگ ٹوٹنا اور رونق ٹوٹنا، رنگ شکستن اور رونق شکستن کا اردو ترجمہ ہے اور اردو محاورے کے خلاف ہے۔ "ٹوٹے" کے بجائے "اڑ جائے" بہتر ہے۔

مطلب :- ان کا جلوہ ایسا کفر سوز ہے کہ اس کی وجہ سے بتخانۂ چین کی رونق عاشق کے زنگ کی طرح اڑ گئی۔

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا

(۲۰) وصیٔ ختمِ رسلؐ تو ہے بفتوائے یقیں

وصی لغوی معنی وصیت کرنے والا یا جس کو وصیت کی جائے۔ اصطلاحی معنی جانشین

مطلب :- اے پناہِ جاں! اے فیض رسانِ جان و دل! اے مخدوم! میں اپنے یقین (ایمان) کی بنا پر کہتا ہوں کہ تو وصیٔ حضرتِ خاتم الرسلؐ ہے۔

(نوٹ) اس شعر میں غالب نے اپنا عقیدہ نظم کیا ہے۔ لیکن اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلعم حضرت علیؓ کو اپنا وصی (جانشین) مقرر فرما دیتے تو وہ حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر کبھی ہرگز بیعت نہ کرتے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ صریحاً آنحضرت صلعم کی نافرمانی کے مرتکب ہو جاتے اور ان کی ذات با برکات اس گناہ کبیرہ سے بلاشبہ بالاتر ہے۔ علاوہ بریں انہوں نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی اس بات کا اعلان نہیں کیا کہ مجھے آنحضرت صلعم نے اپنا وصی مقرر فرمایا تھا بلکہ بوقتِ وفات جب ان کے رفقاء نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کسے اپنا جانشین مقرر کرتے ہیں؟ تو اس پیکرِ صدق و صفا اور واقفِ دینِ مصطفےٰؐ نے یہ کلمۂ حق اپنی زبان حقائق ترجمان سے ادا کیا کہ "جس طرح میرے آقاؐ اور مولیٰؐ روحی لہ الفداء نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ اسی طرح (آپؐ کی اتباع میں) میں بھی کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کرتا میرے بعد جسے چاہو اپنا امام منتخب کر لینا"

میں جب کبھی اس بات پر غور کرتا ہوں تو اقبال کا یہ شعر بے اختیار میری زبان پر جاری ہو جاتا ہے :-

حق گوئی و بے باکی، آئینِ جوانمرداں
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبرؐ ، منبر
(۲۱) نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش، نگیں

مطلب :- اے ممدوح! تو نے جناب رسالتمآب صلعم کے دوشِ مبارک پر کھڑے ہو کر ان بتوں کو توڑا جو خانۂ کعبہ میں نصب تھے اور تیرا نامِ نامی، عرش کی پیشانی کے لیے باعثِ زینت ہے۔

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
(۲۲) شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

لفظِ واجب سے فلسفۂ مشائین میں ذات خداوندی مراد ہوتی ہے۔ یہ لفظ دانستہ لائے ہیں تاکہ "ممکن" سے تقابل کی صنعت پیدا ہو سکے۔ کیونکہ فلسفۂ مشائین کی اصطلاح میں "ممکن" اسے کہتے ہیں جو واجب کی بدولت موجود ہو سکے۔ "آئین باندھنا" اردو کا محاورہ نہیں ہے۔ آئین بستن کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے اور آئینہ بندی سے زیب و زینت مراد ہوتی ہے۔

مطلب :- تیری مدح، واجب الوجود (خدا) کے علاوہ بھلا کس سے ممکن ہے؟ یعنی کوئی انسان (ممکن الوجود) تیری مدح نہیں کر سکتا۔ شمع کی آرائش تو شعلۂ شمع ہی کر سکتا ہے۔ یعنی تجھے خدا سے وہی علاقہ ہے جو شعلہ کو شمع سے ہے۔

آستاں پر ہے ترے، جوہرِ آئینۂ سنگ
(۲۳) رقمِ بندگیٔ حضرتِ جبریلِ امیں

رقم بمعنی نقش یا نشانِ سجدہ ۔ سنگِ آستاں کو آئینہ فرض کر کے نقوش بندگی کو جوہر قرار دیا ہے ۔

مطلب :۔ جبریل امین کی بندگی (عبادت) کا نقش تیرے آئینہ سنگِ آستاں کا جوہر ہے یعنی وہ نقوش سنگِ آستاں میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے آئینے میں جوہر نظر آتے ہیں ۔

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار، آمادہ
(۲۴) خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں

مطلب :۔ خدا نے انسانوں کو جو جان و دل و دیں عطا کئے ہیں سب لوگ ان چیزوں کو تیرے در پر نثار کرنے کے لیے آمادہ (تیّار) ہیں ۔

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں، کام و زباں
(۲۵) تیری تسلیم کو ہیں، لوح و قلم، دست و جبیں

مطلب :۔ تیری مدح کے لیے دل اور جان، کام و زبان بن گئے ہیں ۔ یعنی جان اور دل دونوں تیری مدح کرتے ہیں ۔ اسی طرح تجھے آداب و تسلیمات بجا لانے کے لیے لوح و قلم، ہاتھ اور پیشانی بن گئے ہیں یعنی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر تجھے سلام کر رہے ہیں ۔

کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیٔ ممدوحِ خدا
(۲۶) کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

مطلب :۔ کوئی انسان، اس شخص کی مدح کیا کر سکتا ہے جس کی مدح خود خدا کر رہا ہو! اسی بات کو باندازِ دگر یوں بیان کیا ہے کہ جس طرح خدا کے سوا جنت کی آرائش کوئی نہیں کر سکتا ۔ اسی طرح خدا کے سوا، تیری مدح بھی کوئی نہیں کر سکتا ۔

جنسِ بازارِ معاصی، اسدُ اللہ اسد
(۲۷) کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
(۲۸) ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
(۲۹) کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

پہلے مصرع کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) اگر اسد اللہ کو غالب کا نام قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ میں اسد اللہ نام اسد تخلص، جنسِ بازارِ معاصی ہوں۔ (۲) اگر اسدُ اللہ کو حضرت علیؓ کا لقب قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ کے شیر! میں اسد جنسِ بازارِ معاصی ہوں۔

مطلب :۔ تیرے سوا میرا کوئی خریدار (پرسانِ حال) نہیں ہے چونکہ مجھے تیرے فضل و کرم پر یقین ہے اس لیے میں عرضِ مطالب میں اس درجہ گستاخ ہو گیا ہوں۔ تو میری دعا کو ایسا حسنِ قبول عطا کر کہ خود اجابت (قبولیت) میری دعا کے ہر لفظ بلکہ ہر حرف پر آمین کہے۔

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
(۳۰) کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

مطلب :۔ جنابِ حسینؓ کے غم سے میرا سینہ یہاں تک لبریز ہو جائے کہ میری آنکھیں، خونِ جگر سے ہمیشہ سرخ رہیں۔

طبع کو الفتِ دُلدل میں یہ سرگرمیٔ شوق
(۳۱) کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

مطلب :۔ جنابِ حسینؓ کے گھوڑے سے مجھے اسقدر محبت ہو جائے کہ وہ جہاں تک

چلنے میں اس کے ہر قدم پر اپنی پیشانی رکھتا رہوں۔ یعنی اسکا قدم ہو اور میری جبیں ہو۔

(۳۲) دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں

مطلب:۔ میرے دل کو ممدوح کی محبت سے نسبت ہو اور میرا سینہ توحید سے معمور ہو جائے۔ میری نگاہ ہمیشہ تیرے حسن کا جلوہ دیکھتی رہے اور میری سانس سچائی کو پسند کرتی رہے۔

(۳۳) صرفِ اعداء، اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب، گل و سنبلِ فردوسِ بریں

مطلب:۔ تیرے دشمن، دوزخ کی آگ میں جلتے رہیں اور تیرے دوست، جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

قصیدۂ سوم

(۱) ہاں مہِ نو! اسنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

جب کوئی شخص کسی کو جھک کر سلام کرتا ہے تو ہلال سے مشابہت ہو جاتی ہے۔

مطلب:۔ ہلالِ عید سے خطاب ہے کہ ہمیں بھی اس کا نام بتا جسے تو جھک کر سلام کر رہا ہے۔

(۲) دو دن آیا ہے تو نظر، دمِ صبح ؛ یہی انداز اور یہی اندام

مطلب:۔ تو دو دن تک صبح کے وقت (قبل طلوعِ آفتاب) اسی انداز اور اسی صورت سے نظر آیا ہے۔ چھبیسویں اور ستائیسویں شب (قبل طلوعِ آفتاب) پچھلے کو چاند نظر آیا کرتا ہے۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(۳) بارے دو دن کہاں رہا غائب ٭ بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام

مطلب :- لیکن تو دو دن کہاں غائب رہا ؛ بیشک گردشِ ایام کے سامنے ہر شخص مجبور ہے۔ اگر چاند تیس کا ہوتا ہے تو ۲۸ ویں اور ۲۹ ویں شب کو بالکل نظر نہیں آتا۔ اور اگر ۲۹ ویں کا ہوتا ہے تو، ۲۷ ویں اور ۲۸ کو چھپا رہتا ہے۔

(۴) اڑ کے جاتا کہاں ؟ کہ تاروں کا ٭ آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مطلب :- تو بھلا کہاں جا سکتا تھا! آسماں نے تو ستاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔

(۵) مرحبا اے سرورِ خاص خواص ٭ حبذا اے نشاطِ عامِ عوام !

(۶) عذر میں تین دن نہ آنے کے ٭ لے کے آیا ہے عید کا پیغام

حبذا بھی مرحبا کی طرح کلمہ تحسین و تبریک ہے۔

مطلب :- اے خواص کے لیے باعثِ سرورِ خاص اور اے عوام کے لیے موجبِ نشاطِ عام ! تیرا آنا مبارک ہو! کیونکہ تو عید کی مسرت لے کر آیا ہے۔

(۷) اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا ٭ صبح جو جاوے اور آوے شام

مطلب :- مثل مشہور ہے "صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے "، شاعر نے اس مثل کو نہایت بر محل صرف کیا ہے کیونکہ چاند صبح کو غائب ہو کر شام کو نمودار ہو جاتا ہے۔

(۸) ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا ٭ تیرا آغاز اور ترا انجام

مطلب :- تیرے طرزِ عمل سے سب کو تیرا آغاز اور انجام معلوم ہو گیا۔ کہ تو اسی طرح ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال بنتا رہتا ہے۔

(۹) رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے ٭ مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

(۱۰) جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ٭ ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام

مطلب :- تو اپنے دل کی بات (اپنی اُمید گاہ) مجھ سے ناحق چھپاتا ہے۔ میں

چیلنجر ہر گز نہیں ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ آج دنیا میں عوام (انام) کی امیدگاہ ایک ہی ہے۔

(۱۱) میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش ☆ غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام!
(۱۲) جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو ☆ تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مطلب:۔ میں نے مانا کہ تو اس کا حلقہ بگوش (غلام) ہے تو کیا میں اُس (ممدوح) کا غلام نہیں ہوں؛ میں جانتا ہوں کہ تو اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ اسی لیے میں نے بطرزِ استفہام اس صداقت کا اظہار کیا ہے۔

(۱۳) مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ ☆ قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
(۱۴) تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا ☆ جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

مطلب:۔ اے چاند! اگر آفتاب کو ممدوح کی بارگاہ کا ہمیشہ ہر روز قرب حاصل ہو تو بجا ہے۔ لیکن تجھکو عید کے علاوہ اور کسی دن روشناسی (باریابی) کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۱۵) جانتا ہوں کہ اسکے فیض سے تو ☆ پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
(۱۶) ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون ☆ مجھ کو کیا بانٹ دیگا تُو انعام
(۱۷) میرا اپنا جُدا معاملہ ہے ☆ اور کے لین دین سے کیا کام

مطلب:۔ میں جانتا ہوں کہ ممدوح کے فیض وکرم سے تو پھر بدرِ کامل بنا چاہتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تو ماہ بن! ماہتاب بن! میں تیرے معاملہ میں دخل دینے والا کون؛ تو اپنے انعام میں سے مجھے تو کچھ نہیں بانٹ دے گا! مجھے تیرے اوپر رشک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے بھی انعام ملے گا۔

(۱۸) ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص ☆ گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

(۱۹) جو کہ بخشیگا تجھ کو فرّ فروغ ٭ کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

مطلب :- اگر تجھے رحمت عام کی توقع ہے تو مجھے عطیۂ خاص کی آرزو ہے۔ جو تجھے روشنی عطا کرے گا، کیا مجھے چاندنی رات میں شراب پینے کو نہ دے گا؟

(۲۰) جبکہ چودہ منازلِ فلکی ! ٭ کر چکے قطع، تیری تیزیٔ گام

(۲۱) تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر ٭ کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

(۲۲) دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز ٭ اپنی صورت کا اک بلوریں جام

مطلب :- جب تو چودہ منازل فلکی طے کر کے چودھویں کا چاند بن جائے گا۔ اور تیری روشنی سے کوچہ و محلات و صحن و در و دیوار و بام سب منوّر ہو جائیں گے تو اپنی تیری صورت کے بلوریں جام میں شراب نوش کروں گا۔

(۲۳) پھر غزل کی روش پہ چل نکلا ٭ توسنِ طبع چاہتا تھا لگام!

لگام چاہتا تھا یعنی لگام کا اشارہ چاہتا تھا۔ اشارۂ لگام کنایہ ہے بادہ و جام سے جس کا ذکر اس سے پہلے شعر میں گذرا۔

مطلب :- چونکہ اس شعر میں بادہ و جام کا ذکر آ گیا اس لیے میری طبیعت غزل سرائی کی طرف مائل ہو گئی۔

غزل

(۲۴) زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام ٭ تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مطلب :- میں تو تیرے غم میں خود ہی تمام ہو چکا تھا تو نے مجھے قتل کر کے بے فائدہ بدنامی کیوں مول لی!

(۲۵) مئے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

مطلب :- مرزا نے محاورے سے خوب فائدہ اٹھایا ہے "زندگی حرام ہو گئی"

بمعنی زندگی میں کچھ مزہ باقی نہیں رہا۔ لیکن حرام کے معنی ناجائز اور ممنوع کے بھی ہیں اور شراب کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے ایہام کا لطف پیدا ہو گیا کہتے ہیں کہ یہ مانا کہ شراب حرام ہے مگر جب زیست بھی حرام ہو گئی ہے تو پھر شراب کیوں نہ پئیں؟ اس سے غم تو غلط ہو جائے گا یعنی زیست تو حرام نہ ہو گی۔

(۲۶) بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے ٭ کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

مطلب:۔ ان سے بوسہ کی توقع تو کہاں ہے۔ یہی غنیمت ہے کہ وہ اس بات سے آگاہ نہ ہوں کہ مجھے ان کی گالیوں میں بھی مزہ آتا ہے۔ ورنہ وہ گالیاں دینی بھی بند کر دیں گے۔

(۲۷) کعبہ میں جا، بجائیں گے ناقوس
ابتو باندھا ہے دیر میں احرام

مطلب:۔ ہم تو آزاد طبیعت رکھتے ہیں جس طرح بتخانہ میں احرام باندھ لیا ہے۔ اسی طرح کعبہ میں جا کر سنکھ بجائیں گے۔ یعنی ہم کفر اور اسلام دونوں سے بے نیاز ہیں۔

(۲۸) اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ دام

دام بمعنی قرض + مطلب:۔ مجھے وہ شرابِ معرفت میسر ہے جس کی بدولت یہ چرخ گردش (رقص) کر رہا ہے۔

(۲۹) بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار
دِل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

مطلب:۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ جن کو دل لینے کی ضد تھی، انہیں

بوسہ دینے سے انکار ہے۔

(۳۰) چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے ❊ کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

مطلب:- ہوں تو میں مغلوب مگر میں نے اپنا نام غالب اس لیے رکھا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ غالب تو ہم ہیں نہ کہ تو۔ لہٰذا وہ مجھ پر ناراض ہوں گے۔ اور مجھے اس میں لطف آئیگا۔

(غزل ختم شد)

(۳۱) کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تُو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے! جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

ناصیہ سا۔ سجدہ کرتے ہیں + بہرام یعنی مریخ۔

مطلب:- اب پھر ہلال عید سے خطاب کرتے ہیں کہ اے پری چہرہ قاصدِ تیز رو! وہ کون ہے جس کے در پہ مہ و مہر و زہرہ و مریخ سب ناصیہ سا ہیں؟

(۳۲) تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن ❊ نامِ شاہنشہ بلند مقام

(۳۴) قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ ❊ مظہرِ ذوالجلال والاکرام

مطلب:- اگر تو نہیں جانتا تو میں اس شہنشاہ بلند مقام کا نام بتاتا ہوں ان کا نام نامی بہادر شاہ ہے جو قبلۂ چشم و دل ہیں اور خدائے ذوالجلال والاکرام کے مظہر ہیں۔

(۳۵) شہسوارِ طریقۂ انصاف ❊ نو بہارِ حدیقۂ اسلام

مطلب:- وہ طریقۂ انصاف کے شہسوار یعنی بہت عادل ہیں اور دینِ اسلام کے باغ کی تازہ بہار ہیں۔

(۳۶) جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز ❊ جس کا ہر قول، معنیٔ الہام

مطلب :- ممدوح کا ہر فعل اپنے اندر اعجاز (کرامات) کا رنگ رکھتا ہے اور اس کا ہر قول الہامی معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر میں غالب نے لفظی خوبیاں بھی جمع کر دی ہیں مثلاً فعل اور قول، صورت اور معنی۔

(۳۷) بزم میں میزبانِ قیصر و جم ؛ رزم میں اوستادِ رستم و سام

مطلب :- اس کی محفل میں ایسے نامور بادشاہ مہمان ہوتے ہیں جو مرتبے کے لحاظ سے اپنے زمانے کے قیصر اور جمشید ہیں اور میدانِ جنگ میں رستم اور سام جیسے بہادر اس سے فنونِ جنگ سیکھتے ہیں۔

(۳۸) اے ترا لطف، زندگی افزا ؛ اے ترا عہد، فرخی فرجام

مطلب :- اے ممدوح تیرا لطف زندگی بڑھانے والا ہے اور تیرا عہدِ حکومت مبارک انجام ہے۔

(۳۹) چشم بد دور خسروانہ شکوہ ؛ لوحش اللہ، عارفانہ کلام،

(۴۰) جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم ؛ جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

لوحش اللہ یہ دراصل لا اوحشہ اللہ کا مخفف ہے جس کا مطلب ہے اللہ اسے تباہ نہ کرے یا اللہ اس سے رنج و غم دور کر دے۔ لیکن یہ کلمۂ تحسین و آفرین بھی ہے اور یہاں اسی معنی میں مستعمل ہے + مرشدِ جام سے عارفِ جامی (مولانا عبدالرحمٰن) مراد ہیں۔ اسی لیے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں "عارفانہ کلام" لائے ہیں۔ دونوں شعروں میں لف و نشر مرتب ہے۔

مطلب :- خدا تیرے شکوہِ خسروانہ کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے کیونکہ قیصرِ روم تیرے ادنیٰ خدام میں سے ہے اور سبحان اللہ تیرا عارفانہ کلام اس پایہ کا ہے کہ عارفِ جامی جیسے اکابر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

(۴۱) وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے ؛ ایرج و تور و خسرو و بہرام

(۴۲) زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے ؛ گیو، گودرز، بیژن و رہّام

مطلب :- قدیم ایران کے نامور بادشاہ تجھے وارثِ ملک تسلیم کرتے ہیں اور قدیم ایران کے نامور پہلوان تیری جسمانی طاقت کا لوہا مانتے ہیں۔

(۴۳) مرحبا! موشگافیٔ ناوک ؛ آفریں! آبداریٔ صمصام

(۴۴) تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف ؛ تیغ کو تیری، تیغِ خصم، نیام

مطلب :- دونوں شعروں میں لف و نشر مرتب ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرے تیر کی موشگافی کا یہ عالم ہے کہ دشمن کے تیر کو نشانہ بناتا ہے۔ اور تیری تلوار کی آبداری کا یہ عالم ہے کہ دشمن کی تلوار کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ "نیام" سے اس طرف اشارہ ہے کہ تیری تلوار دشمن کی تلوار کے جگر میں اس طرح داخل ہوتی ہے جس طرح نیام میں۔

(۴۵) رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند ؛ برق کو دے رہا ہے کیا الزام

(۴۶) تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا ؛ تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

مطلب :- تیرے عظیم الجثہ ہاتھی کی چنگھاڑ نے رعد کا دم بند کر دیا یعنی اس کے سامنے رعد دم بخود ہے۔ اور تیرے تیز رفتار گھوڑے نے برق کی تیزی (سرعت) کو مات کر دیا۔

(۴۷) فنِّ صورت گری میں تیرا گرز ؛ گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

(۴۸) اس کے مضروب کے سر و تن سے ؛ کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

ادغام کہتے ہیں ایک حرف کو دوسرے حرف میں اس طرح ملا دینا کہ دونوں مل کر ایک حرف بن جائیں۔ مثلاً شب پر کا تلفظ شپّر کرتے ہیں۔ کیونکہ بے، پے میں مدغم ہو گئی۔ مطلب :- تیرا گرز، صورت گری میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مضروب کے سر کو اس کے سینے میں اس طرح دھنسا دیتا ہے کہ

سر اور تن (سینہ) دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں یعنی ادغام کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۴۹) جب ازل میں رقم پذیر ہوئے ؛ صفحہ ہائے لیالی و ایام
(۵۰) اور ان اوراق میں بکلک قضا ؛ مجملاً مندرج ہوئے احکام
(۵۱) لکھدیا شاہدوں کو، عاشق کش ؛ لکھدیا عاشقوں کو، دشمن کام
(۵۲) آسماں کو کہا گیا کہ کہیں ؛ گنبدِ تیز گرد نیلی فام
(۵۳) حکمِ ناطق لکھا گیا کہ کہیں ؛ خال کو دانہ اور زلف کو دام
(۵۴) آتش و آب و باد و خاک نے لی ؛ وضع سوز و نم و رم و آرام
(۵۵) مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز ؛ ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

مطلب:- جب پیدائشِ عالم سے پہلے، راتوں اور دنوں کے صفحات پر کارکنانِ قضا و قدر نے تمام احکام (واقعات) مجملاً تحریر کئے تو معشوقوں کے لیے یہ لکھا کہ وہ ہمیشہ عاشقوں کو قتل کرتے رہیں گے۔ اور عاشقوں کے لیے یہ لکھا کہ وہ دشمنوں کی آرزو کے مطابق برباد ہوتے رہیں گے۔ آسمان ہمیشہ گردش کرتا رہے گا۔ اور شعرا تل کو ہمیشہ دانہ اور زلف کو ہمیشہ جال سے تعبیر کیا کریں گے اور آگ ہمیشہ جلایا کرے گی، پانی ہمیشہ بہا کرے گا، ہوا ہمیشہ چلا کرے گی۔ اور خاک ہمیشہ ساکن رہے گی، چمکیلے سورج کو ہمیشہ دن کا بادشاہ اور روشن چاند کو ہمیشہ رات کا کوتوال (حاکم) کہا کریں گے۔

(۵۶) تیری توقیعِ سلطنت کو بھی ؛ دی بدستور صورتِ ارقام
(۵۷) کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم ؛ اس رقم کو دیا طرازِ دوام
(۵۸) ہے ازل سے روانیِ آغاز ؛ ہو ابد تک رسائیِ انجام

بعض نسخوں میں روانی کے بجائے "روائی" درج ہے ۱۲

مطلب:- اسی طرح کارکنانِ قضا و قدر نے سلطنت (حکمرانی) کا فرمان

تیرے نام لکھا اور حکم خداوندی کے بموجب لکھ دیا کہ تو ہمیشہ حکمرانی کرتا رہے گا۔ لہٰذا میں دعا دیتا ہوں کہ تیری حکومت جو ازل سے شروع ہوئی ہے، ابد تک قائم رہے۔

قصیدۂ چہارم

(۱) صبحدم دروازۂ خاور کھلا ٭ مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خاور بمعنی مشرق + منظر بمعنی دریچہ +

مطلب :۔ صبح کے وقت مشرق کا دروازہ کھلا۔ گویا آفتاب عالمتاب کے ظاہر ہونے کے لیے دریچہ کھل گیا۔ یعنی آفتاب طلوع ہوا۔

(۲) خسروِ انجم کے آیا صرف میں ٭ شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

گنجینۂ گوہر بمعنی موتیوں کا خزانہ۔ کنایہ ہے ستاروں سے + خسروِ انجم بمعنی ستاروں کا بادشاہ۔ کنایہ ہے آفتاب سے۔

مطلب :۔ رات کو ستاروں کا جو خزانہ کھلا تھا وہ سب آفتاب نے خرچ کر دیا۔ یعنی صبح ہوئی تو سب ستارے غائب ہو گئے۔

(۳) وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود ٭ صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

سیمیا ایک فن ہے جس کی بدولت غیر موجود اشیا، موجود نظر آتی ہیں۔

مطلب :۔ صبح کے وقت چاند اور ستاروں کی حقیقت واضح ہو گئی۔ کہ دراصل ان کی نمود سیمیا وی تھی یعنی درحقیقت ان کا کوئی وجود نہ تھا۔

(۴) ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر، کھلا

کھلا دھوکا بمعنی صریحی دھوکا +

مطلب :۔ ستارے دراصل معدوم ہیں مگر موجود نظر آتے ہیں۔ گویا یہ بازیگر ہمیں کھلا ہوا (علانیہ) دھوکا دیتے ہیں۔

(۵) سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو ❊ موتیوں کا ہر طرف زیور، کھلا

مطلب :۔ رات کے وقت، سطحِ آسمان پر، موتیوں کا زیور، ہر طرف کھلا پڑا تھا، یعنی ہر طرف ستارے جگمگا رہے تھے۔

(۶) صبح آیا، جانبِ مشرق نظر ❊ اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا

(۷) تھی نظر بندی، کیا جب ردِّ سحر ❊ بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

(۸) لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے ❊ رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

ردِّ سحر بمعنی جادو کے اثر کو زائل کرنا ۔ صبوحی بمعنی وہ شراب جو صبح کے وقت پیتے ہیں۔

مطلب :۔ صبح کے وقت مجھے مشرق کی طرف ایک سُرخ رنگ والا معشوق نظر آیا جو برہنہ سر تھا یعنی اس کے سر پر کوئی چادر نہ تھی۔ چونکہ یہ فریبِ نظر تھا اس لیے جب میں نے اس جادو (سحر) کا توڑ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دراصل سُرخ شراب کا ساغر ہے یعنی ساقی نے صبح کے وقت شراب پینے کے لیے ایک سنہری جام میرے سامنے رکھ دیا ہے۔

(۹) بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ ❊ کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

(۱۰) تاجِ زریں، مہرِ تاباں سے سوا ❊ خسروِ آفاق کے مونھ پر کھلا

مطلب :۔ جب صبح ہوئی تو بزمِ شاہی آراستہ ہوئی یعنی دربارِ عام منعقد ہوا۔ اور بادشاہ سلامت جب تاجِ شاہی زیب سر کر کے تخت پر رونق افروز ہوئے تو وہ تاج اُن کے مونھ پر مہرِ تاباں سے بڑھ کر کھلا یعنی آفتاب سے بڑھ کر اُن کے چہرے پر زیب دیتا تھا۔

(۱۱) شاہِ روشن دل، بہادر شہ کہ ہے ❊ رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

مطلب:۔ بہادر شاہ ایسا روشن ضمیر بادشاہ ہے کہ ہستی کا سارا راز اس پر منکشف ہے۔ گویا یہ انکشافِ رازِ ہستی اس کی روشن دلی کی دلیل ہے۔

(۱۲) وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں ❊ مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

نُہ چرخ و ہفت اختر سے کائنات مراد لی ہے۔

مطلب:۔ ممدوح کی شان یہ ہے کہ اس کی تخلیق (صورتِ تکوین) سے اس کائنات کی تخلیق کا مقصد واضح ہو گیا یعنی یہ کائنات اسی کے لیے بنائی گئی ہے۔

(۱۳) وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے ❊ عقدۂ احکامِ پیغمبر ؐ کھلا

تاویل بمعنی توضیح و تشریح + احکامِ پیغمبرؐ سے شریعتِ اسلامی مراد ہے۔ عقدہ بمعنی گرہ۔ یہاں اس سے مشکل مسائل مراد ہیں۔

مطلب:۔ ممدوح کے علم و فضل کا یہ عالم ہے کہ اس نے شریعت کے تمام مشکل مسائل حل کر دیئے ہیں۔

(۱۴) پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام ❊ اسکے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

(۱۵) روشناسوں کی جہاں فہرست ہے ❊ واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

مطلب:۔ جب ممدوح کے سپاہیوں کا رجسٹر کھولا گیا۔ تو پہلا نام دارا کا نکلا۔ یعنی دارا جیسے بادشاہ اس کی فوج میں ملازم ہیں۔ اور اس کے خدام کی فہرست میں قیصر کا حلیہ درج ہے یعنی قیصر جیسے بادشاہ اس کے خادموں میں سے ہیں۔

(۱۶) توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ❊ تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

(۱۷) نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب ❊ تو کہے، بتخانۂ آذر کھلا!

توسن بمعنی گھوڑا + تھان بمعنی اصطبل + غیرتِ صرصر یعنی ہوا سے بھی

زیادہ تیز + نو کہے بمعنی گویا + آذر، حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام ہے جو بُت گری میں ماہر تھا +

مطلب:۔ بادشاہ کے گھوڑے میں یہ خوبی ہے کہ جب وہ تھاں سے کھلا تو اس کے نقوشِ قدم سے سیکڑوں تصویریں بنتی چلی گئیں۔ نقوشِ قدم کو آذر کے تراشیدہ بتوں سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کا نقشِ پا بہت خوبصورت ہے۔

(۱۸) مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے ٭ منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

مطلب:۔ بادشاہ کی تربیت کے فیض سے مجھ کو سورج، چاند اور محورِ زمین کے منصب یا فرائضِ منصبی یعنی علم الافلاک سے آگاہی حاصل ہوئی۔

(۱۹) لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک ٭ میری حدِّ وسع سے باہر کھلا

مطلب:۔ بادشاہ کی نظرِ کرم سے میری تمام مشکلیں آسان ہو گئیں۔

(۲۰) تھا دلِ وابستہ، قفلِ بے کلید ٭ کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا

یہاں استفہام محض تعجب کے لیے ہے۔ یعنی میں بہت آزردہ خاطر تھا۔ لیکن بادشاہ کی مہربانی سے میری سب پریشانیاں دور ہو گئیں۔

(۲۱) باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار ٭ مجھ سے گر شاہِ سخن گستر، کھلا

مطلب:۔ اگر شاہِ سخن فہم مجھ سے بے تکلف ہو گیا یا اگر وہ میری جانب ملتفت ہوا تو میں اُسے اپنی شاعری کا کمال دکھاؤں گا۔ کھل جانا بمعنی بے تکلف ہو جانا۔

ع راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

(۲۲) ہو جہاں گرمِ غزل خوانی، نفس ٭ لوگ جانیں، طبلۂ عنبر کھلا

مطلب:۔ جس وقت میں غزل خوانی شروع کروں گا تو لوگوں کو یہ محسوس ہو گا کہ

عنبر کا صندوقچہ کھل گیا۔

غزل

(۲۳) کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا ٭ کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

مطلب :۔ اگر قفس کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا تو میں اس طرح کنج قفس میں نہ بیٹھا رہتا۔

(۲۴) ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ٭ یار کا دروازہ پاویں، گر، کھلا

مطلب :۔ اگر ہم یار کا دروازہ کھلا پائیں تو ہم اندر نہیں جائیں گے (اندر جانا پسند نہیں کریں گے)، کیونکہ اس صورت میں ہمیں کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اندر جانے کا لطف تو جب ہے کہ ہم دستک دیں تو ہمارے لیے فوراً دروازہ کھولا جائے۔

(۲۵) ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ ٭ دوست کا ہے راز، دشمن پر کھلا

مطلب :۔ ہم بھی کتنے سادہ لوح ہیں! ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اس کے رازدار ہیں۔ حالانکہ اس کے سب راز، رقیب پر بھی ظاہر ہیں۔

(۲۶) واقعی دلِ پر بھلا لگتا تھا داغ ٭ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

مطلب :۔ کھلنا بمعنی زیب دینا۔ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا داغِ دل بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مگر جب اس نے ہمارے دل پر زخم لگایا، تو وہ اس داغ سے بھی بہتر معلوم ہوا۔

(۲۷) ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان ٭ کب کمر سے غمزے کی، خنجر کھلا

مطلب :۔ اس کی ابرو ہمیشہ تیر برساتی رہتی ہے اور اس کا غمزہ ہمیشہ دل میں خنجر چبھوتا رہتا ہے۔

(۲۸) مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ ٭ رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

مطلب :۔ جب رہبر کا ساتھ ہُوا تو معلوم ہُوا کہ وہ خود منزل سے ناواقف ہے۔ لیکن مفت کا رہبر (بدرقہ) کسے بُرا معلوم ہوتا ہے! ہم نے سوچا چلو رہبر نہ سہی ساتھی ہی سہی۔

(۲۹) سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی، مینہہ اگر دم بھر کھلا!

مطلب :۔ آنسوؤں کی بارش سے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔ اگر دم بھر کے لیے بھی آنسو رک جائیں تو آگ اور زیادہ بھڑکنے لگتی ہے۔

(۳۰) نامہ کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ ٭ رہ گیا خط، میری چھاتی پر کھلا

مطلب :۔ چونکہ محبوب کا خط اور پیامِ موت دونوں بیک وقت آ گئے اس لیے نامۂ محبوب میرے سینے پر کھلا کا کھلا رہ گیا، پڑھ ہی نہ سکا۔ محاکات کے اعتبار سے بہت خوب شعر کہا ہے۔ صرف ایک مصرع میں عاشق کی ناکامی اور نامرادی کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

(۳۱) دیکھیو! غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی ٭ ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

مطلب :۔ خبردار! اگر غالبؔ سے کوئی اُلجھا! کیونکہ وہ بظاہر کافر (بے دین) ہے مگر دراصل خدا رسیدہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ناراض ہو کر بددعا دے بیٹھے۔

(غزل ختم شد)

(۳۲) پھر ہُوا مدحت طرازی کا خیال ٭ پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

یہاں سے پھر مدح شروع ہو گئی۔ "مہ و خورشید کا دفتر کھلا" کنایہ ہے قصیدے کے اشعار سے جو حسن اور دلکشی میں مثلِ ماہ و خورشید ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ کنایہ بھی مہ و خورشید سے کم نہیں ہے۔

مطلب :۔ پھر مجھے مدحت طرازی کا خیال آ گیا یعنی پھر قصیدہ شروع ہو گیا۔

(۴۳) خامہ نے پائی طبیعت سے مدد ٭ بادباں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا

دوسرے مصرع کی نثر یوں ہو گی "لنگر اٹھتے ہی، بادبان بھی کھل گیا۔ بعض نسخوں میں دُوسرا مصرع یوں لکھا ہے "بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا" لیکن یہ غلط ہے کیونکہ لنگر اٹھایا جاتا ہے کھولا نہیں جاتا۔ ہاں، بادبان کھولا جاتا ہے۔ طبیعت کو بادبان اور خامہ کو لنگر فرض کیا ہے۔

مطلب:۔ جب ہاتھ میں قلم لیا تو طبع موزوں نے اس کی امداد کی۔ یعنی مضامینِ عالیہ، قلم کے ذریعہ سے زینتِ قرطاس بننے لگے۔ اِس بات کو یُوں ادا کیا ہے کہ جیسے لنگر اُٹھتے ہی بادبان بھی کھل جاتا ہے اسی طرح قلم اُٹھاتے ہی طبیعت بھی کھُل گئی!

(۴۴) مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ ٭ عرض سے یاں رُتبۂ جوہر کھلا

عرض اور جوہر، فلسفہ کی اصطلاحیں ہیں جن کی تشریح ہو چکی ہے "عرض" کنایہ ہے مدح سے۔ "جوہر" کنایہ ہے جوہر ذاتِ ممدوح سے۔ عرض کے دو معنی ہیں۔ (۱) جوہر کا مقابل (۲) بیان یعنی مدح + جوہر کے بھی دو معنی ہیں (۱) عرض کا مقابل (۲) جوہر ذاتِ ممدوح یعنی ممدوح کی ذاتی خوبیاں +

مطلب:۔ میری مدح سے ممدوح کی ذاتی خوبیاں عیاں ہو گئیں، اور یہ بات بالکل صحیح ہے کیونکہ جوہر کا رتبہ تو عرض ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے مصرع میں غالب نے اپنی جودتِ طبع کا ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ کیونکہ جوہر وہ ہے جو قائم بالذات ہو۔ اور عرض وہ ہے جو قائم بالغیر ہو یعنی جوہر کی بدولت قائم ہو۔ اگر دُنیا میں عرض کا وجود نہ ہو تو جوہر کی قدر و قیمت یا اس کی نضیلت کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتی۔ شاعر نے جوہر کے مذکورہ بالا دونوں مفہوموں کو کیسی خوبصورتی سے ثابت کر دیا!

(۳۵) مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا ؛ بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

چکّر کھا گیا یعنی مضطرب یا حواس باختہ ہوگیا + لفظ "چکّر" میں دوسری خوبی یہ ہے کہ چکّر اور چرخ میں معنوی اشتراک ہے یعنی چرخ کے دو معنی ہیں۔ (۱) آسمان (۲) چکّر۔

مطلب:۔ جب بادشاہ کے لشکر کا علم (رایت) کھلا تو اس کی ہیبت سے سورج کانپنے لگا۔ اور آسمان چکّر کھانے لگا یعنی حواس باختہ ہوگیا۔ اگر اس خیال کو بھی مدِنظر رکھا جائے کہ قدما، گردشِ افلاک کے قائل تھے، تو مضمون کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

(۳۶) بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب ؛ اب علوِ پایۂ منبر کھلا

مطلب:۔ منبر کی عظمت کا سبب یہ ہے کہ خطیب اس پر بیٹھ کر بادشاہ کا نام لیتا ہے۔

(۳۷) سکۂ شہ کا ہُوا ہے رُوشناس ؛ اب عیارِ آبروئے زر کھلا

مطلب:۔ سونے کی آبرو کی کسوٹی (وجہ) یہ ہے کہ بادشاہ کا سکّہ اس پر نقش ہے۔

(۳۸) شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ ؛ اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

مطلب:۔ سکندر نے آئینہ محض اس لیے بنایا تھا کہ ممدوح کی آئینہ داری (خدمت) کر سکے۔

(۳۹) ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے ؛ اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

طغرل + سلجوقی خاندان کا پہلا فرمانروا تھا + سنجر۔ اسی خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا۔ بڑا صاحبِ جاہ و جلال اور علما کا قدردان تھا۔

مطلب:۔ طغرل اور سنجر لوگوں کو فریب دیکر بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ دراصل

بادشاہی ممدوح کا حق ہے۔ یعنی ممدوح کے سامنے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۴۰) ہو سکے کیا مدح ؛ ہاں اک نام ہے ٭ دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

جہاں داورِ جہاں بمعنی بادشاہِ جہاں ٭

مطلب :- میں نے داورِ جہاں کی مدح میں ایک دفتر لکھ کر اپنا نام اس کے مداحوں کی فہرست میں درج کرالیا ہے۔ دراصل اس کی مدح کا حق مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔

(۴۱) فکر اچھی، پر ستائش ناتمام ٭ عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا

مطلب :- میری فکر تو بہت بلند ہے یعنی اس میں رنگِ اعجاز (معجزہ) پایا جاتا ہے۔ مگر ستائش سے عہدہ برآنہ ہو سکا۔ اس لیے باوجود معجز نگاری میرا عجز ثابت ہے۔ خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ اعجاز میں اپنا عجز ثابت کر دیا۔

(۴۲) جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل ٭ تم پہ اے خاقانِ نام آور، کھلا

مطلب :- چونکہ میں جانتا ہوں کہ تم پر لوحِ ازل کی تمام سرنوشت آشکار ہے اس لیے مجھے اپنا حالِ دل کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۴۳) تم کرو صاحبقرانی، جب تلک ٭ ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

مطلب :- جبتک دنیا قائم ہے خدا کرے تم حکومت کرتے رہو! صاحبقران وہ شخص جس کی ولادت کے وقت زہرہ اور مشتری ایک برج میں جمع ہو جائیں ۱۲

مثنوی در صفتِ انبہ

(۱) ہاں دلِ درد مندِ زمزمہ ساز ٭ کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

"ہاں" کلمۂ تاکید ہے + دوسرے مصرع کے شروع میں لفظ "تو" محذوف ہے

مطلب :- اے دلِ درد مند و زمزمہ سنج! خزانۂ راز کا دروازہ کھول، یعنی

آموں کی صفت بیان کر۔

(۲) خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا ❊ شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا

مطلب:۔ میرے قلم کا صفحہ پر رواں ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی شاخِ گل سے پھول جھڑنے لگیں۔ بالفاظِ دگر، میرے قلم سے شعر نہیں نکلتے، بلکہ پھول جھڑتے ہیں۔

(۳) مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے ❊ نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

مطلب:۔ اے دل! تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا لکھوں! نکتہ ہائے خرد فزا بیان کر۔

(۴) بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ❊ خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے

رطب - معنی کھجور +

مطلب:۔ آموں کی خوبیاں بیان کر اور اس طرح کہ قلم سے کھجوریں و شیریں مضامین ٹپکنے لگیں۔

(۵) آم کا کون مردِ میداں ہے ❊ ثمر و شاخ، گوئے و چوگاں ہے

مردِ میداں بمعنی مقابل، ثمر (آم) کو گیند اور شاخ کو چوگان قرار دیا ہے۔

مطلب:۔ آم کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؛ اس کا ثمر گیند ہے اور اس کی شاخ چوگان ہے جس کا جی چاہے آئے اور مقابلہ کرے۔ "ہمیں چوگاں ہمیں گوئے" محاورہ ہے جس کا مطلب ہے جس کا دل چاہے مقابلہ میں آ جائے۔

(۶) تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں ❊ آئے، یہ گوئے اور یہ میداں

(۷) آم کے آگے پیش جاوے خاک ❊ پھوڑتا ہے جلے پھپھولے، تاک

(۸) نہ چلا جب کسی طرح مقدور ❊ بادۂ ناب بن گیا انگور

(۹) یہ بھی ناچار، جی کا کھونا ہے ❊ شرم سے پانی پانی ہونا ہے

تاک بمعنی انگور کی بیل، نیز انگور۔

مطلب:- اگر انگور کو آم پر فوقیت کا دعویٰ ہے تو شوق سے مقابلہ میں آجائے مگر حقیقت یہ ہے کہ انگور بھی آم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پس یونہی حسد کرتا ہے یعنی اس کی برابری یا اس پر فوقیت کا دعویٰ کر کے گویا اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے۔ اگرچہ مقابلہ کرنے کے لیے وہ بادۂ ناب بن گیا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ شراب بن کر بھی مقابلہ نہ کر سکا۔ بلکہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ خوبی اس اندازِ بیان میں یہ ہے کہ شراب بھی دیکھنے میں پانی ہی معلوم ہوتی ہے۔

(۱۰) مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے ٭ آم کے آگے نیشکر کیا ہے!

(۱۱) نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ٭ جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

مطلب:- حقیقت یہ ہے کہ آم کے سامنے گنا بھی پھیکا معلوم ہوتا ہے علاوہ بریں نہ اس میں پھول ہوتے ہیں نہ شاخیں نہ پتے نہ پھل اور اس کی بہار بھی موسم خزاں میں ہوتی ہے۔

(۱۲) اور دوڑائیے قیاس کہاں ٭ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

(۱۳) جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ٭ کوہکن باوجودِ غمگینی!

(۱۴) جان دینے میں اس کو یکتا جان ٭ پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

جانِ شیریں محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جان جو سب کو عزیز ہوتی ہے شیریں کے دو معنی ہیں (۱) محبوب یا عزیز (۲) فرہاد کی محبوبہ کا نام بھی شیریں تھا

مطلب:- حق تو یہ ہے کہ جانِ شیریں میں بھی یہ مٹھاس نہیں ہے۔ اگر جان میں شیرینی (لذت یا محبوبیت) ہوتی تو فرہاد اگرچہ جان دینے میں (جان نثار کرنے میں) یکتا تھا، مگر پھر بھی اس آسانی سے جان نہ دیتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جان میں شیرینی نہیں ہے۔

(۱۵) نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ٭ کہ دواخانۂ ازل میں مگر
(۱۶) آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام ٭ شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

مطلب :- مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھل دواخانۂ ازل میں تیار کیا گیا۔ بایں طور کہ آتشِ گل (پھولوں کی آگ) پہ قند کا قوام بنایا گیا اور اس قوام (چاشنی) کے تار کا نام ریشہ رکھ دیا گیا۔ آم کے ریشہ کو قوام کے تار سے تشبیہ دی ہے۔

(۱۷) یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے ٭ باغبانوں نے باغِ جنت سے
(۱۸) انگبیں کے بحکمِ ربّ النّاس ٭ بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

رافت یعنی رحمت + انگبیں بمعنی شہد + رب الناس یعنی خدا + آم کے سیاہ موہنہ کو مہر سے تشبیہہ دی ہے +

مطلب :- یا یوں سمجھو کہ بوجہ شفقت خدا کے حکم سے باغبانوں نے جنت سے شہد کے گلاس مہر لگا کر بھیجے ہیں۔

(۱۹) یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات ٭ مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
(۲۰) تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل ٭ ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

نخل عربی میں کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ مگر فارسی والے اِس کو محض درخت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

مطلب :- یا یہ سمجھو کہ خضر نے شاخِ نبات (مصری کی شاخ) زمین میں بوئی اور مدتوں اسے آبِ حیات سے سینچا تب کہیں جاکر اس پر پھل لگا۔ جسے ہم آم کہتے ہیں۔

(۲۱) تھا ترنج زر ایک خسرو پاس ٭ رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس
(۲۲) آم کو دیکھتا اگر اک بار ٭ پھینک دیتا طلائے دست افشار

طلائے دستِ افشار بمعنی خالص سونا جو ہاتھ سے دب جائے یا مُڑ جائے۔

مطلب:۔ خسرو (شاہِ ایران) کے پاس سونے کا ایک ترنج تھا۔ اگرچہ اس کا رنگ پیلا تھا مگر اس میں آم کی سی خوشبو کہاں! اگر وہ آم کو دیکھ پاتا تو اُس کُندن (خالص سونے) کو فوراً اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا اور آم کو اُٹھا لیتا۔

(۲۳) رونقِ کارگاہِ برگ و نوا ⁂ نازشِ دودمانِ آب و ہوا

برگ و نوا کنایہ ہے چمن یا باغ سے اور آب و ہوا کنایہ ہے موسمِ بہار سے

مطلب:۔ آم کیا ہے! باغ کی رونق ہے اور موسمِ بہار کے لیے باعثِ فخر و ناز ہے۔

(۲۴) رہروِ راہِ خلد کا توشہ ⁂ طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

مطلب:۔ آم کیا ہے! وہ توشہ (زادِ راہ) ہے جو جنتی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اور طوبیٰ و سدرہ کا لختِ جگر (محبوب یا پھل) ہے۔

طوبیٰ بمعنی درختِ جنّت ۔ سدرہ بمعنی بیری کا درخت جہاں جبرئیل علیہ السلام کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔

(۲۵) صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ⁂ ناز پروردۂ بہار ہے آم

مطلب:۔ آم کیا ہے، صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے اور ناز پروردۂ بہار ہے۔

(۲۶) خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو ⁂ نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

نوبر بمعنی نیا یا تازہ پھل ۔

مطلب:۔ خصوصاً وہ آم جو ہر کس و ناکس کو نصیب نہ ہو سکے اور باغِ سلطان کا ثمر نو رسیدہ ہو۔

(۲۷) وہ کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد ⁂ عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد

پہلے مصرع میں عہد سے عہد و پیمان مراد ہے اور دُوسرے میں عہد سے زمانہ مراد ہے ۔ یہ شعر گریز کا ہے۔

مطلب :۔ میرا ممدوح ولی عہدِ سلطنت ہے اور اسکا عدل، حامی و محافظِ زمانہ ہے۔

(۲۸) فخرِ دیں، عزّ و شانِ جاہ و جلال ☆ زینتِ طینت و جمالِ کمال

فخرِ دیں کے دو معنی ہیں (۱) ممدوح کا نام مرزا فخر الدین، لقب فتح الملک عرف مرزا فخرو تھا۔ (۲) دین کے لیے باعثِ فخر + ولیعہد مرحوم کی سرکار سے مرزا کو چار سو روپے سالانہ ملتے تھے۔

مطلب :۔ ممدوح دین کے لیے موجبِ فخر ہے اور جاہ و جلال کے لیے باعثِ عزت ہے۔ اس کی ذات، فطرت (طبینت) کے لیے زینت کا اور کمال کے لیے جمال کا سبب ہے۔

(۲۹) کارفرمائے دین و دولت و بخت ☆ چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

مطلب :۔ وہ دین و دولت و بخت کا کارفرما اور تاج و مسند و تخت کا سنوارنے والا ہے۔

(۳۰) سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے ☆ خلق پر، وہ، خدا کا سایہ ہے

مطلب :۔ اگر اس کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو وہ شخص بادشاہ ہو جائے۔ پس یوں سمجھو کہ وہ دنیا والوں کے حق میں ظلّ اللہ (خدا کا سایہ) ہے۔

(۳۱) اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور ☆ جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

(۳۲) اس خداوندِ بندہ پرور کو ☆ وارثِ گنج و تخت و افسر کو

(۳۳) شاد دل، شاد و شادماں رکھیو ☆ اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

مفیض بمعنی فیض پہنچانے والا یعنی خدا + افسر بمعنی تاج +

مطلب :۔ اے خدا کہ تو سایہ اور نور دونوں کے وجود کو فیض پہنچاتا ہے یعنی تو نے دونوں کو وجود عطا کیا ہے۔ جبتک دنیا میں سایہ اور نور کی نمود ہے، میرے ممدوح کو جو بندہ پرور بھی ہے اور وارثِ تخت و تاج بھی ہے، شادماں رکھیو اور مجھ پر مہرباں رکھیو۔

قطعات

(۱)

(۱) اے شہنشاہِ فلک منظر و بےمثل و نظیر ٭ اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل

مثل و نظیر و شبہ و عدیل چاروں مترادف ہیں + فلک منظر یعنی رفیع المرتبت۔

مطلب:۔ اے فلک مرتبہ بے مثل و بے نظیر بادشاہ! اے کرم کرنے والے عدیم المثال جہاندار!

(۲) پاؤں سے تیرے ملے، فرقِ ارادت، اورنگ!
فرق سے تیرے کرے، کسبِ سعادت، اکلیل

مطلب:۔ تختِ شاہی اپنا فرقِ (سر) ارادت، تیرے پاؤں سے ملتا ہے یعنی تیرا خادم ہے۔ اور تاجِ شاہی تیرے سر سے سعادت حاصل کرتا ہے۔ یعنی تیرا سر اس کے لیے باعثِ عزت ہے۔

(۳) تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریلؑ

مطلب:۔ تیرا اندازِ سخن، زلفِ الہام کے لیے بمنزلہ شانہ ہے یعنی تُو اپنے کلام میں الہامی نکتے بیان کرتا ہے اور تیرے قلم کی رفتار گویا جبریلؑ کے بازوؤں کی حرکت ہے۔ یعنی تیرے اشعار میں الہامی رنگ پایا جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں تشبیہہ قابلِ داد ہے۔

(۴) تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیمؑ
تجھ سے دنیا میں بچھا، مائدۂ بذلِ خلیلؑ

مائدہ بمعنی دسترخوان یا خوانِ نعمت + بذل بمعنی خرچ کرنا مراد ہے سخاوت یا فیاضی۔

[مطل]ب:۔ تجھے خدا سے وہی قرب ہے جو حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھا۔ اور تیرے خوان کو دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ کی سخاوت اور مہمان نوازی کی یاد تازہ ہو گئی۔

(۵) بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ ٭ بکرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

داغ نہ بمعنی داغ لگانے والا یعنی شرمندہ کرنے والا۔ ناصیہ بمعنی پیشانی +

مطلب :۔ تُو اپنے کلام کے ذریعہ سے الفاظ اور معانی کے مرتبہ کو بلند کرنے والا ہے اور تُو نے اپنی بخشش کی وجہ سے قلزم اور دریائے نیل کو شرمندہ کر دیا ہے۔

(۶) تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر ٭ تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

(۷) ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر ٭ زہرہ نے ترک کیا، حوت سے کرنا تحویل

توفیر بمعنی فراوانی یا زیادتی یا کثرت، تقلیل بمعنی کمی یا قلت، ثور اور حوت دو بُرجوں کے نام ہیں، تحویل بمعنی تبدیلی، علمِ نجوم کے رو سے جب ماہ، بُرج ثور میں اور زہرہ برج حوت میں ہو تو دُنیا میں عیش و طرب کی فراوانی ہوتی ہے۔

مطلب :۔ تاکہ تیرے عہد میں عیش و طرب کی فراوانی اور رنج و غم کی قلت ہے ماہ نے برج ثور میں اور زہرہ نے بُرج حوت میں مستقل طور سے قیام کر لیا ہے۔

(۸) تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین ٭ تیری بخشش، مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

رہین بمعنی گروی رکھی ہوئی شئی۔ یہاں مراد ہے ذمہ دار یا ضامن، انجاح بمعنی کامیابی

مطلب : تیری عقل میرے مفاسد یا میری خرابیوں یا برائیوں کی اصلاح کی ذمہ دار ہے اور تیری بخشش میرے مقاصد برلانے (میری تمنائیں پوری کرنے) کی کفیل ہے۔

(۹) تیرا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید ٭ تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

غالب نے یہاں لفظ اقبال کو لغوی معنی میں استعمال کیا ہے یعنی رخ کرنا یا ملتفت ہونا

مطلب :۔ میں تیرے کرم کی توجہ سے زندہ ہوں اور اگر تو مجھ سے بے اعتنائی کرے تو میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ دونوں مصرعوں میں صنعتِ ترصیع پائی جاتی ہے یعنی دونوں مصرعوں میں ہم پلہ الفاظ لائے ہیں۔

(۱۰) بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں ٭ چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

(۱۱) پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتہ وقات میں گانٹھ　　پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

(۱۲) تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم　　کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

پیچھے یعنی بعد ازاں ؛ ضابطہ بمعنی قانون ؛ جرِ ثقیل لفظی معنی وزنی شی کو کھینچنا۔ لیکن یہ ایک فن کا نام بھی ہے جس میں وزنی شی کو اُٹھانے کے ضابطے اور قاعدے مدون کئے گئے ہیں

مطلب :۔ اے ممدوح میری بدبختی نے مجھے برباد اور فلک کج رفتار نے مجھے ذلیل کرنا چاہا۔ اس لیے پہلے میرے ناخن تدبیر کی جڑ میں کیل ٹھونکی (پہلے مجھے معذور بنایا) پھر میری زندگی کے دھاگے میں گرہ ڈال دی (ظاہر ہے کہ جس کے ناخن بیکار ہو جائیں وہ گرہ نہیں کھول سکتا) نتیجہ یہ نکلا کہ میں ہر وقت اپنی تباہی کے خیال سے غرض وہ رہتا ہوں اور شدتِ مصائب سے سانس لینی بھی دشوار ہو گئی (سانس لینی گویا وزنی شئ کھینچنا ہے)

(۱۳) دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی　　غمِ گیتی سے مرا سینہ عمرو کی زنبیل

غالب نے لفظِ عمرو کو غلط نظم کر دیا ہے یہ لفظ عُمر نہیں ہے بلکہ عَمْرو ہے۔ چونکہ داستان گو عموماً جاہل ہوتے ہیں اسلئے وہ عَمْرو کا تلفظ عُمر کیا کرتے ہیں۔ چونکہ لفظِ عمرو نہیں بندھ سکتا اور عُمر کہہ نہیں سکتے۔ اس لیے اس کو اُمَر پڑھنا چاہیئے۔

داستان امیر حمزہ میں عَمْرہ بن اُمیہ ایک کردار ہے جس کی زنبیل میں دُنیا جہان کی چیزیں سما جاتی تھیں مگر وہ پر نہیں ہوتی تھی۔ یہ داستان سراسر لغو ہے۔ عمرو کی زنبیل کنایہ ہے کثرت یا معموری سے۔ محض اسی لیے یہ محاورہ استعمال کیا ہے ؛ لقا کی داڑھی میں بال بال موتی پروئے جاتے تھے اسلئے لقا کی داڑھی بھی کنایہ ہے کثرت سے ؛

مطلب :۔ میرے اشعار دُرِ معانی کے اعتبار سے "لقا کی داڑھی" ہیں اور میرا سینہ کثرتِ غمِ گیتی سے عَمْرو کی زنبیل بنا ہُوا ہے۔

(۱۴) فکر میری، گہر اندازِ اشاراتِ کثیر　　کلک میری، رقم آموز عباراتِ قلیل

مطلب :۔ اگرچہ میری تحریر میں الفاظ بہت کم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں معانی کثیر پوشیدہ

ہوتے ہیں۔ یعنی میرے اشعار میں بلاغت کی شان پائی جاتی ہے۔

(۱۵) میرے ابہام پر ہوتی ہے تصدق توضیح میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

ابہام کے لغوی معنی ہیں اخفا یعنی بات کو پردے میں رکھنا یا واضح نہ کرنا :: ابہام ضد ہے توضیح کی :: اجمال ضد ہے تفصیل کی :: ان دو شعروں میں غالب نے بڑی عمدگی کے ساتھ اپنے اندازِ بیان کی خصوصیات واضح کر دی ہیں۔ یعنی وہ اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن میں معانی کثیرہ پوشیدہ ہوتے ہیں اور شعر گوئی میں ابہام و اجمال کو مدّنظر رکھتے ہیں

مطلب :۔ میرا کلام مبہم ہونے کے باوجود واضح اور مجمل ہونے کے باوجود مفصل ہوتا ہے۔

(۱۶) نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

مطلب :۔ اگر میری مالی حالت اچھی ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتا اور اگر مجھے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا تو جلدی نہ کرتا۔ اس شعر میں ابہام اور اجمال سے کام لیا ہے۔ یعنی صاف لفظوں میں بیان نہیں کیا ہے کہ جس بات کی تکلیف نہ دیتا اور جس معاملہ میں جلدی نہ کرتا۔ لیکن اخفا کے باوجود اظہار کا رنگ جھلک رہا ہے یعنی میں مفلس ہوں اس لیے آپ کو جود و عطا کی تکلیف دے رہا ہوں اور حصول انعام میں عجلت سے کام لے رہا ہوں۔

(۱۷) قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

حسن طلب قابل داد ہے :: ڈھیل بمعنی تامل یا بے پروائی ::

مطلب :۔ اے ممدوح! خستہ نوازی میں دیر مت کر اور میری مشکل آسان کرنے میں تامل مت کر۔

(۲)

(۱) گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے

(۲) بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مِل جاؤ
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے

تقریر بمعنی بیان:- پہلے شعر کی نثر یوں ہوگی "وہ دن گئے جب تم نادانستگی میں، ہم سے غیروں کی وفاداری بیان کیا کرتے تھے اور ہم خاموش رہتے تھے۔

مطلب:- معشوق سے ازراہ طنز و شوخی کہتے ہیں کہ وہ دن گئے جب تم ہم سے غیروں کی وفاداری کی تعریف کیا کرتے تھے اور ہم چُپ رہتے تھے۔ آخر تمہارا اُن سے بگاڑ ہو گیا ناحیں تم شرمندہ مت ہو۔ اس قصّے کو جانے دو، ہم سے میل کرلو اور ہم سے قسم لے لو ہم کبھی تمہیں طعنہ نہیں دیں گے کہ کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ اغیار وفادار نہیں ہیں، اپنے مطلب کے یار ہیں۔

(۳)

(۱) کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

(۲) وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

(۳) صبر آزما وہ اُنکی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ انکا اشارہ کہ ہائے ہائے

(۴) وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

مطرا بمعنی تر و تازہ یا خوشبودار :- حف نظر اردو میں بمعنی چشم بددور مستعمل ہے (حفا عربی زبان میں سنوارنے، خدمت کرنے یا مہربانی کے معنوں میں آتا ہے۔ اس مفہوم میں مستعمل نہیں ہوتا :- یہ قطعہ غالب کے قیام کلکتہ کی یادگار ہے۔ اُنھوں نے کلکتہ کا سفر جیسا کہ معلوم ہے، اپنی پنشن کے سلسلہ میں کیا تھا۔ اس قطعہ میں اُنھوں نے اُن چار چیزوں کا

ذکر کیا ہے جو انہیں بہت مرغوب تھیں۔

باغات، بتانِ خود آرا، میوہ ہائے شیریں اور بادۂ ناب۔

مطلب:۔ اس قطعہ میں کوئی شعر مشکل نہیں ہے اس لیے اس قدر کافی ہے کہ اے ہم نشیں! تو نے کلکتے کا ذکر نہیں کیا بلکہ میرے سینے میں تیر مار دیا! جب مجھے وہاں کے تر و تازہ باغات اور حسین عورتیں یاد آتی ہیں تو دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ان کی صبر آزما نگاہیں اور ان کے طاقت ربا اشارے مرتے دم تک نہیں بھول سکتا! وہاں کے لذیذ میوے اور وہاں کی خوش ذائقہ شراب! کیا بات ہے ان نعمتوں کی۔

(۴)

(۱) ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ✽ زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیئے

چکنی ڈلی سے چکنی سپاری مراد ہے۔

مطلب:۔ آپ کی ہتھیلی پر جو یہ چکنی سپاری رکھی ہوئی ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے بجا ہے یہ اچھی اس لیے ہے کہ آپ کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔

(۲) خامہ، انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ✽ ناطقہ، سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

انگشت بدنداں بمعنی حیران ✽ سر بگریباں بمعنی متفکر۔

مطلب:۔ قلم حیران ہے کہ اس کی کیا کیا خوبیاں بیان کرے اور قوت گویائی متفکر ہے اسے کس چیز سے تشبیہہ دے اور کیا کہے۔

(۳) مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے ✽ حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیئے

مطلب:۔ ہم اسے دوستوں کے خط کی مہر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اسے حسینوں کے بازو کا تعویذ بھی قرار دے سکتے ہیں۔

(۴) مسی آلود سر انگشتِ حسیناں لکھیے ✽ سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیئے

مانا بمعنی مشابہ۔ یہ لفظ اُردو محاورے کے خلاف ہے۔
مطلب :- ہم اسے سلیمان کی انگوٹھی سے یا کسی پری کی پستاں کی بھٹنی سے تشبیہہ دے سکتے ہیں (سرِ پستان عموماً سیاہی مائل ہوتے ہیں)

(۶) اخترِ سوختہ قیس سے نسبت دیجئے — خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلیٰ کہئے
مطلب :- ہم اسے مجنوں کے اخترِ سوختہ سے یا لیلیٰ کے چہرے پر سیاہ تل سے تشبیہہ دے سکتے ہیں سوختہ اس لیے کہا کہ جلی ہوئی چیز عموماً سیاہ ہو جاتی ہے۔

(۷) حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض — نافہ، آہوے بیابانِ ختن کا، کہئے
مطلب :- ہم اسے حجرِ اَسْوَد (کالا پتھر جو کعبہ کی دیوار میں نصب ہے) یا آہوئے ختن کا نافہ بھی کہہ سکتے ہیں (مشک کا رنگ بھی سیاہی مائل ہوتا ہے)

(۸) وضع میں اس کو اگر جانیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہئے
مطلب :- اگر شکل یا بناوٹ کے اعتبار سے اسے تریاق کا قاف قرار دیں (قاف بھی سپاری کی طرح گول شکل کا ہوتا ہے) تو رنگ کے اعتبار سے اسے مسیحا کا سبزۂ نو رستہ کہہ سکتے ہیں (اور سبزہ دراصل سیاہ بالوں کو کہتے ہیں)

(۹) صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہئے
مطلب :- اگر اسے عبادت خانے میں سجدہ گاہ قرار دیں تو میکدے میں شراب کے مٹکے کی اینٹ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ ڈلی بہت معزز اور محترم ہے۔

(۱۰) کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے — کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہئے
(۱۱) کیوں اِسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے — کیوں اِسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہئے
(۱۲) کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے — کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہئے
مطلب :- اگرچہ ہم اسے گنجِ محبت اور درِ گنجِ محبت کا قفل یا پرکارِ تمنا کا نقطہ، یا گوہرِ نایاب یا عنقا کی آنکھ کی پتلی یا لیلیٰ کی تلاش کا کھوج یا سلمیٰ کی اونٹنی کا نقش پا کہہ سکتے

ہیں مگر گیہوں کہیں؟

(۱۴) بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض ۔ اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

مطلب:۔ بطرز اختصار کلام، ہم آپ کے کفِ دست کو دل فرض کرتے ہیں اور اس چکنی سپاری کو اس دل کا سویدا قرار دیتے ہیں۔

نوٹ:۔ ۱۸۳۰ء میں جب مرزا کلکتہ میں تھے، ایک مجلس میں شعراء کا ذکر ہو رہا تھا۔ کہ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا "لوگ فیضی کو جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے" اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا جب فیضی پہلی مرتبہ اکبر کے سامنے حاضر ہوا تھا تو اُس نے ڈھائی سو شعروں کا قصیدہ اِسی وقت کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں۔ جو دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر کہہ سکتے ہیں" مخاطب نے ایک چکنی ڈلی جیب سے نکال، ہتھیلی پر رکھی اور کہا کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو مرزا نے تیرہ شعر کا یہ قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔ اُردو شاعروں میں اس قطعہ کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ مرزا نے گیارہ شعروں میں عدیم المثال تشبیہات نظم کی ہیں جن کی تعداد اکیس ۲۱ ہے۔ (یادگارِ غالب)

(۵)

(۱) نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے ۔ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

(۲) نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر ۔ جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

مطلب:۔ اے مخاطب! یہ بیسنی روٹی جو حضور بادشاہ سلامت نے مجھے بھیجی ہے اُس کی لذت تجھے کیا بتاؤں! یہ سمجھ لے کہ ایسی لذیذ روٹی بہشت میں بھی نہیں ہے اگر ہوتی تو آدم بھی کھاتے اور جب اسے ایک مرتبہ کھا لیتے تو پھر گیہوں ہرگز نہ کھاتے اور جب گیہوں نہ کھاتے تو بہشت سے کیوں نکالے جاتے!

سہرا

(۱) خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا ؛ باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

مرزا نے یہ سہرا بہادر شاہ مرحوم کے محبوب فرزند جواں بخت کی شادی کے موقع پر لکھ کر پیش کیا تھا۔ مرزا نے پہلے مصرعہ میں جو محاورہ "ترے سر سہرا" باندھا ہے وہ پورا نہیں بندھا۔ محاورہ میں "ترے سر سہرا" نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں:۔
ترے سر فضیلت کا یا شاعری کا یا سعادت کا سہرا ہے"

چنانچہ ذوق نے پورا محاورہ نظم کیا ہے ع آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

مطلب:۔ اے بخت خوش ہو کہ آج تجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ تو نے شہزادے کے سر پر سہرا باندھا ہے۔

(۲) کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ؛ ہے ترے حسن دل افروز کا زیور، سہرا

مطلب:۔ یہ سہرا تیرے حسین چہرے پر بہت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ سہرا تیرے حسن دلفروز کے حق میں بمنزلہ زیور ہے۔

(۳) سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ ؛ مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

نمبر کو اردو میں لمبر کہتے ہیں۔

مطلب:۔ اے کلاہ! بیشک تجھے شہزادے کے سر پر چڑھنا زیب دیتا ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ سہرا مرتبے کے لحاظ سے تجھ سے اونچا نہ ہو جائے (ظاہر ہے کہ سہرا کلاہ کے اوپر باندھتے ہیں)

(۴) ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی ؛ ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

چونکہ سینی کو کشتی بھی کہتے ہیں اس لیے اس کی رعایت سے پہلے مصرع میں "ناؤ" لائے ہیں

مطلب:۔ چونکہ یہ سہرا کشتی میں رکھ کر لائے ہیں اسلئے معلوم ہوا کہ اس میں ایک ناؤ موتی

(بہت سے موتی اپروئے گئے ہوں گے۔

(۵) سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی ÷ تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

مطلب :- اس انداز سے گز بھر سہرا گوندھنے میں ساتوں سمندروں کے موتی فراہم کئے گئے ہوں گے۔ قافیہ میں محاورہ بہت برمحل صرف ہُوا ہے۔ گز بھر یعنی چھوٹا سا۔

(۶) رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا ÷ ہے رگِ ابرِ گہر بار، سراسر سہرا

پسینہ کی بوندوں کو گوہر سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب :- دولھا کے چہرے پر گرمیٔ حسن کی وجہ سے پسینہ کی جو بوندیں نمودار ہو گئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سہرے کی لڑیاں گویا ابرِ گوہر بار کی رگیں ہیں۔

(۷) یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے ÷ رہ گیا آن کے، دامن کے برابر سہرا

مطلب :- چونکہ سہرا کا قبا سے بڑھ جانا بے ادبی میں داخل تھا اس لیے وہ دامن کے برابر آکر رہ گیا حسن تعلیل قابل داد ہے۔

(۸) جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز ÷ چاہیئے پھولوں کا بھی اک مقرر سہرا

مطلب :- مقرر یعنی ضرور ÷ تاکہ موتی اپنے جی میں نہ اترائیں کہ کوئی ہمارا مدِ مقابل نہیں ہے اس لیے پھولوں کا بھی ایک سہرا ضرور ہونا چاہیئے۔

(۹) جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے ÷ گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکہ سہرا

"اپنے میں نہ سمانا" محاورہ نہیں ہے۔ آپے میں نہ سمانا کہنا چاہیئے۔

مطلب :- پھول خوشی کے مارے اپنے آپے میں نہیں سماتے، اس لیے انہیں گوندھنا بہت دشوار ہے۔

(۱۰) رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک ÷ کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

مطلب :- ایک طرف رُخِ تاباں کی دمک ہے دوسری طرف گوہرِ غلطاں کی چمک ہے گویا سہرا، ماہ (رُخ) اور اختر (گوہر) کی آب و تاب دکھا رہا ہے۔

(۱۱) تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار ٭ لائے گا تابِ گراں بارئ گوہر سہرا

مطلب :- سہرے میں ریشم کا تار نہیں ہے۔ بلکہ ابرِ بہار کی رگ ہے، اس لیے سہرا گراں بارئ گوہر کی تاب لا رہا ہے یعنی موتیوں کے بوجھ کو اُٹھائے ہوئے ہے حُسنِ تعلیل قابلِ داد ہے۔

(۱۲) ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں ٭ دیکھیں، اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

مطلب :- ہم غالب کے طرفدار نہیں ہیں، ہاں سخن فہم ضرور ہیں اس لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اس سے بڑھ کر سہرا نہیں کہہ سکتا۔

---

(۷)

(۱) منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی ٭ اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

مطلب :- اس نظم سے مجھے احوال واقعی کا عرض کرنا منظور ہے، اپنے حُسنِ طبیعت کا حال بیان کرنا منظور نہیں ہے۔ دوسرے مصرع کی بندش اُلجھی ہوئی ہے اس کی نثر یوں ہوگی :- "اپنا بیانِ حسنِ طبیعت مجھے منظور نہیں"

نوٹ :- یہ قطعہ وضاحت طلب ہے۔ ہُوا یہ کہ جب غالب کا سہرا بہادر شاہ مرحوم کی نظر سے گذرا تو مقطع دیکھ کر انہیں یہ خیال ہُوا کہ مرزا نے میرے اُستاد پر چوٹ کی ہے۔ چنانچہ جب ذوقؔ مرحوم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے کہا کہ تم بھی اس کے جواب میں ایک سہرا لکھ دو اور مقطع کے مضمون کو مدِ نظر رکھنا۔ ذوقؔ نے اُسی وقت سہرا لکھ کر پیش کر دیا جس کا مطلع یہ تھا :-

اے جواں بخت! مبارک تجھے سر پر سہرا ٭ آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

اس مطلع میں خوبی یہ ہے کہ محاورہ صحیح نظم کیا ہے۔ مقطع کے تیور ملاحظہ ہوں :-

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سُنا دو ان کو ٭ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور، سہرا

جب مرزا کو اس حادثہ کا علم ہُوا تو فوراً تاڑ گئے کہ یہ سارا ہنگامہ اُس "سخن گسترانہ بات" پر برپا ہُوا ہے جو مقطع میں "آ پڑی تھی۔" اس لیے بادشاہ کے دل سے زنگِ ملال زائل کرنے کے لیے یہ قطعہ موزوں کیا اور حضور میں گذرانا۔

(۲) سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری ؛ کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

مطلب:۔ پشتہا پُشت سے میرے اجداد کا پیشہ سپہ گری چلا آرہا ہے اس لیے میں اپنے بزرگوں کے جنگی کارناموں پر فخر کرتا ہوں، شاعری کو اپنے لیے باعثِ فخر نہیں سمجھتا۔

نوٹ:۔ مرزا کی شوخی ملاحظہ ہو کہ معذرت میں بھی "اُستادِ شہ" پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آئے۔ سب جانتے ہیں کہ ذوق کے آبا و اجداد معمولی حیثیت کے لوگ تھے اور ذوق کو دلی میں جو عزت حاصل تھی وہ محض اِس لیے کہ وہ بادشاہ کے اُستاد تھے۔ یعنی ان کے لیے شاعری ہی ذریعہ عزت تھی۔

(۳) آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صُلحِ کُل ؛ ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مطلب:۔ میں چونکہ ایک آزاد منش آدمی ہوں اور میرا مسلک صُلحِ کُل ہے اس لیے میں کبھی ہرگز کسی سے عداوت نہیں کر سکتا یعنی کسی سے عداوت رکھنا میرے مذہب کے خلاف ہے

(۴) کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ؛ مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

مطلب:۔ میں نے مانا کہ مجھے دنیاوی جاہ و ثروت حاصل نہیں ہے مگر میرے لیے یہ عزت کیا کم ہے کہ میں بادشاہ کا غلام ہوں۔

(۵) اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال ؛ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

مطلب:۔ میری کیا مجال کہ میں بادشاہ کے اُستاد سے پرخاش کا خیال بھی دل میں لاؤں

اس شعر میں بھی طنز کے کئی نشتر پوشیدہ ہیں (۱) ذوق سے پرخاش ممکن ہے مگر اُستادِ شہ سے پرخاش ناممکن ہے (۲) دوسرا مصرع پہلو دار ہے یعنی چاہا ہو تو

اسے طنز پر محمول کر دو۔ چاہو حقیقت کا مظہر سمجھ لو۔

(۶) جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر ؛ سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

مطلب:۔ چونکہ بادشاہ کا دل خود جامِ جہاں نما ہے یعنی اس پر میرے دل کا حال سب روشن ہے۔ اس لیے مجھے قسم کھانے یا گواہ لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے

(۷) میں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدعا ؛ جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

مطلب:۔ کہاں میں کہاں ریختہ گوئی؟ یعنی میں تو دراصل فارسی زبان کا شاعر ہوں اُردو اشعار تو محض آپ کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا کرتا ہوں۔

نوٹ:۔ اس شعر میں بھی درپردہ ذوق پر طنز ہے کیونکہ وہ میدانِ فارسی کے مرد نہیں تھے اور غالب اُردو شاعری کو اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔

(۸) سہرا لکھا گیا زرہٗ امتثالِ امر ؛ دیکھا کہ چارہ، غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مطلب:۔ میں نے یہ سہرا محض نواب زینت محل بیگم (بانوے شاہ) کے حکم کی تعمیل میں لکھا تھا۔ کیونکہ ان کے حکم سے انحراف میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

(۹) مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ؛ مقصود اس سے، قطعِ محبت نہیں مجھے

مطلب:۔ میں نے مقطع میں جو ادعا کیا ہے وہ محض ایک شاعرانہ تعلی ہے یعنی میں نے محض زیبائش کلام کے لیے ایسی بات لکھ دی (شعراء عموماً ایسی تعلیاں کیا کرتے ہیں) اس سے میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں اپنے دوستوں سے تعلقاتِ محبت منقطع کر دوں۔

(۱۰) روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ ؛ سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

مطلب:۔ وہ تعلی یا خودستائی محض ایک امر اتفاقی ہے میں نے دانستہ کسی خاص آدمی پر چوٹ نہیں کی اگر میرا اشارہ کسی خاص آدمی کی طرف ہو تو خدا مجھے روسیاہ کرے بھلا میں کوئی سودائی یا مجنوں یا وحشی ہوں جو ایسی حرکت قبیح کا ارتکاب کرتا۔

دوسرے مصرع کی بندش قابلِ داد ہے۔

(۱۱) قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں ٭ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

مطلب :- یہ مانا کہ میری قسمت بُری ہے مگر میری فطرت بُری نہیں ہے۔ اور میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

نوٹ :- اس شعر میں طنز پوشیدہ ہے کہ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میرے ہنر کی قدر نہ ہوئی ٭

(۱۲) صادق ہوں اپنے قول میں غالب، خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مطلب :- میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میری یہ معذرت صداقت پر مبنی ہے میں نے جو کچھ کہا ہے بالکل سچ ہے کیونکہ مجھ کو جھوٹ بولنے کی عادت ہی نہیں ہے۔

---

(۸)

(۱) نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے اتنی جو ارادت ہے تو کس بات سے ہے

مطلب :- اس شعر میں استفہام، محض تعجب کے اظہار کے لیے ہے اور اس لیے بلاغت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی دراصل شاعر اپنے ممدوح سے کہتا ہے کہ مجھے تجھ سے جو ارادت اور عقیدت ہے یہ انعام و اکرام کی بناء پر نہیں ہے بلکہ محض محبت کی بناء پر ہے اور یہ محبت تیری ذاتی خوبیوں کی وجہ سے میرے دل میں پیدا ہوئی ہے۔

(۲) گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے ٭ رونقِ بزمِ مہ و مہر، تری ذات سے ہے

(۳) اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

دوسرے مصرع میں غالب نے محاورہ غلط باندھ دیا صحیح محاورہ یہ ہے۔
"مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہے۔"

مطلب:۔ تیری شان یہ ہے کہ اگر تو محفل آراستہ کرے یا دربار منعقد کرے تو چاند اور سورج کو بھی تیری ذات سے رونق نصیب ہو جائے اور میں وہ ہوں کہ جب میں اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو خود مجھے اپنی اوقات (زندگی) سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔

(۴) خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست ؛ نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

خستگی بمعنی زخمی ہونے کی حالت و قیاس کہتا ہے کہ ممدوح کا ہاتھ کسی حادثہ میں زخمی ہو گیا ہوگا۔

مطلب:۔ چونکہ میرا دل زخمی ہے اور تیرا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا ہے اس لیے عارضی طور پر (سرِ دست) میرے دل کو تیرے ہاتھ سے ایک گونہ نسبت پیدا ہو گئی ہے۔

نوٹ:۔ یہ مطلب اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ممدوح کا ہاتھ زخمی ہو گیا ہو گا۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ ممدوح کے ہاتھ کی خستگی کا بھلا چاہنا یعنی اس کی زحمت میں اپنے لیے راحت کا پہلو تلاش کرنا، آئینِ مدحت سرائی کے سراسر منافی ہے

اگر اس مفروضہ کو غلط قرار دیا جائے اور خستگی کو اپنے دل سے متعلق سمجھا جائے، تو پھر بقول نظم طباطبائی "کوئی صاف معنی مصنف کی عبارت سے ہرگز نہیں نکلتے"، بڑی کھینچا تانی کے بعد یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ خدا میرے دل کی خستگی کا بھلا کرے جس کی بدولت تیرا ہاتھ میرے زخمِ دل کے اندمال میں مصروف ہے یعنی تو اپنے ہاتھ سے میرے زخم پر مرہم لگا رہا ہے۔ اس طرح میرے دل کو تیرے ہاتھ سے ایک نسبت پیدا ہو گئی۔

اگر خستگی سے خستہ حالی یعنی مُفلسی مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ خدا میری مُفلسی کا بھلا کرے جس کی بدولت تیرا ہاتھ (دستِ کرم) میری طرف بڑھا یعنی تو میری امداد پر آمادہ ہُوا۔ یہ تیسرا مطلب بہتر معلوم ہوتا ہے۔

(۵) تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو، شرف، خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

مطلب:۔ اگرچہ مجھے خضر سے ملاقات کا بھی شرف حاصل ہے لیکن چونکہ تو مرتبہ کے لحاظ سے سکندر ہے اس لیے تیرا مِلنا یعنی تجھ سے ملاقات میرے لیے باعثِ فخر و مباہات ہے۔

نوٹ:۔ نظم طباطبائی نے خضر سے شہزادہ خضر سلطان فرزند بہادر شاہ مرحوم اور جوش ملسیانی نے خود بہادر شاہ مغفور مراد لی ہے لیکن یہ سب قیاسی باتیں ہیں کیونکہ یہ متحقق نہیں ہو سکا کہ (نصرت الملک) سے کون شخص مراد ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ نصرت الملک، اکبر شاہ ثانی کے وزیر کا نام تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ نصرت الملک، بہادر شاہ کے کسی فرزند کا نام تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۶) ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر، قاضیِ حاجات سے ہے

قاضی الحاجات بمعنی حاجتیں پوری کرنے والا یعنی خدا

مطلب:۔ دن رات خدا سے یہ دعا ہے کہ تیرا اقبال اور مرتبہ ہمیشہ برقرار رہے۔ توسنِ دولت کی عناں (دولت کے گھوڑے کی باگ) سے ثروت اور جاہ و مرتبہ مراد ہے۔

(۷) اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالب خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے

ریو وریا بمعنی چاپلوسی، عیاری، مکاری ؛ اہل خرابات بمعنی رندانِ قدح خوار

مطلب :- ریو وریا کا گمان تو زاہدوں اور عابدوں پر ہو سکتا ہے غالب تو مے نوشوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس پر خوشامد یا ریاکاری کا گمان نہیں ہو سکتا یعنی میں نے آپ کی مدح، ارادت کی بنا پر کی ہے نہ کہ انعام و اکرام کی توقع پر۔

---

(۹)

(۱) ہے چہار شنبہ، آخر ماہِ صفر، چلو ؛ رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

(۲) جو آئے، جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست ؛ سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

مطلب :- آج آخری چہار شنبہ ہے۔ آؤ چمن میں شراب کی ناند بھر کر رکھ دیں، تاکہ جو آئے، جام بھر کے پیئے اور مست ہو کر سبزے کو روندتا پھرے اور پھولوں کو پھاند جائے یعنی بیخود ہو کر باغ میں اُچھل کود کرنے لگے۔

(۳) غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدح بادشاہ ؛ بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

مطلب :- اے غالب! اس بیان کو چھوڑو، مجھے بادشاہ کی مدح کے علاوہ اور کوئی بات پسند نہیں ہے یعنی تشبیب ختم کرو، مدح شروع کرو۔

(۴) بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر، مہر و ماہ، ماند

مطلب :- آج بادشاہ سلامت کے حکم سے سونے چاندی کے چھلے تقسیم ہو رہے ہیں جن کی چمک دمک کے سامنے مہر و ماہ کا حُسن بھی ماند ہے۔

نوٹ :- چاند کا رنگ چاندی کی طرح روپہلا اور سُورج کا رنگ سونے کی طرح سنہرا ہوتا ہے۔

(۵) یوں جانئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

مطلب :- یوں سمجھو کہ یہ چھلّے نہیں ہیں بلکہ لاکھوں آفتاب اور کروڑوں چاند ہیں جنہیں بیچ میں سے خالی کر دیا ہے۔

نوٹ :- آخری چہار شنبہ کے دن لال قلعہ میں سونے چاندی کے چھلّے تقسیم ہُوا کرتے تھے۔

---

(۱۰)

(۱) اے شاہ جہاں گیر، جہاں بخش، جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

مطلب :- اے جہانگیر، جہاں بخش اور جہاندار بادشاہ! تجھے غیب سے ہر وقت کامیابی اور شادمانی کی بشارت ملتی ہے۔

(۲) جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو ٭ تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

مطلب :- جو عقدۂ دشوار کہ دوسروں کی کوشش سے بھی حل نہیں ہو سکتا، تیرے ایک اشارے سے حل ہو جاتا ہے۔

(۳) ممکن ہے، کرے خضر، سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے، چشمۂ حیواں سے طہارت

مطلب :- ہرگز ممکن نہیں کہ خضر، اپنے لبوں کو آبِ حیات سے پاک کئے بغیر سکندر سے تیرا ذکر کر سکیں۔

(۴) آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں، جو کرے تیری وزارت

مطلب :- آصف کو سلیمان ؑ کی وزارت کی بدولت عزت حاصل ہوئی لیکن تو اس مرتبہ کا بادشاہ ہے کہ (۱) جو شخص تیری وزارت کرے وہ فخرِ سلیمان ہے۔

(۴) اگر سلیمان تیری وزارت کریں تو یہ بات ان کے لیے باعثِ فخر ہے۔

(۵) ہے نقشِ مریدی ترا، فرمانِ الٰہی ٭ ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت

مطلب:۔ جو شخص تیرا مرید بنتا ہے وہ گویا فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرتا ہے اور جو شخص تیری غلامی اختیار کرتا ہے وہ گویا فرمان (توقیع) امارت حاصل کر لیتا ہے۔

(۶) تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلان ٭ تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

(۷) ڈھونڈے نہ ملے، موجۂ دریا میں روانی ٭ باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

مطلب:۔ اگر تو پانی سے بہنے کی طاقت سلب کرے تو دریا کی موجوں سے روانی مفقود ہو جائے اور اگر تو آگ سے نقصان پہنچانے کی طاقت دفع کر دے تو اس میں حرارت ناپید ہو جائے۔

(۸) ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل ٭ ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

(۹) کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر ٭ قاصر ہے ستائش میں تری، مری عبارت

مطلب:۔ گرچہ مجھے نکتہ سرائی اور سحر طرازی (شعر گوئی) میں مہارتِ تامہ (توغل) حاصل ہے مگر میں تیری مدح کرنے سے قاصر ہوں۔ اس لیے مدح کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

(۱۰) نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیٔ صنعتِ حق، اہلِ بصارت!

(۱۱) تجھ کو شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک ٭ غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

نوروز۔ ماہ فروردیں کی پہلی تاریخ جبکہ آفتاب برجِ حمل میں آتا ہے۔ اسی تاریخ سے آفتاب پرست ایرانیوں کا نیا سال شروع ہوتا ہے، اور یہ ان کی عید کا دن ہے عید نوروز ایران کا قومی تہوار ہے ٭ نظارگی بمعنی دیکھنے والے ٭ شرفِ مہر۔ آفتاب کے برجِ حمل میں داخل ہونے کو اصطلاح میں شرفِ مہر کہتے ہیں۔

مطلب:۔ آج نوروز ہے یعنی وہ دن ہے جبکہ اہلِ بصارت (عقل مند لوگ) قدرتِ حق

کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اے ممدوح! تجھ کو شرفِ مہر الخویلِ آفتاب در برج حمل، مبارک ہو! یا تجھ کو آفتاب سا شرف اور مرتبہ مبارک ہو! اور غالب کو تیری بلند مرتبہ چوکھٹ دور گاہ) کی زیارت یعنی تیرے دربار میں حاضری مبارک ہو۔

---

(۱۱)

(۱) افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو ۞ اس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے

(۲) جس پاس، روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ۞ روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

مطلب:۔ جس شخص کے پاس روزہ کھولنے کے بعد کھانے کے لیے کچھ موجود ہو اُسے روزہ رکھنا لازم ہے مگر جس کے پاس روزہ کھولنے کے بعد کھانے کو کچھ نہ ہو تو وہ شخص اگر مجبور ہو کر روزہ نہ کھائے تو اور کیا کرے؟ روزہ کھانا یعنی روزہ نہ رکھنا۔

---

(۱۲)

(۱) اے شہنشاہِ آسماں اورنگ ۞ اے جہاندار آفتاب آثار

(۲) تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں ۞ تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

(۳) تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ۞ ہوئی میری یہ گرمیٔ بازار

(۴) کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز ۞ روشناسِ ثوابت و سیار

آسماں اورنگ۔ وہ شخص جس کا تخت آسمان ہو ۞ آفتاب آثار یعنی آفتاب کی سی شان و شوکت رکھنے والا ۞ گرمیٔ بازار یعنی عزت و شہرت ۞ ثوابت (ثابت کی جمع) وہ ستارے جو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے ۞ سیار یعنی وہ ستارے جو گردش کرتے رہتے ہیں ۞

مطلب:۔ اے ممدوح! میں ایک گدائے بے نوا اور دردمند انسان تھا مگر آپ

نے مجھے ایسی عزت بخشی کہ ثوابت اور سیّار بھی مجھے پہچاننے لگے۔ یعنی میں ساری دُنیا میں مشہور ہو گیا۔

(۵) گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری ؛ ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
(۶) کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی ؛ جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
(۷) شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں ؛ بادشہ کا غلامِ کار گزار

مطلب :- اگرچہ بے ہنر ہونے کی شرم کے باعث میں خود اپنی نظر میں اتنا ذلیل ہوں کہ اگر میں اپنے کو خاکی کہوں تو مجھے یقین ہے کہ خاک کو بھی میری نسبت کی وجہ سے شرم آنے لگے گی۔ لیکن میں پھر بھی خوش ہوں کہ ممدوح کا غلام تو ہوں۔

(۸) خانہ زاد اور مرید اور مدّاح ؛ تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
(۹) بارے نوکر بھی ہو گیا، صد شکر ؛ نسبتیں ہو گئیں مشخص، چار

مطلب :- میں آپ کا غلام اور مرید اور مدّاح تو پہلے سے تھا اب کچھ دنوں سے آپ کی سرکار میں ملازم بھی ہو گیا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپ سے چار نسبتیں قائم ہو گئیں۔ مشخص بمعنی متعین یا متحقق۔

(۱۰) نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں ؛ مدّعائے ضروری الاظہار

مطلب :- اس لیے اگر اپنے دل کا مدعا جس کا اظہار ضروری ہے، آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں ؟

(۱۱) پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں ؛ ذوقِ آرائشِ سر و دستار
(۱۲) کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر ؛ تا نہ دے بادِ زمہریر، آزار

مطلب :- اے ممدوح! اگرچہ مجھے لباس فاخرہ پہننے کا شوق نہیں ہے۔ لیکن موسمِ سرما میں اس قدر لباس تو لازماً درکار ہے جس کو پہن کر سرد ہوا سے محفوظ رہ سکوں زمہریر وہ کرہ ہے جہاں بخارات، یخ بستہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں جاڑا مراد ہے۔

(۱۳) کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش ٭ جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
(۱۴) کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال ٭ کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
(۱۵) رات کو آگ اور دن کو دھوپ ٭ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
(۱۶) آگ تاپے کہاں تلک انسان ٭ دھوپ کھائے کہاں تک جاندار
(۱۷) دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی ٭ وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

مطلب :- اگرچہ بہت نحیف و ناتواں ہوں مگر بہر حال جسم رکھتا ہوں اس لیے ڈھانکنے کے لیے کپڑا درکار ہے چونکہ میرے پاس سردی سے بچنے کے لیے کپڑے نہیں ہیں اس لیے دن کو دھوپ کھاتا ہوں، رات کو آگ تاپتا ہوں۔ اے خدا مجھے آگ کے عذاب سے بچا!

(۱۸) میری تنخواہ جو مقرر ہے ٭ اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
(۱۹) رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک ٭ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
(۲۰) مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات ٭ اور چھ ماہی، سال میں دو بار

مطالب :- میری تنخواہ کے ملنے کا عجب طریقہ ہے مجھے چھ مہینے کے بعد تنخواہ ملتی ہے۔ مُردوں کی چھ ماہی تو سال میں ایک دفعہ ہوتی ہے۔ لیکن میری چھ ماہی سال میں دو مرتبہ ہوتی ہے۔

نوٹ :- قلعہ کے ملازمین کو سال میں دو مرتبہ تنخواہ ملا کرتی تھی۔ مرزا نے حسبِ عادت اپنی تنخواہ کو مُردے کی چھ ماہی قرار دے کر، اس رسم کا مضحکہ اڑایا ہے۔

(۲۱) بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ٭ اور رہتی ہے سود کی تکرار
(۲۲) میری تنخواہ میں تہائی کا ٭ ہو گیا ہے شریک ساہوکار

سود کی تکرار سے سود در سود مراد ہے۔ مطلب واضح ہے۔

(۲۳) آج مجھ سا نہیں زمانے میں ٭ شاعر نغز گوے و خوش گفتار

(۲۴) رزم کی داستان گر سنیے ✽ ہے زباں میری، تیغ جوہر دار

(۲۵) بزم کا التزام گر کیجے ✽ ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

مطلب:- آج دنیا میں کوئی شاعر مجھ سا نغز گو اور خوش گفتار نہیں ہے اگر میں رزمیہ مضامین نظم کروں تو زبان (کلام) سے تلوار کا کام لے سکتا ہوں اور بزمیہ مضامین نظم کروں تو میرا قلم موتی برسا سکتا ہے (نغز بمعنی عمدہ، خوب یا نادر)۔

(۲۶) ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ✽ قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار

(۲۷) آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ✽ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

(۲۸) میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ ✽ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

(۲۹) ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام ✽ شاعری سے مجھے نہیں سروکار

(۳۰) تم سلامت رہو ہزار برس ✽ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مطلب واضح ہے۔ شعر ۲۷ میں لطفِ زبان واقعی قابلِ داد ہے۔

---

(۱۳)

(۱) سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے ✽ جہاں میں جو کوئی، فتح و ظفر کا طالب ہے

(۲) ہُوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے ✽ کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

سیہ گلیم بمعنی بدبخت ✽ شریکِ غالب کے دو معنی ہیں (۱) وہ شریک جو دوسرے شریک پر غالب ہو (۲) غالب کا شریک ✽ اس مصرع میں غالب نے اپنے تخلص سے فائدہ اُٹھاکر یہ مضمون پیدا کیا ہے ✽

مطلب:- چونکہ میں بدبخت ہوں اس لیے جو شخص دوسروں پر فتح و ظفر یعنی غالب آنے کا طالب ہے، اسے لازم ہے کہ میرا نام نہ لے کیونکہ میں ہمیشہ مغلوب رہا ہوں مجھے کبھی کسی پر غلبہ میسّر نہیں ہُوا، ثبوت اس کا یہ ہے کہ جو شخص بھی میرا شریک ہُوا

وہ شریک غالب ہو گیا یعنی مجھ پر غالب آگیا۔ شاعرانہ لطف اس میں یہ ہے کہ غالب کا شریک لامحالہ شریکِ غالب ہی ہو گا؛

---

(۱۴)

(۱) سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آپڑی ؛ مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز حاضر نہ ہوئے

(۲) تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے

تبرید اس دوا کو کہتے ہیں جو دو مسہلوں کے درمیان پی جاتی ہے۔

مطلب:۔ غالب نے اس قطعہ میں بارہ دن کی رخصت طلب کی ہے یعنی بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا ہے کہ بوجہ منضج و مسہل و تبرید، بارہ دن تک دربار میں حاضر نہ ہو سکوں گا؛

---

(۱۵)

(۱) خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر ؛ کہ جسکے دیکھے سے سب کا ہُوا ہے جی محظوظ

(۲) ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی محظوظ!! ۱۸۵۴ء

خجستہ بمعنی مبارک ؛ انجمن بمعنی محفل ؛ طوئے بمعنی شادی یا جشن عروسی؛ محظوظ بمعنی مسرور؛

مطلب:۔ میرزا جعفر کے نکاح کی مبارک محفل میں شریک ہو کر سب لوگ بہت محظوظ و مسرور ہوئے۔ چونکہ یہ محفل ایک مبارک سال میں واقع ہوئی ہے اسلئے اس کا مادہ تاریخ بھی محظوظ بر آمد ہُوا۔

---

(۱۶)

(۱) ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی ٭ ہُوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید

(۲) کہا غالبؔ سے تاریخ اسکی کیا ہے ٭ تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

سنہ ۱۲۷۰ھ

مطلب :- جب میرزا جعفر کی شادی ہوئی تو محفل میں زہرہ نے رقص کیا۔ لوگوں نے تاریخ نکاح دریافت کی تو غالب نے کہا "انشراحِ جشنِ جمشید"۔

---

(۱۷)

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں ٭ دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرتے نہیں کرتے ہوئے سلام ٭ اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

مطلب :- جب کسی بات سے ناواقف یا کسی معاملہ سے بے خبر ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ تو کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ چونکہ درباری آداب کے مطابق جب اہل قلعہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کے بجائے دائیں کان پہ ہاتھ رکھتے تھے۔ اس لیے مرزا نے رباعی کا یہ دلکش مضمون پیدا کیا کہ اہلِ دربار اگرچہ ایک ہی بادشاہ کے خانہ زاد ہیں مگر باہم آشنا نہیں ہیں۔

رُباعیات

(۱)

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال ٭ ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال

آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم ٭ اے عمر گذشتہ ایک قدم استقبال

"اتمام بزمِ عیدِ اطفال" کنایہ ہے خاتمہ عہدِ طفلی سے ۔ ساغر کشِ حال، کنایہ ہے غفلت شعاری سے ۔ سوادِ اقلیمِ عدم کنایہ ہے عالمِ پیری سے ۔

مطلب :۔ دراصل جوانی کے پلٹ آنے کی آرزو کی ہے ۔ لیکن اس آرزو کا اظہار بڑے دلکش انداز میں کیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ عہدِ طفلی کے خاتمہ کے بعد، جوانی مستی اور غفلت میں گزاری ۔ اب بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ اے عمرِ گذشتہ! ہم تیرے قریب ہی آپہنچے ہیں (تو بھی عدم میں ہے اور ہم بھی مُلکِ عدم کے قریب آگئے ہیں) اس لیے تو ہمارے استقبال کے لیے دو ایک قدم چل کر آجا ۔

(آرزوئے اعادہ عہدِ شباب)

---

(۲)

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا ۔ کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا

رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ۔ ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پرنم تھا

مطلب :۔ میں رات محبوب کی زلف (سیاہی) اور رخ (سفیدی) کے تصور میں رویا چونکہ ہر قطرۂ اشک میں آنکھ کی سی سیاہی اور سفیدی پیدا ہو گئی ۔ یعنی ہر قطرۂ اشک ایک دیدۂ پرنم بن گیا ۔ اِس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں صبح تک ہزار آنکھ سے روتا رہا ۔

(۳)

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال ۔ ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال

تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی ۔ لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

یہاں لڑکوں سے معشوق مراد ہیں ۔ چنانچہ میر تقی میر فرماتے ہیں :۔

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب ۔ اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

مطلب :- جس طرح بچے آتشبازی کا تماشہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اسی طرح حسینانِ عالم عاشقوں کے جگر کو جلا کر، سوزِ جگر کا تماشہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ؛

(۴۲)

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بیتابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی

ہم اور فسردن اے تجلّی افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

دل تھا یعنی جب ہمارے دل میں طاقت تھی ؛ جان بمعنی زندگانی ؛ دردِ تمہید بمعنی جس کی ابتدا ہی درد والم سے ہوئی ہو ؛ سہی بمعنی برداشت کی ؛ فسردن بمعنی افسردگی، مایوسی ؛ تجلّی سے محبوبِ حقیقی کی تجلّی مراد ہے ؛ تکرار بمعنی اعادہ یعنی کسی شئے کو جو فنا یا معدوم ہو چکی ہو بجنسہٖ و بعینہٖ دوبارہ پیدا کرنا ؛ تجدید بمعنی کسی شئے کو ازسرِ نو پیدا کرنا یا معرضِ ظہور میں لانا ؛ واضح ہو کہ تکرارِ تجلّی اور تجدیدِ تجلّی یہ فلسفۂ تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ فلسفۂ تصوف میں یہ بات مسلم ہے "لا تکرار فی التجلی یعنی کوئی تجلّی دوبارہ ویسی ہی نہیں ہوتی، تجلّی جب ہوتی ہے بالکل نئی ہوتی ہے۔

ع ہر دم بلباسِ دگر آں یار بر آمد

مطلب :- جب ہمارے دل میں طاقت تھی یعنی ہم نئے نئے عاشق ہوئے تھے تو ہم نے زندگی کی تمام سختیاں برداشت کیں، یعنی رشکِ غیر کی بیتابی اور دیدارِ یار کی حسرت۔ لیکن اب ہم پر عالمِ افسردگی طاری ہے۔ اے محبوب! مانا کہ تیری تجلّی میں تکرار نہیں ہو سکتی مگر تجدید تو ممکن ہے۔ ہم بھی طالبِ تجلّی ہیں۔ طور والی تجلّی نہ سہی، نئی تجلّی سہی۔

ہے خلقِ حسد قماش، لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش، لڑنے کے لیے

یعنی ہر بار، صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش، لڑنے کے لیے

خلقِ حسد قماش۔ دُنیا کے لوگ جن کا شعارِ زندگی حسد کرنا ہے۔ وحشت کدہ

تلاش بمعنی دُنیا ٭ کاغذ باد بمعنی پتنگ ٭ بد معاش یعنی افرادِ حسد شعار ٭

مطلب :- دُنیا میں جو لوگ حاسد ہیں وہ ہر وقت آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور چونکہ دُنیا میں حاسدوں کی کثرت ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دُنیا دراصل عرصۂ مخاصمت ہے۔ یعنی دُنیا کے لوگ پتنگ کی طرح آپس میں لڑنے کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں ٭

(۶)

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا ۔۔۔ اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں ۔۔۔ غالبؔ! مونہہ بند ہو گیا ہے گویا

مطلب :- ہمارا دل بہت غمگین (نژند) ہے، وجہ یہ ہے کہ ہمیں محبوب سے بہت شکایت ہے مگر حرفِ شکایت زبان پر لانے کی تاب نہیں۔ گویا ہمارا مونہہ بند ہو گیا ہے۔ چوتھے مصرع میں لفظ گویا میں ابہام کا رنگ پیدا ہو گیا ہے جو لطف سے خالی نہیں ہے ٭

(۷)

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ ۔۔۔ دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں ۔۔۔ سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

دوسرا مصرع رباعی کی بحر سے خارج ہے۔ یعنی دو حرف، وزنِ رباعی سے زائد ہیں اگر "دل رُک کر بند ہو گیا ہے" پڑھا جائے تو بھی مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر "دل روک کے بند" پڑھیں تو عیب دُور ہو جائے گا مگر مصرع مہمل ہو جائے گا۔ اسی لیے نظم طباطبائی کو یہ لکھنا پڑا "اب خیال کرو کہ غالبؔ سا موزوں طبع شخص اور ناموزوں کہہ جائے" (شرح دیوانِ غالب صـ ۳۶۲)

دل کا رُک جانا یعنی گرفتگیٔ خاطر ٭ سونا، سوگند ہو گیا ہے یعنی نیند نے آنے کی

قسم کھائی ہے ۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ میرا دل ایذا طلب ہو گیا ہے اور شدتِ غم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب دل کی حرکت بند ہو جائے گی ۔ اندریں حالات نیند سے قطعاً محروم ہو گیا ہوں ۔

(۸)

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ۔۔۔ سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۔۔۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

حالی کہتے ہیں ۔" آخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائش پوری کروں یعنی آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ یہ بات اپنی طبیعت کے اقتضاء کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اگر اس باب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میرے معترضین نافہم اور کند ذہن ہیں تو ان کی دل شکنی اور تحقیر یقینی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو خود ملزم ٹھہرتا ہوں پس ہر طرح مشکل ہے ۔"

(۹)

بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جمجاہ نے دال ۔۔۔ ہے لطف و عنایت شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال ۔۔۔ ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے یہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو "شاہ پسند" کہلاتی تھی پہلے مصرع میں لفظ دال سے شاہ پسند دال مراد ہے ۔ دوسرے مصرع میں لفظ دال عربی ہے جس کے معنی ہیں دلالت کرنے والا یعنی رہنما یا دلیل ۔ بے بحث و جدال یعنی بلاشبہ ۔ چوتھے مصرع میں لفظِ دال وہ حرف ہے جو دولت ، دین ، دانش اور داد کے شروع میں آیا ہے ۔ مراد اس سے یہ ہے کہ بلاشبہ یہ دال بہت قیمتی اور محترم ہے ۔ لفظ دال میں جو ابہام ہے ، غالب نے اسی لیے چوتھے مصرع کا مضمون پیدا کیا ہے ۔

مطلب :۔ شاہ جمجاہ نے جو مجھے مونگ کی دال بھیجی ہے یہ ان کے لطف وکرم پر دال ہے۔ یوں سمجھو کہ بلا شبہ یہ دال، دولت ودین ودانش وداد کی دال ہے یعنی بہت قیمتی ہے۔

(۱۰)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم

ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کے شبِ قدر و دِوالی باہم

صفاتِ ذوالجلالی یعنی صفاتِ ایزدی :: سافل بمعنی ادنیٰ درجہ کے لوگ :: شبِ قدر کے لحاظ سے جلالی اور عالی کے الفاظ اور دِوالی کی رعایت سے جمالی اور سافل کے الفاظ لائے ہیں۔ شبِ قدر کا تعلق عالمِ علوی سے ہے اور اس میں جلال ایزدی کا اظہار ہوتا ہے۔ دوالی کا تعلق عالمِ سفلی سے ہے اور اس میں رنگِ جمال پایا جاتا ہے ::

مطلب :۔ بادشاہ میں خدا کی جلالی اور جمالی صفات کا عکس پایا جاتا ہے چونکہ اس سال کی شبِ قدر اور دوالی ایک ہی رات میں واقع ہوئی ہیں۔ اسلئے سافل اور عالی دونوں مسرور و شاداں نظر آتے ہیں۔

(۱۱)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ، شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

مطلب :۔ میری دعا ہے کہ خدا، بادشاہ کو زندہ رکھے تاکہ وہ دنیا میں دانش اور داد کی اشاعت کرے۔ یہ گانٹھ جو رشتۂ عمر میں دی گئی ہے گویا ایک صفر ہے جو اعدادِ عمر میں اضافہ کے لیے لگایا گیا ہے۔ مثلاً اگر بادشاہ کی عمر ۷۰ سال ہے تو خدا کرے ۷۰۰ سال ہو جائے ::

(۱۲)

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا　　اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں　　ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

مطلب :- خدا کرے رشتۂ عمر میں لاکھوں تار ہوں اور اتنے ہی سال شمار کئے جائیں۔ اگر سو سال کی عمر کے بعد ایک گرہ لگائی جائے تو خدا کرے ایسی ہزار گرہیں لگائی جائیں۔ یعنی خدا کرے بادشاہ لاکھوں برس جئیں!

(۱۳)

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں　　عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا　　کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

حالی کہتے ہیں "یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے۔ ظلم سے ہاتھ اٹھانا یعنی ظلم سے دستبردار ہونا۔ یا اسے ترک کرنا۔ باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں"۔　(یادگارِ غالب ص۱۵۵)

جو ہاتھ ظلم سے اٹھاتا ہوگا" یہاں ہاتھ اٹھانے میں ایہام ہے (۱) ظلم سے باز آجانا یا اس ظلم سے قطع تعلق کرلینا (۲) مارنے کیلئے ہاتھ اٹھانا یعنی تلوار بلند کرنا۔
مطلب :- لوگ کہتے ہیں کہ اب اس نے عاشقوں پر ظلم کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ کیونکہ جو ہاتھ اس نے ظلم سے اٹھایا ہوگا۔ اس میں تلوار ضرور ہوگی۔ رباعی کے مضمون کا لطف ایہام میں پوشیدہ ہے"

(۱۴)

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے　　کرتے ہیں درنگ، کام کرنیوالے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ　　وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

حالی لکھتے ہیں "اس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی

اور نئی طرح کی ہے۔ کہ ہم ہر چند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ پھر بھی ہماری حاجت روائی میں ورنگ (دیر) اور لیت ولعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ! خدا ہی سے کہیں۔ مگر پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح وشام کرنے والے ہیں۔ صبح وشام کرنا محاورے میں لیت ولعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا ہی کا کام ہے اس لیے خدا کی نسبت بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کام روائی خلق میں جیسی لیت ولعل وہاں ہوتی ہے ویسی کہیں نہیں ہوتی۔ اکثر ساری عمر امید میں ہی گذر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ (یادگار غالب صہ ۱۵۵)

(۱۵)

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے لیکن غالب
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

برف آب بمعنی آبِ برف یا آب سرد۔

مطلب:۔ مجھے روزہ رکھنے سے انکار نہیں مگر روزہ رکھنے کے لیے آرام کے اسباب یعنی خس خانہ اور برفاب ضروری ہیں۔ اگر یہ چیزیں مجھے میسر ہوتیں تو میں ضرور روزہ رکھتا۔

(۱۶)

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں اشہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

چونکہ سیم کے بیج، فیروزے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اِس لیے غالب نے انہیں فیروزہ قرار دے کر رباعی کا مضمون پیدا کیا کہ یہ سیم کے بیج جو سالن میں پڑے ہوئے ہیں دراصل فیروزے ہیں۔ لہٰذا ہم ان کی تسبیح بنا کر ہر دانے پر بادشاہ کو سو دعائیں دیں گے ؎

تمت بالخیر

کتابخانہ [illegible]

عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ
لاہور